

عشقِ قتا ہے عشقِ ابرتا

پاک سوسائٹی

ڈرافٹ کام

امجد جاوید

ہمارے موجودہ معاشرے کی عکاس ایسی داستان ہے، جس میں منقرض کرداروں کی بخت کے ساتھ ساتھ
وارداتِ عشق کا وہ بیان ہے، جس کی انت انسان کے لئے فنا بھی بن سکتی ہے اور بقا بھی

عشق فنا ہے عشق بقا

مصنف : امجد جاوید

علم و عرفان پبلشرز

34- اردو بازار لاہور

فون 042-7352332-7232336

نوٹ:

اس ناول کے جملہ حقوق بحق مصنف (امجد جاوید) اور پبلشرز
(علم و عرفان) محفوظ ہیں۔ ادارہ علم و عرفان نے اردو زبان اور ادب کی ترویج کیلئے اس
کتاب کو kitaabghar.com پر شائع کرنے کی خصوصی اجازت دی ہے، جس
کے لئے ہم انکے بے حد ممنون ہیں۔

”.....کچھ اس داستان کے بارے میں“

”عشق فنا ہے، عشق جا“.....! ہمارے موجودہ معاشرے کی عکاس ایسی داستان ہے، جس میں منفرد کرداروں کی نعت کے ساتھ، واردات عشق کا وہ بیان ہے، جس کی انت انسان کے لئے فنا بھی بن سکتا ہے یا پھر جیسے دائمی مقام پر قائم ہو جاتا ہے۔

یہ داستان اپنے جلو میں کئی پہلو رکھتی ہے، جس میں ایسے کردار ہیں، جو ہمارے آس پاس پھرتے ہیں، ہمارے درمیان سانس لیتے ہیں اور جن سے ہم اپنی روزمرہ زندگی میں ملتے رہتے ہیں۔ انہی کرداروں سے وابستہ یہ داستان وگداز، اس معاشرے کے بہت سارے کھلے راز ہمارے سامنے رکھتی ہے۔ جنہیں ہم اکثر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ حالانکہ ان کرداروں اور ان کھلے رازوں کی پہچان ہی وقت کی اہم ضرورت ہے۔

اس داستان کو احمد جاوید نے اپنے اس خاص منفرد اسلوب میں لکھا، جو انہی کا وصف ہے، اور یہ طے ہے کہ وہ مکمل تحقیق کے بعد ہی کوئی تحریر منظر عام پر لاتے ہیں۔ ایسا اس لئے بھی ہے کہ جہاں وہ صاحب طرز ادیب ہیں، وہاں صحافیانہ رنگ بھی رکھتے ہیں۔ یوں ان کا اسلوب ”دو آتھ“ ہے۔ اس داستان میں کچھ نازک حالات کو چھوٹے ہوئے انہوں نے کمال مہارت سے اپنا بیخام دیا ہے کہ آج کل کا نوجوان، جس طرح اپنے آپ کو نموانے کے لئے جدوجہد کر رہا ہے، ایک واضح مقصد ہونے کے باعث وہ کس راستے پر چل پڑتا ہے۔ معاشرے کے انہی نشیب و فراز اور اپنی ذات کی لٹی کر دینے والے حالات کی جانب نشاندہی کرتی اس داستان میں وہ اشارے موجود ہیں، جن سے تمہیر سیرت کے ذریعے اعلیٰ انسانی اقدار کے مقامات تک رسائی حاصل کی جاسکتی ہے۔

احمد جاوید نے یہ داستان بہت منظر و انداز میں لکھی ہے، جس میں تہہ در تہہ کھلتے راز، عشق کی انوکھی تشریح، انسانی نفسیات کے مختلف پہلو، سماجی مسائل کی نشاندہی، فلسفیانہ رنگ، زبان و بیان کی وہ سادگی کہ جس سے ہات سیدھی دل میں اتر جائے، اور تحریر کی وہ چاشنی، جس سے قاری نہ صرف مستکبڑ ہوتا ہے بلکہ نئے آنے والے خیالات اسے سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے اس داستان میں قاری کے تصور کو تحریک دی ہے۔ مجھے امید ہے کہ احمد جاوید کی یہ داستان، ”عشق فنا ہے، عشق جا“ اپنی سابقہ تحریروں کی مانند عوامی قبولیت کی سند ضرور حاصل کرے گی۔

(انشاء اللہ)

محل فرراز احمد

امجد جاوید کی زندہ تحریر

”مشق قلم ہے، مشق قلم“ میں مشق کا تاثر گہرا ہے۔ یہ معاشرے میں سسٹم کے شکار بے کچھے افراد کی داستان ہے۔ اس جبر کی کہانی جس نے عام آدمی کی زندگی کو جہنم بنا دیا ہے۔ امجد جاوید کی دردمندی، مسائل کی تہہ تک پہنچ کر ان عوامل کو بے نقاب کرتی ہے جو اس انتشار اور افراتفری کے ذمے دار ہیں۔ امجد جاوید کا قلم گہرائی کے ساتھ موضوع کو کھنگالنا اور سچ کی پرتوں کو اٹھانے کی سعی کرتا نظر آتا ہے۔ تاہم ”مشق قلم ہے، مشق قلم“ محض جذبوں کی شدت اور اپنے موقف کے اظہار کی داستان نہیں، امجد جاوید کو کہانی کہنا آتا ہے، اور اسی باعث کہیں اس کہانی میں آکٹا ہٹ کا جمول نہیں۔ تحریر کی رفتار، بیانیہ کی روانی اور چابکدستی جہاں قاری کو بانٹھے رکھتی ہے، وہیں دیکھے ہمالے، آس پاس کے کردار، ہلکے گہرے تاثر کے ساتھ نمودار ہو کر اٹھ اٹوٹ چھوڑ جاتے ہیں۔ میں ادب کے ایک طالب علم کی حیثیت سے کہوں گا کہ امجد جاوید کا اسلوب اپنی پہچان بنانے میں کامیابی سے ہمکنار ہے، امجد جاوید کی یہ تحریر زندہ ہی نہیں، جوان بھی رہے گی۔

دیکھیہر شہزاد

کتاب گھر کا پیغام

آپ تک بہترین اردو کتابیں پہنچانے کے لیے ہمیں آپ ہی کے تعاون کی ضرورت ہے۔ ہم کتاب گھر کو اردو کی سب سے بڑی لائبریری بنانا چاہتے ہیں، لیکن اس کے لیے ہمیں بہت ساری کتابیں کمپوز کروانا پڑیں گی اور اسکے لیے مالی وسائل درکار ہوں گے۔ اگر آپ ہماری براہ راست مدد کرنا چاہیں تو ہم سے kitaab_ghar@yahoo.com پر رابطہ کریں۔ اگر آپ ایسا نہیں کر سکتے تو کتاب گھر پر موجود Ads کے ذریعے ہمارے سپانسرز ویب سائٹس کو وزٹ کیجئے، آپ کی یہی مدد کافی ہوگی۔

یاد رہے، کتاب گھر کو صرف آپ بہتر بنا سکتے ہیں۔

وہ بچپلے آدمے گھٹے سے ڈاکٹر جمیل کی بکواس سن رہی تھی جو نہایت گھنٹیا انداز میں اُس سے "اعلمہار مشق" کرتا چلا جا رہا تھا۔ وہ اگر نرس ہونے کی وجہ سے اس وقت ڈیوٹی پر نہ ہوتی تو اب تک اُس کے منہ پر کئی تھپڑ مار چکی ہوتی۔ ڈاکٹر جمیل اس کے جذبات سے بے نیاز انتہائی سوتیانہ انداز میں اپنی کہے جا رہا ہے جبکہ راحیلہ اُس کے لفظوں سے لفظوں محسوس کرتے ہوئے خود میں صٹ کر رہ گئی تھی۔ وہ جو اب تک اس ماحول سے مزاحمت کرتی چلی آ رہی تھی اسے لگ رہا تھا کہ یہ ماحول اُسے تو ڈر کر رکھ دے گا۔ اس نے اب تک جو خود میں توانائی بچا کر رکھے ہوئے تھی اُسے ڈر تھا کہ اس قوت کے باعث وہ کہیں پھٹ نہ جائے۔ یوں وہ خود کو تو مزادے گی ہی لیکن کسی نہ کسی کی جان بھی ضرور لے لے گی۔ اس سے بچنے کا راحیلہ نے کبھی حل تلاش کیا تھا کہ وہ اس قسم کی بیہودہ گفتگو سنی رہے مگر اس کے معنی اور معلوم کو اپنے دماغ تک رسائی نہ لینے دے جبکہ ادھیڑ عمر ڈاکٹر اپنے شہادت زدہ چہرے کے ساتھ کبڑ رہا تھا۔

"دیکھو راحیلہ! میں بالکل سیدھا اور صاف گو انسان ہوں۔ میں تمہیں شادی وغیرہ کے سبز باغ نہیں دکھاؤں گا کیونکہ میں پہلے ہی سے شادی شدہ ہوں میرے دل بچے ہیں مگر میں تم سے دوستی ضرور چاہوں گا۔ یہ میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش بن چکی ہے۔ میری یہ دوستی تمہیں کہاں سے کہاں تک پہنچا دے گی اس کا تم اندازہ نہیں کر سکتی ہو۔" ڈاکٹر جمیل نے انتہائی ملائمت اور پیار سے لہجے میں دھیرے دھیرے سمھانے کے بعد چند لمبے خاموش ہو کر اس کی طرف دیکھا رہا تا کہ اُس کے چہرے پر سے اُبھرتے ہوئے تاثر سے اپنی کئی ہوئی بات کا اندازہ لگائے مگر راحیلہ کا چہرہ ساٹا رہا۔ وہاں کچھ نہ پا کر اُس نے مزید کوشش کی اور بولا۔

"میں جبر کا قائل نہیں اور نہ ہی کسی طرح کی بلیک میلنگ کو اچھا سمجھتا ہوں۔ سیدھی سی بات ہے تم مجھے اچھی لگتی ہو اور میں تمہارا ساتھ چاہتا ہوں۔ اس کے عوض تمہارے سارے مسائل حل ہو جانے کی میں ضمانت دیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ پھر سے خاموش ہو کر اُس کی طرف دیکھنے لگا مگر راحیلہ کے چہرے پر ڈراما تاثر بھی ایسا نہیں اُبھرا کہ جس سے ڈاکٹر جمیل کو بلکا سا بھی اشارہ مل جائے۔ وہ اس کے لفظوں زدہ لفظوں والی بکواس پر کسی بھی قسم کا کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں کرتا چاہے وہی تھی لیکن ڈاکٹر جمیل بھی اپنی دھن کا پکا تھا وہ اسی طرح کی باتیں کرتا رہا جیسے کسی شکار کو کھیرے میں لانے سے پہلے پوری طرح تھکا دیا جائے۔ ادھیڑ عمر ڈاکٹر اچھا خاصا شکاری معلوم ہو رہا تھا۔ راحیلہ کے اندر غبار اُٹھتا چلا جا رہا تھا۔ وہ ہمیشہ ان باتوں پر چپ سا دھسے رکھتی کوئی جواب نہ دیتی۔ اپنی ڈیوٹی کرتی اور وہاں ہنس ہنس چلی جاتی پھر وہاں جا کر اپنے آنسوؤں سے کلیہ بھگوئی رہتی۔ یہاں تک کہ اُس کی روم میٹ لسرن جوزف اُس کی ڈھارس بندھاتی اُسے حوصلہ اور تسلی دیتی۔۔۔

اس وقت بھی اُس نے اپنی کھائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی ڈیوٹی ختم ہونے میں تھوڑا وقت باقی تھا۔ اُس نے ایک سرد آہ لی اور ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ وہ ڈاکٹر جمیل کو پوری طرح نظر انداز کر دینا چاہ رہی تھی مگر وہ باوجود کوشش کے اُسے نظر انداز نہیں کر پار ہی تھی کیونکہ اُس کے ہدیو دار لفظوں نے ماحول میں مزاحم چار چکی تھی۔ اُس نے بے بسی سے ادھر ادھر دیکھا تو اُس کی نگاہ گھڑی سے باہر پڑی جہاں کارٹون کے آخری سرے پر لوگ آ جا

رہے تھے۔ اس وقت وہ وہی اذیت سے گزر رہی تھی۔ ڈاکٹر جمیل اُسے اپنے سامنے بٹھائے مسلسل بیچودہ ہاتھیں کرتے چلا جا رہا تھا جبکہ وہ وہی اذیت کی اس حد تک پہنچ گئی تھی جہاں سے بے حسی کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ اُسے ڈاکٹر کی ہاتھیں تو سنائی دے رہی تھیں مگر وہ ان کا معلوم سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کر رہی تھی۔ اُس کی نگاہ کھڑکی سے باہر کاریڈور میں ان مریضوں پر تھی جو دوسرے ڈاکٹروں سے چپک آپ کروانے کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کھڑکی میں سے کاریڈور کا آخری سرا بھی دکھائی دے رہا تھا جہاں داخلی دروازہ تھا۔ اُس کی ساری توجہ اسی جانب تھی کہ اُس داخلی دروازے میں سے چند پولیس والے اندر داخل ہوئے جن کے گھبرے میں ایک لہارتا لگا تو جوان تھا اُس کے ہاتھوں میں ہتھیاری اور بیروں میں بیڑی تھی۔ قدم قدم چلتے ہوئے بیڑی کی جھنکار ایک عجیب خوفزدہ کر دینے والا تاثر پیدا کر رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ قدموں سے چل رہا تھا بیڑی کا کندھا اُس کے ہاتھ میں تھا۔ اگلے چند لمحوں میں وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ انہی لمحات میں راحیلہ نے سکھ کا سانس لیا۔ اُسے معلوم تھا کہ پولیس والے ملزم کو لے کر انہی کے کمرے میں آئیں گے۔ یوں تو موزی دیر کے لئے ہی کسی وہ ڈاکٹر جمیل کی خرافات سے بچ جائے گی۔

کئی دروازے میں سب سے پہلے ایس ایچ او داخل ہوا پھر ملزم اور اُس کے بعد دوسرے پولیس والے تھے۔ راحیلہ نے ڈھکوس کیا کہ پولیس والوں کی تعداد معمول سے کچھ زیادہ ہی ہے بلاشبہ وہ کوئی خطرناک مجرم ہو گا جیسی اُس نے کمرے کے صحن وسط میں کھڑے اس ملزم کو دیکھا۔ لہا قدموں کی موٹی لیکن قدرے سرخ آنکھیں ستواں ناک پتلے پتلے ہونٹ جس پر ہلکی ہلکی مونچھیں بہت ہی سج رہی تھیں داڑھی پر اچھی خاصی لونس تھیں بے ترتیب اور اٹکھے ہوئے بال کافی بوڑھے ہوئے تھے۔ سرخ گال اور اسی طرح ہونٹ جو دائیں طرف سے پھٹا ہوا تھا تھی ہوئی گروان پر دائیں جانب نیل بڑا ہوا تھا۔ سلی ہوئی شلوار تھیں پردے تھے اٹکھیاں نیلی ہو رہی تھی۔ بلاشبہ وہ پولیس تشدد کا شکار ہو چکا تھا۔ اُس نے ملزم کو بہت غور سے دیکھا تھا اور جیسی اُسکے دل نے لمبے بھر میں گماہی دے دی کہ یہ تو جوان کنبہ نہیں ہو سکتا اور نہ ہی اس سطح کا مجرم ہے جس طرح پولیس اسے یہاں لے کر آئی ہے۔ اُس کے چہرے پر ایک بانوس جسم کی مصمصیت تھی صرف اُسکی آنکھیں چہرے سے اٹکی دکھائی دے رہی تھیں جن میں حصہ نفرت اور بے باکی پوری طرح جھانک رہی تھی۔ اُس نے خالی کرسی دیکھی اور اُس پر بیٹھ گیا تو ایک سپاہی نے آگے بڑھ کر اُسے کال سے پکڑا اور غصے میں بولا۔

”اوائے امر رہا ہے تو جو یہاں کرسی پر ڈھیر ہو رہا ہے۔ اٹھو کھڑا ہو جا۔ جب تک صاحب نہ کہیں تو کیسے بیٹھ سکتا ہے۔“

اگرچہ اُس کے بیٹھ جانے سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا لیکن سپاہی کا یہ حکم محض اسے ڈبیل کرنے کے لئے تھا۔ اُس پر تو جوان نے گھوم کر اُس سپاہی کی طرف دیکھا۔ تو جوان کی نگاہوں سے شیطے برسنے لگے تھے جسے بھانپتے ہوئے ایس ایچ او نے فوراً کہا۔

”کوئی بات نہیں بیٹھے رہو۔“ یہ کہہ کر اُس نے ڈاکٹر جمیل کی طرف دیکھا جو عینک میں سے ایس ایچ او کو دیکھ رہا تھا دونوں کی نگاہیں ملیں تو اُس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب! اس کامیڈیکل چارجے کل اسے ریمائنڈر کے لئے پیش کرنا ہے۔“

”اوا چھا۔۔۔“ ڈاکٹر نے ساری بات سمجھتے ہوئے تو جوان کو غور سے دیکھا اور پھر ایس ایچ او سے پوچھا۔ ”کوئی ہڈی وڈی تو نہیں ٹوٹی ہے نا اس کی۔۔۔؟“

”آپ خود تلی کر لیں دیکھ لیں اسے۔۔۔“

ایس ایچ اونے کہا تو ڈاکٹر نے اٹھتے ہوئے اُسے ایک بچہ پریٹ جانے کا اشارہ کیا۔ سبھی وہ نوجوان ہاتھ کے اشارے سے اُسے روکتے ہوئے بولا۔

”بیمخوڈا کٹر! پہلے مجھے پانی پینا ہے۔“ اس کے لہجے میں ایسی فراہمت تھی کہ ماحول میں سناٹا چھا گیا۔
”اسے پانی پلاؤ۔“

ایس ایچ اونے ایک سپاہی کی جانب دیکھتے ہوئے حکم دیا تو نوجوان دھاڑتے ہوئے بولا۔
”اونے مجھے تم لے کر آئے ہو تمہی پانی پلاؤ۔“

یہ کہتے ہوئے اُس نے ایک ہی سانس میں کئی گالیاں بک دیں۔ ایک لمبے کے لئے ایس ایچ او کی توجیوں پر بل پڑے آنکھوں سے غصہ چمکا اور پھر اگلے ہی لمبے وہ بے عزتی برداشت کرتے ہوئے خود پانی لینے پڑا گیا۔ اُس نے کونے میں دھرے کلمے سے پانی کا ایک گلاس بھرا اور نوجوان کے پاس لے آیا۔ سبھی ملام نے اُس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کی جانب دیکھا اور دونوں ہاتھوں سے گلاس گرا دیا ایس ایچ او کے ہاتھ سے گلاس گر کر چکنا چور ہو گیا۔

”تمہیں اپنے باپ کو پانی پیش کرنے کی تمیز نہیں ہے؟“

نوجوان ملام نے کسی گھاک مجرم کی طرح کہا تو راحیلہ کانپ کر رہ گئی اُسے وہ اپنا سارا تاثر ٹوٹا ہوا محسوس ہوا جو چند لمبے پہلے اُس نے اپنے تئیں ذہن میں بنایا تھا۔

”تم یہاں سے چلو تمہیں ساری تمیز میں سکھاؤں گا۔“

ایس ایچ اونے دانت پیستے ہوئے کہا جسے بہر حال راحیلہ نے سن لیا۔ ایک لمبے کے لئے قصور میں وہ نوجوان اُسے خون میں لت پت دکھائی دیا تو وہ ہلر ڈگئی۔

”تمہیں تین دن ہو گئے ہیں مجھے تیز سکھاتے ہوئے لیکن اب کچھ نہیں سمجھ پائے ہو۔ ڈرو اس وقت سے جب تم میری زبان بولو گے بے غیرت!“

ملام نے فراتے ہوئے سرد لہجے میں کہا تو ایس ایچ او جھٹکا بولا۔

”تیرے جیسے کئی بھڑوے آئے اور گئے۔ غنٹے کی طرح اپنے تلوے نہ چٹوائے تو میرا نام بھی سلامت خان نہیں۔۔۔ چل میڈیکل کرو۔“ اُس کے لہجے میں نخوت اور غصہ کھل گیا تھا۔
”پہلے پانی۔“

وہ مظلوم انداز میں کہتے ہوئے حقارت سے بولا۔ اسی لمبے راحیلہ نے ایک طرف پڑا ہوا گلاس اٹھایا اور کولر سے پانی بھرنے چل دی۔ سبھی ملام نے کہا۔

”نہیں یہی لے کر آئے گا۔“ اس نے ضدی لہجے میں کہا۔

”سنیں جانتا ہوں کہ تم یہ سب کیوں کر رہے ہو اس لئے چپ چاپ۔“ ایس ایچ او غصے میں کہتے ہوئے خاموش ہو گیا تو وہ بولا

”مجھے کھول کر دیکھو پھر میں تجھے بتاؤں۔ ایک دفعہ کھول تو سکی۔“

اس نے انتہائی غصے میں کہا تو ایس ایچ او بولا۔

”ممبر۔۔۔ ممبر میرے بیٹے! ممبر کر۔ ابھی جا کے تجھے کھولنا ہوں۔“

”تم وہاں بھی نہیں کھولو گے مجھے۔ ایک بندھے ہوئے مرد کو تو پانچ دس گھنٹے بھی مار سکتے ہیں۔“

طرم کی آواز میں کسی دشمنی چھپتے کی سی غراہٹ تھی۔ راحیلہ کو نجانے کیوں وہ اچھا لگ رہا تھا۔ پانی بھر کر وہ آگے بڑھی اور اس کے بالکل

قریب جا کر اس کا ہاتھ پکڑا اور اس میں گلاس تھماتے ہوئے بولی۔

”یہ لیں پانی پی لیں۔“

راحیلہ کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ اس نے لگاؤ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ راحیلہ نے اس کی نگاہوں میں نجانے کتنی جولا نیاں دیکھیں۔

نمورنگا ہوں میں کس قدر گہرا نیاں تھیں ایک لمبے میں وہ ڈور تک ڈوب جانے کے باوجود اندازہ نہیں لگا سکی تھی۔

”نہیں لے جاؤ۔۔۔“

طرم نے نہ کہا تو وہ اس کی نگاہوں کے تصور سے نکل آئی۔ اس نے خود کو سمیٹا اور پھر دھبے سے لہجے میں بڑے رसान سے بولی۔

”جوش سے نہیں ہوش سے کام لیتے ہیں۔ پھر پہاڑ بھی ہوں نارتے میں تو وہ بھی رستہ دے دیتے ہیں۔ پی لو۔“ اس کے یوں کہنے پر

طرم نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں پہلے حیرت اور پھر ممنونیت آتری۔ اس نے دھیرے سے گلاس پکڑ لیا۔ چند گھنٹ پانی پینے کے

بعد اس نے گلاس واپس کر دیا۔

”دیکھا دیکھا۔ اس بے غیرت کو کیا اس نہیں تھی ابو نبی تک۔“

ایس ایچ او نے کہنا چاہا تو طرم نے فرماتے ہوئے کہا۔

”خاموش۔۔۔ خاموش رہو ورنہ ابھی تجھے اپنے جوتے صاف کرنے پر لگا دوں گا۔“

”لوئے چل سیدھا ہو کر بیٹھ۔“ یہ کہہ کر ایس ایچ او نے گویا جان چھڑائی اور ڈاکٹر کو اشارہ کیا۔

”کیا نام ہے تمہارا۔۔۔؟“ ڈاکٹر نے سرسری سے معائنے کے بعد طرم سے پوچھا۔

”جنید اقبال۔“ اس نے عام سے انداز میں کہا اور پھر تیزی سے بولا۔ ”اس رپورٹ کی کوئی وقعت ہوگی یا نہیں مگر تمہارے بارے

میں پتہ چل جائے گا کہ تم کیا شے ہو۔ رپورٹ لکھتے ہوئے میری یہ بات ذہن میں رہے۔“

”اوئے لے چلو اسے باہر۔۔۔“

ایس ایچ اونی کہا تو وہ سپاہی اسے باہر لے گئے۔ ایس ایچ اونی پسند کے مطابق رپورٹ بخوانے لگا۔ راحیلہ ایک جانب کھڑی رہی۔ ڈاکٹر اور ایس ایچ اونی مصروف تھے کہ نسرین جو زلف آگئی ڈیوٹی نام ختم ہو چکا تھا۔ اس نے ڈاکٹر کی قطعاً پرواہ نہیں کی اور وہ دونوں باہر چلی گئیں۔ جنید پولیس کے نرنے میں باہر لان کے ایک کونے میں کھڑا تھا۔ راحیلہ کو نبھانے کیا سوچتی وہ اس کی طرف بڑھ گئی۔ نسرین کو حیرت ہوئی کہ یہ کدھر جا رہی ہے؟ وہ جنید کے پاس جا کھڑی ہوئی اور اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے بولی۔

”خوشی ہو یا اذیت! اسے برداشت کرنے کی صلاحیت انسان کے اندر ہوتی ہے۔ میری دعائیں ہے تمہارے لئے۔“

اس نے کہا تو جنید نے چوک کر اس کی طرف دیکھا۔ کتنے ہی لمحے وہ بوجھتی ساکت رہا۔ راحیلہ آگے بڑھ گئی۔ اس کے اندر ایک عجیب طرح کی مہمانیت اتر آئی تھی۔

”کون تھا وہ؟ تم نے کیا کہا ہے اے۔ کیا بات تھی؟“

نسرین ایک ہی سانس میں کلی سوال کر گئی تو راحیلہ نے کہا۔

”ہاشم چلو جاتی ہوں۔“

اس کے یوں کہنے پر نسرین اٹھتے ہوئے اس کے ساتھ چلتی چلی گئی ان دونوں کا رخ اپنے ہاشم کی طرف تھا۔

☆☆

ہر شہر میں ایک مخصوص چوک تو ہوتی ہے جہاں رات گئے تک چہل پہل رہتی ہے۔ اس چوک میں بھی رات کا دوسرا پہر گزر جانے کے باوجود رونق تھی۔ ٹریک کا زور بہت حد تک ختم ہو گیا تھا، کھانے پینے کی دکانیں کھلی ہوئی تھیں اور لوگ کھانے پینے کے ساتھ گپ شپ میں مصروف تھے۔ ہر جانب سکون محسوس ہو رہا تھا۔ بس ایک پھاڑی کی دوکان پر ریڈیو بج رہا تھا جس کے ساتھ ہی جائے کی دوکان تھی اور کئی لوگوں کے ساتھ وہاں ہمایوں بھی اپنے تین دوستوں کے ساتھ چائے پینے گیا تھا۔ وہ چاروں لاء کے طالب علم تھے اور ان دنوں اس کے قلم امتحان چل رہے تھے۔ رات گئے پڑھائی کے بعد وہ یہاں چائے پینے آ گئے تھے۔ وہ یہاں آتے تو پھاڑی کی دوکان پر رکھے ریڈیو پر ضرور تہرہ کرتے۔ پھاڑی نے وہ ریڈیو نشانہ کی طور پر اب بھی رکھا ہوا تھا۔ جب اس کے ہاپ نے یہ دوکان شروع کی تھی تب یہ نیا تھا اور اب دوسری نسل تک منتقل ہو گیا تھا۔

”دیکھو ریڈیو خاموش ہو گیا ہے۔ اب پینٹس کس چینز پر کون سا اسٹیشن لگے گا؟“ عمو نے ہنستے ہوئے کہا تو اٹھتے ہیں چائے آگئی۔

”چل چھوڑ تو جائے پی۔“

ہمایوں نے کہا تو وہ چائے کی جانب متوجہ ہو گئے۔ وہ چائے پی رہے تھے کہ اچانک ان کے قریب ہی ایک پولیس دین آ کر رکی اور اگلے ہی لمحے اس میں سے چند سپاہی نکل کر آگے بڑھے۔ ایک سب انسپلر آگے تھا۔ وہ تیزی سے ساتھ ہی آئس کریم کی دوکان میں گھسے اور جاتے ہی سب انسپلر کا ڈنپر کھڑے آئس کریم والی دوکان کے مالک کو گریبان سے پکڑ کر باہر لانے لگا۔ وہ حیرت زدہ سا کچھ کہنے کی کوشش کرنے لگا مگر اس نے ایک نہ سنی اور اُسے سمجھ کر دوکان سے باہر لے آیا۔ اس کی بیچ تانی اور مزاحمت میں لوگ ان کی طرف متوجہ ہو گئے ہمایوں بھی اسی جانب دیکھ رہا

تھا۔ چند لمبے بعد وہ دوکاندار کو گھسیٹ کر سڑک پر لے آئے۔ اس دوران اس پر تھپڑوں اور ٹکوں کی بارش ہوتی رہی۔ دوکاندار بے چارہ ان سے یہی پوچھتا رہا کہ قصور تو تائیں مگر اسے قصور تو کیا بتایا جاتا اسے غلطیہ گالیاں بھی دینے لگے۔ ان کے ارد گرد جو لوگ اکٹھا ہونا شروع ہو گئے وہ سب تماشا دیکھ رہے تھے کسی میں ہمت نہیں تھی کہ وہ پولیس والوں کا ہاتھ روک سکیں۔ ہمایوں بھی انہی تماشاخیوں میں شامل تھا جو تھوڑے سے قاصلے پر بیٹھا اس نوجوان دوکاندار کو پٹتا ہوا دیکھتا رہا۔ وہ نوجوان بے ذم سا ہو کر سڑک پر گر گیا تو ایک سپاہی نے اس کے کپڑے اُتارنا شروع کر دیئے۔ انہی لمحات میں نجانے ہمایوں کو کیا ہوا وہ اٹھ کھڑا ہوا اور سب انسپکٹروں کو قاطب کرتے ہوئے بولا۔

”یہ سراسر لاقانونیت ہے۔ بس کر ڈیہ ظلم مت کرو۔۔۔ کچھ تو اس کی عزت کا خیال کرو۔“

اس کے یوں کہنے پر یکدم سناٹا چھا گیا۔ سب انسپکٹرنے اس کی جانب یوں دیکھا جیسے وہ بہت بڑا گناہ کر چکا ہو۔ وہ چند لمبے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر آگے بڑھا کہ اس کا گریبان پکڑ لیا اور پھر انتہائی حقارت سے بولا۔

”اُوئے تو کون ہے ہمیں عزت اور قانون کا سبق پڑھانے والا۔۔۔ پہلے میں تجھے تو بتا دوں کہ عزت اور قانون کیا ہوتا ہے؟“

یہ کہتے ہوئے اُس نے ایک زوردار تھپڑ ہمایوں کے گال پر دے مارا۔ تبھی اس سب انسپکٹروں کی مدد کے لئے دو سپاہی آئے انہوں نے بھی اسے تھپڑوں اور ٹکوں پر رکھ لیا۔ اس کے ساتھ ہی غلطیہ ترین گالیوں کا طوفان ان کے منہ سے اُبلتا رہا۔ ہمایوں نے کسی قدر مزاحمت کی کوشش کی لیکن اس کی تلاش نہ چلی چند ہی لمحوں میں وہ خرد حال ہو گیا۔ تبھی سب انسپکٹرنے اُونچی آواز میں کہا۔

”اٹھا ڈان دونوں کو اور تھانے لے چلاؤ وہیں پوچھتے ہیں۔“

یہ کہتا ہوا وہ دین میں بیٹھا تو سپاہی نے پہلے دوکاندار کو اور پھر ہمایوں کو دین میں جانوروں کی طرح پھینکا اور انہیں لے کر چل دیئے۔ یہ سب آٹا ٹاٹا ہوا۔ وہ تو چلے گئے مگر جھوک میں سوائے تھپڑوں کے اور کچھ نہ رہا اس کے تینوں دوست بھی فوراً ہی وہاں سے چلے گئے۔

تھانے پہنچتے ہی انہیں سیدھا اس کمرے میں لے جایا گیا جہاں ایک مدھم سا لمب روٹن تھا اور ننگے فرش پر ایک لڑکا اونڈھ سے پڑا ہوا تھا۔ دو سپاہی ڈنڈے لے کر اس کے اوپر کھڑے تھے اور ایس ایچ او ایک کرسی پر بیٹھا یہ کارروائی انتہا کم سے دیکھ رہا تھا۔ ہمایوں کو یوں لگا جیسے وہ لڑکا بے ہوش ہو چکا ہے۔ وہ اپنے آپ کو پولیس نارچر سیل میں پا کر خوف زدہ ہو گیا۔

”تمہیں تو ایک کولانے کے لئے بھیجا تھا اور تم دولے آئے ہو۔“ ایس ایچ او نے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”آکس کریم والا تو یہ ہے۔“ سب انسپکٹرنے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”اور یہ دوسرا۔“ ایس ایچ او نے پوچھا۔

”یہ خواہ مخواہ کا خدائی نوچدار ہے قانون اور عزت کی بات کرتا ہے۔ میں اسے ذرا قانون اور عزت کا سبق دینے کے لئے لایا ہوں۔“

یہ کہہ کر اُس نے مختصر سے اعزاز میں تفصیل بتا دی۔ یہ سن کر ایس ایچ او نے کہا۔

”اسے ادھر رہنے دو اور آکس کریم والے کو لے جا پوچھ اس سے اور بتائے تو اسے بھی لے آنا۔“ یہ کہہ کر اُس نے ہمایوں کی طرف

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

دیکھا اور کہا۔ ”کیوں بنے تجھے کیوں خارش ہوئی تھی؟“

”میں تو — میں نے تو صرف —“

ہمایوں نے بھکاتے ہوئے کہا تو فرش پر پڑے ہوئے لڑکے نے خود کو سپردھا کر یا۔ وہ جینید تھا، اُس نے ہمایوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”مرد تیرے اور نئے مرد — جو کہا ہے اس پر قائم رہ —“ یہ کہہ کر وہ ایس ایچ او کو غلیظی گالی دیتے ہوئے بولا۔ ”چار دن ہو گئے مجھ سے

ایک بات بھی نہیں منوا سکے ہیں۔“

”بکواس بند کر —“ ایس ایچ او دھاڑا۔

”یہ بکواس تو بند نہیں ہوگی تجھے جو اکھاڑتا ہے اکھاڑ لے۔“

جینید نے انتہائی خطر سے کہا ایس ایچ او دانت نہیں کر رہا گیا۔

”تجھے اگر صبح عدالت میں پیش نہ کرنا ہوتا تو میں بتاتا ایک بھی ہڈی سلامت نہیں رہتی تھی۔“ یہ کہتے ہوئے اُس نے دونوں سپاہی کی

طرف دیکھا اور پھر سارا رخسہ ہمایوں پر اتار دیا۔ جینید اپنے سامنے ہمایوں کو پختے ہوئے دیکھتا رہا۔ تھوڑی سی دیر میں ہمایوں بے ہوش ہو گیا۔

”اسے ہوش میں لاؤ۔“

ایس ایچ او نے کہا اور پھر سب انسپکٹر کو باہر جانے کا اشارہ کرتے ہوئے خود بھی چلا گیا۔ اس وقت صبح کی اذانیں ہونا شروع ہو گئی

تھیں۔ شاید ہمایوں کے چوت کہیں زیادہ لگ گئی تھی اسے ہوش نہیں آیا۔ سپاہی اپنے طور پر جمن کرتے رہے۔ تھک کر ان میں سے ایک باہر کی

طرف گیا، تھوڑی دیر میں سب انسپکٹر اندر آیا اُس نے ہمایوں کو دیکھا تو پریشان ہو گیا۔ تب جینید نے کہا۔

”اوائے لے جا اسے ہسپتال ورنہ تیرے گلے پڑ جائے گا۔ بندہ دیکھ کر تو ہاتھ ڈالا کرو۔“

”بک بک بند کر اوائے۔“ سب انسپکٹر نے کہا اور سپاہیوں کو اسے اٹھانے کا اشارہ کر کے خود بھی باہر چلا گیا۔

رات کا آخری پہر ختم ہونے کو تھا جب سرکاری ہسپتال میں پولیس وین داخل ہوئی۔ ڈاکٹر والے کمرے کے باہر دھڑے بچا پر لیٹے ہوئے

بوڑھے وارڈ بوائے نے سر اٹھایا۔ پولیس وین پر نگاہ پڑتے ہی وہ جلدی سے اٹھ کر اس کی جانب بڑھا جہاں وین ڈک تھی اور دو سپاہی باہر آ

چکے تھے۔ تھی وین کی اگلی نشست سے اترتے ہوئے سب انسپکٹر نے بوڑھے وارڈ بوائے سے اپنے مخصوص انداز میں پوچھا۔

”ڈاکٹر ہے۔۔۔؟“

”جی وہ ابھی آ جاتے ہیں۔۔۔ آپ حکم کریں؟“

”اوائے جلدی سے ہلاؤ ڈاکٹر ایریس مر ایض ہے۔“

”جی میں ابھی لایا۔“

”یہ کہہ کر بوڑھا وارڈ بوائے ہسپتال کی کالونی کی جانب تقریباً ہانکتے ہوئے تیزی سے چل دیا۔ سب انسپکٹر ٹپٹنے لگا پھر ٹپٹتے ہوئے ڈک

کر سہا بیوں سے بولا۔

”دیکھو تو سہی زندہ ہے یا مر رہا گیا ہے؟“ یہ کہہ کر اس نے لہو بھر کر سوچا اور پھر تیزی سے بولا۔ ”بلکہ ایسا کر ڈاے نکالو اور اس بیخ پر ڈال

دو۔ اسے ہم نے اپنے کھاتے میں تو نہیں ڈالنا ہے۔“

اس کے حکم کے ساتھ ہی سہا بی بھرتی کے ساتھ وین کی جانب بڑھے۔ اگلے ہی چند لمحوں میں ہمایوں کو ہانگوں اور کانٹوں سے پکڑ کر

جانور کی طرح باہر نکالا اور اسے لے جا کر بیخ پر ڈال دیا جہاں پہلے بوڑھا وارڈ بوائے پڑا تھا۔ تقریباً دس منٹ بعد بوڑھے وارڈ بوائے کے ساتھ ڈاکٹر نمودار ہوا۔ ان دونوں کے قدموں میں تیزی تھی۔

”کہاں ہے مریض۔“

ڈاکٹر نے آتے ہی سب انسپکٹر کی طرف دیکھ کر پوچھا تو وہ کرسٹ لیجے میں بولا۔

”وہ۔۔۔ اُدھر۔۔۔ بیخ پر پڑا ہے۔“ ڈاکٹر نے اس طرف دیکھ کر قدم بڑھانا چاہا تو انسپکٹر نے مزید کہا۔ ”سنو ڈاکٹر ایہ لڑکا ہماری چھترول

سے بے ہوش ہوا ہے۔ ممکن ہے ایسی جگہ چوٹ لگ گئی ہو جسے یہ برداشت نہ کر پایا ہو۔ فی الحال تو بے ہوش ہے سر بھی سکتا ہے لہذا ایسی صورت حال

میں مدد عارضی غائب کرنا ہے۔ ہم اسے لائے ہی نہیں۔۔۔ اچھی طرح سن لیا ہے نا؟“

”پہلے مجھے مریض تو دیکھنے دو۔“ ڈاکٹر نے قدرے نرمی سے ہوتے ہوئے کہا۔

”کہانا وہ پڑا ہے۔۔۔ ہم جا رہے ہیں تم اسے دیکھتے رہو۔ بیخ گیا تو اچھا ہے بھگا دینا اسے۔“

سب انسپکٹر یہ کہتا ہوا وین کی جانب بڑھ گیا۔ اس دوران وارڈ بوائے کسی جانب سوئی ہوئی نرس کو بھی اٹھالایا جو آنکھیں ملتی ہوئی آگئی۔

وین جا چکی تھی اس کی آواز نہ ہم ہو کر محدود ہو گئی تھی جب ڈاکٹر اس پر جھکا اس نے بغیر دیکھی بچے نے دیکھے دل کی دھڑکن سنی تو اسے یقین ہو گیا

کہ مریض زندہ ہے۔ اُن تینوں نے اسے ابھر چنسی وارڈ میں ڈالا جس میں سارے دن کی گندگی ابھی تک چڑی ہوئی تھی۔

تقریباً ایک گھنٹے کی مسلسل کوشش کے بعد ہمایوں کو ہوش آ گیا مگر یہ ہوش اسے حواسوں میں نہیں لایا۔ وہ خالی خالی نگاہوں سے اُنہیں

دیکھتا رہا تو ڈاکٹر نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔

”اسے نہیں پڑا رہنے دو۔“ پھر پیڈ پر چند دوائیں لکھ کر نرس کو ہاتھ دے ہوئے کہا۔

”یہ دوائیں سلور سے لے کر اسے دو۔ میں آفس میں ہی ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکلا چلا گیا۔

☆☆

انور علی اور اصغر علی دونوں جگے بھائی تھے۔ ان دونوں کے درمیان ایک بہن تھی صفراں بی بی۔ انور علی اس وقت زیر تعلیم تھا

جب اُن کے والد کا انتقال ہو گیا اس طرح تمام تر ذمہ داری انور علی کے کندھوں پر آ پڑی۔ تھوڑی سی زمین تھی جس پر کاشتکاری کر کے وہ بہر حال

عشق کا ہے عشق بتا

ایک خوشحال زندگی بسر کر رہے تھے۔ بہت مشکل سے انور علی نے میٹرک تک تعلیم حاصل کر لی تو اسے گاؤں سے قریب اسی سکول میں عارضی نوکری مل گئی جس میں نہ صرف وہ پڑھا تھا بلکہ اب اصغر علی بھی پڑھ رہا تھا پھر ان دنوں اس کی نوکری پکی ہو گئی جب اصغر علی پڑھنے کے لئے شہر چلا گیا۔ انور علی نے مزید تعلیم حاصل کرنے کی کوشش ہی نہیں کی کیونکہ گھریلو حالات نے اسے اجازت ہی نہ دی تھی۔ ملازمت اور کاشتکاری نے اسے کچھ مزید سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ گزر رہے وقت کے ساتھ جب انور علی انجینئرنگ کا امتحان پاس کر چکا تو انہوں نے مصفران کی شادی ساتھ والے گاؤں میں کر دی اس کے ساتھ ہی انور علی کو بھی بیاہ دیا گیا۔ اصغر علی کی ملازمت کو ابھی سال بھی نہیں ہوا تھا کہ اس کی شادی بھی شہر کے ایک کاروباری گھرانے میں ہو گئی۔ والدہ اپنے فرائض سے سبکدوش ہوئی تو اللہ کو پیاری ہو گئی۔

وقت کا دھارا اپنی مخصوص رفتار سے بہتا چلا گیا اور اپنے پیچھے بہت ساری تبدیلیاں چھوڑتا گیا۔ انور علی کے دو بیٹے سعید اور ہمایوں پیدا ہو چکے تھے مصفران بی بی کا شوہرا سے لے کر برطانیہ چلا گیا اور انور علی نے شہر میں شاندار گھر بنا لیا تھا جس میں اس کے تین بچے فخر، سلمیٰ اور صفیہ بہت پرسکون زندگی بسر کر رہے تھے۔ شروع میں دونوں بھائیوں کے درمیان بہت پیار اور احترام رہا۔ یہاں تک کہ ہمایوں اور صفیہ کی مٹھی بچپن ہی میں کر دی گئی تھی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ جب اصغر علی کے پاس دولت آنا شروع ہوئی تو سب سے پہلے زرعی زمین تقسیم ہوئی اور پھر فروخت ہو گئی۔ اس کا اصغر علی کو کوئی فرق نہیں پڑا لیکن انور علی کی زندگی مشکل ہوتی چلی گئی۔ وہ زمین کی فروخت سے شہر کے ایک نچلے درجے کے علاقے میں گھر ہی بنا سکا پھر ملازمت میں گھر چلانا اور بچوں کو پڑھانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہو گیا۔ یوں دن دن انور علی کی دولت میں اضافے کے ساتھ مصفران کی زندگی تبدیل ہونا چلا گیا جبکہ انور علی کے حالات مشکل سے مشکل تر ہوتے چلے گئے مگر اس نے کبھی حوصلہ نہیں ہارا۔ بڑا بیٹا انجینئر اور چھوٹا وکیل بننے جا رہا تھا وہ اپنا پیٹ کاٹ کر بھی ان کی ضروریات کو پورا کر رہا تھا۔ سعید اپنی تعلیم کے لئے لاہور میں مقیم تھا ہمایوں کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ وہ ڈاکٹر بنے لیکن نجانے کیوں وہ اس کے بس سے باہر ہو گیا تھا۔ اگرچہ وہ پڑھائی میں تیز تھا ذہین اور سمجھدار تھا ہمیشہ اچھے مارکس لیتا رہا تھا لیکن چند برسوں سے نجانے اسے کیا ہوا تھا کہ وہ خندی اکڑ اور اپنی مرضی کا مانگ ہو گیا تھا۔ انور علی کو کچھ نہیں آئی کہ اس کے سن میں کیا ہے جبکہ اصغر علی اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ایک خوشحال اور بھرپور زندگی گزار رہا تھا دولت نے اس کے گھر کا راستہ دیکھ ہی لیا تھا اوپر سے کاروباری سسرال اس کے سارے کالے دلہن کو کاروبار میں لگا کر سفید کر چکے تھے۔ یوں محض دولت کی بنیاد پر ان دونوں بھائیوں کی زندگی میں نہ صرف فرق پیدا ہو گیا تھا بلکہ رشتے داری کا احترام بھی تحلیل ہو چکا تھا اور اس دن تو یہ تعلق تقریباً ختم ہو کر رہ گیا تھا جب ہمایوں اور صفیہ کی مٹھی کے بارے میں انور علی کی بیوی زینب نے یونہی سرسری سی بات کی تھی اس پر اصغر علی نے واضح کاف الفاظ میں کہہ دیا تھا۔

”بھائی! آج تو آپ نے اس مٹھی کے بارے میں بات کر دی ہے لیکن آئندہ اس بات کا ذکر بھی نہیں کرنا اس میں ہی بھلائی ہے۔“

”نہیں کبھی نہیں۔۔۔؟“ زینب نے حیرت سے پوچھا۔

”اس میں سمجھ نہ آنے والی کوئی بات نہیں ہے۔۔۔ وہ پرانی بات تھی کسی کو کیا پتہ تھا کہ آئندہ حالات کیا ہوں گے۔ اب ہم نہیں اور آپ لوگوں میں اسٹینس کا بہت بڑا فرق ہے۔ آپ لوگوں کی سال بھر کی کمائی میرے ایک مہینے کی آمدن کے برابر بھی نہیں ہے۔ ہمایوں کیادے سکے گا

اے؟ نکالت جتے جتے جتی ہے۔ میں اپنی بیٹی کی زندگی برباد نہیں کر سکتا اس لئے میرا خیال ہے کہ ہمیں اس منگنی کے بارے میں بھول جانا چاہئے۔“

”اصغر علی! تم نے کتنے آرام سے رشتے ناتے ختم کر دیئے ہیں۔ کیا ایسا ممکن ہو سکے گا؟ کیا بچوں کو اس تعلق کے بارے میں پتہ نہیں؟۔۔۔ ساری دنیا جانتی ہے۔۔۔“

”ساری دنیا کو چھوڑیں! اہالی اور رہی بچوں کی بات تو ہماری ساری زندگی ہماری بیٹی کو وہ معیار زندگی نہیں دے سکے گا جو اسے اب میسر ہے۔ میں تو کہتا ہوں یہ فضول بحث اب ختم ہو جانی چاہئے۔“

”اس سے دونوں خاندانوں کے درمیان۔۔۔“ نعناب کہتے کہتے رک گئی۔

”پتہ ہے تعلقات ختم ہو جائیں گے۔۔۔ تو ہو جائیں مجھے انکی پروا نہیں ہے۔“ اصغر علی نے حتیٰ الامکان میں کہہ کر گویا بات ہی ختم کر دی۔ اس دن کے بعد ان دونوں خاندانوں میں تعلقات تقریباً ختم ہو کر رہ گئے تھے۔ خوبی رشتوں میں اٹھنٹس کے فرق نے سرد مہری گھلا کے رکھ دی تھی۔ اس کا سب سے زیادہ اثر ہمایوں نے لیا تھا۔ اگرچہ اس نے اس بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا لیکن اس کی سوچوں میں بھونچال آچکا تھا۔ صفیہ بیچن ہی سے اس کے ساتھ منسوب ہو چکی تھی بڑھتی عمر کے ساتھ اس نے صفیہ ہی کو اپنے خیالوں اور سوچ کی پنہا نیوں میں محسوس کیا تھا۔ وہ اسے پوری طرح اپنا مان چکا تھا۔ محبت کی کوئٹل پھوٹی تو وہ نہ صرف اس کے من میں پودے کی طرح پھیل چکی تھی بلکہ اپنی خوشبو سے اسے سورا بھی کر چکی تھی۔ اس نے تعلق کے ختم ہو جانے پر احتجاج نہیں کیا تھا بالکل خاموش تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ صفیہ کو حاصل کر کے رہے گا۔ اس کے یقین کی بنیاد اپنے آپ پر اعتماد کی وجہ سے تھی۔ شاید یہ وہی لمحہ تھا جب اس کی محبت نے عشق کی حد میں قدم رکھ دیا تھا۔ کسی کو معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ اندر ہی اندر اپنے من میں بجانے کتنے فیصلے کر چکا ہے۔ انور علی تو اپنے بچوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کی ذہن میں حالات کی چکی میں پس رہا تھا۔

انور علی کے لئے یہ خبر بہت بڑا چکا تھی کہ ہمایوں کو پولیس کالڈ کر لے گئی ہے۔ اگرچہ اسے یہ پتہ بھی گیا کہ ہمایوں نے قصور ہے اس سے محض اتنی ہی غلطی ہوئی تھی کہ سب انسپکٹرز کو قلم کرنے سے باز رہے کہ وہ بیٹھا تھا لیکن وہ شخص جس نے ساری زندگی اپنی عزت کے لئے ہی جگ و دو کی تھی وہ اپنی نگاہوں میں آپ ہی گر گیا۔ رات کے پچھلے پہر جب اسے بتایا گیا تھا۔ اس وقت ہی سے وہ شرمندگی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کی کجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ مگر میں سوگوار کی چھا گئی تھی۔ اس وقت اڈائیں ہو رہی تھیں جب نعناب نے انور علی سے منت بھرے لہجے میں کہا۔

”جب اس کے دوست کہہ رہے ہیں کہ ہمارے بچے کا کوئی قصور نہیں ہے تو پھر تم کیوں اس طرح سوگوار بیٹھے ہو اور ہم اس کی مدد نہیں کریں گے تو اور کون کرے گا؟“

”نعناب! پوری زندگی میں تمہارے نہیں گیا اور اب۔۔۔“ وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

”تم پتہ تو کرو جا کر۔۔۔“

نعناب نے روتے ہوئے کہا تو انور علی نے اس کے چہرے کی جانب دیکھا اور پھر اٹھ گیا۔۔۔

اس وقت سپید کمر نمودار ہو چکا تھا جب انور علی تھانے میں گیا۔ وہاں پر سناٹا چھایا ہوا تھا ایک جانب دو سنتری کمرے تھے اور دفتر میں نشی لینا ہوا تھا آہٹ پا کر وہ متوجہ ہوا تو انور علی نے پوچھا۔

”یہاں پردات ہمایوں کو لایا گیا تھا میں اس کا باپ ہوں۔“

اس کے یوں کہنے پر نشی نے غمراہ لود آنکھوں سے اس کی جانب دیکھا اور قدرے سوچتے ہوئے بولا۔

”رات دو تین لڑکوں کو لائے تو تھے لیکن ان میں کوئی ہمایوں نام کا نہیں ہے۔۔۔ خیر جو بھی ہیں وہ اس وقت حوالات میں ہیں۔ وہاں دیکھ لو اگر ان میں سے ہو تو آ کے بات کر لیتا ورنہ جاؤ کہیں اور جا کے پڑ کرو۔۔۔“

یہ کہہ کر وہ پھر سے لیٹ گیا۔ انور علی پلٹا اور حوالات کی جانب چلا گیا۔ وہاں چند لوگ تھے۔ ان میں جنید بھی تھا جو دیوار سے لگائے بیٹھا تھا۔ انور علی نے سب پر نگاہ ڈالی تو اسے ہمایوں دکھائی نہیں دیا جبکہ جنید اس کی جانب بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ چند لمحوں بعد وہ بولا۔

”کس کو تلاش کر رہے ہو بزرگ۔۔۔؟“ جنید کے لہجے میں کافی حد تک ملائمی تھی۔

”بیٹے! یہاں میرا بیٹا رات لایا گیا ہے میں نے سنا ہے وہ۔۔۔“

انور علی اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا تو جنید نے پاس پڑے لڑکے کو اٹھایا اس نے سر پر سے کپڑا ہٹایا تو وہ اس کریم والا تھا۔

”یہ تو نہیں ہے۔۔۔؟“ جنید نے پوچھا۔

”نہیں نہیں۔ یہ نہیں ہے۔۔۔“ انور علی نے تیزی سے کہا۔

”تو پھر وہ دوسرا ہوگا جو غواخواہ اسے پجاتے ہوئے پھنس گیا۔“ اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور پھر آئس کریم والے سے پوچھا۔ ”اوائے“

تیرے ساتھ جو لڑکا تھا کیا تو اسے جانتا ہے؟“

آئس کریم والے نے پہلے جنید کو اور پھر انور علی کو دیکھا پھر سوچتے ہوئے بولا۔

”وہ لڑکا روزانہ ہی جائے پینے آتا تھا اپنے دوستوں کے ساتھ شاید اس کا نام ہمایوں ہے۔“

”اس وقت کہاں ہے وہ۔۔۔؟“ انور علی نے جلدی سے پوچھا۔

”پہنچیں۔۔۔ ان لوگوں نے اسے بہت مارا تھا وہ برداشت نہیں کر سکا اس لئے بے ہوش ہو گیا تھا۔ میرا خیال ہے وہ اسے کہیں چھوڑ آئے ہیں۔“

جنید نے کہا تو انور علی کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ چاہے جس قدر شرمندگی محسوس کر رہا تھا لیکن آخر باپ تھا اپنے بیٹے کے بارے میں ایسی بھیا تک بات سن کر اس کا کیچھنہ کھو گیا تھا۔ وہ تیزی سے نشی کے پاس گیا اور اسے ساری صورت حال بتائی۔

”او جاؤ یارا کہیں اور پڑ کرو اس کا۔۔۔ حوالات میں نہیں ہے تو ہمارے پاس نہیں۔ مجھے اس کا نہیں پتہ۔۔۔ اب جاؤ میرا سر نہ کھاؤ۔“

نشی نے احتجاجی کمرورے انداز میں کہا تو انور علی مایوس ہو گیا۔ وہ تھانے سے نکل آیا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی کہ وہ کیا کرے؟ ایسے میں

اُسے یہی سوچا کہ وہ اپنے بھائی اصغر علی کے پاس جائے۔ وہ جیسا بھی ہے اس کی مدد ضرور کرے گا۔ اُس کا بہت زیادہ اثر و رسوخ ہے، اس لئے یہ کام اُس کے لئے اتنا مشکل نہیں ہوگا۔۔۔ اس وقت سورج نکل آیا تھا جب وہ انور علی کے گھر میں بیٹھا ہوا تھا۔ اصغر علی نے ساری رواد بہت سکون سے سنی تھی۔ انور علی جب کہہ چکا تو بڑے سکون سے بولا۔

”دیکھیں بھائی صاحب! میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں لیکن جہاں تک معاملہ ہمایوں کا ہے، میں اس کی طرف سے مطمئن نہیں ہوں۔ میں کچھ نہیں کر سکتا اور مگر یہ پولیس وغیرہ کا چکر میرے بس میں نہیں ہے۔“ اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔

”اصغر علی! میرا بیٹا بے قصور ہے۔“

”اُسے کیا ضرورت تھی کسی اور کے معاملے میں تا تک اڑانے کی؟ آپ بھگتے۔“

”یہی ایک معمولی غلطی ہوئی ہے اُس سے لیکن پولیس کا رویہ دیکھو! کوئی بتائی نہیں رہا کہ وہ کہاں ہے۔ تم اپنا اثر و رسوخ استعمال کر دیکھو پتہ کرو کہ وہ کہاں ہے؟ اس کے بارے میں معلوم تو ہو۔“ انور علی نے منت بھرے لہجے میں کہا۔

”ہاں، میں اپنا اثر و رسوخ استعمال کروں تا کہ میرے جاننے والوں کو پتہ چل جائے کہ میرے بڑے بھائی کا بیٹا مجرم ہے، تم نے پکھری میں۔۔۔ کچھ تو ہے جو اُسے پولیس پکڑ کر لے گئی ہے ورنہ پولیس والوں کا سر نہیں پھرا جو یوں لوگوں کو پکڑ کر لے جاتے پھرتے۔ اتنی بھی انداز مگر یہ نہیں بسا آپ مان لیں کہ آپ کا بیٹا مجرم ہے۔ اُس نے جرم۔“

”وہ بے قصور ہے۔“ انور علی نے سختی سے تردید کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں آپ تو کہیں گے آپ کی اولاد ہے وہ۔ بہر حال میں اس سلسلے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔“

اصغر علی نے سرد مہری سے کہا تو انور علی اُس کی طرف حیرت سے دیکھتا رہا۔ جسے اُس نے اولاد کی طرح پالا تھا، اُس کے دماغ پر دولت اس حد تک خمار کی صورت چڑھ گئی تھی کہ بھائی کو بھی پہچاننے سے انکار کر دیا۔ اُسے زندگی میں پہلی بار اتنا شدید دکھ ہوا تھا تو وہ میاں دیر تک تو وہ ایک لفظ بھی نہ کہہ سکا، تبھی اصغر علی نے کہا۔

”مجھے کیس جانا ہے آپ چائے پی کر جائیے گا۔۔۔“

اُس نے جواب کا انتظار بھی نہیں کیا اور اٹھ کر چلا گیا تھا۔ انور علی کی آنکھوں میں بس آنسو نہیں آئے ورنہ اُس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ وہ اٹھا اور اپنے گھر کی جانب چل دیا۔ وہ مایوسی کی انتہا پر تھا۔ جب اپنا ہی خون سفید ہو جائے تو پھر کسی سے کیا امید رکھی جاسکتی ہے؟ اُسے نہ ہمایوں سے کوئی شکوہ تھا اور نہ اصغر علی سے کوئی شکایت، اُسے گلہ تھا تو فقط اپنی قسمت سے جس نے کبھی بھی اس کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ اُس نے ماشی میں جہا تک کر دیکھا شاید کہیں کوئی غلطی یا کوتاہی ہوگئی ہو جس کی سزا اُسے مل رہی ہو لیکن ایسا کچھ بھی اُس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔۔۔ وہ انتہائی دلبرداشتہ ہو کر اپنے گھر کی دہلیز تک جا پہنچا۔

☆☆

”تمہیں معلوم ہے تالیاتی کیوں آئے تھے؟“ سہلی نے بیڈ پر بیٹھے ہوئے کہا تو کالج کے لئے تیار ہوتی ہوئی صفیہ نے کوئی اہمیت نہ دیتے ہوئے عام سے لہجے میں کہا۔

”مجھے الہام نہیں ہوتے اور پھر مجھے ضرورت بھی نہیں ہے کہ ان کے بارے میں معلومات لہجی بھروں۔۔۔“

”ارے بڑی گفتگو سنگ خیر ہے۔“ یہ کہتے ہوئے سہلی نے چائے کا پلہ لیا۔

”کیا ہے۔۔۔؟“

صفیہ نے بالوں میں لپک لگاتے ہوئے آئینے میں دیکھا اور اسی لاپرواہی سے پوچھا تو سہلی نے ساری تفصیل بتادی جس پر تجربہ کرتے ہوئے صفیہ نے غصہ سے کہا۔

”یہ جو غصہ بظاہر ہوتے ہیں تا ان کی کوشش ہوتی ہے کہ اپنی نا آسودہ خواہشوں اور مجبور یوں کے باعث اپنے اندر پید ا ہونے والی مصلحت کو دور کر سکیں ایسے میں وہ اپنی اوقات سے بڑھ کر بہت کچھ کر جاتے ہیں۔ نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ انہیں اپنی اوقات پر ہی آنا پڑتا ہے جیسا کہ اس ہالوں کے ساتھ ہوا ہے۔۔۔ کس نے کہا تھا کہ وہ دوسروں کے معاملے میں دخل دے؟“

اپنی طرف سے اس نے پورا تجربہ کر ڈالا تھا جس سے صفیہ کی ذہنی کیفیت کا بھر پورا اندازہ ہوتا تھا۔ اس نے اپنا سراپا آئینے میں دیکھا۔ بلکا سامیک اپنی جس میں آنکھوں پر خاص توجہ دی گئی تھی بڑی بڑی آنکھوں میں کاجل کی ہلکی سی ڈور اور پگلوں کو مسکارے سے سجایا ہوا تھا۔ کس کر انداز کی کئی چوٹی، نیکے ڈوہیارینگ کے ٹاپس اور گلابی گداز ہوتوں پر بلکا سالپ لائبر لگایا ہوا تھا۔ مطمئن سی ہو کر اس نے آنچل گلے میں ڈالا اور سائیز نچیل پردھری کتابیں اٹھا کر بیگ پر رکھنے لگی۔

”ویسے بڑے عرصے بعد انہوں نے ہمارے ہاں چکر لگایا ہے۔“ سہلی اپنی ہی ذہن میں کہے جا رہی تھی۔

”مجبوری تھی تا ورنہ وہ کیوں آتے؟“ صفیہ نے بیگ کا ترم سے پر ڈالتے ہوئے کہا۔

”ویسے ہالوں دیکھنے میں نہ آئیں ہے۔ ٹھیک ٹھاک ہے، بیڈ روم بنے بات کرنے کا بھی اُسے سلیقہ ہے۔ بس یہ۔۔۔“

”۔۔۔ دولت نہیں ہے۔“ صفیہ نے اُس کی بات کا سٹے ہوئے کہا۔ ”سہلی! یہ دولت آج کی حقیقت ہے۔ اگر ان کے پاس بھی روپے

کی ریل چل ہوتی تو ہمارے گھر مدد کے لئے نہ آتے فوراً ہی روپے خرچ کرتے اور اُسے چھڑا کے لے آتے اور بات کرنے کا سلیقہ ہوتا تا اُسے تو یوں مارکھاتا۔۔۔؟“ صفیہ نے طہر یا انداز میں کہا۔

”اگر اُس کی تمہارے ساتھ شادی ہو جاتی۔۔۔“

”ایسا خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا وہ۔ میرا پ سلامت رہے میرے سر پر وہ ہمیں اتنا خرچ دیتا ہے جو اُس نے اب تک دیکھے بھی نہیں

ہوں گے۔ پھر اُن کے اور ہمارے ایشیوں کا بہت فرق ہے۔ وہ تو مجھے وہ سہولیات نہیں دے سکتا جو مجھے یہاں میسر ہیں۔۔۔ نہ میں اُس کے ساتھ

ہو کون نہیں مر سکتی اور پھر مجھے وہ پسند ہی نہیں ہے۔ میں ایسا سوچ ہی نہیں سکتی۔“

”ویسے ایک بات ہے۔“ سہلی نے کہا چاہا تو صفیہ جلدی سے بولی۔

”سہلی! یہ تم صبح صبح کیا قصے کر رہی ہو۔ مجھے کالج جانا ہے ابھی نہیں نے ناشتہ بھی کرنا ہے۔ چھوڑو ان فضول لوگوں کی بات۔“

اُس کے یوں کہنے پر سہلی نے شاکی لگا ہوں سے اُس کی جانب دیکھا اور کپ میں پڑی ہوئی چائے ایک ہی گھونٹ میں پی گئی۔ صفیہ کمرے سے باہر جا چکی تھی۔



جس طرح ہماری ذم توڑتی سماجی قدروں نے انسانی جذبات و احساسات کو پامال کیا ہوا ہے، ٹھیک اسی طرح خود مرضی کی ہوانے ماحول کی خوبصورتی کو زہر آلود کر کے رکھ دیا ہے۔ راحیلہ کا حسن بھی اس کے لئے عذاب بن گیا تھا۔ میٹرک کر لینے کے بعد جب اُس نے نرسنگ سکول میں داخلہ لیا تھا تو اُسے معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ کن لوگوں میں جا رہی ہے۔ مسیحا کی کے اس مقدس پیشے سے متعلق لوگوں کی رائے کیا ہے۔ وہ ایک نرس کو کس نگاہ سے دیکھتے ہیں؟ ہسپتال کے اندر وارڈ بوائے سے لے کر ڈاکٹر تک کیسے کیسے مردوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ اسے تو یہ خبر بھی نہیں تھی کہ ایک نرس کسی مریض سے تنگ نہیں ہوتی بلکہ مریض کے لواحقین سے وہ زیادہ دل برداشتہ ہوتی ہے۔ راحیلہ کو احساس تو اسی وقت ہونا شروع ہو گیا تھا جب اُس نے ہسپتال میں ڈیوٹی دینا شروع کر دی تھی۔ ایک عجیب عدم تحفظ والا ماحول اُس کے ارد گرد بن گیا تھا۔ بائٹل کے اندر ہوتی تو چند سینئر نرسوں کا اُس کے ساتھ بڑا ہراساں کرنا ہوتا جیسے اُس کا بہت زیادہ ہی خیال رکھا جا رہا ہو۔ ہسپتال میں ہوتی تو سنسناتے ہوئے فخرے بدن میں چھید کر دینے والی لٹا ہیں اور سوتیاں جذبات کا اظہار اُس کی سوچوں میں زہر بھرتا جس سے وہ نہ صرف ہمیشہ بے چین اور مضطرب رہتی بلکہ نامعلوم خوف اُسے ہر وقت گھیرے میں لیے رکھتا۔

سلگتے چہرے

ضو بار یہ ساحر کے جذبات نگار ہم سے ایک خوبصورت ناول..... اُن سلگتے چہروں کی کہانی جن پر بھی آنکھوں میں انتظار کا عذاب اودے رہا تھا۔ ایک ایسی لڑکی کی داستان حیات جسے اپنے خوابوں کو کچل کر میدان عمل میں آنا پڑا۔ اس کے نزل گل جذبوں پر فرض کا تاگ بھین کا زخم بیٹھا تھا۔ اس لئے محبت کو جانچنے پر کتنے کفن سے وہ ناواقف تھی۔ لیکن اس سب کے باوجود دل کے دیرانے میں کہیں ہلکی ہلکی آنچ دینا محبت کا جذبہ ضرور موجود تھا۔ وہ جو سائے کی طرح قدم قدم اسکے ساتھ رہا اس پر بیٹھے والی ہر اذیت کو اُس نے بھوگا۔ وہ ادھوری لڑکی اُسے جاننے اور پہچاننے کی کوشش میں لگی رہی۔ مگر وہ گس گس بھی بیکر بن کر اسکے سامنے نہیں آیا اور جب وہ سامنے آیا تو بہت دیر ہو چکی تھی؟؟

یہ ناول کتاب گھر دستیاب ہے، جسے روحانی معاشرتی ناول سیکشن میں پڑھا جا سکتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ انسانی زندگی پر ماحول بہت زیادہ اثر انداز ہوتا ہے لیکن انسان کسی بھی ماحول کا حصہ اس وقت بنتا ہے جب وہ اس ماحول کو قبول کر لے اور شاگرد سے مزاحمت رہے تو تذبذب اور خوف اُسے قبولیت سے پرے رکھتا ہے۔ راحیلہ بھی شاید اس ماحول کا حصہ بن جاتی لیکن اُسے اپنی وہ ماں کا آنسوؤں بھرا چہرہ ہمیشہ یاد رہتا جس نے شہر جاتی ہوئی راحیلہ سے صرف اتنا کہا تھا۔

”بہٹی! تیری ماں نے عزت سے زندگی گزارا ہے بس میری اس عزت کی لالچ تیرے ہاتھوں میں ہے۔“

اُسے شاپنی ماں کا چہرہ بھولا اور نہ وہ درو بھرا لہجہ یہی اُس کی ذہال بن گئے ورنہ غریب گھروں سے آئی ہوئی معصوم تو عمر اور خوشحال لڑکیاں ان گھاک حکاریوں کے ہاتھوں میں تو بس پھڑ پھڑا کر رہ جاتی ہیں جو ہمیشہ اپنے شکار کی تاڑ میں رہتے ہیں۔۔۔ ممکن تھا کہ سبز باغ اور لالچ کی چکا چوند میں راحیلہ اپنی ماں کا چہرہ اور لہجہ بھول جاتی لیکن جب بھی کبھی ایسا ہوا اُس دُستلا تے ہوئے چہرے اور لہجے کو اُس کی روم سیٹ سرین جو زلف واضح کر دیتی۔ وہ بھی انہی لڑکیوں میں سے تھی جنہیں اپنی عزت و عصمت کا پاس ہوتا ہے اور وہ ماحول کی آلودگیوں سے دُور رہنے کی حتی المقدور کوشش کرتی ہیں۔ دونوں ہی ایک دوسرے کے ڈکھا دکھاوا تھیں۔ اگر وہ دل کر خوش ہوتی تھیں تو آنسو بہانے میں بھی شریک رہتی تھیں یوں اُن کی ٹریٹنگ کا آخری سال آ گیا تھا۔ اسی سال راحیلہ کا سامنا ڈاکٹر جمیل جیسے شخص سے ہوا جس نے اُسے ڈیپٹی اذیت میں مبتلا کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ اوجیز عمر رانا نکھاری تھا جسے ہر کوئی کھتا کر مارتے میں مزہ آتا تھا۔ وہ اُس پر فریفتہ ہو گیا تھا۔ راحیلہ جو اب تک ماحول سے مزاحمت کرتی چلی آ رہی تھی ڈاکٹر جمیل کے سامنے آ کر اُسے یوں لگا جیسے اُس کی ساری توانائی ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ وہ رسانی اور بیخچ والا بندہ تھا اور نہ ہر بار اُس کی ڈیپٹی اسی ڈاکٹر کے ساتھ نکلتی۔ اُس نے بہتری کوشش کی اپنی پرنٹنڈنٹ سے بھی کہا لیکن اُس کی کسی نے نہ سنی۔ ہمیشہ اُس کی ڈیپٹی ڈاکٹر جمیل کے ساتھ لگ جاتی جس کی توجہ مریضوں پر کم اور اس پر زیادہ رہتی جبکہ راحیلہ اس سے شدید نفرت کرتی تھی۔

”اب اٹھ جا سرین! ڈیپٹی شروع ہونے میں صرف آدھا گھنٹہ رہ گیا ہے۔“ راحیلہ نے اُسے اٹھاتے ہوئے کہا۔

”اڈیا راجیج صبح کی ڈیپٹی بھی نا۔“

یہ کہتے ہوئے سرین نے بھر پور انگڑائی لی پھر اٹھ کر تیزی سے چار ہونے لگی۔ دونوں ناشکر کرنے کے بعد جب ہسپتال کی جانب چلیں تو ڈیپٹی کا وقت ہو چکا تھا۔ دونوں تیز تیز جاری تھیں کسا چاک سرین نے کہا۔

”آج پھر اُس منحوس کا چہرہ دیکھنا پڑے گا نہیں۔“

”اُس ڈاکٹر کا۔۔۔؟“ اُس نے خیالوں میں کھوئے ہوئے کہا پھر گہری سنجیدگی سے بولی۔ ”ارے وہ تو اب معمول بن گیا ہے لیکن جب

سے نہیں نے جدید کو دیکھا ہے تا تو پوچھ نہیں کیوں مجھے پانا آپ بدلتا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔“

”ہائیں۔۔۔ آج صبح تو ایسی کوئی بات نہیں تھی؟“ سرین نے حیرت سے پوچھا۔

”کل ہی سے نہ صرف مجھے احساس آیا ہے بلکہ بہت حوصلہ ملا ہے۔ میں دو رات جاں گئی ہوں کہ نڈے سے نڈے ماحول میں بھی خود کو کیسے

پھنسا جا سکتا ہے۔“

”خدا کرے۔“

لسرین نے کہا اور پھر دونوں الگ ہو کر اپنے اپنے وارڈز کی جانب چل دیں۔ راحیلہ خود میں بہت اعتماد اور حوصلہ محسوس کر رہی تھی۔ وہ جس وقت ڈاکٹر کے کمرے میں پہنچی تو اس کی ساتھی نرینس بھی آچکی تھیں جبکہ ڈاکٹر کی میز پر ڈاکٹر جمیل براجمان تھا۔ وہ شاید اسی کے انتظار میں تھا۔ جیسے ہی وہ اندر داخل ہوئی اس نے بڑے ہی پیار سے کہا۔

”راحیلہ! ادھر آ جاؤ اور بتاؤ کہ لیٹ کیوں ہو گئی ہو۔“

اس کے لہجے میں ملامت ملی خوشامد تھی جس پر راحیلہ چند لمبے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوچتی رہی پھر لفظوں کو چباتے ہوئے بولی۔

”سنو ڈاکٹر! میں آپ تک تمہاری بہت زیادہ بکواس بن چکی ہوں لیکن آپ نہیں۔ آپ اگر تم نے میرے سامنے کوئی بیوقوفی کی تا تو تمہارے دانت توڑ دوں گی۔ کبھے تم۔“

اس نے کہا تو کمرے میں یکدم سنانا چھا گیا۔ اس کی ساتھی نرینس بھی حیرت زدہ ہی خاموش ہو گئیں۔ راحیلہ نے کسی کی پروا نہیں کی اور اپنی کرسی پر جا بیٹھی۔ ایسا کہہ کر اسے کوئی پشیمانی نہیں بلکہ روحانی آسودگی ملی تھی۔ وہ نہ سکون ہو گئی تھی۔ اس نے یہ دیکھنے کی زحمت ہی نہیں کی کہ ڈاکٹر جمیل کا چہرہ کس قدر مسخ ہو گیا ہے؟

☆☆

ہمایوں کی جب آکھ کھلی تو پہلے اسے سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ وہ کہاں ہے؟ دھیرے دھیرے جب شعور نے اس کا ساتھ دیا تو اسے سمجھ آنا شروع ہو گئی۔ چونکہ اس کریم والا سب انسپکٹر سپاہی تشوڑ تھا نہ اسے سب یاد آ گیا۔ پھر اسے ہوش نہیں رہا تھا۔ اس نے اپنے ارد گرد دیکھا۔ خاکروب کمرے کی صفائی کر رہا تھا۔ سبھی وہ بچان گیا کہ وہ ہسپتال میں ہے۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو پورا بدن ٹیسوں میں بدل گیا اس کے منہ سے کراہ نکل گئی اور وہ پھر سے بیڈ پر ڈھیر ہو گیا۔ اسے لگا جیسے وہ پھر بہوش ہونے کو ہے۔ خاکروب نے کراہ سنی تو جھانڑو پھیرنا بند کر دی اور اس کی طرف لپکا۔

”ڈاکٹر کو بلاؤ پلیز۔“ اس نے بمشکل خاکروب سے کہا۔

”اس وقت تو کوئی بھی نہیں ہے جی۔“ وہ بولا۔

”کسی نرس ہی کو بلا دو۔“ ہمایوں نے کراہتے ہوئے کہا۔

”اچھا نہیں دیکھتا ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔ چند لمحوں بعد وہی رات والا ڈاکٹر آ گیا اس کے ماتھے پر تینوں پڑی ہوئیں تھیں۔ اس نے ہمایوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”بولو کیسا محسوس کر رہے ہو۔“

”ڈاکٹر! میرا پورا بدن — ڈھک رہا ہے اور —“

”دیکھو اگر تم اپنا بیجان یہ دو کہ تمہیں کسی گاڑی وغیرہ کے ساتھ حادثہ پیش آ گیا ہے تو میں ابھی تمہیں ایڈمٹ کر لوں گا اور تمہارا علاج بھی

ٹھیک ہو جائے گا۔“

”لیکن ڈاکٹر! مجھے تو پولیس نے —“

ہا یوں نے کہا نا چاہا تو وہ اس کی بات کاٹ کر بولا۔

”اے بھول جاؤ۔“

”کیسے بھول جاؤں —؟“ اس نے احتجاجاً کہا۔

”تو بھروسہ — میں تمہاری وجہ سے اب تک یہاں بیٹھا ہوا تھا۔ تم اب تک یہاں درج نہیں ہو جانا پڑے گا تمہیں اور نئی شفٹ کے

لوگ تمہیں قبول نہیں کریں گے۔ اب تمہارا جو فیصلہ ہو۔“

ڈاکٹر نے اشارے میں اسے اپنا منہ دکھا کر کہا تو ہا یوں سوچ میں پڑ گیا۔ پھر دیر سے پوچھا۔

”مجھے یہاں کون لایا تھا —؟“

”دو لوگ تھے وہ تمہیں یہاں چھوڑ کر چلے گئے۔ انہوں نے اپنا نام پتہ بھی نہیں بتایا۔“ ڈاکٹر نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

”اس کا مطلب ہے ڈاکٹر! آپ بھی مجبور ہو چکے نہیں بول سکتے — خیر ابھی میں اس قدر ٹوٹی پھوٹی حالت میں گھر نہیں جانا چاہتا۔ آپ

مجھے ایڈمٹ کر لیں۔“ ہا یوں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے — یہ کہہ کر اس نے کلب بورڈ اس کے سامنے کروایا۔“ یہاں دھچکا کر —“

ہا یوں نے دھچکا کر دیے تو ڈاکٹر نے ایڈمٹ سلپ بنا دی اور چلا گیا۔

اُسے وارڈ میں منتقل کر دیا گیا۔ ہا یوں کو ڈرپ لگ گئی تو وہ سوچنے لگا کہ میں کس طرح کے معاشرے میں جی رہا ہوں۔ کیا یہ انسانوں کا

معاشرہ کہلانے کا حقدار ہے؟ — طاقت کا قانون تو جنگل میں ہوتا ہے تو کیا ہماری شہری آبادیاں بھی جنگل میں جکی ہیں؟ بلاشبہ جرائم پیشہ لوگ کسی

بھی معاشرے کے لئے ناسور ہوتے ہیں لیکن کیا ہم نے کبھی غور کیا کہ معاشرے میں وہ کون سے عناصر ہیں جو مجرم پیدا کر رہے ہیں؟ — جہاں

خوف ہو وہاں اعتماد نہیں ہوتا اور جہاں ظلم ہو وہاں بغاوت ضرور جنم لیتی ہے۔ ہم کس طرف جا رہے ہیں؟ قانون نافذ کرنے والے ادارے ہی جب

قانون شکنی پر اتر آئیں تو اس معاشرے کا اللہ ہی حافظ ہوتا ہے تب اس معاشرے میں ٹوٹ پھوٹ نسلوں تک جا پہنچتی ہے پھر وہاں اخلاقی قدروں

پر ماتم بے کار ہوتا ہے۔

ہا یوں کی ذہنی رو اس طرف بہہ نکلی تو اسے اپنا خون کھولنا ہوا محسوس ہوا۔ بے بسی میں انسان فقط اپنے آپ ہی کو جلا سکتا ہے۔ اس نے

ان سارے خیالات کو جھٹک دینا چاہا لیکن دماغ تو کبھی کسی وقت بھی سوچ سے خالی نہیں رہ سکتا۔ اس نے بساط ذہن پر سے مہرے ہٹا دیئے تو دماغ

نے سوچوں کا نیا کھیل کھینے کے لئے پھر سے مہرے سجانا شروع کر دیئے۔ اس کی سوچوں پر صفیہ حاوی ہو گئی تھی جسے اس نے بچپن ہی سے چاہا تھا۔ اسے اگر مہرے ہارے میں پڑے چلے گا تو اس کا ردِ عمل کیا ہوگا۔ کیا اس نے تموز اہبت ڈکھ محسوس کیا ہوگا یا پھر اسے معلوم ہی نہیں کہ میں کس حال میں ہوں؟۔۔۔ صفیہ کا خیال آتے ہی اس کے ذہن میں یہ سوال گونجنے لگے تھے اور ان کا جواب بھی اسے معلوم تھا۔ اسے پتہ تھا کہ اس کا نہ کوئی ردِ عمل ہوگا اور نہ ہی اسے کوئی ڈکھ محسوس ہوا ہوگا۔ بچپن میں اگر وہ ساتھ کھیل لیتے تھے تو وہ ان کے بھولپن کا ڈور تھا لیکن بڑھتی عمر کے ساتھ وہ اس سے ڈور ہوتی چلی گئی۔ اس میں ان کے خاندانوں کے درمیان ڈوری بھی وجہ تھی جو درمیرے درمیرے پیدا ہو چکی تھی لیکن اس کے دل سے صفیہ محسوس ہو سکتی تھی۔ ہر نئے دن کے ساتھ اس کی محبت دل میں بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ دو سال قبل جب انہوں نے عشقی سے بھی انکار کر دیا تھا اس وقت سے ہمایوں نے صفیہ کا حصول اپنا مقصد بنا لیا تھا۔ اسے ان ساری مجبور یوں کا علم تھا جن کے باعث ان کے خاندانوں میں ڈوریاں پیدا ہوئی تھیں مگر وہ بے بس تھا۔ اس کی سمجھ میں یہ بات کبھی نہیں آئی تھی کہ تموز سے وقت میں ڈیر ساری دولت کس طرح کمائی جاسکتی ہے۔ وہ جب بھی سوچتا اس کا ذہن جرائم کی طرف جاتا، تموز سے وقت میں ڈیر ساری دولت تو سیدھے رستے سے نہیں کمائی جاسکتی تھی۔ انہی سوچوں کے دوران اسے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ جرائم کی دنیا میں بھی قسمت جب ساتھ دے تو ہی بندہ کامیاب رہتا ہے ورنہ ساری عمر جیل کی سائخوں میں گزارنا اس کا مقدر بن جاتا ہے۔

ہمایوں کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ حقیقت پسند تھا اور خیالی دنیا میں رہنے والا بندہ نہیں تھا۔ اسے یقین تھا کہ دو اور دو پانچ بنانے کے لئے قسمت نہیں بلکہ بندے کی اپنی قوت ارادی کام کرتی ہے۔ پتہ نہیں کہ وہ ٹھیک تھا یا غلط اسے ابھی دنیا کا تجربہ ہوا تھا یا نہیں لیکن اس کا دل کہتا تھا کہ وہ سب کچھ حاصل کر سکتا ہے جس کی وہ خواہش کرتا ہے لیکن اس کے لئے انتظار کرنا ہوگا کہ صحیح وقت اس کے ہاتھ لگ جائے۔ شکاری اس وقت ہی شکار کر سکتا ہے جب وہ صبر اور تحمل سے کام لے ورنہ جلد بازی میں نہ صرف شکار ہاتھ سے نکل جاتا ہے بلکہ محنت بھی اکارت جاتی ہے۔ شکاری کا یہ ہی ہنر ہوتا ہے کہ وہ ٹھیک وقت پر شکار پہ ہاتھ ڈال دے۔ ہمایوں کو یہ ساری باتیں معلوم تھیں اور وہ جانتا بھی تھا کہ یہ سارے ہنر اسے آجائیں لیکن صفیہ اسے پھر بھی بہت ڈور دکھائی دے رہی تھی۔ انہی لمحات میں جبکہ صفیہ اسے اپنی دسترس سے ڈور نظر آتی اس کے اندر جولانی بھر جاتی وہ کچھ نہ کچھ کرنے کو بے تاب ہو جاتا۔ ایک تڑپ تھی جس سے وہ بے حال ہو جایا کرتا تھا۔ اس کیفیت میں کیا کچھ پنہاں تھا اسے کچھ نہیں آتی تھی مگر کچھ کر دکھانے کا مزہ اس کے روم روم میں سما جاتا تھا۔

ایسے وقت میں جبکہ وہ اپنی ہی سوچوں سے اذیت میں مبتلا تھا اسے وارڈ کے داخلی دروازے پر اپنے دوست وسیم کا چہرہ دکھائی دیا جو حلاشی نگاہوں سے ہر پیکر کو کچھ ہاتھ آتی تھی اس کی نگاہ ہمایوں پر پڑی تو وہ تیر کی طرح اس کی جانب آیا۔ وہ اس کی حالت دیکھ کر قدرے حواس باختہ ہو گیا۔

”تم۔۔۔ تم خیریت سے تو ہونا؟“ وسیم نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں بس کوئی بڑی نہیں ٹوٹی باقی سب خیریت ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”یہاں۔۔۔ تمہیں کون۔۔۔ خیر میں ابھی آتا ہوں۔ میں تمہارے مگر فون کر کے بتا دوں کہ تم مل گئے ہو۔ وہ بہت پریشان ہو رہے

ہیں۔“

وسم یہ سنتے ہی پلٹ گیا اور ہمایوں کو احساس ہوا کہ اس کا باپ اسے تلاش کر رہا ہوگا، ماں کتنی پریشان ہوگی۔ وہ آئندہ آنے والے دنوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ کیا واقعی وہ ان کی امیدوں پر پورا نہیں اتر سکے گا؟ جس طرح اس کا باپ کہتا ہے زندگی میں کبھی کامیاب نہیں ہو پائے گا۔ کیا ایسا ہی ہوگا؟ اس نے خود سے سوال کیا جس کا تا دیر اے جواب نبل سکا تو اس نے ساری سوچیں ذہن سے نکال دیں وہ سوچنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اس وقت اسے یوں محسوس ہوا ہاتھ کہ جیسے وہ زمین پر بیٹھنے والا وہ کیڑا ہے جسے سب حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ مایوس ہو چکا تھا خود سے نہیں بلکہ اپنے ماحول، معاشرے اور دنیا سے۔!

☆☆

اس وقت سورج خاصا چمک رہا تھا جب حوالات کا دورہ اڑا رکھا۔ اس میں دیگر قیدیوں کے ساتھ جنید کو بھی باہر آنے کا اشارہ کیا گیا وہ اٹھا اور حوالات سے باہر آ گیا۔ ان سب کو تھانے کے احاطے میں نہ صرف جمع کیا جا رہا تھا بلکہ جھکڑیاں بھی لگا کی جا رہی تھیں۔ ایسے ایسے اور سلامت خان گہری لگا ہوں سے سب کو دیکھ رہا تھا، سبھی جنید کو بڑی ڈالی جانے لگی تو وہ ہنس کر بولا۔

”کیوں سلامت خان، اپنے باپ کے سامنے پیش کرنے لے جا رہا ہے کیا بتائے گا اے۔“

”کم از کم دس دن کا ریاضت لوں گا۔“ اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”جب تک تو اپنے سارے بہنوئیوں کے بارے میں نہیں بتائے گا“

اس وقت تک۔۔۔

”نہیں نے کب تیری بہن کو چھیڑا ہے اور چھیڑنے پر تو اتنے دن کا ریاضت نہیں مٹا۔۔۔ کچھ اور ڈالا ہے ایف آئی آر میں۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

”تو آج واپس آ جا پھر دیکھتا ہوں تو کیسے بھونکتا ہے۔“

سلامت خان نے اسے نظر انداز کیا اور دوسرے ملزموں کی جانب متوجہ ہو گیا۔ جنید نے ایک گھر پر توجہ لگا لیا جیسے یہ اس کی پہلی فتح ہو۔ نبھانے کیوں انہی لمحات میں اسے دوسرے یاد آ گئی جس کے ایک فخرے نے اس میں زندگی بھر دی تھی۔ وہ خاموش ہو گیا جیسے وہ اس ماحول ہی میں نہ ہو۔

احاطہ عدالت میں جب ملزموں کی گاڑی داخل ہوئی تو جنید کو ڈور ہی سے اپنے کچھ ساتھی دکھائی دیئے۔ اسے حوصلہ ہو گیا کہ وہ اکیلا نہیں ہے اس کو سنبھالنے والے موجود ہیں۔ گاڑی ایک جگہ رُک گئی اور ہاری ہاری ملزم نیچے اترنے لگے۔ ایسے میں جب جنید اترتا تو اس کے ساتھی قریب آ گئے تھے۔ چار سپاہی اس کے ارد گرد تھے۔ وہ ایک طرف جا کر کھڑا ہو گیا سلامت خان ان کے پاس تھا کہ دو ہندے اس کے قریب آ گئے۔

”اوشتمرادہ آ گیا۔۔۔ اتنا زیور کھن لیا ہے۔“

ایک نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ وہ جنید کے گلے ملنا چاہتا تھا کہ سلامت خان نے روک دیا۔

”اوسے کون ہے تو؟۔۔۔ چل بہت۔“

”اُوئے سلامت خان! شاید تو مجھے جانتا نہیں ہے۔ میں نے اپنا نام بتایا تو یہ تیری پینٹ گئی ہو جائے گی۔ تو اس کا ریاض لینے آیا ہے نا، لیکن میں اسے اپنے ساتھ لے کر جانے کے لئے آیا ہوں۔“ اُس نے اتنا ہی کہا تھا کہ سلامت خان چو کنا ہو گیا، وہ کوئی حکم دینے والا ہی تھا کہ وہ شخص بولا۔ ”کچھ بھی کہنے سے پہلے اپنے بیٹے کا دھیان کر لینا۔ وہ گرامر سکول میں پڑھتا ہے نا اس وقت وہ اپنی کلاس میں بیٹھا ہوا ہے۔ کیا اُس کی سلامتی نہیں چاہو گے؟“

اُس شخص نے کہا تو سلامت خان کا رنگ اُڑ گیا۔

”یہ کیا ہو اس کر رہے ہو تم۔۔۔؟“ وہ چیخا۔

”میرے ساتھ زبان سنبھال کر بات کرنا۔۔۔“ یہ کہہ کر اُس نے جنید کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”خیر نہیں اپنے شہزادے کو بہکا کر نہیں لے جاؤں گا۔ اس کی ضمانت کرواؤں گا۔ ٹکرنڈ کر تیرے قانون کے مطابق سارا کام ہوگا۔۔۔“

”تم ایسا نہیں کر سکتے۔“ سلامت خان نے کھردرے لہجے میں کہا۔

”کیوں نہیں کر سکتا؟ قانون تیرے باپ کا ہے کیا؟۔۔۔ تو نے چار دن بغیر پرچہ کاٹنے اسے جس بے چارے کو رکھا اس پر تشدد کیا۔ یہ قانون کے مطابق تھا؟۔۔۔ میں یہ نہیں چلا کہ کہاں ہے ورنہ اسے آپ تک لے گئے ہوتے۔“

”مخرموں سے اس طرح ہی پنچا جاتا ہے نہیں چاہوں تو ابھی۔۔۔“

”کچھ بھی نہیں کر سکو گے۔ یہ جان لو سلامت خان! اس اندھیر گھری میں اگر تم لوگ من مانی کر سکتے ہو تو ہمیں کون روک سکتا ہے؟۔۔۔ جرم کہاں سے پھوٹ رہا ہے تم بھی جانتے ہو اور نہیں بھی۔۔۔“

”نہیں تم سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔ جاؤ، ہٹو یہاں سے۔“ سلامت خان نے کہا۔

”نہا ایسے نہ ہوا سے آرام سے ناشتہ کر لینے دو۔“ اُس نے فرماتے ہوئے کہا۔

”نہیں امید رکھوں گا کہ تم۔۔۔“

”کچھ نہیں کریں گے ناشتہ کروائیں گے۔ جب تم اسے پیش کرو گے تو ضمانت ہو جائے گی۔ بس اتنا سا کام ہے۔۔۔“ اُس نے ہنستے ہوئے کہا تو سلامت خان وہاں سے چل دیا۔ جب وہ شخص جنید کی جانب مڑا اور ہنستے ہوئے بولا۔ ”ٹکرنڈ کر شہزادے! ابھی ضمانت ہو جائے گی ہر ایک کے سامنے بڑی بڑی بیٹگی ہے۔“

یہ کہہ کر اُس نے اشارہ کیا تو ایک شخص پوتلی میں بندھا ہوا ناشتہ لے آیا۔۔۔

پھر جنید کی ضمانت ہو گئی۔ اگرچہ یہ بہت مشکل کام تھا لیکن ہو گیا تھا۔ وہ احاطہ عدالت میں بغیر ہتھیاری اور بیڑی کے کھڑا تھا۔ اُس کے ساتھی غائب ہو چکے تھے جاتے ہوئے انہوں نے اس کے کان میں پھونک مار دی تھی کہ اُسے کہاں آنا ہے؟ اُس کا اپنا تو کوئی تھا نہیں جس کے پاس وہ جاتا۔ اُس نے ایک لمبی اور سرد آہ بھری تھکا لگا ہوں سے ارد گرد دیکھا اور ایک طرف چل پڑا۔ وہ پوری دنیا میں تھا تھا۔

جنید ایک عام سے کاروباری گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ دو بھائی اور ایک بہن کے بعد سب سے چھوٹا تھا اس لئے والدین کی طرف سے اسے لاڈ پیار بھی بہت ملا تھا۔ بچپن ہی سے وہ بہت شرارتی اور ذہین واقع ہوا تھا۔ ہر کلاس میں بہترین نمبر لے کر کوئی نہ کوئی پوزیشن ضرور حاصل کرتا تھا۔ ان کے گھریلو حالات نہ اتنے ٹھک تھے کہ ضروریات کو ترستے اور نہ ہی اتنے کشادہ تھے کہ فضول خرچی کر سکتے۔ انہی حالات میں وہ پتا پڑھا کالج میں آ گیا۔ یہیں پر اس کی ملاقات مذہبی تنظیم کے ان لوگوں سے ہوئی جو بہت شدت سے کام کرتے تھے۔ جنید ان کے لئے ایک اچھا کارکن ثابت ہوا اس لئے اس پر محنت بھی بہت کی جانے لگی یہاں تک کہ جب دو سال چہارم میں آیا۔ اس وقت تک پورا کالج اس کے نام سے خوف کھانے لگا تھا۔ مذہبی تنظیم میں اس کا نام تھا لیکن اس کے گھر والوں نے اسے پوری طرح بے دخل کر دیا تھا جس کا اسے کوئی افسوس نہیں تھا۔ اس کا یقین تھا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے ٹھیک کر رہا ہے۔ کبھی کبھار اُسے اپنا گھر، بہن بھائی اور والدین یاد آتے تو اس کا دل بھرا آتا لیکن ایسے وقت میں اس کا مقصد اس کے سامنے آ جاتا جس کی خاطر اس نے اپنی جان بھٹکی پر رکھی ہوئی تھی۔ چندہ جمع کرنے سے لے کر تہذیبی کے وقار تک جو بھی اسے ذمہ داری دی جاتی وہ پوری جان سے نبھانے کی کوشش کرتا۔ اسے یہ باور کرایا گیا تھا کہ اگر اس راہ میں جان بھی ملی جائے تو وہ جنت کا حقدار ہوگا۔ اس لئے وہ بڑی ثابت قدمی سے اس راہ پر چلتا چلا جا رہا تھا یہاں تک کہ اب وہ ان افراد میں شامل تھا جو کسی بھی معاملے میں کوئی بھی فیصلہ کرنے کے مجاز تھے۔ ایسے میں قانون نافذ کرنے والے ادارے ان سے غافل نہیں تھے انہیں معلوم تھا کہ علاقے میں کون سی سرگرمیاں کن کی طرف سے ہو رہی ہیں۔ جرائم کی جزیں ہمارے معاشرے کے اندر ہی ہوتی ہیں۔ یہیں پھلتی پھولتی اور گہری ہوتی ہیں۔ کسی بھی پھونسنے والی کوئی کوئی معلوم نہیں ہوتا کہ زمین سے باہر ماحول کیسا ہوگا۔ اسے کیسی ہوا ملے گی اور کس طرح کی روشنی میسر آئے گی۔ اگرچہ جنٹیک تھیوری کا اپنا ایک فلسفہ ہے جو تجربات کی بنیاد پر درست ہے لیکن بہت سے بیج جو ہر آلود نہیں ہوتے جب وہ پودے بنتے ہیں تو بادِ موسم انہیں نہ صرف زہر پلانا دیتی ہے بلکہ ان کا پھل بھی زہر بھرا ہوتا ہے۔ اس میں اس بیج کا کوئی تصور نہیں ہوتا۔ جس طرح کسی کیمیکل فیکٹری کا فاضل مواد زمینوں کو بخر کر دیتا ہے اسی طرح ہمارے معاشرے میں ایسے نظریات بھی ہیں جو ذہنوں کو بھی بخر بنا دیتے ہیں۔ جب معاشرے میں انصاف نہیں ہوتا مانتور کی حکومت چلتی ہے تو ہر کسی کو اپنے وقار میں تھمپا رہنا ہی پڑتا ہے۔ یہی ماحول معاشرے میں انتشار ہے سستی اور بے راہ روی کا باعث بنتا ہے۔ اس میں تصور کسی کا نہیں ہوتا لیکن ذرا سا گہری نگاہ سے دیکھا جائے تو ساری بات سمجھ آ جاتی ہے اور یہ الگ بات ہے کہ کوئی دیکھتے ہوئے بھی اندھا بن جائے۔ سب کچھ اس کی نگاہ کے سامنے ہو گا مگر اس میں دیکھنے کی صلاحیت ہی نہ ہو۔

جنید احاطہ عدالت سے باہر آ گیا تھا۔ وہ کھڑا سوچ رہا تھا کہ کدھر جائے؟ جہاں اسے جانے کا تاپا گیا تھا وہاں وہ فوراً ہی نہیں جا سکتا تھا۔ تبھی اس کے ذہن میں اس نرس کا خیال آیا کہ کیوں نہ اس سے ملا جائے لیکن اگلے ہی لمحے اسے اپنی سوچ پر حیرت ہوئی۔ وہ ایسا کیوں چاہتا ہے کہاں وہ اور کہاں نرس۔۔۔؟ اسے خود پر ہنسی آئی اور ایک جانب چل دیا۔ اسے اپنے ایک پرانے دوست کا خیال آ گیا تھا جو کم از کم ایک دن اسے اپنے پاس رکھ سکتا تھا۔

☆☆

شام ڈھلنے کو تھی سورج کاسی کے جمال جیسا رہا تھا۔ بکے بکے ہادل تھے اور ہوا قدرے تیز تھی۔ ایسے میں صفیہ، سہلی اور ان کی ماں زینون لان میں بیٹھتی ہوئیں تھیں۔ ان کے درمیان ہمایوں زہر بحث تھا۔ سہلی کا اتنا قصور تھا کہ اُس نے اپنی ماں کے کہنے پر اُن کے گم فون کیا تھا جس پر صفیہ اچھا خاصا بگڑ گئی تھی۔

”تجھے ضرورت کیا تھی اُن سے بات کرنے کی وہ لوگ ہیں اس قابل کہ اُن سے بات کی جائے؟“ صفیہ نے نظرت سے منہ بگاڑتے ہوئے کہا۔

”تو کیا ہو گیا، طوفان آ گیا ہے؟۔۔۔ تم چاہے لاکھ نفرت کرو ان سے آخروہ اپنے ہیں۔ کیا ہوا جو تیرے ساتھ تیرے باپ کا دماغ بھی خراب ہو گیا ہے۔“ زینون بی بی نے غصے میں کہا۔

”بات یہ نہیں ہے کہ آپ نے فون کیا۔ کر لیا، اب کیا ہو گا اس کا فائدہ ہے کوئی۔۔۔ وہ ہسپتال میں پڑا ہے کیا آپ میاوت کرنے جائیں گی اُس کی؟۔۔۔ نہیں نا اور اگر جائیں گی تو ہمارے گھر میں خواہ مخواہ کی لینشن بن جائے گی۔۔۔ نہ گئے تو ان کا لگا بھن جائے گا کہ پوچھنے تک نہیں آئے اور چلے گئے تو وہ خواہ مخواہ کے خواب دیکھنا شروع کر دیں گے۔“

”اُنہوں نے اب کیا خواب دیکھے ہیں۔“ زینون بی بی نے دھیرے سے کہا۔

”آپ کو نہیں پتہ ان غریب لوگوں کی پرانیلم ہی سہی ہوتی ہے۔ اعلیٰ تھا تو بازو پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ذرا سا اچھا بول تو ان کے ساتھ تو اُمیدیں لگا کے بیٹھ جاتے ہیں۔ اس سے اچھا نہیں ہے کہ ان سے بات ہی نہ کی جائے۔“

”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔۔۔“ زینون بی بی نے اُسے جھاڑا۔ ”جو کچھ آج تمہارے باپ نے بھائی انور علی کے ساتھ کر دیا ہے؟ میرا نہیں خیال کہ وہ زندگی بھر اس پر کھٹ پر دوبارہ قدم رکھیں گے۔“

”نہ رکھیں، ہمیں کیا۔۔۔ اچھا ہے، اُن سے جان چھوٹے گی۔“ صفیہ نے ناک سکیڑتے ہوئے لاپرواہی سے کہا۔

”سہلی! اسے سبھاؤ کا اپنے پھر اپنے ہوتے ہیں وہ جیسے بھی ہوں۔ مجھے پتہ ہے اُنہوں نے تمہارے باپ کے ساتھ کتنا اچھا سلوک کیا ہے مگر آج تمہارے باپ کا رویہ دیکھ کر میرا دل بھی رو دیا ہے۔ ٹھیک ہے ان سے تعلق نہ رکھو لیکن اُنہیں دھکا رو تو نہیں۔“

”ای او یکھا نا اچھے بھلے تھے ہم لوگ، گھر میں کس قدر سکون تھا لیکن اُن کا بھڑک پڑا ہے اس گھر میں بے سکونی ہی پھیل گئی ہے۔“ صفیہ نے نظرت سے کہا

”تم نہیں سمجھو گی۔“ زینون بی بی نے اُسوں بھرے لہجے میں کہا۔

”میں غلط نہیں کہہ رہی ہوں۔۔۔ کیا آپ اس لئے افسردہ نہیں ہیں کہ ان کے ساتھ یہاں اچھا سلوک نہیں ہوا اور اگر وہ نہ آتے تو کیا آپ ایسے افسردہ ہوتیں یوں دکھا کا اٹکھا کر رہی ہوتیں؟۔۔۔ میں انکار نہیں کرتی ہوں ان کی رشتے داری سے لیکن وہ اپنے کینے کی سزا خود بھگتیں۔

پاپا نے ٹھیک کہا ہے کہ وہ کس منہ سے لوگوں کو یہ کہیں کہ ان کا سا۔۔۔ تجھجا ملازموں کی طرح حوالات میں پڑا ہے۔ کیا ناک نہ کھتی ان کی۔۔۔؟“

”تم اور تمہارا باپ اپنی ناک بچائے رکھو اور ذرا وقت سے جب کبھی تم ان کی جگہ پر ہو گے۔“

”امی! کیا ہو گیا ہے آپ کو ان سچ لوگوں کے لئے آپ اپنی ہی اولاد کو بددعا میں دے رہی ہیں؟“ منیہ نے انتہائی حیرت سے کہا۔

”کوئی ماں اپنی اولاد کو بددعا نہیں دے سکتی۔ میں تو ذرا رعبی ہوں۔ اتنا فرور اچھا نہیں ہوتا اللہ کو فرور قطعاً پسند نہیں ہے اور حالات

بدلتے ہوئے کتنا وقت لگتا ہے۔“

”ٹھیک ہے امی! لیکن پاپا نے محنت کی اور آج اس کا پھل کھا رہے ہیں۔ تایا کو کس نے روکا تھا کہ وہ محنت نہ کریں وہ بھی ڈاکٹریا انجینئر

بن جاتے اور خوب دولت کماتے۔“

منیہ نے اپنی ماں کو سمجھاتے ہوئے کہا تو سہلی نے بات بدلنے کی خاطر پوچھا۔

”امی! ویسے جب اس کی اور ہمایوں کی مقلقی۔“

”کیوں اذیت دے رہی ہو سہلی! میں اس واقعے کو بھول جانا چاہتی ہوں، کھریج دینا چاہتی ہوں اپنی زندگی سے۔ یہ وہ واقعہ ہے

جس میں میری کوئی مرضی نہیں تھی مگر مجھ پر دھبہ بن کر رہ گیا ہے۔“ وہ تقریباً جیسے ہوئے استعجاباً بولی۔

”چلو یہ مینشن ختم کرو۔ شام ہو گئی ہے آؤ اندر چلیں۔“ سہلی نے گویا بات ہی ختم کر دی۔

”امی! آپ پلیز! ان لوگوں کا خیال نہ کیا کریں ذمہ داری ہوتی ہے آپ۔۔۔ جب پاپا ہی کو ان کی پرواہ نہیں ہے جن کا ان سے خونی رشتہ

ہے تو آپ کیوں اور پھر ہم نے ان سے کیا لیتا دینا۔ وہ اپنی دنیا میں خوش رہیں اور ہم اپنے گھر۔۔۔“ منیہ نے گویا بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے بیٹی! جیسا تم لوگ چاہو۔“ زینتوں بی بی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ اُسے معلوم تھا کہ اگر وہ مزید بات کرے گی تو اُسے کچھ اور

سننے کو ملے گا۔ وہ اٹھ کر اندر چلی گئی اس کے پیچھے ہی دونوں بیٹیاں بھی ڈرائنگ روم میں آ گئیں۔ منیہ وہاں پر نہیں بیٹھنا چاہتی تھی ورنہ پھر اسی حالے

سے کوئی نہ کوئی بات ہو جانا تھی سو وہ اپنے کمرے کی طرف جانے کے لئے بیڑھیوں کی جانب بڑھ گئی۔

اگرچہ ان نے بیڈ پر بیٹھے ہی ٹی وی آن کر لیا تھا لیکن اُس کی سوچیں آوارہ ہو گئیں۔ اُسے ہمایوں سے نفرت تھی مگر کبھی کبھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ

کیوں اُسے اچھا نہیں سمجھتی۔ وہ چند مہینے جہان تھا یا صلاحیت تھا لیکن صرف فریب تھا اور اُسے فریبوں سے سخت نفرت تھی۔ اُس کا انا خیال تھا کہ بندہ اگر

فریب ہوتا ہے تو صرف اپنی کالی کی وجہ سے ورنہ محنت سے وہ روپیہ بنا سکتا ہے اور اس معاشرے میں اک خوشحال زندگی گزار سکتا ہے۔ ہمایوں لاکھا چھا

سکی لیکن اُس کا کوئی اٹلٹس نہیں تھا اور جو لوگ ان کے معیار پر نہیں اترتے تھے وہ اُسے ایک آنکھ نہیں مہاتے تھے۔ وہ تو ہمایوں کو اپنا رشتے دار ماننا تو دور کنار

اُس کے بارے میں سوچنا بھی پسند نہیں کرتی تھی۔ اُس کے خیالوں میں تیور بس چکا تھا۔ وہ اُس کی کلاس فیلو سائزہ کا بھائی تھا۔ لہذا قد سا نولا سارنگ

تناسب خدو خال کے علاوہ وہ ایک فیکٹری کا مالک تھا۔ وہ باپ کے بزنس کو سنبھالنے کی بجائے اپنا بزنس کر رہا تھا۔ جدید ماڈل کی گاڑی اور یہ بڑا سا گھر

جس میں ہر سہولت میسر تھی۔ وہ کبھی کبھار سائزہ کو لینے کے لئے آتا تھا پھر باقاعدہ آنے لگا۔ منیہ کئی بار ان کے ہاں بھی جا چکی تھی اور بات شناسائی سے

بڑھ کر دوتی تک آ گئی تھی۔ فیسی تحائف کا تبادلہ بھی ان کے درمیان ہو چکا تھا لیکن بات بڑھتے بڑھتے بہت آگے تک بڑھنے والی تھی۔

تیمور اور ہمایوں کا وہ جب بھی موازنہ کرتی ہمایوں اُسے بہت ڈور تک دکھائی نہ دیتا تھا۔ وہ چاہے قریبی رشتے دار تھا یا کوئی اُس سے خونی رشتہ تھا۔ اس کا ہنڈم ہوتا یا کوئی صلاحیت بھی کہیں پس منظر میں چلی جاتی جبکہ تیمور اُسے اپنی رگ جاں سے بھی قریب دکھائی دیتا۔ وہ جیسا بھی تھا اور جو بھی تھا اس معاشرے میں پوری احماد سے مو کو کرتا تھا۔ اس کا اپنا ایک ملکہ احباب تھا جس میں شہر کے معزز افراد تھے۔ اس کا خیال تھا کہ جیسے ہی وہ اپنے کاروبار میں جم گیا تو سیاست میں بھی حصہ لے گا۔ وہ اپنے خیالات میں بہت اُدنچا تھا۔ ان سب سے ہٹ کر اُس کا ایک خاندانی پس منظر تھا جو کاروباری طے میں بہت عزت اور احترام سے دیکھا جاتا تھا وہ دو اور دو پانچ کرنے کی عادی نہیں تھی حقیقت پسندی اس لئے نہ صرف اسے دو اور دو چار کرنا آتا تھا بلکہ اسی پر یقین رکھتی تھی۔ اُس نے نے ہمایوں کو اپنی زندگی سے نکال باہر کیا تھا اُس کی جگہ اُب تیمور کا ساتھ بہک رہا تھا۔

☆ ☆

رات کا آخری پہر چل رہا تھا مگر ہمایوں کی آنکھ سے نیند غائب تھی۔ وہ اپنے گھر میں اپنے ہی بستر پر بڑا تھا لیکن پھر بھی بے سکون تھا۔ سر شام وہ آ گیا تھا اور پھر آتے ہی اُسے نوبت بی بی نے ساری رو داد سنائی دی کہ کس طرح تمہارے چاچا نے تمہارے باپ کے ساتھ سلوک کیا ہے۔ وہ پریشان تو تھے ہی ایک نیا دکھ بھی اُنہیں مل گیا۔ جب سے وہ اپنے بھائی کے گھر سے آئے تھے اُنہیں ایک چپ لگ گئی تھی جیسے اُن کا سب کچھ کھو گیا ہو۔ وہ تو جیسے مٹی کا ڈمیر ہو کر گھر میں ہی پڑے رہے۔ اگر وہ ہم اطلاع نہ دیتا کہ وہ ہسپتال میں ہیں تو پتہ بھی نہ چلتا۔ اُن کا ارادہ نہیں لگ رہا تھا کہ وہ کہیں جائیں گے تلاش کرنے پر تو اطلاع ملنے پر ماں نے رو رو کے اُنہیں ہسپتال بھیجا تھا۔ ہمایوں کو اندازہ ہو رہا تھا کہ اُس کے باپ کو کتنا ڈکھ ہوا ہوگا۔ اس سے یہ ساری باتیں اُس کی ماں نے رو رو کر کہیں۔ وہ اُسے باہر کرانا چاہتی تھی کہ وہ کس قدر رازیت سے گزرے ہیں اور اُس کا باپ کس قدر ڈکھی ہو رہا ہے۔ وہ چپ چاپ سنتا رہا مگر دل ہی دل میں کڑھتا رہا۔ سب انیسٹر کو احساس دلانے کا عمل اُسے اپنی زندگی کی سنگین غلطی محسوس ہو رہی تھی جس نے نہ صرف اُس کی سوجوں میں زہر بھردیا تھا بلکہ اُس کے والدین کی جموئی میں نئے ڈکھ آگرے تھے۔ وہ خود کو ہی قصور وار سمجھ رہا تھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو شاید اُس کا باپ ڈکھی نہ ہوتا۔ اگر کوئی غیر رازیت دے تو اتنا ڈکھ نہیں ہوتا جبکہ انہوں کی الیت زندہ در گور کر دیتی ہے۔ اُس کے باپ کا لفظ اتنا ہی قصور تھا کہ اُس نے اپنے بیٹے کے لئے دردناک لی تھی اور چاچا کو لفظ اپنے سامنے مر جے کا خیال تھا جو محض دولت پر مبنی گئی تھی۔ پھر وہ دشمن جان جو اُس کے خیالوں میں چھائی ہوئی تھی اُس سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ فون کال کر کے ہی اُس کی خیریت دریافت کر لیتی۔ وہ اُس کے لئے کتنے اچھے خواب دیکھتا ہے جس میں لفظ وہی اُس کی سمسٹر ہوتی ہے مگر اُس نے بھی اسے نظر انداز کر دیا۔ ہمایوں اچھی طرح سمجھتا تھا کہ ایسا کیوں ہے دولت کی اُدھی دیوار ان میں حائل تھی جس نے نہ صرف خونی رشتوں کو بھلا دیا تھا بلکہ اُن میں سوچوں کا واضح فرق آ گیا تھا اُس کا داغ اُسے حقیقت پسند ہونے کے لئے کہا۔ وہ واضح حقائق بیان کرتا جن کی بنیاد پر ہنیہ کو بھول جانا ضروری تھا لیکن اُس کا دل کسی طور مانتا ہی نہیں تھا۔ وہ ساری منطق اور دلائل کو رد کر دیتا۔ اُسے یقین تھا کہ ایک دن ہنیہ اُس کی ہوگی۔ اُسے اپنی محبت پر اتہار تھا کہ وہ ہنیہ کا دل ضرور جیت لے گا مگر کب تک؟ یا اُس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔

اس واقعہ سے پہلے تک ہمایوں دو خاندانوں میں ڈوری کی وجہ صرف ایشیئس ہی کو سمجھتا تھا ایک آس کی ڈور پھر بھی تھی کہ وہ ان کا خونی

رشتے دار ہے۔ اُس کے پاس بھی اگر کوئی تھوڑا بہت اسٹینس ہوا تو وہ ضرور قابل توجہ گردانا جائے گا۔ اُس کا چاچا ضرور اُسے چاہے گا ایک ماں تھا کہ وہ اپنے بڑے بھائی کی لاج ضرور رکھے گا لیکن اس واقعہ کے بعد یہ مجرم بھی ٹوٹ گیا تھا۔ جس بیٹے کی مدد کے لئے باپ کو ٹھکرا دیا جائے وہ اپنی بیٹی اُسے کیوں دے گا؟ وہ جو آس کی ڈوری تھی اُسے ٹوٹی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ بے چین سا ہو کر اُٹھ بیٹھا۔ اُس نے اپنے ابو کو دکھا دوڑائی پرانا سا بوسیدہ کمرہ اُس کی حالت زار پر غصہ رہا تھا۔ اس کمرے میں اُس نے غلوں میں رہنے والی صفیہ کے خواب دیکھے تھے جس کے باپ نے اُسے بُری طرح ڈھکھار دیا تھا۔ کیا وہ بھی ایسا ہی چاہتی ہے؟۔ اس سوال نے اُسے پھر سے اُمید دلا دی۔ آج تک اُس نے براہِ راست کبھی اس موضوع پر اُس سے بات نہیں کی تھی ایسا اس لئے بھی تھا کہ بچپن میں ہی مٹھی نے یہ احساس پیدا کر دیا تھا کہ وہ اُس کے لئے ہے۔ تب دونوں ہی میں ایک خاص قسم کی جھجک رہی جس کی وجہ سے نہ تو کوئی طویل ملاقات ہوئی اور نہ لمبی باتیں رہیں۔ پھر دونوں میں اسٹینس کی دیوار بلند ہونا شروع ہوئی۔ ہمایوں کے دل میں تو وہ سب اسی طرح رہا اور وقت کے ساتھ ساتھ صفیہ کی محبت کو نپل سے پودے تک کے سفر میں رہی جو تناور درخت بننے کے عمل میں تھی لیکن ہمایوں دیوار کے اس پار نہیں دیکھ سکا کہ صفیہ کی حالت کیا ہے۔ کیا وہ بھی اُسے چاہتی ہے؟ کیا اُب بھی اس کا نام آجانے سے اُسکے چہرے پر شرمیں دیتے روشن ہوتے ہیں۔ کیا اُب بھی اُس کے احساس سے گال سرخ ہو جاتے ہیں اور لگا ہیں جھک جاتی ہیں؟ اس بارے ہمایوں کو کچھ پتہ نہیں تھا۔

اس رات ہمایوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اپنے چاچا اور اس کے خاندان سمیت صفیہ کو بھی بھول جائے یا پھر؟۔۔۔ اس سے آگے وہ کچھ بھی نہ سوچ سکا۔ یہ محبت بھی کیا بلا ہوتی ہے۔ خود سے کوئی فیصلہ بھی نہیں کرنے دیتی ہمیشہ اپنا آپ ہی منواتی ہے۔ جب بھی وہ ایسا سوچتا صفیہ کی محبت آڑے آ جاتی۔ وہ اُسے بھول جانے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے اس اوجھڑن میں رات گزارتی چلی جا رہی تھی۔ اچانک اُسے خیال آیا کہ کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے قضا ایک بار اُسے صفیہ سے تو بات کر لینی چاہئے کہ وہ کیا سوچتی ہے؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنے تئیں فیصلہ کر لے اور وہ اس کی آس میں بیٹھی رو جائے۔ تب اگر بعد میں اُسے یہ معلوم ہوا تو کچھ تاوانہ کی کاروگ بن جائے گا۔ تب لہوں میں ہی فیصلہ ہو گیا کہ حتمی فیصلہ اس وقت کرے گا جب وہ صفیہ سے مل لے گا۔ یہ سوچتے ہی اطمینان کی ایک لہر اُس کے من میں سرایت کر گئی وہ مطمئن ہو گیا اور اسی بوسیدہ کمرے میں سکون سے سو گیا۔

☆☆

جس طرح اندھیرے میں چمکتا ہوا جگنو روشنی کی اُمید دلاتا ہے بالکل اسی طرح راحیلہ کی زندگی میں جنیدی آمد نے اُسے حوصلہ مند بنا دیا تھا۔ اُسے یہ قطعاً اُمید نہیں تھی کہ وہ زندگی میں دو بار کبھی اُسے مل پائے گی۔ نہ جانے کتنے لوگ آئے اور چلے گئے جن میں بہت سارے کڑیل جوان بھی تھے زندگی کے سنے دکھانے والے بہت لوگ بھی اُسے ملے اور ان لوگوں سے بھی سامنا ہوا جو حقیقت کی تلخ تصویر دکھا کر اپنی راہ پر لانا چاہتے تھے اور ہر بار وہ ثابت قدم رہی تھی۔ لیکن دُنیا میں ایسا مادہ در یافت نہیں ہوا جو اپنی حیثیت نہ بدل سکے۔ پتھر پر بھی لگا تار ضرب پڑتی رہے تو وہ بھی آخر کار ٹوٹ جاتا ہے جبکہ راحیلہ ایک عام سی لڑکی تھی جو کبھی کبھی اپنی ہی خواہشوں اور حسرتوں کے بوجھ تلخ و بکراہت حال ہو جایا کرتی تھی۔ زندگی کی رنگینیاں اور لذتیں اُسے بھی اپنی طرف کھینچتی تھیں سنبھلے پنوں کی چمک اُس کی آنکھوں کو بھی خیرہ کر دیا کرتی تھی لیکن اُس کے اندر جو حراست تھی

اُس نے راحیلہ کو ہمیشہ ثابت قدم اور مضبوط رکھا تھا۔ ممکن تھا کہ یہ ثابت قدم مضبوط بچہ کسی دھماکے سے ٹوٹ جاتا، اُس نے جنید کو دیکھ لیا تھا۔ اُس کی نگاہوں نے بات کرنے کے انداز اور طرز عمل نے اُس میں بھی جرأت بھری تھی، جس کا عملی ثبوت وہ ڈاکٹر جمیل کو ڈانٹ کر دے چکی تھی۔ اُسے یہ اچھی طرح احساس تھا کہ ڈاکٹر جیسے لوگ جو چہرے پر نقاب و در نقاب سجانے رکھتے ہیں یہ دنیا کے سامنے شرافت کا مجسمہ دکھائی دینے والے اندر سے کس قدر غلیظ ہوتے ہیں۔ وہ اپنی تہلیل پر اُسے مصافحہ کرنے والا نہیں ہے۔ مٹنے کے سامنے سے جب بڑی اٹھالی جائے جسے وہ کھینچوڑنا چاہتا ہو تب مٹنے میں ہاؤڈا پین عود کر آتا ہے۔ اس بات سے وہ اچھی طرح واقف تھی لیکن اُس کے اندر جو عزم اور جرأت پیدا ہو چکی تھی اس نے ڈاکٹر کے خوف کو بہت پرے پیٹھک دیا تھا۔ جنید اُس کے خیالوں میں بس چکا تھا حالانکہ اُسے یہ معلوم تھا کہ وہ کبھی اُسے نہیں مل سکے گا اور اگر کبھی مل بھی گیا تو جس طرح کے اُس کے جذبات ہیں شاید ہی وہ اُس کے سامنے اظہار کر سکے۔ اس لئے دوبارہ ملنے کی امید نہ رکھتے ہوئے بھی وہ اپنی ذمہ داریوں میں اُسے یاد رکھ رہی تھی۔ چند دنوں میں وہ بہت بدل کر رہ گئی تھی جس کا اظہار نسرین جو زلف نے بھی کر دیا تھا۔ اس شام وہ دونوں کمرے میں بیٹھی ہوئی تھیں کہ نسرین نے کہا۔

”راحیلہ! کیا تمہیں نہیں لگتا کہ تم خاصی بدل گئی ہو؟“

”ایسا کیا۔۔۔ میں بدل گئی ہوں؟“ اُس نے حیرت سے پوچھا۔

”بالکل تم بدل گئی ہو۔ پہلے سے زیادہ خاموش رہتی ہو تم میں خصلت اور چہ چہ اپنی بھی بہت کم ہے۔ اپنے آپ پر توجہ دیتی ہو اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تم دوسروں کے بارے میں بھی لا پرواہ ہو گئی ہو۔“ نسرین نے اُس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں تمہاری کسی بات سے انکار نہیں کروں گی نسرین! یقیناً ایسا ہو گا مگر میں جو بدل گئی ہوں تو ایسا میں نے جان بوجھ کر نہیں کیا ہے سب کچھ خود بخود ہو گیا ہے۔“ وہ خیالوں میں گھومتی ہوئی بولی۔

”ایک بات اور جو اہم بھی ہے اور خطرناک بھی وہ یہ کہ تم اب زیادہ بے باک لگ رہی ہو اور حوصلہ مند ہو گئی ہو۔ یہ تمہیں نقصان۔“

”مطلب۔۔۔؟“ اُس نے نسرین کی بات کا لٹے ہوئے پوچھا۔

”مطلب یہی کہ کل شام جو تم نے سینئرز کو نئی طرح ڈانٹ دیا تھا، کیا وہ تمہیں مصافحہ کرے گی اور وہ ڈاکٹر۔“

نسرین نے کہنا چاہا تو راحیلہ جیزی سے بولی۔

”کیا میں نے غلط کیا تھا۔ میں اپنی ماں کو فون کرنے کے لئے پی سی او پر کھڑی تھی۔ اُس نے مجھے کیوں موبائل فون کی آفر کی۔ کیا اُس نے یہ فریڈی فریبٹ کو دیکھ کر کی میری ہمدردی میں کی یا پھر؟ تم اچھی طرح جانتی ہو اُس کا کیا مقصد تھا۔ کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ اُس نے مجھ پر طعنے کیا اور محض میری اوقات جتانے کے لئے ایسا کیا؟۔۔۔ نہیں نسرین! میں اُس کا جو مقصد تھا میں اسے پورا نہیں کر سکتی۔“

”لیکن جس طرح پہلے تم اُس کی آفر کو آرام سے دیکھ رہے تھے اور اب اسے دیکھ کر اُس کی عزت کر دینے کی حد تک توجہ دیتے ہو۔ تمہیں نہیں معلوم کہ وہ تمہارے ساتھ کچھ بھی کر سکتی ہے۔“ نسرین نے قدرے خوفزدہ ہوتے ہوئے کہا۔

”جو ہوگا دیکھا جائے گا۔۔۔ اگر میں شروع دن سے ہی ایسا رویہ رکھتی تو انہیں جرأت تک نہ ہوتی کہ مجھ سے کوئی فضول بات بھی کرتا۔“

”لیکن اگلے سال کی جو محنت اکارت جائے گی اس کا کیا ہوگا؟۔۔۔ اس سے دشمنی ہی بڑھتی ہے دوست تو نہیں ملتے۔“ نسرین نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”لیکن میں غلامت کی زندگی برداشت نہیں کر سکتی۔۔۔“ اُس نے حقیقی انداز میں کہا تو نسرین خاموش رہی وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ سکتے ہی لے لے یونہی بیت گئے تو وہ پھر نسرین کو سمجھانے والے انداز میں بولی۔ ”دیکھو ایک کم محو اور پانے والی جس کا کوئی اور ذریعہ آمدنی نہیں ہے نہ وہ اگر سونے کے زیورات کی نمائش کرتی ہے بہترین لباس پہنتی ہے اپنے تعلقات ٹھواتے ہوئے رسائی کی بات کرتی ہے تو کیا میں اُسے دیکھ کر کھاسل جاؤں۔ ایک عورت ہونے کے ناتے میرا بھی دل کرتا ہے کہ مجھے یہ سب ملے مگر عزت کھودینے کے عوض یہ سب ملا بھی تو کیا ملا؟۔۔۔ میں جب تک بی سکتی ہوں اپنا آپ بچاؤں کی باقی جو قسمت میں ہوا اُسے میں نال نہیں سکتی۔“

”تم ٹھیک کہتی ہو یہ بات بھی اُسے ہی ہیں جو ان سے بڑب جائے۔۔۔ جیسے تم چاہو۔“

نسرین نے تھمرا ڈالتے ہوئے کہا اور اُٹھ کر باہر چلی گئی۔

راحیلہ یہ اچھی طرح سمجھتی تھی کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے ڈرست کہہ رہی ہے لیکن اس کے کہنے سے وہ اپنا آپ تو نہیں بدل سکتی تھی۔ اُسے اچھی طرح علم تھا کہ ڈاکٹر جمیل کے بعد اب سینٹرز میں کمی اس کی بھلائی نہیں چاہیں گی۔ آخری سال کے جو باقی چند مہینے رہتے تھے ان میں کچھ بھی ہو سکتا تھا مگر اُسے مدد ہوئی تھی کہ وہ ان کی بات نہیں مانے گی۔ وہ جنید کی احسان مند تھی کہ اسی کی وجہ سے اُسے اتنا حوصلہ مل گیا تھا۔

چند دنوں سے وہ خود بھی محسوس کرنے لگی تھی کہ وہ جنید کو بہت یاد کرتی ہے۔ شاید اُسے یہ احساس نہیں تھا کہ وہ جو کوئی اُس کے لاشعور میں چھپ کر بیٹھا ہوا ہے، ممکن ہے کہ جنید ہی اُس کی حقیقی تصویر ہو۔ اگلے سارے لوگوں میں وہی انہی اُسے آسٹا سا لگا تھا جیسے کوئی اُس کا اپنا ہوا اور جس کا ساتھ پا کر بندہ حوصلہ مند ہو جاتا ہے۔ راہیلہ کے لئے وہ شخص ایک نئی زندگی لے کر آیا تھا۔

اس شام اُسے پتہ ہی نہ چلا کہ نسرین کب آ کر اپنے بیڈ پر لیٹ گئی ہے۔ وہ اپنے ہی خیالوں میں کھوئی رہی تھی۔

☆☆

رات کا پچھلا پہر تھا جب اچانک جنید کی آنکھ کھل گئی۔ درو کی اک نرس اُٹھی تھی جو کرون کی کچھلی طرف سے ہوتی ہوئی اُس کے سر میں کچھیل گئی تھی۔ وہ اچھی طرح سے جانتا تھا کہ ایسا کیوں ہوا ہے؟ پچھلے دنوں جو اُس نے کشیدہ بھیلایا تھا یہ اسی کی وجہ سے تھا۔۔۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا اور درد کو سہارنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس وقت اسے میڈیسن کی ضرورت تھی جو چند قدم کے فاصلے پر پڑی ہوئی تھی لیکن ان لمحات میں اُس کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ اُسے اور وہ میڈیسن لے لے۔ وہ کتنی ہی دیر تک یونہی بیٹھا اور برداشت کرتا رہا، پھر دیر سے دیر سے درد کم ہونا شروع ہو گیا۔ اُس نے ہمت کی اور میڈیسن اٹھالیں۔ قریب پڑے فریج میں سے پانی لیا اور میڈیسن نگل کر واپس اپنے بیڈ پر آ گیا۔ اس کا درد کافی حد تک کم ہو گیا تھا۔ اس لئے اُس نے وہ پارہ مٹانے کی کوشش کی لیکن نیند آنکھوں سے قابغ تھی۔۔۔

اُسے وہ چند دن پہلے گزرے ہوئے بھیسا تک دن یاد آنے لگے۔ اُس کے پکڑے جانے کا کوئی امکان نہیں تھا لیکن پھر بھی وہ پولیس کے ہتھے چڑھ گیا۔ یہ سوالیہ نشان اب بھی اُس کے سامنے موجود تھا کہ ایسا کیوں ہو گیا لیکن چند دن سوچنے کے بعد بھی اُسے جواب نہیں مل سکا تھا۔ اس لئے جنید نے یہ سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ بہت جلد یہ بات سامنے آ جائے والی تھی۔ اس کے ساتھ اُسے وہ نرس بھی یاد آ جاتی جس نے محض ایک فخرے میں اُسے بہت زیادہ حوصلہ دے دیا تھا وہ نرس بھی اُس کے لئے ایک معمر بن گئی تھی۔ وہاں گزارا ہوا ایک ایک لڑکے سے یاد آ جاتا لیکن وہ سوال جنوز تشہر رہتا کہ اُس نرس نے کیا سوچ کر اس قدر حوصلہ مند باتیں کہی تھیں کہ جو پچھلے سارے دنوں کی اذیت بھلا دینے کے لئے کافی تھیں۔ اُس کی نگاہوں میں کس قدر اپنائیت تھی اور پھر جب اُس نے کہا تھا کہ جوش سے نہیں ہوش سے کام لیتے ہیں۔ پھر پہاڑ بھی ہوں رستے میں تو وہ بھی رستہ دے دیتے ہیں۔ یہ سچی حوصلہ افزا بات تھی۔ اسی بات کے غماز نے ہی اُسے ساری اذیتیں بھلا دی تھیں۔ تب اُس نے فقط یہی جانا تھا کہ وہ اپنا فرض بھاری ہے۔ سچی اچھی بات کہہ کر اُس نے گویا ساری بات ہی ٹھم کر دی تھی لیکن۔۔۔ لیکن وہ دوبارہ کیوں اُس کے پاس آئی تھی اور پھر اس وقت ایسی بات کہی جس نے اُسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ خوشی ہو یا اذیت اُسے برداشت کرنے کی صلاحیت انسان کے اندر ہوتی ہے۔ میری ذات میں ہیں تیرے لئے۔۔۔ اُس کی یہ بات بڑی ٹھنکی تھی اس کے پیچھے یا تو بہت گہری سوچ تھی یا پھر محض تجربہ و زندگی کی لڑکی اس قدر گہری بات نہیں کہہ سکتی تھی۔۔۔ خیر یہ بحث تو الگ رہی کہ وہ بات گہری تھی یا نہیں مگر یہ بات ہے کہ وہ کیا سوچ کر دوبارہ یہ بات کہنے کے لئے اُس کے پاس آئی تھی؟ یہی وہ سوال تھا جس کی وجہ سے وہ نرس اُس کے لئے معمر بن گئی تھی۔ اُس کی کچھ میں نرس کا رویہ نہیں آ رہا تھا۔ کیا وہ اُسے کوئی خاص پیغام دینا چاہتی تھی یا پھر؟۔۔۔ اتنا سوچ کر وہ منتشر ہو کر رہ جاتا اُسے کچھ کچھ نہیں آتی تھی کہ یہ کیا تھا۔

اس رات بھی یہی اُس کے دماغ میں چلنے لگا۔ درد کی شدت کا احساس تو کم ہو گیا لیکن وہی الجھن بڑھتی چلی گئی۔ وہ کون تھی، کیا کہنا چاہتی تھی۔ ایسا اُس نے کیوں کیا تھا؟ سوال ذرا سوال تھے جن کا جواب فقط اُس نرس کے پاس ہی تھا۔ اُسے یاد تھا کہ جب وہ احاطہ عدالت سے باہر نکلا تھا تو اس نے نرس سے ملنے کی خواہش کی تھی شاید لاشعوری طور پر ہی الجھن اُس سے ملنے کے لئے آمادہ کر رہی تھی۔ تو کیا اُسے اُس نرس سے ملنا چاہئے؟ جیسے ہی اُس نے خود سے یہ سوال کیا تو خود ہی چونک گیا۔ کلی سوال پھر اُس کے سامنے در آئے۔ جن کا جواب اس وقت اُس کے پاس نہیں تھا۔ تم اُس سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟ یہی سوال ایک بہت بڑی رکاوٹ بن کر اُس کے سامنے آن پھرا۔ وہ ایک لڑکی ہے۔ فقط ایک لڑکی کو ملنا تو اُس کے شان شایان نہیں ہے۔ اُس کا ایک عظیم مقصد ہے اور اس مقصد کے حصول کے لئے وہ اپنی جان ہاتھ پر رکھے سرگرداں ہے۔ اُس نے جو حوصلہ مند باتیں کہیں تھیں، اندر سے کہیں آواز آئی تو وہ چونک گیا۔ پھر اس کے جواب میں جو اُس نے دیکھ لیا وہ یہی تھی کہ ایسی حوصلہ مند باتیں تو اُس نے بہت سنی ہیں۔ اگر اس میں حوصلہ اور جرأت نہ ہوتی تو اب تک مر گیا ہوتا۔۔۔ تو پھر تم نے اُسے اپنے ذہن میں کیوں بٹھایا ہوا ہے۔ کیوں معمر بنی ہوئی ہے تمہارے لئے؟ اندر سے کہیں سختی کے ساتھ کہا گیا تو وہ بڑی طرح چونک گیا۔ تو کیا مجھے اُسے بھلا دینا چاہئے؟ اُس نے خود سے ہی سوال کیا تو جواب ملا کہ ہاں بھلا دینا ہی بہتر ہے۔ وہ ایک عورت ہے اور اس عورت کی حیثیت ہی کیا ہے تمہارے سامنے؟ تم عظیم مقصد کے لئے ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ معمولی عورت تمہارا راستہ کھونٹ کر سے بچ جاؤ اس سے کہ شیطان کے جال بڑے سنہری ہوتے ہیں۔ اُس نے اپنے اندر

سے یہ حبیبتی تو اُسے احساس ہوا کہ اُسے نرس سے نہیں ملنا چاہئے۔ یہ سوچ کر اُسے قدرے اطمینان ہوا۔ میڈیسن کے زیر اثر درد تو تقریباً ختم ہو چکا تھا اُسے سکون ہوا تو پھر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

☆☆☆

ہمایوں اس گریڈ کالج کے سامنے کھڑا تھا جس میں صفیہ پڑھتی تھی۔ گیٹ میں سے لڑکیاں باہر آ رہی تھیں۔ وہ ہانپک پر بیٹھا اُن آنے والی لڑکیوں میں سے صفیہ کا منتظر تھا۔ وہ سوچ چکا تھا کہ آج اُس سے حتمی بات کرے گا۔ اُس کا خیال تھا کہ جو نبی وہ اُسے دکھائی دے گی وہ اُسے لے کر کسی قریبی ریسٹوران میں جا بیٹھے گا اور پوری طرح اُس سے بات کرے گا تاکہ جو منظر بھی ہو واضح ہو جائے۔ اُس کا دل کہتا تھا کہ صفیہ اُس کی بات ضرور سنے گی اور اسی کے حق میں اپنا فیصلہ دے گی۔ یہ اگر ہو جاتا تو ہمایوں نے یہ نشان لی تھی کہ وہ پوری دنیا سے نکل جائے گا لیکن صفیہ کو کسی طور پر ایسا نہیں ہونے دے گا۔ اُسے معلوم تھا کہ تھوڑے فاصلے پر ڈرائیور گاڑی لئے صفیہ کا منتظر ہے۔ ممکن ہے آج وہ اُس کے ساتھ نہ جائے لیکن اُسے یہ باور تو ہو جائے گا کہ ہمایوں اُس کی راہ میں کھڑا ہے۔ وہ کوئی نہ کوئی صل نکال لے گی۔ اُس کا ذہن ایسی ہی سوچیں سوچتا چلا جا رہا تھا جبکہ اُس کی نگاہیں گیٹ پر لگی ہوئیں تھیں۔ ذرا سے فاصلے پر ڈرائیور گاڑی لے کر آیا ہوا تھا اُس کے پاس چند لمحے تھے جس میں اُس نے صفیہ سے بات کرنا تھی۔ اگر وہ اُسے دیکھے بغیر گاڑی تک پہنچی تو اگلے دن پھر آنا پڑے گا۔ وہ چاہے ایک گلاہ ہی اُسے دیکھ لے اتنا ہی کافی تھا۔ وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اُسے صفیہ کا چہرہ دکھائی دیا۔ ہمایوں کا دل دھڑک اٹھا اُس کی محبت اُس کے سامنے تھی۔

دو گیٹ سے نکلی تو لڑکیوں کے جلو میں تھی۔ وہ ایک طرح کا گروپ تھا جو فیشن اور ماڈرن بننے کی ذہن میں منفرد دکھائی دیتا تھا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی انسان اپنے خیالوں اور سوچوں میں اتنا پختہ نہیں ہوتا لیکن اگر اُسے ہم خیال لوگوں کی محفل میں آ جائے تو وہی کپے خیال پختہ ہو جاتے ہیں۔ صفیہ کا گروپ بھی ایسی ہی لڑکیوں کا تھا جو دولت کی نمود و نمائش میں ایک دوسرے سے بڑھ کر تھیں۔ ظاہر ہے دوسرے معاملات میں بھی اُن کے خیال "اُوٹپے" تھے۔ اپنی پوزیشن ثابت کرنے کے لیے وہ زور بھی لگاتی تھیں۔ اس سارے گروپ کو دیکھ کر ایک بار تو ہمایوں بے حوصلہ سا ہو گیا تھا شاید وہ اس کی تکلف سے بہت ڈر کی "چیزیں" تھیں لیکن اگلے ہی لمحے اُسے خود پر اتماد محسوس ہوا۔ کچھ بھی ہو صفیہ نہ صرف اُس کی منتظر ہے بلکہ اُس کی کزن بھی تو ہے۔ اسی اتماد کے سہارے وہ آگے بڑھا۔ اس وقت تک صفیہ اپنے گروپ سے الگ ہو کر کار کی جانب بڑھ رہی تھی اور یہی وہ لمحہ تھا جس کا ہمایوں کو انتظار تھا۔ وہ تھیر کی مانند اس تک پہنچا ہانپک کو اس کے قریب بریک لگانے ہوئے جھٹکا تو صفیہ نے چمک کر اُس کی طرف دیکھا اور حیرت سے ڈک گئی۔

"کیسی ہو صفیہ۔۔۔؟"

اُس نے حیرتی سے پوچھا تو صفیہ نے تیوریوں پر ہل ڈالتے ہوئے کہا۔

"میں تو نمیک ہوں مگر تم یہاں کیا کر رہے ہو۔۔۔؟"

"میں۔۔۔ میں تمہارے لیے یہاں آیا ہوں مجھے تم سے ایک بات کرنی ہے۔" ہمایوں نے حیرتی سے کہا۔

”بات کرنی ہے۔۔۔ مجھ سے۔۔۔؟“ وہ حیرت سے بولی۔

”ہاں بہت ضروری ہے۔ تم۔۔۔ ابھی میرے ساتھ چلو یا پھر۔۔۔“

اُس نے کہاں چاہا تو صفیہ کا چہرہ ایک دم سے سرخ ہو گیا وہ دانت پیستے ہوئے بولی۔

”کیا کچھ اس کر رہے ہو تم۔۔۔ تم ہوش میں تو ہو؟“

اس کے یوں کہنے پر ہمایوں اُس کی جانب ہونٹوں کی طرح دیکھنے لگا۔ اُسے یہ احساس ہی نہیں رہا تھا کہ وہ کالج کے گیٹ کے سامنے

صفیہ کو روکے کھڑا تھا۔

”صفیہ! یہ تم کیا بات کر رہی ہو میں ہمایوں۔۔۔“

اُس نے بے ساختہ کہاں چاہا مگر صفیہ نے بات کاٹ کر کہا۔

”تم کوئی بھی ہو مجھے تم جیسے لفظوں سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ میرا رشتہ چھوڑو اور دفع ہو جاؤ ورنہ۔۔۔“

ہمایوں شدت حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ورنہ۔۔۔ کیا مطلب۔۔۔؟“

لفظ ابھی اُس کے منہ ہی میں تھے کہ صفیہ کا ہاتھ اٹھا اور ایک زنائے سے تھپڑ ہمایوں کی گال پر مار دیا اور انتہائی غصے میں بولی۔

”یہ ہے مطلب۔۔۔ اس سے پہلے کہ تمہاری ہڈی پہلی ایک کروادوں دفع ہو جاؤ یہاں سے اور دوبارہ کبھی میرے راستے میں آنے کی

ہمت نہیں کرنا۔“

صفیہ انتہائی غضب سے آگ اُگل رہی تھی۔ اس کا چہرہ سرخ اور آنکھیں غصے میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اُس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ہمایوں

کو وہ ہیں قتل کر دے لیکن وہ اتنا کچھ ہی کر سکی تھی جبکہ ہمایوں پر تو جیسے حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ گئے تھے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کے ساتھ یہ

ذلت بھرا سلوک بھی ہو سکتا ہے۔ وہ حیرت کی انتہاؤں پر تھا اُس کی نگاہیں صفیہ کی شیطاں گفتی ہوئی آنکھوں پر لگی ہوئیں تھیں جن سے نفرت اُبل رہی

تھی۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہا رہا تھا لیکن ایک لفظ ہی اُس کے منہ سے نہ نکل سکا۔ ”تھپڑ کی آواز کے ساتھ ہی لوگ ان کی جانب سنجھ ہو گئے تھے۔ صفیہ

چند لمبے نفرت سے ہمایوں کو دیکھتی رہی اور پھر گھوم کر آگے بڑھ گئی۔ ہمایوں حیرت سے ساکت ہوا وہ اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا تھا۔ وہ کار میں بیٹھ کر

ڈرائیور کو پھیلے کا کہہ چکی تھی ’کار آگے بڑھی تو کسی نے ہمایوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”میاں! اب جائیے بہت ہو گئی۔“

”آب دوبارہ یوں لڑکیوں کے کالج مت آنا۔“

ایک اور آواز اُس کے کانوں میں ٹھنڈی طرح لگی تو اُس نے اپنے آپ کو سمیٹا اور پھر پوری قوت سے کار کا پیچھا کرنے کا سوچا لیکن وہ کچھ

بھی نہ کر سکا۔ اُسے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ خواب دیکھ رہا ہے اور یہ سارے واقعات کسی خواب ہی کا حصہ ہوں لیکن گال پر پڑنے والے تھپڑ کی

حدت اُسے حقیقت کا احساس دلارہی تھی اُس کا دماغ گھوم کر رہ گیا تھا۔۔۔

اُسے پتہ ہی نہیں چلا کہ وہ کب اپنے گھر تک پہنچا۔ اُس نے ہائیک کھڑی کی اور سیدھا اپنے کمرے کی جانب چلا گیا۔ وہ اپنے بستر پر بیٹھا اور سوچنے لگا کہ آخر اُس کے ساتھ یہ ہو کیا گیا ہے ایسا تو اُس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ صفیہ! سنے لوگوں کے درمیان اُسے یوں ذلیل کر دے گی۔ بے اختیار لاشعوری طور پر اُس کا ہاتھ اپنے گال پر چلا گیا۔ اس تھپڑ کی آواز اب تک اُس کے ذہن میں گونج رہی تھی جیسے کوئی شے ساکت ہو جائے۔

”کیا صفیہ مجھ سے اتنی نفرت کرتی ہے کہ۔۔۔“

اُس کے اندر سے آواز ابھری جسے اُس نے خود ہی دبا دیا لیکن فوراً بعد ہی اُس کے دماغ نے کہا۔

”وہ تم سے نہیں تمہاری غربت سے نفرت کرتی ہے۔ تم اُس کے قابل ہو ہی نہیں ورنہ وہ اپنا رویہ تو کم از کم اچھا رکھتی۔ کوئی بہانہ بنا دیتی اس طرح تمہیں ذلیل تو نہ کرتی۔۔۔۔“

شرمندگی کے احساس سے وہ گڑا جا رہا تھا زمین پھٹی نہیں ورنہ وہ اس میں سما جاتا۔ اُسے لوگوں کی نظروں میں ملنے، حقارت اور مذاق کی پروا نہیں تھی اُس کی لگا ہوں کے سامنے تو صفیہ کی آنکھیں ساکت ہو گئی تھیں جن میں حد درجہ نفرت اور حقارت کے ساتھ شدید طعنے تھا۔

”اس نے کسی بھی خوبی رشتے کی پروا نہیں کی۔۔۔؟“ اُس نے اجماعاً گئی سے سوچا۔

”خونی رشتہ!۔۔۔ ترس آ رہا ہے تم پر اور تمہاری اُمید پر۔ ذنیبا بدل گئی اس کے معیار بدل گئے اور تم ابھی تک رشتے ناتوں کے جال میں پھنسے ہوئے ہو۔ موت مل گیا ہے نا تمہیں!۔۔۔ اس طرح تو کوئی اجنبی بھی تمہارے ساتھ نہ کرے جس طرح اُس نے کیا۔“ دماغ نے پھر اُسے سمجھایا۔ تو اُس کا غصہ کن ٹیوں پر ٹھوکریں مارنے لگا۔

”سین اے۔۔۔“

”کیا کر لو گے تم؟۔۔۔ جس طرح تم وہاں کچھ نہیں کر سکتے آئندہ بھی اُس کا کچھ نہیں بگاڑ پاؤ گے۔ تمہاری حیثیت کیا ہے تم جس رشتے کے زعم میں اس سے بات کرنے گئے تھے اس پر صفیہ نے لکیر پھیر دی ہے۔ اب کیا تعلق ہے تمہارا اُس سے۔۔۔؟“

”کچھ بھی ہے وہ میری بے اور میں اُسے حاصل کر کے رہوں گا۔“

”اگر تمہیں ذلیل ہونے کا شوق ہے تو کرو کوشش ورنہ چانس کوئی نہیں ہے اتنی دولت کے بعد تو شخص خودکشی کی جا سکتی ہے۔“

”کیا کروں میں پھر کیا کروں۔“

اُس نے اپنے ہال لوچے ہوئے کہا۔ پھر بے بس سا ہو کر اپنے بستر پر ڈھ گیا۔ وہ اپنے آپ کو ذنیبا کا بے بس ترین آدمی تصور کر رہا تھا۔

☆☆

اس دوپہر جب صفیہ گھر میں داخل ہوئی تو زینون بی بی کو تھوڑا بدلی ہوئی محسوس ہوئی اُس کا چہرہ غصے سے بگڑا ہوا تھا۔ زینون بی بی آخر ماں تھی ایک لمبے میں پہچان گئی کہ آج کوئی غیر معمولی بات ہوئی ہے جس کی بنا پر صفیہ کا چہرہ تباہ ہوا ہے۔۔۔ صفیہ نے آتے ہی کتابوں والا بیگ ایک جانب پھینکا اور چپ چاپ صوفے میں جھنس گئی۔ اُس نے اپنے سر کو یوں پکڑ لیا تھا جیسے وہ خود اپنے غصے کو کنٹرول کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

”کیا بات ہے بیٹی! طبیعت خراب ہے کیا۔۔۔؟“

زینون بی بی نے بڑے پیار سے پوچھا تو صفیہ گویا پھٹ پڑی۔

”طبیعت نہیں قسمت خراب ہے میری۔۔۔“

”اللہ نہ کرے بیٹی! یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔۔۔“ وہ قدرے خوف زدہ انداز میں بولی۔ ”ہوا کیا ہے۔۔۔؟“

”آج۔۔۔ بلکہ ابھی کچھ دیر پہلے میں اس شخص کے ہاتھوں ذلیل ہوئی ہوں جسے آپ لوگ اپنا خون کھتی ہیں۔ ایسا تو کوئی اجنبی بھی نہیں

کرتا۔۔۔“ اُس نے اچھائی قصے میں کہا۔

”ہوا کیا ہے کچھ ہوگی بھی۔۔۔؟“ وہ گہری تشویش سے بولی۔

”وہ۔۔۔ وہ لنگھا گیا آج کالج کے سامنے میرا راتہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ سب لوگ دیکھ رہے تھے اور وہ۔۔۔“ اُس نے روہانسو

ہوتے ہوئے کہا۔

”بیٹی! تمہیں غلط فہمی ہوئی ہوگی وہ تم سے کوئی بات۔۔۔“

”اما! آپ پھر اسی شخص کی طرف داری کر رہی ہیں جس سے میں شدید نفرت کرتی ہوں۔ آپ اس کے بارے میں وضاحت کر رہی ہیں

مجھ پر یقین نہیں ہے میں غلط کہہ رہی ہوں تو ذرا ثبور سے پوچھ لیں پھر تو آپ کو یقین آجائے گا یا پھر اس دن یقین آئے گا اس دن آپ کی آنکھیں

کھلیں گی جب سچ چورا ہے پر۔۔۔“ صفیہ بے اختیار کہتے کہتے اپنی بات کا ادراک کرتے ہوئے خاموش ہو گئی۔

”تم فکر نہیں کرو میں اسے سمجھا دوں گی۔ وہ۔۔۔“

زینون بی بی نے کہا جاہلیان وہ قصے میں بولی۔

”آپ کیا سمجھائیں گے اسے میں بس پاپا کا انتظار کر رہی ہوں۔ وہ آجائیں تو میں ان سے کہہ کر اس غیبت کا داغ لھکانے لگوں

کی۔ میں۔۔۔“

”خبردار اپنے پاپ سے کچھ مت کہا۔“ زینون بی بی اچانک تیزی سے بولی۔ ”پہلی بات تو یہ ہے کہ ہاویں نے کوئی ایسی اوجھی حرکت

نہیں کی ہوگی۔ مان لیا کہ اُس نے بد تمیزی کی بھی ہے تو کیا تم اس آگ کو حرید بھڑکانا چاہتی ہو؟ تمہاری یہ نفرت دو بھائیوں کے درمیان خون خرابہ

کرائے گی۔۔۔“

”آپ کو یقین نہیں آئے گا لیکن اس غیبت کا ذہن گندا ہے۔ کیا میں گئی تھی اُس کے پاس کہ وہ مجھ سے بد تمیزی کرے؟۔۔۔ آپ مان

لیں کہ وہ سچے لوگ ہیں اور اوجھی حرکتیں کرتے ہیں۔ اس کا خمیازہ انہیں بھگتنا ہی پڑے گا اور یہ کیا کہہ دیا آپ نے کہ میں آگ بھڑکاری ہوں میں

خون خرابہ کراؤں گی۔ وہ جو میرے راستے میں۔۔۔“

”کیا کہہ دیا ہے اُس نے یہی تا کہ اُس نے تم سے کوئی بات کرنا چاہی ہوگی۔ تمہیں انہی کو کرنے کی کوشش تو نہیں کی؟“ زینون بی بی بھی

فصے میں آگئی۔

”ماما! آپ۔۔۔“

صفیہ حیرت زدہ رہ گئی تو وہ قدرے قہر سے سمجھاتے ہوئے بولی۔

”دیکھو تمہارے نزدیک چاہے یہ کھیل تماشا ہی ہو۔ تم اس سے نفرت کرتی ہو اور اس کی بد تمیزی پر اُسے سنی بھی سکھانا چاہتی ہو لیکن یہ

کیوں بھولتی ہو کہ تم ایک لڑکی ہو۔۔۔“

”وہ جو مرضی چاہے۔۔۔“

”خاموش۔۔۔“ زینون بی بی نے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے دھیرے سے کہا، پھر اُس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے بولی۔ ”تو اپنے

باپ سے کہے گی بھائی سے کہے گی۔ وہ غیرت میں آ کر کچھ بھی ہمایوں کے خلاف کریں گے۔ بات تو اڑے گی نانا پھر افسانے بننے سے کوئی روک سکے گا تم روک پاؤ گی؟۔۔۔ کچھ ہوش کی دوا کرو لڑکی! زینون بی بی نے اُسے سمجھایا۔

”ماما! مجھے یہ کچھ نہیں آ رہی کہ آپ اُس کی وکالت کیوں کر رہی ہیں۔ کل اگر اُس کی یہ صحت پڑ گئی کہ مجھے انخواہ کر لے تو۔۔۔“

”تم جو باپ بیٹی ہو، نانا تمہارے دماغ میں جو دولت کا خناس ہے یہ تم دونوں کو کہیں کا نہیں چھوڑے گا۔ خون تو سپرد ہو ہی گئے ہیں اب خون

خرابہ بھی کروا کے چھوڑو گی۔۔۔ جاؤ لڑو مرو۔ دنیا کو فخر سے بتانا کہ تمہیں تمہارے کزن نے نرہ املا کہا ہے۔“ زینون بی بی رو مانسو ہوتے ہوئے بولی۔

”ماما! آپ بخشنے دماغ سے سوچیں۔ آج اُس کی یہ صحت پڑی ہے تو کل اُس کا حوصلہ بڑھے گا پھر اگر پاپا کو معلوم ہوا تو کیا بتائیں گے

کہ ہم نے انہیں کیوں انکار نہیں کیا تھا؟“ صفیہ قدرے ڈھکی پڑتے ہوئے بولی۔

”تم جانو اور تمہارا باپ نہیں آج کے بعد تمہارے کسی بھی معاملے میں نہیں آنے والی۔۔۔ تم آپ بھنکار ہو گئی ہو اپنے معاملات خود حل

کر سکتی ہو۔“

ریشمی خطرہ

مسعود جاوید کے باصلاحیت قلم کی تحریر۔ جرم و مزاح اور جاسوسی و سراغ رسانی پر ایک منفرد تحریر۔ ایک ذہین قائل اور

خوبصورت خاتون (پرائیوٹ) سراغ رساں کا دلچسپ قصہ، ایک مجرم اس پر فریفتہ ہو گیا تھا۔ ان کی ممکنہ شادی کی شرط بھی عجیب و غریب تھی۔

ایک نہایت دلچسپ سنسنی خیز ناول۔ سراغ رساں کے نام کی مناسبت سے ایک خاص ترتیب سے کون قتل کر رہا تھا؟ جاننے کے لیے

پڑھیے۔۔۔ ریشمی خطرہ۔۔۔ جو کتاب گھر کے جاسوسی ناول سیکشن میں دستیاب ہے۔

”ماما! آپ میری بات کو غلط سمجھ رہی ہیں میں تو بس اتنا چاہتی ہوں کہ آئندہ وہ ایسی کوئی حرکت نہ کرے۔“ منیہ نے تیزی سے کہا اس کے لہجے میں احتجاج تھا۔

”تو کیا میں یہ نہیں کر سکتی میں نہیں روک سکتی۔ ایک کام اگر سہولت سے ہو جائے تو اسے مشکل ضروری کرنا ہے۔ کیا تم چاہتی ہو کہ لوگ تمہارے بارے میں افسانے بناتے پھریں؟“ زینون بی بی نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے ماما! میں ابھی پایا سے کچھ نہیں کہوں گی لیکن آئندہ اُسے مجھ سے بات کرنے کی ہمت نہیں ہونی چاہئے۔“ منیہ یہ کہتے ہوئے اٹھ گئی تو زینون بی بی اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ وہ جب چلی گئی تو زینون بی بی سوچنے لگی کہ وہ کس سے بات کرے۔ انور علی سے زینب سے یا پھر ہمایوں سے؟ — بات تو اُسے کرتا ہی ورنہ ممکن ہے معاملہ بند نہ جاتا۔ ابھی تک اُسے پوری بات کا خود بھی پتہ نہیں تھا۔ ایک جانب اگر اس کی بیٹی تھی تو ہمایوں بھی تو اس کا کچھ لگتا تھا — وہ سوچنے لگی کہ وہ کس سے بات کرے؟

☆ ☆

تبدیلی چاہے حالات میں ہو یا انسانی رویے میں ایک فطری عمل ہے۔ انسان جب بھی اور کسی بھی حالات میں کوئی عمل کرتا ہے اس میں کبھی بہت جذباتی ہوتا ہے اور کبھی یہی جذبات بہت ٹھنڈے ہوتے ہیں۔ جذبات کی گرمی سردی ہو یا پھر مسلسل عمل کی محنتوں کی حالت کے بدلنے ہوئے اطواروں یا پھر وسائل کی کمی بیشی تبدیلی ناگزیر ہوتی ہے۔ یہی تبدیلی انسان کو یکسانیت کا شکار نہیں ہونے دیتی —

چند ان دنوں یکسانیت کا شکار ہو چکا تھا۔ ایک ہی گھر میں سارا دن بڑے رہتا۔ کھالیا بی بی اور سو گیا یا پھر بی بی پر لگا ہیں جہاں بیٹھے رہتا جس سے وہ اکتا گیا تھا۔ اُسے کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کب تک زبردست رہنے کا حکم رہے گا۔ وہ باہر کھلی فضاؤں میں رہنا چاہتا تھا اس کمرے میں تو اس کا دم گھٹتا تھا۔ اس کے ساتھیوں نے جو بھی کیا تھا تو فی تھا یا غیر قانونی اُسے پولیس سے تو آزاد کروا دیا تھا لیکن ایک ہی گھر کے اندر تک محدود رہنے کی مصیبت میں ڈال دیا تھا۔ اگرچہ وہ اس تہائی سے اکتا گیا تھا لیکن اس تہائی نے اُسے ایک قاعدہ بھی پہنچایا تھا کہ وہ اب تک کی ساری جمع تفریق کر چکا تھا جس کا حاصل کچھ بھی نہیں آیا تھا۔

اُسے اچھی طرح یاد تھا کہ جب وہ کالج کے ابتدائی دنوں میں تھا انہی دنوں ایک طلبہ عظیم کے چند لوگ اُس سے بہت ملنے تلے تھے وہ اُس کی باقاعدہ دعوت کرتے اور اپنے مخصوص انداز میں مذاہمی باتیں کیا کرتے تھے۔ دیر دیر سے وہ بھی اُن کا ہم خیال ہو گیا یہاں تک کہ جب وہ سال دوم میں آیا تو وہ بھی انہی کی طرح لوگوں کو اپنا بیخام سنا سنا ہوا دکھائی دینے لگا۔ یہی اُس کی ابتدا تھی لیکن شاید ابھی اُس کی یہ ابتدا نہیں تھی۔ ابھی وہ اپنے والدین کے ساتھ رہتا تھا۔ اُس کے والد کو چند کی سرگرمیوں کے بارے میں جب تھوڑا بہت علم ہوا تو اُس نے بہت جلد سے اپنے بیٹے کو سمجھایا۔ اُس کے تئیں وہ اپنے بیٹے کو اچھی طرح سمجھا چکا تھا لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ پورے دن میں ایک دو گھنٹے اپنے باپ کے ساتھ گزارنے والا چند باقی ڈیڑھ سارا وقت اپنے ان دوستوں میں گزارتا جو اُس کے تھکی ساتھی تھے۔ گرم خون اور مذاہمی خیالات ان دونوں نے مل کر اُسے ایسی راہ پر ڈال دیا کہ ایک دن وہ اپنے گھر کو خیر آباد کہہ کر اپنے نفسی ساتھیوں میں آ گیا جہاں سے اُس کی نئی زندگی کا آغاز ہوا۔ اُسے باقاعدہ تربیت دی گئی اور ان ساری

عشق کا ہے عشق بتا

رکاوٹوں سے بچنے کے لیے جو ان کے مقصد کی راہ میں حائل ہوتی تھیں، تحریر و تقریر سے لے کر اسلحہ چلانا تک اُسے سکھا یا تھا۔ اب وہ ایک پختہ تنظیمی ساتھی تھا جس نے بہت ساری کارروائیاں کی تھیں اور ان دنوں وہ سارے ساتھی زیر زمین تھے۔

جنید کو یہ اچھی طرح احساس تھا کہ ان کی تنظیم ایک سیاسی جماعت کی ذیلی تنظیم ہے اور بہت سارے معاملات میں سیاسی حالات بہت اہم ہوتے ہیں۔ ان کی سیاسی جماعت بھی ایک خاص طرح کا انقلاب لانا چاہتی تھی اور وہ اس انقلاب کے لیے اپنی جان تک دینے کا عزم کیے ہوئے تھا لیکن کبھی کبھی جب اُسے اپنے والدین بہن بھائی یاد آتے تو اُس کا جی بھر آتا۔ وہ سوچتا کاش وہ بھی ایک عام سی زندگی گزار رہا ہوتا لیکن پھر اگلے ہی لمحے یہ خیال آ جاتا کہ وہ عام سی زندگی کے لیے بنایا نہیں ہے بلکہ وہ ان خاص لوگوں میں شامل ہے جو قوموں کی تقدیر بدل دیا کرتے ہیں۔ اسی ذمہ میں جانے اُس نے کتنے زخم کھائے تھے اور ایک سخت قسم کی زندگی گزارنے پر مجبور تھا۔

اس رات ہالیوں کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا جب ڈیٹان اُس کے پاس آ گیا۔ وہ بھی اُس کی طرح کسی جگہ پر تھا، تنہائی سے اُستنا یا تو اُس کے پاس آ گیا تا کہ یہ یاد ترین دن کچھ تو خوشگوار گزریں۔ ڈیٹان اُس کا سینئر تنظیمی ساتھی تھا جس کے ساتھ وہ اُن محروکوں میں شریک ہو چکا تھا جن میں اُس نے موت کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ وہ صوفے پر پھیل کر بیٹھ گیا تو ہالیوں نے اُس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

”اچھا ہو گیا یا رتم آگے ہو اور منس تو یہاں سے بھاگنے والا تھا۔“ ہالیوں نے خوشی بھرے لہجے میں کہا۔

”کیوں بھاگنا کیوں چاہتے تھے؟“ ڈیٹان نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

”اُستنا گیا ہوں یا رتمبائی سے۔“ اُس نے عام سے لہجے میں کہا۔

”اوہ۔۔۔ منس سمجھا کہیں تم میری طرح اپنے ہی خیالوں سے تنگ آ گئے ہو۔“ ڈیٹان کے لہجے میں اچھا خاصا ڈکھلا ہوا تھا جیسے وہ بہت کچھ کہنا چاہ رہا ہو لیکن ضبط کر رہا ہو۔

”خیالوں سے تنگ۔۔۔ منس سمجھا نہیں؟“ جنید نے واقفانہ کھنکھتے ہوئے پوچھا۔

”تم ایسے کرو تیار ہو جاؤ ہم آج کلکں باہر سے کانا کھائیں گے شہر سے دور کہیں دیرانے میں تھوڑا وقت گزاریں گے۔“ اُس نے انتہائی اُکتائے ہوئے انداز میں کہا۔

”اوپر اُخیریت تو ہے نا کیسی باتیں کر رہے ہو تم۔“ جنید نے اُس کی جانب غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”بہت ساری باتیں ہیں کرنے کی۔۔۔ تم سے جو کہا ہے وہ کرو اور اگر تمہارا دل نہیں چاہتا تو صاف بتا دو۔ منس کسی اور کے پاس چلا جاتا ہوں۔“

وہ تھی سے بولا تو جنید کو معاملہ خاصا گھمبیر لگا اس لیے بچتے ہوئے بولا۔

”منس کون سا اٹکار کر رہا ہوں۔۔۔ چلاؤ تم فریج میں سے اپنی پسند کا کوئی مشروب لےو اور منس نہا کر آتا ہوں پھر چلتے ہیں۔۔۔ اب خوش؟“ اُس کے لہجے میں معاصرانہ انداز تھا۔

”چلو یار—!“

ذیشان نے کہا اور فریج کی جانب بڑھ گیا۔

تقریباً دو گھنٹے کے بعد وہ ذیشان کی لائے ہوئی کار میں اس کے ساتھ بیٹھا تو ذیشان نے خوشدلی سے کار بڑھا دی جب جنید نے پوچھا۔

”ایک بات سچی بتانا یار تمہیں آج ہو کیا گیا ہے خاصے بدلے بدلے دکھائی دے رہے ہو؟“

”میں آج تم سے جی باتیں ہی کرنے آیا ہوں۔ میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ یہ سب تم سے کہہ دوں گا تو میرے من کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا

مگر اپنے آپ کو بھی مطمئن کرنا چاہتا ہوں۔ تمہارا یہ سوال بنتا ہے کہ آخر میں ہی کیوں؟ تو سنو۔ میں نے اپنے سارے لوگوں پر لگاؤ دوڑائی اُن

میں تم ہی جیسے معقول بندے دکھائی دیئے ہو جس سے بات کروں مشورہ کروں۔ اپنے آپ کو جانچ سکوں کہ میں غلط ہوں یا صحیح۔؟“

ذیشان تو جیسے پھٹ پڑا اور ہائیوں کو لگا جیسے ذیشان ذہنی طور پر بہت ہی زیادہ مستحضر ہے۔ وہ اس کی کیفیت کو کبھی طرح سمجھتا تھا۔ ایسی

کیفیت کبھی کبھی اُس پر بھی طاری ہو جایا کرتی تھی لیکن ایسا اس وقت ہوتا جب وہ کسی طرح سے بھی ذہنی انتشار کا شکار ہوتا۔ جنید کو احساس ہو گیا کہ

ذیشان کے اندر بہت ساری باتیں ایسی ہیں جنہیں وہ کہہ دینا چاہتا ہے وہ باتیں اُسے سن لیتا چاہئیں۔۔۔ اُس نے بہت طامعیت سے کہا۔

”میں تمہاری ساری باتیں سنوں گا اور جہاں تک ہو گا تمہیں بہترین مشورہ دوں گا۔“

”جنید—!“ ذیشان نے چند لمحے بعد کہا اور لوٹھرتے کے بعد بولا۔ ”ہماری زندگی کیا ہے یار کبھی تم نے سوچا کہ عام انسانوں سے

بہت گریہوں زندگی بسر کر رہے ہیں جیسے ہم کسی جنگل کے باسی ہوں۔ چھتے پھرتے ہیں گھات لگاتے ہیں شکار کرتے ہیں اور ہر لمحہ شکار ہوجانے کا

ڈر لگا رہتا ہے۔“ اس کے لہجے میں خوف سے زیادہ اکتاہٹ تھی۔

”تمہیں یہ خیال کیوں آیا۔۔۔؟“ اُس نے دیرے سے پوچھا۔

”خیال؟— یہ محض خیال نہیں ہے یار ایک ایسی سچ حقیقت ہے جس میں ہم زندہ ہیں۔“ وہ جلی سے بولا۔

”تم صرف ڈیٹریشن کا شکار ہو رہے ہو۔ یقیناً یکساہت اور تمہائی نے۔“

”تم یہ کتابی باتیں کر کے میرا دماغ مت خراب کر دوہ بات کرو جو حقیقت ہے۔ زندگی سچ اور سچی حقیقت۔ مجھے لگتا ہے تم سوچتے سمجھتے

کی صلاحیت کھو بیٹھے ہو۔ تمہاری آنکھوں پر بھی بٹی بندھی ہے اور تم کو لہو کے تیل کی مانند ایک دائرے میں گھومتے چلے جا رہے ہو یا پھر کسی سدھانے

ہوئے جانور کی طرح وہی کرتے ہو جو حکم ملتا ہے۔“

”میں اب تک نہیں سمجھ پایا ذیشان! کس آخر تم کہا کیا چاہتے ہو؟ تم پورے اعتماد کے ساتھ میرے ساتھ بات کر سکتے ہو۔“ جنید نے

کہا تو اس وقت تک وہ ایک بہترین ہونٹل کے سامنے پہنچی کچے تھے۔

”اندر بیٹھ کر سہولت سے بات کرتے ہیں۔“

ذیشان نے کہا اور گاڈی پارکنگ کی جانب موڑ دی۔

وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے کھانے کا آرڈر دے چکے تھے اور جنید اس انتظار میں تھا کہ وہ کوئی بات پھینے دے جبکہ ڈیٹان سوچ رہا تھا کہ بات کا آغاز کہاں سے کرے؟ پھر اسی نے خاموشی توڑی اور بولا۔

”تم اور میں بھی جانتے ہیں نا کہ ہم ایک اعلیٰ ترین مقصد کے لیے کام کرتے ہیں۔ ہماری دوستی اور دشمنی اللہ کے لیے ہی ہے لیکن کیا حقیقت میں ایسا ہی ہے؟“

اس کے یوں کہنے پر جنید چونک گیا۔ وہ بہت ہی اہم معاملے پر بات کرنے جا رہا تھا۔

”تم کیا سوچتے ہو۔۔۔؟“ ہمایوں نے پوچھا۔

”میرے سوچنے یا نہ سوچنے سے حقیقت تبدیل نہیں ہوگی، میرے دوست! تم نے کبھی غور کیا ہے کہ ہم کیا کر رہے ہیں؟“

”دیکھو ہمارا مقصد بہت ہی اعلیٰ وارفع ہے۔ اللہ کی زمین پر اللہ کا نظام نافذ کرنا ہماری ذمہ داری ہے اور ہم اس کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔۔۔“ جنید نے اسے مقصد یاد دلایا۔

”تمہارا کہنا بالکل درست ہے ایسا ہی ہونا چاہئے۔ اس سے کوئی بھی مسلمان انکار نہیں کر سکتا اور نہ کرنا چاہئے اور دوسری بات کہ کوئی بھی مذہب یا عقیم ہو اس کا پیغام اس کی تصورات بہترین اصولوں پر مبنی ہوتی ہیں۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ وہ اپنے ہی پیغام اپنی ہی تعلیمات کے اصولوں پر کاربند رہتے ہیں اگر کاربند رہتے ہیں تو اس کا نتیجہ انسانیت کے حق میں ہوتا ہے۔۔۔ میں سوال کرتا ہوں کہ کیا خدا جنگ چاہتا ہے؟“

”تم مجھے بہت زیادہ منتشر لگتے ہو ڈیٹان! کہیں تم۔۔۔“

”ذروت میں اپنی عقیم کے خلاف نہیں جا رہا لیکن ایک انسان ہونے کے ناتے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت تو رکھتا ہوں نا؟۔۔۔ میرے دماغ میں بھی سوچ آتی ہے۔ میں جو دیکھتا ہوں اس پر مجھے بھی یہ فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے کہ میرے سامنے جو کچھ ہو رہا ہے آیا وہ درست ہے یا غلط؟۔۔۔ مجھے سبق دینے والے مجھ پر حکم چلانے والے اگر خود ہی اپنے حکم سے انحراف کر جائیں تو پھر ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ بولو تم اس پر کیا کہتے ہو؟“

”میں۔۔۔“ جنید نے چونکتے ہوئے کہا۔ ”میں پھر اپنا ہی فیصلہ کروں گا۔“

”یہی میرا حال ہے میں اپنا فیصلہ خود کرنا چاہتا ہوں لیکن امید یہ ہے کہ میں اب اپنا فیصلہ بھی خود نہیں کر پاؤں گا۔ میں نے جب بھی سچ بولا ان کے اعمال پر انکی اٹھائی تو ندرتاً قرار دے دیا جاؤں گا۔ تب دنیا میں جو میرے ساتھ فیصلہ ہونا تھا وہ ہو جائے گا مگر آخرت میں کیا ہوگا۔ مجھے جنت ملے گی یا دوزخی ٹمبرا دیا جاؤں گا؟“

”ڈیٹان! تم تو بہت آگے کی سوچ رہے ہو۔“

”تم یہ مانتے ہو نا کہ میں تم سے بہت پہلے اس عقیم میں ہوں۔“ ڈیٹان نے اس کی سٹی ان سٹی کرتے ہوئے کہا۔ ”بلاشبہ اس کا مقصد نیک ہے لیکن اس کا نتیجہ۔۔۔ میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آ رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے ہی ساتھیوں کا خون رائیگاں گیا اور کیا میرا خون بھی

رائیگاں جائے گا؟“

”میں اب تک نہیں سمجھ پایا کہ ختم کہنا کیا چاہتے ہو۔“ جنید نے زنج ہوتے ہوئے کہا۔

”تم بس سنو اور پھر اس پر غور کرو فیصلہ کرنے کا تمہیں اختیار ہے۔“ یہ کہہ کر وہ لہجہ بھر کر خاموش ہوا اور پھر کہتا چلا گیا۔ ”دین میں جہاد فرض ہے مجھے اس سے قطعاً انکار نہیں اور جہاد کرنا میں فرض ہے۔ غیر مسلم پوری طرح زور لگاتے ہیں کہ مسلم اُمہ سے جہاد نکال دیا جائے مگر یہ ان کا احمق پن ہے۔ وہ قرآنی تعلیمات کو نہیں فتح کر سکتے اور امت مسلمہ کی بقا ہی اس میں ہے کہ وہ جہاد پر کاربند رہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ جب ہم جہاد کے لئے نکلیں تو ہمیں یہ پورا یقین ہو کہ ہم واقعی جہاد کر رہے ہیں لیکن چند لوگوں کے فیصلے پر سب کچھ ختم ہو جاتا ہے کیا اللہ کا قانون بدل جاتا ہے؟“

”یہ کیا کہہ رہے ہو تم۔“

”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ میں نہیں کہتا یہ مفادات کا کھیل ہے یا ہم کس کی لڑائی لڑ رہے ہیں لیکن جو ہمیں حکم دیتا ہے ہمیں اس سے تو سوال کرنے کا حق ہے کہ اس کا فیصلہ جہاد و جہد کو تیز کر رہا ہے یا اس پر لکیر پھیر رہا ہے؟۔۔۔ اس دعوت کو قبول کرنے سے لے کر آج تک پر غور کرو۔ تمہیں میری باتوں کی تائید میں بہت کچھ ملے گا۔ ایک مجرم اگر کوئی جرم کرتا ہے تو اپنے مفاد کے لیے کرتا ہے لیکن ہم کیا کر رہے ہیں؟“

”ڈیٹان! کیا تم نے ایسا کچھ دیکھا۔۔۔؟“ پہلی بار وہ اس کی گفتگو کو کھتے ہوئے بولا۔

”ہاں بہت کچھ۔۔۔ سچی تو میں نے اپنے طور پر سوچا ہے کہ تم سے مشورہ کر رہا ہوں کہ بولو ہمیں کیا کرنا چاہئے؟“

”جب تک میری پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہوگا اس وقت تک میں کوئی بات نہیں کروں گا۔“

جنید نے اٹل لہجے میں کہا۔ اس سے پہلے کہ ڈیٹان کچھ کہتا ان کے سامنے کھانا چاچا جانے لگا۔ وہ خاموش ہو گئے۔ ویر چب کھانا رکھ کے چلا گیا تو ڈیٹان نے کہا۔

”نی المال کھانا کھاؤ۔۔۔ رزق سامنے آ گیا ہے باقی باتیں بعد میں۔“

اس دن جنید کے سامنے بہت ساری باتیں آئیں۔۔۔ دراصل وہ جس جماعت کی ذیلی عظیم میں تھے ان کے فیصلے تو سیاسی جماعت کے بڑے لیڈر ہی کرتے تھے اور انہیں حکم سنا دیا جاتا تھا پھر وہ بلا چون و چرا حکم کی تعمیل کر دیتے۔ لیکن کچھ عرصے سے قائدین ایسی راہ پر چلنے لگے تھے جسے مفاہمت نہیں مفادات کا حصول کہا جاسکتا تھا۔ ان کے فیصلے انہی کے پیغام کے منافی جا رہے تھے اس لئے تنظیمی لوگوں میں اشتکار کی کیفیت پیدا ہو جانا فطری عمل تھا۔ جس کا حق پر قائم کی گرفت نہ رہے وہ قائلہ ٹکھری جایا کرتا ہے۔ ڈیٹان کی دور رس نگاہیں سب دیکھ رہی تھیں۔ جنید نے جب کئی آنکھوں سے سارے معاملات کو دیکھا تو نہ صرف چونکا بلکہ مایوس بھی ہو گیا مگر اسے یہ یقین نہیں تھا کہ قائدین کا رویہ مفاہمت بھرا ہے مفادات کے حصول کے لیے یا پھر پسپائی ہے کیا ہے؟ اس یقین کے ساتھ اس کا فیصلہ بھی متوقع تھا۔ جو کچھ بھی تھا وہ اپنی جگہ لیکن پہلی بار اس نے اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا تھا۔ یہ اس کے لیے ایک بہت بڑی تہدیلی تھی۔

☆☆

رات کا گہرا سناٹا چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ ہمایوں اپنے بوسیدہ سے کمرے میں بیٹھا ہوا مسلسل سوچ رہا تھا کہ ان چند دنوں میں اُس کے ساتھ کیا ہو گیا ہے۔ ان دو واقعات نے اُسے چھوڑ کر رکھ دیا تھا یہاں تک کہ اُس کی سوچوں کی بنیاد ہی مل گئی تھی۔ یوں جیسے کسی نے اُس کے اندر زہر کا بیج بویا ہو۔ شاید اُس کے اندر کی زمین زخمی تھی پھر جیسے ہی حالات کے زہر کا بیج اس کے اندر بویا گیا تو اُس نے اپنا رنگ رنگ دکھانا شروع کر دیا۔ اُسے احساس ہونے لگا کہ جیسے اُس کے اندر کی دنیا میں کہیں تبدیلی ہونا شروع ہو گئی ہے۔ وہ جس قدر ان واقعات کو بھلانا چاہتا اسی قدر اُسے یاد آتے تھے۔ شرمندگی اور اپنی کم مائیگی کا احساس اُس کے اعتماد کو زور زور سے دبا رہا تھا۔ وہ خود کو دنیا کا احمق ترین شخص محسوس کر رہا تھا۔ جس کی عقل نجانے کہاں کھو گئی تھی۔ پہلی بار اُسے معاشرے کے بارے میں سوچنے کی تحریک ملی تھی۔ اُس کا اپنے آپ سے پہلے سوال ہی یہی تھا کہ اُس نے غلط کیا ہے یا پھر اس معاشرے کی اخلاقی قدریں ہی دم توڑ گئی ہیں۔ یوں اُس نے اپنے رویے کے بارے میں سوچا اور معاشرے پر بھی غور و فکر کیا جس کا جواب اُسے یہی ملا کہ دونوں ہی ایک دوسرے کے لیے مس فٹ ہیں۔ اُسے خود بدلنا ہو گا یا پھر اس معاشرے کو تبدیلی کے بغیر وہ اس معاشرے میں سانس بھی نہیں لے سکتا۔ اُس کا اعتماد ٹوٹ چکا تھا۔

شخصیت کو پارہ پارہ کر دینے والی انہی سوچوں میں وہ گن تھا اُسے کچھ ہوش نہیں تھا کہ باہر اندھیرا اُس قدر ہو گیا ہے اُس کے گمراہی کے لیے کہ وہ ہیں یا پھر اُس کی اپنی دنیا کیا ہے۔ وہ تقریباً ہر معاملے میں یوں بے نیاز ہو گیا تھا کہ جیسے وہ اس دنیا کے لیے بنا ہی نہیں ہے۔ اُس کے اندر یہ احساس شدت سے گردش کر رہا تھا کہ اس معاشرے کے جو معیار بن چکے ہیں ان پر وہ پورا نہیں اُترتا سو اُس کی حیثیت ایک مظلوم شخص کی سی ہے جو اس معاشرے کے لیے کسی طرح بھی کارآمد نہیں ہے۔

”ہمایوں۔۔۔ اوتے ہمایوں۔۔۔!“

اُس کے باپ نے کمرے میں آ کر اُسے مخاطب کیا تو وہ چونک گیا۔ اُس نے دیکھا کہ اس کا باپ اور اس کے پیچھے غمزدہ چہرے لیے اُس کی ماں اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”جی۔۔۔“ وہ سیدھا ہوتا ہوا بیٹھ گیا۔

”بیٹے! یہ کیا حالت نکالی ہے تم نے۔۔۔؟“ انور علی نے اُس کے قریب پڑی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا تو اُس کی ماں بھی اس کے بستر پر بیٹھ گئی۔

”صنیں۔۔۔ منس ٹھیک ہوں! ابھی آپ کیوں پریشان ہو رہے ہیں۔۔۔؟“ وہ تیزی سے بولا۔

”نہیں تم ٹھیک نہیں ہو۔۔۔ تمہاری حالت بتا رہی ہے کہ تم ٹھیک نہیں ہو۔“ اُس کی ماں نے انتہائی جذباتی انداز میں کہا۔

”کیا ہوا ہے مجھے؟۔۔۔ کچھ نہیں ہوا۔“ اُس نے خود کو سنبھالتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

”بیٹے! ہم جانتے ہیں کہ کیا ہوا ہے اور اس کا اثر تم پر کیا ہو رہا ہے۔ تم ابھی اتنے سمجھدار نہیں ہوئے ہو کہ اس دنیا کو سمجھ جاؤ یہ بہت ظالم ہے لیکن اس دنیا کا مقابلہ تو کرنا ہے میرے بیٹے اور وہ لوگ جو مضبوط نہیں ہوتے“ اُنہیں تو یہ دنیا رگید کر رکھ دیتی ہے۔ اس دنیا میں بہت سارے

عشق کا ہے عشق بتا

ناکردہ گناہوں کی سزا بھی مل جاتی ہے۔" اس کے باپ نے بے چارگی سے کہا۔

"ابا جی! میں نے آج تک یہی کتابوں میں پڑھا۔ آپ نے بھی ہمیشہ اچھائی کی تعلیم دی۔ آپ بتائیں! میں نے کیا جرم کیا تھا۔ ایک شخص کو جو قاتل کا رکھوالا مانا جاتا ہے اسے لاقانونیت سے باز رہنے کے لئے ہی کہا تھا اور اس نے میرے ساتھ کیا کیا، میری شخصیت تک مسخ کر کے رکھ دی! ایک ہی جھگڑے میں میری اوقات بتا دی۔" وہ قدرے تلخ لہجے میں بولا۔

"کتابوں میں پرانی باتیں لکھی گئی ہیں اور ہم بھی پرانے زمانے کے بندے ہیں۔۔۔" اس نے آہ بھرتے ہوئے کہا پھر ایک لمحے کو اس نے اپنے بیٹے کے چہرہ پر لگاوا ڈالی اور تیزی سے بولا۔ "بس تم اس دنیا میں حوصلے سے جینا سیکھو کوئی ایسا کام نہ کرو جس سے تمہیں دکھ ہو۔۔۔"

"ہاہا! میں تم سے یہ پوچھتی ہوں! تم آخر صنفیہ کے کالج کیا لینے گئے تھے۔۔۔ نہ تم جاتے اور نہ وہ تمہارے ساتھ نچھارتی؟"

اس کی ماں نے اپنی رو میں کہا تو وہ چونک گیا۔ اس کی ماں کے لہجے میں آگ تھی! نفرت کی آگ جسے وہ باوجود کوشش کے چھپا نہیں پاتی تھی۔ اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ بھی کتنی بے بس ہے۔

"امی! یہ بات آپ کو کس نے بتائی۔۔۔؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"اس کی ماں زینون بی بی نے۔۔۔ اس گھر میں آپ تک اسی عورت کا دماغ درست ہے ورنہ سب دہشت کی چکا چوند کے سامنے اپنے حواس کھو بیٹھے ہیں۔ انہیں یہ ہوش ہی نہیں کہ ان کا خون رشتہ بھی کسی سے ہے نہ تو۔۔۔"

زینب اسی رو میں بہت کچھ کہنا چاہتی تھی کہ انور علی نے ٹوکے ہوئے کہا۔ "نیک بخت! کیوں خواہ مخواہ اپنا خون ہلار رہی ہے۔ بات خون رشتے کی نہیں ہے سہیں یہ کہنا ہوں کہ اگر کوئی کسی سے تعلق نہیں رکھنا چاہتا تو اس میں زور زبردستی کیا ہے۔ ان کے پاس اگر دولت ہے تو ان کی محنت کی ہوگی۔ یہ حقیقت ہے کہ ہم امارت میں ان کے ہم پل نہیں۔ وہ آب کسی دوسری دنیا کی مخلوق ہو گئے ہیں تو کیا ضرورت ہے ان سے تعلق رکھنے کی! کیا ان کے بغیر ہم زندہ نہیں رہیں گے؟" اس کے لہجے میں دکھ کھلا ہوا تھا۔

"یہی تو میں کہتی ہوں۔۔۔ جب یہ اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ ہم سے ہر تعلق ہر رشتہ توڑ چکے ہیں تو پھر کیا ضرورت ہے ان سے رابطہ رکھنے کی۔۔۔؟"

زینب نے اپنے خاوند کی ہاں میں ہاں ملائی۔ اس پر ہاہاں ایک لفظ بھی نہ کہہ سکا اسے اپنی غلطی کا احساس تھا۔ انہی لمحات میں اس کے اندر سے آواز ابھری کہ کیا واقعی اس نے غلطی کی تھی؟۔۔۔ اس سوال کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ وہ تمباہوتا تو اس پر سوچتا لیکن اس وقت تو اس کے والدین اس سے مخاطب تھے۔

"دیکھو ہاہاں! تو بھول جا کہ وہ ہمارے رشتے دار ہیں۔ ہم نے تو کوشش کی تھی لیکن انہوں نے ہمیں ہار کر دیا کہ اب وہ ہمارے لیے اجنبی بن چکے ہیں۔ ہمیں نہ چاہتے ہوئے بھی انہیں بھولنا ہوگا۔ اب کبھی ایسی بات ذہن میں نہ لانا۔"

"۔۔۔ اور سن تو کچھ بن کے دکھا! تیرے لیے اچھے سے اچھے گھر کا رشتہ لاؤں گی وہ لوگ بھی رشک کریں گے۔"

”زندگی مایوسی اور کمزوری سے نہیں گزارنی جاتی، خود میں اعتماد پیدا کرو۔ خود کو جتنا مضبوط بنا سکتے ہو، اتنی تم کامیاب ہو گے۔“

اُس کے والدین اسے نصیحتیں کرتے چلے جا رہے تھے۔ نجانے انہوں نے کیا کہا، کیا کیا سمجھاتے رہے لیکن وہ کچھ بھی نہیں سن پارہا تھا۔ ان لمحات میں اُسے اپنی بے عزتی، شرمندگی اور کم ہمتی کا شدت سے احساس ہونے لگا تھا۔ اُس نے اپنی آنکھیں بند کر کے اندر سے اُٹھنے والی دُکھ کی لہر کو سہارنا چاہا۔ وہ کتنی ہی دیر تک یونہی پڑا رہا۔ وہ اپنی ساری سوچوں کو ذہن سے نکال کر پھینک دینا چاہتا تھا۔ کتابے بس ہو جاتا ہے انسان، جب وہ کبھی خالی الذہن ہونا چاہتا ہے، جب اُس کی خواہش ہوتی ہے کہ کوئی بھی سوچ اُس کے دماغ میں نہ آئے لیکن ایسا ہوتا نہیں ہے۔ خیال کے بغیر دماغ اسی وقت ہوتا ہے جب زندگی ندر ہے، زندگی اور خیال مشروط ہیں۔ کبھی کبھی تو خیال اس قدر مضبوط ہوتے ہیں کہ زندگی ختم ہو جاتی ہے لیکن خیال اس دنیا میں موجود رہتے ہیں جو حقیقت بن کر اپنا آپ منوالیتے ہیں۔

ہالیوں کے والدین یہی سمجھے کہ اُسے نیند آ رہی ہے، وہ اُسے چھوڑ کر کمرے سے چلے گئے تھے جبکہ وہ جاگ رہا تھا اور اسی گٹنٹنٹن میں تھا کہ گزشتہ چند ہفتوں میں جو اُس کے ساتھ ہو چکا ہے اس کی یادیں کسی طرح اُس کی زندگی سے تھمیل ہو جائیں مگر ایسا ہو نہیں پارہا تھا۔ دراصل اُسے یہ علم ہی نہیں تھا کہ خیالات کو راستہ دینا چاہئے اس پر بھی نہیں رہنا چاہئے۔ نئے خیال آتے ہی تب ہیں جب پرانے خیالات کو ذہن سے نکل کر دیا جائے۔ پھر ایسے میں دوسرے انسان کو بھٹکا دیتے ہیں کیونکہ دوسرے بھی تو خیال ہی ہوتا ہے مگر ہر خیال دوسرے نہیں ہوتا۔ خیال تو اپنے من کا کس ہوتے ہیں۔ اگر انسان تھوڑا غور سے اپنے خیالات کو دیکھے تو اُسے معلوم ہو جائے گا کہ اس کا من کیا کہتا ہے۔ وہ خود کو کسی خواہشیں کیسے ارادے اور کسی امیدیں رکھتا ہے۔ اپنی شخصیت کو بگھنے کے لیے اپنے ہی خیالات کو جانچنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ خیالات کبھی نہیں رکتے وہ جتنے پانی کی مانند آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں لیکن اگر انسان کسی دوسرے پر جم جائے تو یہی دوسرے خیال کا روپ دھار کر اس کے مقصد کی راہ میں حائل ہو جاتا ہے۔ اس لیے دوسرے کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ دوسرے کو اگر من کی تائید مل جائے تو انسان کا اپنے مقصد سے ہٹ جانا لازمی ہو جاتا ہے۔ یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب وہ بیکسو نہیں رہتا اور منتشر ہو کر رہ جاتا ہے۔ انتشار انسانی شخصیت کو چاروں طرف سے دبا دیتا ہے۔ ہالیوں ایسے ہی لمحے میں زکا ہوا تھا۔ وہ انہی خیالات کے ساتھ جم گیا تھا، دوسرے اُسے ڈرا رہے تھے اور کوئی مثبت سوچ اُسے حاصل نہیں دے رہی تھی۔ دور کس لاشور میں یہ یقین ضرور موجود تھا کہ یہ حصار اُسے ختم کر کے رکھ دے گا جس قدر جلدی ممکن ہو سکے، اُسے یہ حصار توڑنا ہو گا مگر یہ کیسے توڑے گا؟ اس سوال کا جواب ہی اُسے نہیں مل پارہا تھا۔ یہ جواب کیسے ملتا، اُس کا ذہن ہی یادوں سے خالی نہیں تھا۔ وہ انہیں ٹھوکر مارتا تو جواب ملتا۔ وہ بے بس ہو گیا۔ اُس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ جائے اور اُس سب اسپیکر کو پکڑ کر اپنا سارا بدل لے لے اور صفیہ!۔ کیا اُس سے ملنا چھپے کا بدل نہیں لے گا؟ اُس کے اندر سے یہ سوال ابھر اُتو وہ تڑپ کر رہ گیا۔ وہ اسپیکر کو تو بھول سکتا ہے لیکن صفیہ کے اس نفرت بھرے رویے کو نہیں۔ وہ لمحہ اُس کی زندگی میں چتر کی مانند گڑ گیا تھا وہ چاہتا بھی تو اسے ہلا نہیں سکتا تھا۔ بلاشبہ اُس کی ساری سوچیں اسی کے گرد گھومنا تھیں۔ اُسے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ آئندہ اُسے کیا کرنا ہے؟۔۔۔ رات کے ان لمحات میں اُسے کچھ بھی سمجھائی نہیں دے پارہا تھا اس لیے وہ آنکھیں موند کر انہی یادوں کو بھلاتے ہوئے نیند میں کھو گیا۔

☆☆

اس دن راحیلہ کا آف تھا۔ جبکہ لسرین جو زف اپنے آف کے بعد گھر سے آج آنے والی تھی اور اس کی ڈیوٹی شام کے وقت شروع ہونا تھی سو وہ پہرے سے گھل وہ اپنے کمرے میں اکیلی تھی۔ صبح ہی اس نے اپنے ضروری کام نمٹا لیے تھے اور اس وقت بچے بھر کی تھکن اتارنے کے لیے بستر پر نیند کے انتقاد میں پڑی تھی۔ اس وقت وہ سونے اور جاگنے کے درمیان تھی کہ اس کے کمرے کا دروازہ بجا۔ پہلے اس نے اپنا وہم ہی سمجھا کہ دستک بہت دہمی تھی لیکن جب قدرے تیز دستک دی گئی تو اسے یقین آ گیا کہ باہر کوئی ہے۔ وہ اٹھی اور دروازے کی جانب گئی دروازہ کھولا تو سامنے سینئرز تھی جس کے ہونٹوں پر دہمی سی نظر یہ مسکراہٹ تھی۔ راحیلہ کے بدن میں غصے کی ایک لہر سرایت کر گئی کیونکہ اسے یقین تھا کہ اس کی آمد خیر سے نہیں ہو سکتی لیکن پھر بھی اس نے خود پر قابو رکھا اور دھیرے سے بولی۔

”جی۔۔۔؟“

”کیا اندر آنے کے لیے نہیں کہو گی؟“ سینئرز نے مسکراتے ہوئے کہا تو اس نے کوئی لفظ کہے بنا راستہ دے دیا۔ وہ اندر آ کر بے تکلفی سے اس کے بستر پر بیٹھ گئی اور کمرے کی حالت دیکھنے لگی۔ راحیلہ کو سی پڑھی تو وہ بولی۔ ”راحیلہ! تمہاری طرح تمہارا کمرہ بھی بہت سادہ ہے۔“

”میں اسی میں سکون محسوس کرتی ہوں میڈم!“ وہ دھم سے اعزاز میں بولی۔

”سکون۔۔۔“ وہ یوں بولی جیسے خود گلابی کر رہی ہو پھر راحیلہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”ہم کتنے مجبور اور بے بس ہوتے ہیں کہ اپنی نارسائیوں کو بھی سکون کا نام دے کر مطمئن ہو جاتے ہیں اور کبھی کبھی ایک پر سکون زندگی کو اپنے چند اصولوں کی خاطر ٹھکرا دیتے ہیں۔ دراصل اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں ہوتا۔ وہ اصول زندگی کی صحیح تصویر بھی غلط منظر کے دکھاتے ہیں جس سے ہمیں سمجھ ہی نہیں آتی۔“

”میڈم! میں یہ نہیں کہوں گی کہ آپ غلط کہہ رہی ہیں۔ آپ کے پوائنٹ آف ویو سے یہ ٹھیک ہوگا مگر یہ بھی تو دیکھیں کہ یہ اصول کہاں سے آئے ہیں۔ یہ ہمارے دین نے ہمیں بتائے ہیں۔ اگر ہم اس پر عمل پیرا نہ ہوں گے تو نہ اس دنیا کے ہیں گے اور نہ آخرت کے۔“

”دیکھو دین دنیا اور آخرت کا قضا اپنی جگہ لیکن تم مجھے یہ بتاؤ کہ ہم جس معاشرے میں رہتے ہیں کیا اس معاشرے میں اپنے اصولوں پر ڈلے رہنا یوں نہیں ہے کہ جیسے ہم حالت جنگ میں ہوں۔ ہم سیدھے راستے پر چلتے ہیں تو لگتا ہے کہ کہیں سے بھی کوئی تیر آگے گا ایسا تیر جو نفرت کے زہر میں بیجا ہویا ہوں کی کمان سے نکلا ہو۔ اگر یہ سارے اصول سچے ہیں انسان کی فلاح کے لیے ہیں تو پھر انہی اصولوں پر چلتے ہوئے جینا کیوں مشکل ہو جاتا ہے۔ دینی احکامات کی پاسداری کیوں نہیں ہے اس معاشرے میں! کہیں ہم خود غلط تو نہیں ہیں؟“ سینئرز نے اب بھی یوں ہاتھیں کر رہی تھی جیسے خود گلابی کر رہی ہو یا پھر ٹرانس میں ہو۔

”میڈم! میں کبھی نہیں آپ کیا کہتا چاہ رہی ہیں۔۔۔“ راحیلہ کو حیرت ہوئی کہ آخروہ کیا کہنا چاہتی ہے۔

”خدا نخواستہ میں دینی اصولوں کو غلط نہیں کہہ رہی لیکن وہ اصول ہیں کن کے لیے؟ ہمارے لیے ہی ہیں نا! تو ہم ہی اپنے رویے اور طرز عمل سے ان کا انحراف کر رہے ہیں۔ اگر ہمارا معاشرہ پوری طرح ان اصولوں پر چلتے تو ہمارے یہاں پر رہنے کا جواز ہی نہیں ہے۔ ہم چار دیواری میں عزت کے ساتھ رہیں یوں در بدر کی شو کریں نہ کھائیں۔ میں جانتی ہوں تمہارے بارے میں تم ایک تہم لڑکی ہو۔ تمہارا واحد

سہارا۔۔۔ نہیں بلکہ تم واحد سہارا ہو اپنی ماں کا جو غربت کے دن یہاں سے دور ایک گاؤں میں گزار رہی ہے۔ تم کیوں مجبور ہو؟۔۔۔ یہاں پر ایک جنگ تم پر مسلط ہے۔ غربت سے لڑ رہی ہو اپنی عزت کے لیے لڑ رہی ہو اپنی خواہشوں، امیدوں اور آرزوؤں سے لڑ رہی ہو۔ وہ اصول تو یہ بتاتے ہیں کہ یہ مجبوریاں تمہارے گھر میں داخل ہی نہیں ہو سکتیں تو پھر۔۔۔؟“ میڈم نے پہلی بار اس کی نگاہوں میں دیکھا تھا۔

”میڈم! کیا آپ نہیں سمجھتی کہ زندگی جدوجہد کا نام بھی ہے۔ میں یہ بھی مانتی ہوں کہ آپ غلط نہیں کہہ رہی ہیں لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ ہم جنہیں سچے اصول سمجھتے ہیں انہی کے خلاف بغاوت کی جائے۔ ہم نرانی کے خلاف بھی تو بغاوت کر سکتے ہیں۔ اخلاقی قدروں سے عاری ہمارا یہ معاشرہ اگر گڑھے میں گر رہا ہے تو کیا ہم جانتے بوجھتے ہوئے بھی اس گڑھے میں گر جائیں۔۔۔ میں مانتی ہوں کہ یہ معاشرہ بہت ظالم ہے لیکن یہ بھی مانیں کہ اگر یہ ظالم ہے تو اس میں کچھ اچانیاں بھی ہیں ورنہ یہ کب کا تارو بر باد ہو چکا ہوتا۔“ راحیلہ نے دیکھے انداز میں اپنی بات کہہ دی۔

”بالکل۔۔۔ زندگی کو ہم جن معنوں میں بھی لینا چاہیں لے سکتے ہیں۔ بس یہ زندگی ہے جس سے فرار بہت مشکل ہے۔ کبھی کبھی اتنی تلخ حقیقتیں ہمارے سامنے آ جاتی ہیں کہ باوجود کوشش کے ہم ان سے بھاگ نہیں سکتے۔ اتنے عشق، رنج، محنت ہیں کہ بندہ ان میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔ نرانی ایک ایسی دلدل ہے جس میں سے انسان نکل ہی نہیں سکتا۔“

”ہاں ایک طریقہ ہے جب انسان اپنے خالق پر بھروسہ کرے تو انسان کا اختیار۔۔۔“

”انسان کا اختیار ہی تو اتنے جاں ہٹائے بیٹھا ہے کہ دوسرا بچنے کی خواہش کے باوجود پھنس جاتا ہے۔۔۔ خیر میرے آنے کا مقصد نہیں پوچھو گی تم۔۔۔؟“

میڈم نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا تو راحیلہ دھیرے سے مسکراتے ہوئے بولی۔

”اس کے علاوہ اور کیا کچھ سکتی ہوں کہ آپ مجھے بغاوت پر آمادہ کرنے آئی ہیں۔۔۔“

”نہیں۔۔۔ میں تمہیں سمجھانے آئی ہوں کہ یہ جو ہمارا ماحول ہے تا اس میں ان دیکھے اتنے پھندے ہیں کہ باوجود کوشش کے ان سے بچا نہیں جاسکتا۔ تم یہاں پر نرسنگ کورس کرنے آئی ہو۔ کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ تم فقط اپنی محنت اور کوشش سے یہ کورس مکمل کر کے یہاں سے چلی جاؤ گی؟۔۔۔ نہیں ایسا ممکن نہیں ہے۔“

”کیا آپ مجھے۔۔۔“

راحیلہ نے کہنا چاہا تو میڈم نے اسے ہاتھ کے اشارے سے کچھ بھی کہنے سے روک دیا اور بولی۔ ”میں بھی تمہاری طرح یہاں آئی تھی۔ مجبور بے کس اور غربت کی ماری ہوئی لیکن اب میرے پاس ہر وہ سہولت ہے جس کی میں خواہش کرتی تھی۔ میں نے اس سسٹم سے تمہاری طرح بغاوت نہیں کی بلکہ اس کا حصہ بن گئی ہوں۔ میں جان گئی ہوں کہ ہوس کے اس کھیل میں کون مجبور محض ہے اور کون خام مال کے ضرورت ہے اور کون جو پاری۔ جتنی میری تنخواہ ہے اتنا تو میں چوٹی پارلر میں خرچ کر دیتی ہوں اور۔۔۔“

”آپ مجھے یہ بتانے آئی ہیں کہ آپ۔۔۔“

”پہلے میری بات سن لو تو خود امبر کرو۔۔۔“ میڈم نے کہا اور پھر لٹکے بھر بعد یولی۔ ”میں کبہ رہی تھی کہ ہر سال ہی آنے والی لڑکیاں کوئی خوشی سے نہیں آتیں۔ ایسے ہی آتی ہیں جیسے میں تھی اور جیسے تم ہو۔ اس ماحول میں اسے سنہرے جال ہیں کہ ان کی آنکھیں چکا چوند ہو جاتی ہیں میری بھی ہوئیں لیکن تمہارے جیسی کئی ایسی ہیں جن کی آنکھیں خیر نہیں ہوتیں۔ میں اعتراف کرتی ہوں کہ میں نے کوشش کی کہ تم بھی ہمارے جیسی ہو جاؤ تم نہیں ہوتیں۔“

”میڈم! آپ صاف لفظوں میں اپنی بات کیوں نہیں کہہ دیتیں۔۔۔؟“

”اس لیے کہ میں باوجود کوشش کے کہہ نہیں پا رہی ہوں شاید میں شرمندہ ہوں۔۔۔ خیر تم نے پریشان نہیں ہونا میں ہوں تمہارے ساتھ۔۔۔ ان دنوں تمہارے بارے میں بہت کچھ کہا جا رہا ہے خصوصاً ڈاکٹر جمیل کی طرف سے تو بہت زیادہ مخالفت چل رہی ہے۔ وہ انا کا مسئلہ بتائے ہوئے ہے لیکن میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا ہے کہ ایک مجبور اور بے بس لڑکی کو ہم لوگ کیوں جہاں میں دھکیل رہے ہیں۔ اس میں ہم سب لوگ شامل ہیں۔ آخری وقت تک تمہاری مخالفت کی جائے گی تمہیں جھکایا جائے گا لیکن تم اسی طرح اپنے اصولوں پر ڈٹی رہنا تم ٹھیک ہو ہم غلط ہیں۔ تمہیں کوئی مسئلہ تو مجھے بتانا۔۔۔“ میڈم نے یوں کہا جیسے ایک بہت بڑا اور جو اس کے سر سے اتر گیا ہو۔

”ٹھیک یا میڈم! میں جانتی ہوں کہ میرے ساتھ بہت کچھ ہوگا لیکن میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ گناہ کی زندگی میں قدم نہیں رکھوں گی چاہے وہ جتنی سنہری ہے میری کوشش تو یہی ہوگی کہ میں سکون سے یہ کوس ختم کر کے یہاں سے چلی جاؤں آگے کا پتہ نہیں مگر مجھے اپنے اللہ پر بھروسہ ہے۔“

”میری دعا ہے کہ تمہارا بھروسہ قائم رہے میں یہی کہنے آئی تھی۔“

میڈم نے کہا اور اٹھ گئی۔ تب راحیلہ نے بھی اُسے مزید بیٹھنے کو نہیں کہا۔ میڈم چلی گئی تو وہ اپنے بستر پر آٹھنٹھی اور سوچوں نے اُسے آن گھیرا۔۔۔“

کیا اس کا آنا اور اس کا ارادہ بھی کوئی سنہری جال ہے۔ وہ اُن کے دام میں دھکیوں اور ڈراوے سے تو نہیں آئی۔ ممکن ہے اُس سے ہمدردی جتا کر ہی اپنا مطلب نکال لیا جائے؟۔۔۔ اُس نے جواب تک ذہنی اذیت برداشت کی تھی اس نے اُسے بہت تھکا کر دیا تھا۔ وہ اپنے مستقبل کے بارے میں کبھی بھی نہیں سوچ سکتی تھی۔ اُس کی سوچ اس سے آگے کبھی بڑھی ہی نہیں تھی کہ کسی نہ کسی طرح نرسنگ کورس مکمل کر لیا جائے۔ اس کے بعد جو ہوگا وہ دیکھا جائے گا۔ میڈم کی ذات کا ایک نیاز اگرچہ اُسے حیرت زدہ کر رہا تھا لیکن اُسے پوری طرح یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس حقیقت کو تو اسی وقت سامنے آنا تھا جب وقت کے ساتھ اس کا اظہار کیا جاتا اور جب فیصلہ وقت پر ہی ہے تو خواہ مخواہ سوچ کر وقت کیوں ضائع کیا جائے؟۔۔۔ اُس نے میڈم اور اُس کے خیالات کو ذہن سے نکالا اور سونے کی کوشش کرنے لگی لیکن شاید سونا اُس کے مقدر میں نہیں تھا۔ اس وقت وہ بھر سے سونے جاگنے کی ہی کیفیت میں تھی کہ دستک ہوئی جس کے ساتھ ہی نرسین جوزف کی آواز آئی۔ وہ اٹھی اور اُس نے دروازہ کھول دیا۔ پھر سامان وغیرہ رکھ دینے کے بعد جب نرسین قفل سے بیٹھی تو راحیلہ نے دیر سے سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”آج تمہیں ایک حیرت انگیز بات بتاؤں؟“

”یو—!“

اُس نے بستر پر ناخفیس پیارتے ہوئے لاپرواہی کے سے انداز میں کہا۔ تب راحیلہ نے میڈم اور اس کے خیالات پوری تفصیل سے اُسے بتادیئے۔ وہ حیرت سے سختی رعبی اور میان میں سوال بھی کرتی رعبی جب ساری بات سن لی تو وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

”راحیلہ! تمہیں نہیں مانتی کہ وہ تمہارے ساتھ ٹھہس ہوگی۔ وہ ایک نئے روپ کے ساتھ تمہارے پاس آئی ہے۔“

”میرا بھی یہی اندازہ ہے لیکن اس کے ٹھہس ہونے کو پوری طرح سے رعبی تو نہیں کیا جاسکتا ہے تا—؟“

”بالکل رعبی نہیں کیا جاسکتا مگر اس کا پچھ تو تب ہی چلے گا جب وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے رویئے کا پچھ چلے گا۔“ نرسین نے بھی اُس کے خیال کی تائید کر دی۔

”ہاں سنا یہ بات سوچ چکی ہوں۔“ وہ دوسرے سے بولی۔

”تو بس تم جتنا مارو اور جس طرح اپنا وقت گزرا رہی ہو گزرا تھی چلی جاؤ۔ خدا تمہاری مدد کرے گا۔“

”چلو چھوڑو ان باتوں کو— تم سناؤ گھر میں سب ٹھیک تھے تا—؟“ راحیلہ نے پوچھا۔

”یہ جھہس بتاتی ہوں پہلے کچھ کہانی لیں— آؤ چلیں۔“

یہ کہہ کر وہ آٹھی اور راحیلہ بھی باہر جانے کو تیار ہونے لگی۔

وہ میڈم کو اپنے ذہن سے نکال چکی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کی وہ ساری باتیں بھی جو سچ تو تھیں لیکن دماغ کو خراب کرنے والی تھیں— اصل میں ہوتا یہی ہے تا کہ جب بھی کسی نظام یا ٹھہس پر تنقید کی جاتی ہے تو اُس کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ پھر نظر اس نظام یا شخصیت کی خامیاں ہوتی ہیں یا پھر تنقید کرنے والا حسد کی آگ میں جلتے ہوئے امتحانہ انداز میں اول قول بکتا ہے۔ نئی زمانہ مگر مسلمانوں پر تنقید ہو رہی ہے تو یہ ہمارے ہی اعمال کا شائبہ ہے۔ ہم ڈہرے شہرے معیار کے ساتھ خود کو مسلمان کہلوانا پسند کر رہے ہیں۔ کسی کی تنقید کے جواب میں کچھ کہنے سے پہلے ہمیں اپنے اعمال اور رویئے کا اندازہ لگانا چاہئے۔ اس میں نہ صرف ذاتی بلکہ قومی ملاح ہے۔

☆ ☆

”تم نے بہت لفظ کیا ہے صفیہ! تم اُس کی بات سن لیتیں یا نہ بھی سنتیں لیکن کم از کم چھڑ مارنے والی حرکت تو نہ کرتیں۔“

سلسلی نے دبو بے شصے میں چائے کا سب لیتے ہوئے صفیہ کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ چونک گئی اور پھر طویہ انداز میں بولی۔

”دیکھو اتنا خوبصورت موسم ہے اور اتنی پیاری ہوا چل رہی ہے۔ شام ڈھلنے کو ہے اس لان میں بیٹھے ہوئے کیا بھینٹی بھینٹی پھولوں کی خوشبو

آ رہی ہے۔ اتنی مزیدار چائے ہے۔ اتنے رو مانگ ماحول کو تم اُس گھٹیا ٹھہس کا ذکر کر کے کیوں خراب کرنا چاہتی ہو؟“ آخری لفظ کہتے ہوئے اُس کا لبو تلخ ہو گیا تھا۔

”تم ایسی باتیں کر کے میرے سوال کا جواب گول نہیں کر سکتی ہو۔“ سلسلی نے بہت آرام سے کہا۔

”تو پھر کیا کرتی؟ وہ مجھے باتیں کرنے کے لیے کسی رستوران میں لے جاتا۔۔۔ نہیں بلکہ وہاں کیوں لے جاتا اس کنگھے کے پاس وہاں جانے کی ہمت ہی نہیں۔۔۔ خیر میں اس کی بات سن لیتی تب وہ کسی اگلی ملاقات کے لیے وقت ہاتھکا۔ ممکن ہے کہ وہ کسی خوبی رشتے کا واسطہ دینا اظہار محبت کرتا۔ میں کیوں سنوں ایسی باتیں اور پھر تمہیں اپنی بہن سے زیادہ اس کا ڈکھ مارے جا رہا ہے۔ میں کہتی ہوں کہ تم اور ماں اس موضوع کو چھوڑتے کیوں نہیں ہو؟“ اس نے زچ ہوتے ہوئے کہا۔

”یہ تمہارے اندیشے ہیں نا کیا ایسا ہوتا۔۔۔ ممکن ہے وہ تم سے کوئی اور بات کرنا چاہتا۔۔۔“

”سنا نہیں تم نے۔۔۔ کیوں اس موضوع کی جان نہیں چھوڑتے آپ لوگ؟“ اس نے پھر ضے میں کہا۔

”جلا چھوڑ دی۔ تم بہت زیادہ بکھدار ہو نا۔۔۔“ سہلی نے جملے ہوئے لہجے میں کہا۔

”میری بہن ابراہان کو اپنے بارے میں اچھا سوچنے کا پورا پورا حقد ہے۔ تم بھی جب اپنے بارے میں سوچو گی تو اپنے تمام کبھی نہیں چاہو گی۔ مجھے وہ شخص بالکل بھی پسند نہیں ہے تو آپ لوگ کیوں اسے مجھ پر مسلط کرنے کی باتیں کرتے ہو میں نے ابھی پڑھتا ہے اپنا آپ کو بزنس وہ ممکن کے طور پر ثابت کرنا ہے کسی بھی ایگزیکٹو پوسٹ کو انجوائے کرنا ہے۔ میں ان کھیلوں کے لیے نہیں مانی ہوں۔“

اس نے بڑے آرام سے اپنی بہن کو سمجھاتے ہوئے کہا تو سہلی ہنس دی۔ اس کی ہنسی میں طنز تھا۔ پھر وہ انتہائی سنجیدگی سے بولی۔

”تم اپنا آپ جس طرح بھی چاہو ثابت کرو ایک دن تو پرانے گھر جانا پڑے گا۔ پاپا ساری زندگی تو اپنے پاس نہیں بٹھا سکتے۔“

”ٹھیک ہے میں باقی ہوں کہ میری شادی ہوگی لیکن ہا یوں جیسے لوگوں کا تو میں تصور بھی نہیں کر سکتی۔۔۔ وہ جو خود بھوکے ہیں میں وہاں کیا کروں گی جا کر۔۔۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تو کیا پھر تمہارے لیے شہزادہ آئے گا۔۔۔“ سہلی نے طنز یہ لہجے میں کہا۔

”شہزادہ آئے گا نہیں آچکا ہے۔“ اس کے لہجے میں غرور تھا۔

”کیا کیہ رہی ہو تم۔۔۔؟“ سہلی حیرت زدہ رہ گئی۔

”میری بھولی بہن تمہارا کیا خیال ہے میں کوئی معمولی شے ہوں؟۔۔۔ وہ اس شہر کے صنعت کار کا بیٹا ہے کسی شادی پر مجھے اس نے دیکھا تھا اور پھر بڑی مشکلوں سے مجھ تک پہنچا ہے۔ ابھی تو میں اسے طرح دے رہی ہوں۔ جب تک وہ پوری طرح پاگل نہیں ہو جاتا اس وقت تک میں اسے اپنا پلو پکڑانے والی نہیں۔“

”یہ پلو وغیرہ کے پکڑ میں کہیں اپنے آپ سے بھی چلی نہ جانا۔“ یہ کہتے ہوئے سہلی نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر بولی۔ ”ایسی کون سی شادی تھی جس میں وہ صنعت کار کا بیٹا اور تم اکٹھے شامل تھے؟“

سہلی نے جیسے اس کا جھوٹ پکڑ لینا چاہا تو وہ تیزی سے بولی۔

”میرے ساتھ وہ پڑھتی ہے نا تمہارا اس کی بڑی بہن کی شادی تھی۔ تاہم کا باپ ایک سفارت کار ہے۔“

”کیا نام ہے اس کا۔۔۔؟“ سہلی نے پوچھا۔

”وہ اس دنیا میں رہتا ہے تو کوئی نام تو ہوگا اس کا۔ تم چھوڑو تمہارے اس دماغ میں یہ سب کچھ نہیں آنے والا اور ہاں اب یہ ساری باتیں ماما کو نہ بتانے بیٹھ جانا ورنہ وہ بھی تمہاری طرح نصیحتوں کا پتھر لے کر بیٹھ جائیں گی۔“ اس نے حکمیر انداز میں کہا جیسے اگر سہلی نے یہ سب بتا دیا تو اس کے لیے اچھا نہیں ہوگا۔

”صفیہ! میں مانتی ہوں کہ ہمارا معیار زندگی بلند ہو چکا ہے اور ظاہر ہے ہم اپنے جیسے دولت مندوں سے ہی میل ملاقات رکھیں گے لیکن تم کیا سمجھتی ہو رشتے تاتے بھی۔۔۔؟“ اس نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا تاکہ وہ اسے کھل کر سکے۔

”ہاں رشتے تاتے“ بھی ہوں گے۔ تمہیں اگر ان کنگالوں کا خیال ہے تو میری زندگی کیوں برباد کرتی ہو خود کر لو اس سے شادی۔۔۔ چار پانچ سال ہی تو بڑی ہو اس سے کیا فرق پڑتا ہے ساری عمر کی روٹیاں لگ جائیں گی ان کی وہ تمہیں ہاتھوں ہاتھ لیس گے۔“ صفیہ نے مسکراتے ہوئے اس پر پلٹ کر کہا۔

”میں تمہیں سمجھا رہی ہوں لیکن تم میری خیال میں وہ بات سمجھ ہی نہیں رہی ہو۔“ سہلی نے شکوہ بھرے لہجے میں کہا۔

”پلو پلو۔۔۔ تم سیدھے کیوں نہیں کہہ دیتی ہو بات۔۔۔؟“

”ضروری نہیں ہے کہ وہ بھی تم سے شادی کرنے پر تیار ہو جائے۔۔۔ دیکھو جوڑے تو آسمانوں پر بنتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اس میں قسمت کا بڑا عمل دخل ہے مگر اس خواہش میں تم اپنا آپ مت گنوا لینا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا دولت مند باپ تمہاری وجہ سے اپنا منہ چھپاتا پھرے۔“

سہلی نے سنجیدگی اور دکھ سے یہ بات کہی تھی لیکن صفیہ نے ایک بھر پر قبضے میں آزادی پھر سنجیدگی سے بولی۔

”تم کیا سمجھتی ہو کہ میں میرے جذبات اور میری عزت کو نہیں ہے؟۔۔۔ بہت جھگی ہوں میں اتنی بھی کتنا بے ہوشی کی حد تک ہوں۔ اگر اس نے اس معاملے میں ڈراما بھی گڑبڑ کی تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔“

”لیکن عزت والہ نہیں آتی اگر ایک بار چلی جائے تو۔۔۔“ سہلی نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”یار! کیوں خواہ مخواہ ڈراما رہی ہو۔ تم بس ہمایوں سے شادی کرنے کے بارے میں سوچو تم دونوں بہت جلد ایک دوسرے کو سمجھ جاؤ گے۔ کیا خیال ہے؟“

صفیہ نے شرارت بھرے انداز میں کہا تو سہلی فقط اس کی جانب دیکھتی رہ گئی۔ اسے یوں لگا جیسے صفیہ کو سمجھانا بہت مشکل بات ہے۔ وہ نہ صرف اپنے خیالات میں بہت اُدھی اُڈان بھر چکی تھی بلکہ وہ اپنے تئیں اپنے مستقبل کے تانے بانے بھی بن چکی تھی۔ خیالوں میں کسی بھی معاملے کو بہت دور تک دیکھ لینا اور بات ہے لیکن عملی زندگی میں سو فیصد نتیجہ سامنے نہیں آتا شاید اس بات کا اندازہ اسے نہیں تھا۔ سہلی اس پر افسوس کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتی تھی وہ اس سچ پر آجکی تھی جہاں اس نے ہر حال میں اپنی مرضی کرنا تھی۔ سہلی کو اپنے بچپن کے وہ دن یاد آنے لگے جب دولت نے

عشق کا ہے عشق بتا

ان کے گھر کی راہ نہیں دیکھی تھی۔ ان دنوں وہ دونوں اپنے کھلونوں سے اکٹھے کھیلتی تھیں۔ ان کی سوچ ایک جھسی تھی اور خواہشیں بھی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب گھر میں دولت آنا شروع ہوئی تو ان میں بھی دوری ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ اب ان میں بہت فرق آچکا تھا۔ پندرہ نہیں یہ دوری دولت نے پیدا کی تھی یا پھر وہ عمر کے اس دور میں آگئی تھی جہاں ہر بندہ اپنی ٹینک تھی سے دنیا کو دیکھتا ہے اور اسے اپنے تئیں بہتر خیال کرتا ہے۔

”ارے کہاں کھو گئیں۔۔۔ کیا تم بھی کسی شہزادے کے بارے میں سوچ رہی ہو؟“

صفیہ نے اسے چمکاتے ہوئے کہا تو سہلی کو اس کا یہ انداز بہت برا لگا۔ تاہم اُس نے خود پر قابو پاتے ہوئے بہت قہل سے کہا۔

”سمیری بہن! امیری دعا ہے کہ تو پوری زندگی خوشیوں میں رہے، تمہ پر غم کا سایہ بھی نہ پڑے۔۔۔ بہر حال حقا رہنا ایک لڑکی کے لیے عزت سے بڑھ کر کوئی اور شے نہیں ہوتی۔“

”سنیں سمجھتی ہوں سہلی! تم بے فکر رہو۔۔۔“

سہلی بار صفیہ نے اُس کی بات کو سمجھنے سے لیا تھا۔ وہ بہت دیکھے لہجے اور بیار سے بولی تھی جس پر سہلی کو بہت پیارا آیا۔ تب اُس نے ذہنی ہوئی شام پر نگاہ ڈالی تو چونک گئی اور اُسٹھے ہوئے لولی۔

”آؤ صفیہ! اندر چلیں۔۔۔ شام ہوگئی ہے۔“

وہ دونوں وہاں سے اٹھیں اور اندر کی جانب چل دیں۔ دونوں ہی خاموش تھیں اور اپنے اپنے طور پر بہت کچھ سوچ رہی تھیں۔

☆ ☆

تہذیبی کے لیے ایک لمحہ یا پھر ایک نکتہ ہی کافی ہوتا ہے۔ وہ اگر کچھ میں آگیا اور دل نے اُسے پوری طرح سے تسلیم کر لیا تو بندے کی پوری شخصیت بدل کر رہ جاتی ہے۔ بعض اوقات ہوتا یوں ہے کہ انسان اپنے مقصد میں اس قدر مگن ہوتا ہے کہ اُسے اور گردنہ کھینے اور اس پر سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ وہ کلابو کے نکل کی مانند اپنی جدوجہد میں مصروف رہتا ہے لیکن جیسے ہی وہ سزا کھا کر دیکھتا ہے تو اُسے پتہ چلتا ہے کہ اُس نے تو کوئی سزا ہی نہیں کیا وہ وہاں کا وہی ہے۔ تب دکھ کی شدت کیا ہوتی ہے اس کا اندازہ ہی لگا سکتا ہے جس کا سفر رائیگاں جاتا ہے۔ چند کی بھی کچھ ایسی ہی کیفیت تھی۔ ذیشان نے سوچنے اور سمجھنے کے لیے اسے اتنا کچھ دے دیا تھا کہ پہلے کابل تو وہ چمکا کر رہ گیا پھر دھیرے دھیرے اُسے بہت زیادہ سمجھ آنا شروع ہوگئی۔ اُس کے بہت سارے ساتھی اپنے مقصد سے ہٹ چکے تھے۔ وہ تربیت یافتہ لوگ تھے اپنے لیے بہت ساری راہیں نکال سکتے تھے۔ جنید کے لیے بھی اس معاشرے میں کھل ل جانا مشکل نہیں تھا مگر وہ اچھی طرح سوچ سمجھ لینا چاہتا تھا کہ ذیشان بہک تو نہیں گیا اور اُسے بھی بہکانا چاہتا ہے؟۔۔۔ اس دن ذیشان نے اتنی باتیں کی تھیں کہ بہت کچھ تو وہ ویسے ہی بھول چکا تھا لیکن جو اُسے یاد رہا تھا اس پر نہ چاہتے ہوئے بھی وہ بہت زیادہ سوچ رہا تھا۔ حقیقت کس قدر تلخ ہوتی ہے اس کا اندازہ اُسے ان دنوں ہوا تھا۔ وہ ایک سوچ کا سرا پکا کر چلتا تو راہ میں نجانے کتنی الجھنیں اُس کے انتظار میں ہوتیں۔ جن سے وہ نکالیں بچا کر فرار نہیں ہو سکتا تھا۔ اُسے سب سے زیادہ دکھ کا سبب یہ تھا کہ اُس کا نہ صرف سینئر تھا بلکہ سیاسی

عشق کا ہے عشق بتا

جماعت کے راہنماؤں میں اچھی خاصی ساکھ بنا چکا تھا۔ اگرچہ وہ ابھی کل کر سامنے نہیں آیا تھا اور انہی کے ساتھ شامل تھا لیکن ذیشان کے مطابق وہ بہت جلد یہ عظیم چھوڑ کر کسی دوسری سیاسی جماعت سے اپنی سیاست کا آغاز کرنا چاہتا تھا۔ وہ عظیم میں دوہری زندگی گزار رہا تھا۔ وہ ڈہری زندگی کیا تھی ذیشان اک یہی معنی اس کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ یہ بات اس نے ایک ایسے انکشاف کی بنیاد پر کہی تھی جس کے بارے میں سوچ سوچ کر جنید کا دماغ گھوم گیا تھا۔ پھر اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اس انکشاف کے سرے کو پکڑ کر یہ معر ضرور حل کرے گا۔

ایک شام وہ عالمگیر کے اس شاندار ٹھکانے پر پہنچ گیا جہاں وہ بیٹھ کر بہت اہم فیصلے کر چکے تھے ذیشان اُس سے پہلے ہی پہنچ گیا تھا۔ وہ ٹھکانہ بظاہر ایک عام سی کوشی تھی لیکن اس کے اندر تمام تر سہولیات میسر تھیں۔ اس وقت سیکورٹی کے نام پر دو لڑکے موجود تھے جنہوں نے ریوالور چھپا کر رکھا ہوا تھا۔ وہ جب پہنچا تو عالمگیر اور ذیشان ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔

”ارے آؤ جنید! بہت دن ہو گئے تم سے ملاقات کیسے ہوئے۔“ عالمگیر اُس سے بظنکیر ہوتے ہوئے بولا۔

”شاید یہ وقت مزے طویل ہوتا اگر تمہارے بارے میں باتیں معلوم نہ ہوتیں۔۔۔“

جنید نے گہری سچیدگی سے کہا تو ایک لمحے کے لیے عالمگیر نے اُس کی جانب غور سے دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے بولا۔

”ارے یا ذبا تمیں تو ہوتی رہیں گی۔۔۔ ٹھنکو۔“ جنید ذیشان سے بھی ہاتھ ملا کر بیٹھ گیا تو عالمگیر نے کہا۔ ”بھلاؤ کیا بچے گئے؟“

”کچھ بھی نہیں۔۔۔“

جنید نے اُس کے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تو عالمگیر نے قدرے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”گتے ہے جیسے تمہیں مجھ سے بڑے شکوے ہیں۔۔۔ ایسی کیا خاص بات ہے؟“

”ایک بات نہیں عالمگیر! بہت ساری باتیں ہیں۔“ اس بار ذیشان نے کہا تو عالمگیر نے جھٹک کر دیکھا لیکن اُس نے اپنی بات جاری

رکھی۔ ”اگر تم ہماری باتوں کا جواب ٹھیک ٹھیک دے دو گے تو اچھا ہوگا۔“

”ورنہ۔۔۔؟“ عالمگیر نے بدلتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”ورنہ تمہیں پتہ ہے کہ کیا ہو سکتا ہے۔“

ذیشان نے سرد لہجے میں کہا ”اُس کی نگاہیں عالمگیر کے چہرے پر تھیں۔ جب عالمگیر نے بھی اسی لہجے میں پوچھا۔

”تم کیا عظیم کے حکم پر آئے ہو۔۔۔؟“

”نہیں ہم اپنے طور پر آئے ہیں۔۔۔“

ذیشان نے ویرے سے حتی لہجے میں کہا تو عالمگیر نے گہری سانس لی اور پھر مسکراتے ہوئے بولا۔

”پھر میں آپ لوگوں کو قاتل کر لوں گا اور یقین جانو میں ہر بات سچ بتاؤں گا۔۔۔ پوچھو۔۔۔؟“

”تم نے سیٹھ فیروز کو کس لیے قتل کیا۔۔۔ اُس کے بارے میں کوئی عظیمی حکم نہیں تھا؟“

ذیشان نے پوجھا تو جنید بھی پوری طرح بہترن گوش ہو گیا۔

”وہ۔۔۔ ہاں وہ۔۔۔ میں نے اس سے صرف پانچ لاکھ مانگے تھے اس نے نہیں دیے تو میں نے اسے ختم کر دیا۔“ وہ انتہائی غم سے

بولتا۔

”جانتے ہو یہ تنظیم کے مقصد۔۔۔“

”۔۔۔ کے خلاف ہے یہی کہنا چاہتے ہو نا تم؟۔۔۔ میں ماننا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے دونوں کی طرف دیکھا اور پھر بڑے ہی طنزیہ

انداز میں کہا۔ ”کیا تم لوگ یہ سوال نہیں کر دے گے کہ میں نے ایسا کیوں کیا؟“ اس کے استفسار پر دونوں خاموش رہے تو وہ کہتا چلا گیا۔ ”میں ماننا ہوں

کہ یہ کام اور اس جیسے کئی اور کام تنظیم کے بنیادی مقاصد کے خلاف ہیں مگر کیا کروں؟ میں بھی انسان ہوں اور اس دنیا میں رہتا ہوں۔ میں جنید کی

طرح اپنا گھر نہیں چھوڑ سکتا۔ میں نے ایک زمانہ دیکھا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب کیا ہو رہا ہے اور کچھ عرصے کے بعد کیا ہونے والا ہے۔؟“

”تم ایک لفظ بھی ہمارے سوال کے جواب میں نہیں بول پائے ہو نا تمسیر۔۔۔؟“ جنید نے سختی سے کہا۔

”دھیرج ذرا چھری تلے دم تو لڑیوارے۔۔۔ میں اپنی بات کہتا ہوں کہ میں ذہری زندگی گزار رہا ہوں۔ اسکا تنظیم کے بڑوں کو بھی علم

ہے۔ انہوں نے مجھ سے کئی ایسے کام کرائے ہیں کہ سونگے تو تمہارا دامناغ بھک سے اڑ جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ اگر وہ لوگ تمہارے سامنے مقدس

ہیں تو رہیں میں تم لوگوں کو اگر سب کچھ بتا بھی دیتا ہوں تو وہ بڑے میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے کیونکہ وہ بھی اس تمام میں ننگے ہیں۔ جب مقاصد کی جگہ

مفادات آ جائیں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔۔۔ کیا تم لوگوں کو معلوم ہے کہ ہماری تنظیم کے کارکن پولیس سے فورمز سے مفاہمت کر رہے ہیں۔ انہیں حتمی

حیثیت دے کر اپنا تعلق اس تنظیم سے ختم کر رہے ہیں۔ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟۔۔۔ تم لوگ خود کچھ دار ہو چکا ہے۔ تمہارا ختم ہو جاتا ہے تب ایسے ہوتا ہے۔“

”تم بھی اپنا تعلق کیوں نہیں ختم کر دیتے ہو۔۔۔؟“ جنید نے جذباتی انداز میں کہا۔ ”کیوں بدنام کرنے پر تلے ہوئے ہو۔۔۔؟“

”سنیں نہیں۔۔۔ خیر چند دنوں تک تم لوگوں کو خود معلوم ہو جائے گا۔ مفادات کے لیے جب اور جن لوگوں سے ہمارے بڑوں کی

مفاہمت ہوگی تو تم احتجاج بھی نہیں کر پاؤ گے۔“

”عالمگیر! تم معلومات دے کر یا پیشین گوئیاں کر کے اپنا دامن نہیں بچا سکتے ہو۔ تم تنظیم کے نام پر انسانیت سوز کام کر رہے ہو جس کا تنظیم

سے تو کیا انسانیت کا بھی تعلق نہیں ہوتا۔ تم نے۔۔۔ تم نے ایک لڑکی کو اغوا کر کے اس کے ساتھ ظلم کیا۔۔۔“

جنید حد درجہ جذباتی ہو گیا جس پر عالمگیر دھیرے سے توجہ لگاتے ہوئے بولا۔

”تو پھر مجھے اپنی تنظیم سے نکال باہر کر دو کیوں رکھا ہوا ہے مجھے۔۔۔؟“

”تم جیسے لوگوں کی وجہ سے اعلیٰ و ارفع مقاصد کی پامالی ہوتی ہے۔ تم جیسے شیطان جب ظلم ترین لوگوں میں شامل ہوتے ہیں تو سب کچھ

غلط کر دیتے ہیں۔ اب بھی وقت ہے اس ظلم کا کفارہ ادا کرو اس لڑکی سے شادی کر لو اور تنظیم سے اپنا تعلق ختم کر کے گناہ زندگی گزارو۔ اسی میں تمہارا

ہلا ہے۔“ جنید نے کہا۔

”بھگیم نے اب تمہارے جیسے لوگوں کو سب سے بھی رکھ لیا ہے۔۔۔ جاؤ جا کر پوری دنیا میں ڈھنڈورا پیٹو۔ میرے پاس کیا لینے آئے ہو؟“

عالمگیر کا لہجہ سرد تھا۔

”تمہیں پیار سے سمجھانے آیا ہوں کہ کچھ جاؤ۔“ ذیشان نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔

”اور اگر نہ سمجھوں تو۔۔۔؟“ عالمگیر نے انتہائی غصے میں فرماتے ہوئے کہا۔

”ہم خدا تو برواشت کر لیتے ہیں لیکن بے غیرت نہیں۔ تمہیں اپنے کیے کی سزا بھگتنا پڑے گی۔“

ذیشان نے کہا تو اگلے ہی لمحے عالمگیر نے ریو اور نکل لیا پھر اسی لہجے میں بولا۔

”دُعا ہو جاؤ یہاں سے۔۔۔ میرے ہی گھر میں بیٹھ کر مجھے ہی دھمکیاں دے رہے ہو کیا سمجھا ہے تم لوگوں نے مجھے؟ میں تمہیں شتم

بھی کر دوں تو مجھے کوئی کچھ نہیں کہہ سکے گا۔۔۔ جاؤ کسی اچھے وقت کی خاطر میں تمہیں جانے کی اجازت دے رہا ہوں۔ اٹھو اور چلے جاؤ۔“

ذیشان اور جنید دھیرے دھیرے اٹھ گئے۔ جنید کو بہت زیادہ افسوس ہو رہا تھا کہ ایسا نہیں ہونا چاہئے تھا وہ تو یہ سوچ کر آیا تھا کہ ممکن ہے

ذیشان کو غلط فہمی ہوگئی ہو لیکن عالمگیر اس طرح سب کچھ مان کر انہیں ڈیل کر کے کا ایسا اُس کے ذہن میں دو درونک نہیں تھا۔ وہ برواشت نہیں کر

پارہا تھا۔ اُس کے اندر سب کچھ جھٹاکوں سے ٹوٹتا چلا جا رہا تھا۔ سچی اُس نے زندگی اور موت کی پرواہ کئے بغیر پلٹ کر ریو اور پر ہاتھ ڈال دیا اور

پوری قوت سے وہ ریو اور چھیٹے ہوئے اُس کے گھونٹ مارا جو اُس کی گردن پر لگا۔ وہ ڈکارتے ہوئے قالین پر گرنا اور اُس کے ہاتھ سے ریو اور نکل کر

اُس سے قدرے فاصلے پر گرنا جسے اٹھانے کے لیے عالمگیر لپکا تو جنید اُس کے اوپر جا پڑا۔ اسی چھینا جھینٹی میں ایک دھماکہ ہوا۔ گولی چل چکی تھی ذیشان

نے دیکھا گولی عالمگیر کے پیٹ میں لگ چکی تھی جس سے خون اُٹنے لگا تھا۔ فائر کی آواز سن کر سیگورٹی والے لڑکے ڈرائنگ روم میں تیزی سے داخل

ہوئے تو ذیشان نے اپنا ریو اور نکال کر انہیں کور کر لیا۔

”ہاتھ اوپر کر لو۔“

انہوں نے ہاتھ اوپر کر لیے تو ذیشان نے انہیں نہج کر دی پھر لہجوں میں انہیں ہانڈھ کر پیچک دیا۔

”کلو۔“

ذیشان نے کہا تو جنید نے انتہائی نفرت سے عالمگیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں ذیشان! ابھی یہ زندہ ہے۔ میں اس کی زندگی بچانے کی بھرپور کوشش کروں گا۔ اس کی طرف سے ابھی میرا دل نہیں بھرا۔“

”کیوں بے وقوفوں جیسی باتیں کرتے ہو۔ تمہیں جو معلوم کرنا تھا وہ۔“ یہ کہتے ہوئے ذیشان چونک گیا۔ اس کے ذہن میں ایک اور

خیال آ گیا تھا۔ اگلے ہی لمحے اُس نے کہا۔ ”چلو اٹھاؤ اسے میں گاڑی لٹا رہا ہوں۔۔۔“

یہ کہتے ہوئے وہ باہر نکلا تو جنید نے اُسے اٹھا لیا اور باہر کی جانب لپکا۔

☆☆

دوہبر سے نکل جہد ماڈل کی سیاہ کار شہر سے دور ایک نبر کے ساتھ جاتے ہوئے کچے راستے پر سڑکی اور پھر تھوڑے سے فاصلے پر نبر سے مشرق کی جانب پختہ راستہ آ گیا جو سیدھا ایک فارم ہاؤس میں جا کر ختم ہو جاتا تھا۔ اس فارم ہاؤس میں لکڑی کا کام بہت زیادہ ہوا تھا۔ ڈور سے بنی لگتا تھا کہ جیسے درختوں، خوبصورت پھولوں سے لدی بیلوں اور پودوں سے ڈھکی یہ کانچ لکڑی ہی کی بنی ہوئی ہے۔ سبز گھاس سے مزین بڑے بڑے لان کے عین درمیان میں بنی کانچ کسی مٹھی ملک کی طرز پر بنائی گئی تھی۔ ایک جانب ملا زمین کے کوارٹر تھے۔ جہاں قدرے زندگی کی چمک پہل تھی جبکہ دوسری طرف ہو کا عالم تھا۔ وہ کار پورچ میں جا کر ڈک گئی جس کے زکے ہی ایک نوجوان نکلا۔ سرخ و سپید چہرہ، کلین شیڈ، تھکے نقوش، گہری آنکھیں۔ اُس نے نیلی پٹی کپ قسم کی ٹوپی سر پر لی ہوئی تھی، کالی چٹون اور آف وائٹ شرٹ کے ساتھ وہ خاصا پینڈ سم دکھائی دے رہا تھا۔ وہ دوسری طرف سے گھوم کر آیا اور دروازہ کھولا۔

”آئیے، ہاری منزل آ چکی ہے۔“

اُس نے خوشدلی سے کہا تو اس میں سے تھوڑی سی کنفیوژن باہر آئی۔ وہ اس ماحول کو دیکھتے ہوئے اپنی حیرت کو چھپانا ہی چاہتی تھی۔

”کیا دیکھ رہی ہو۔۔۔؟“ تیمور نے پستے ہوئے کہا۔

”آں۔۔۔ ہاں نہیں۔۔۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ یہ کانچ کتنا اچھا لگ رہا ہے۔“ صنیہ نے فوراً خود پر قابو پاتے ہوئے اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔

”صنوا اس کانچ کا سارا ڈیزائن میں نے بنایا ہے یہاں کڑے ہو کر میں نے اپنی مگرانی میں یہ بنوایا اور اس پر خرچ ہونے والا سارا سرمایہ میرا اپنا ذاتی تھا، پاپا کا ایک روپیہ بھی خرچ نہیں ہوا اس پر۔“ اُس نے فخریہ انداز میں بتاتے ہوئے مزید کہا۔ ”میں جب برطانیہ میں تھا تو میں نے بہت سارے پیسے جمع کیے تھے۔ میری خواہش تھی کہ میں ایک ایسا فارم ہاؤس بناؤں جو ایک بار میں نے رچرڈل میں دیکھا تھا۔ وہ پورا نقشہ میرے ذہن میں رہا اور پھر یہ بن گیا۔“ تیمور نے یوں کہا جیسے وہ خود کھلی کر رہا ہو یا پھر یہ سب بتانے میں اُسے بہت لطف آ رہا ہو۔

”بہت خوبصورت ہے۔“ صنیہ نے اس کانچ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں یہ تمہیں لگتا ہے لیکن میرے لئے ابھی دو وجوہ کی بنا پر ادھوری ہے ایک یہ کہ جس طرح کا ماحول رچرڈل میں تھا وہ یہاں نہیں ہے۔ وہ گہرا ایٹلا آسمان گہرے ہادل سرسئی اور دو دو صیابھیگا ہونا ماحول۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔“

”اور دوسری۔۔۔؟“

صنیہ نے لاشعوری انداز میں پوچھا تو اُس نے چمکتے ہوئے تیزی سے کہا۔

”تم۔۔۔ جب تم ڈیٹن بن کر میرے ساتھ اس کانچ میں رہو گی۔“ اُس نے صنیہ کی آنکھوں میں جھانکا، اُس کا لہجہ بہت غمور ہو گیا تھا۔

صنیہ نے شرم سے منہ دوسری جانب پھیر لیا، تب اُس نے کہا۔ ”آؤ اندر چلتے ہیں میں نے اسے سجایا بھی ویٹرن سٹائل میں ہے۔ آؤ۔“

یہ کہتے ہوئے اُس نے اندر کی جانب قدم بڑھا دیے۔ تبھی اندر کا دروازہ اپنے آپ کھل گیا اندر اسکا ملازم اپنی بیوی کے ساتھ کھڑا تھا۔

”سلام صاحب۔۔۔!“ دونوں نے تقریباً ایک زبان ہو کر کہا۔

”وعلیکم السلام۔۔۔ کہو تم لوگ ٹھیک ہو نا۔۔۔؟“ تیمور نے ان پر نگاہ ڈالتے ہوئے پوچھا۔

”جی ہاں لگ بھگ ہیں۔۔۔ آئیں صاحب!“

ملازم نے انتہائی خوشامد انداز میں کہا تب تیمور نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور صفیہ سے بولا۔

”آؤ نا۔۔۔!“

وہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی ڈرائنگ روم میں آگئی۔ اُسے لگا جیسے وہ کسی ظلم کا سینہ دیکھ رہی ہے یا پھر اچانک وہ غیر ملک میں آگئی

ہے۔ وہ ڈرائنگ روم بالکل یونہی تھا جیسے کسی مغربی ملک سے اٹھا کر یہاں پر لے آیا گیا ہو۔ وہ گہری نگاہ سے ارد گرد دیکھ رہی تھی کہ تیمور بولا۔

”پہلے یہ کھج دیکھ لی جائے پھر سکون سے بیٹھ کر گپ شپ لگاتے ہیں۔۔۔“

”بعد میں دیکھیں گے۔۔۔“

صفیہ نے کہا اور ایک صوفے میں جھنس گئی۔ اُس کے ملازمین جا چکے تھے۔ ان میں خاصوش ذرا آئی پھر تیموری نے کشنگو کا سلسلہ جوڑا۔

”تم صفا اس وقت آئی تمہارا کیوں گئی تھیں جب میں نے شادی کا ذکر کیا تھا؟“

”یہ باتیں قبل از وقت ہیں تیمور۔۔۔!“ صفیہ نے دھیرے سے کہا۔

”ہوں گی لیکن تمہارے لیے۔۔۔ میں تو فیصلہ کر چکا ہوں۔“ وہ حتمی انداز میں بولا۔

”اتنی جلدی۔۔۔؟“ وہ حیرت سے بولی۔

”ہاں۔۔۔ میں تو فیصلہ کر چکا ہوں لیکن تم پر اپنا فیصلہ مسلط نہیں کروں گا۔ جب تم چاہو گی تب ہی میں اپنے والدین سے کہوں گا کہ وہ

تمہیں مانتے کے لیے تمہارے پاپا کے گھر جائیں۔ تم اپنا فیصلہ کرنے میں جتنی دیر مرضی لگاؤ مگر جب کرو تو اتنی مضبوطی سے کہ پھر کوئی اور سوچ تمہیں
ڈسٹرب نہ کر سکے۔“ اُس نے مسکراتے ہوئے اپنی بات کہ دی۔

”میں نے ابھی پڑھنا ہے اپنا آپ آنا ہے۔ تم اس وقت تک میرا انتظار کر لو گے۔۔۔؟“

تیمور صفیہ کے چہرے کی جانب غور لگا ہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”صفیہ! میری زندگی میں بہت ساری لڑکیاں آئیں اور گئیں۔ یورپ

میں بہت سارا حسن دیکھا لیکن جب سے میں نے تمہیں دیکھا ہے پہلی نگاہ میں ہی میں نے فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ جو ایک چہرہ کہیں من میں چھپا ہوتا ہے
تم ہالک دیکھی ہو۔ میری یہ خوش قسمتی ہوگی کہ تم میری ہو جاؤ۔ یہ۔۔۔ میں تمہیں اپنے جذبات بتا رہا ہوں۔ میری خواہش ہے۔ تمہیں کونفیس نہیں کر
رہا ہوں۔ تم سوچو سمجھو اور پھر جو فیصلہ کرو۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو تیمور! تم اپنی تعلیم مکمل کر چکے ہو اپنے باپ کے ساتھ بزنس دیکھ رہے ہو۔ اب تم شادی کرنا چاہو گے لیکن میرے پاس

ابھی یہ فیصلہ کرنے کا اتنا حوصلہ نہیں ہے میں۔۔۔“

وہ بڑی مشکل سے کہہ پارہی تھی کہ تمور نے اُسے نوک دیا۔

”چھوڑو! صفو! یہ سب مستقبل کی باتیں ہیں۔ ابھی ہم بہت سارا وقت اچھے دوستوں کی طرح انجوائے کریں گے پھر فیصلہ بھی ہو جائے گا“ تم لینٹن مت لو۔“ اُس نے مسکراتے ہوئے کہا تو صفیہ ایک دم سے خوش ہو گئی۔ وہ اس کی طرف گہری نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ جیسے کوئی بچا اپنے من پسند کھلونے کو دیکھتا ہے۔ ”تم ہستے ہوئے بہت اچھی لگتی ہو۔“

تمور نے کہا تو صفیہ پھر سے شرمانی۔ دونوں کے درمیان پھر سے خاموشی ڈر آئی۔ یوں کتنا ہی وقت بیت گیا۔ وہ یوں بیٹھے رہے جیسے خاموشی بھی ایک زبان رکھتی ہو۔ اُن کی یہ خاموشی اس وقت ٹوٹی جب دونوں ملازم میاں بیوی چائے کے ساتھ کافی سارے لوازمات رکھے وہاں آ گئے۔

”میں چائے بنا لوں گی۔“ صفیہ نے کہا تو وہ دونوں چلے گئے تب اُس نے پوچھا۔ ”یہاں یہ وہی رہتے ہیں جبکہ باہر۔“

”یہاں کم از کم تیرہ ملازمین ہیں۔ اچھا لگتا ہے مجھے یہاں آنا میں ہر چھٹی کے دن یہاں ضرور آتا ہوں۔ یہ قارم ہاؤس عیارا تو ہے لیکن۔۔۔“ وہ کہتے کہتے رُک گیا۔

”لیکن کیا۔۔۔؟“ وہ تجسس سے بولی۔

”تم سے زیادہ خوبصورت نہیں ہے۔ یہ گہری آنکھیں یہ خوبصورت لب۔۔۔“ وہ اسے شمار پھرے لہجے میں کہہ رہا تھا کہ صفیہ سے چائے چمک گئی۔ تب وہ بولا۔ ”دھت تیرے کی سارے رومانس بھرے موڈ کا ستیا ناس مار دیا۔“

اس پر صفیہ کھنگھلا کے ہنس دی پھر چائے کا کپ اُسے صحتاے ہوئے بولی۔

”یہ تم مرد شادی سے پہلے عورت کی بڑی تعریفیں کرتے ہو۔ اُسے حوز پر ہی اپسرا اور نجانے کیا کیا کہہ کر تعریفیں کرتے ہو لیکن جیسے ہی وہ بیوی بن جائے تو وہ حوز پر ہی الہراے چاری چہل ڈانڈ اور نجانے کیا کیا جاتی ہے۔ ٹھیک کہہ رہی ہوں نا میں۔؟“

”نہیں! فلفل کہہ رہی ہو۔ کم از کم میں اپنے معاملے میں ایسا ہونا ہوا محسوس نہیں کر رہا ہوں کیونکہ میری صحیحوں کی جو شدتیں ہیں نا وہ شادی کے بعد ہی شروع ہوں گی۔ اس وقت تم نہ صرف میری قانونی بیوی ہوگی بلکہ ہم آزادانہ گھوم پھر سکیں گے۔ وہ جو درمیان میں ایک پردہ ساحل رہتا ہے وہ نہیں رہے گا۔۔۔ یقین رکھنا! صفو! شادی کے بعد ہی میری محبت میں جولا نیاں آئیں گی۔“

”جس کے بارے میں کم از کم میرا بھی کوئی فیصلہ نہیں ہے۔۔۔“

”میں مانتا ہوں۔۔۔“ تمور نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”اچھا خیر! چھوڑو۔۔۔ وہ تم کوئی خاص بات کرنا چاہ رہے تھے؟“ صفیہ نے اُسے یاد دلایا۔

”ہاں وہ بات۔۔۔“ جیسے وہ اہم بات اُسے یاد آگئی ہو تب وہ سنجیدگی سے بولا۔ ”صفو! میں آج تمہیں یہاں صرف اس لیے لایا تھا کہ مستقبل کے بارے میں ہم تھوڑا پلان کریں گے۔ جو بہر حال باتوں ہی باتوں میں مجھ پر واضح ہو گیا ہے لیکن ایک بات اب بھی وضاحت طلب

ہے۔

”وہ کون سی؟“ صفیہ نے لاپرواہی سے پوچھا۔

”وہ یہ کہ میں نے یہ سنا ہے تمہاری منگنی تمہارے کسی کزن کے ساتھ ہو چکی ہے۔ کیا جی ہے؟“

”تمہیں یہ سب کیسے پتہ چلا؟“

”تاہم سے وہ یونہی باتوں ہی باتوں میں کہہ گئی تھی۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ۔۔۔“

”میری کوئی منگنی نہیں ہوئی، میں کسی بچپن کی منگنی کو نہیں مانتی اور اگر ہے بھی تو اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے نہ میری نظر میں اور نہ پاپا کی نگاہ

میں۔۔۔“

”تو اس کا مطلب ہے کہ منگنی ہوئی تھی لیکن تم اور تمہارے گھر والے نہیں مانتے۔“

”ہاں۔۔۔ اور پلیز تم اس کا نام مت لو۔ کوئی اور بات کرو۔“

اُس نے خالی کپ رکھتے ہوئے کہا ”اسی لمحے تیمور نے بھی کپ رکھ دیا۔“

”آؤ تمہیں فارم باؤس دکھاتا ہوں۔ پھر ہمیں واپس بھی جانا ہے۔“

صفیہ نے یہ سنا تو اس کے ساتھ اٹھ گئی۔ بظاہر اُس کا موڈ بہت اچھا تھا، وہ تیمور سے بہت دلربا بنا تھا، از میں باتیں بھی کرتی جا رہی تھی لیکن

اندر سے وہ منگنی والی بات پر بہت کڑھ رہی تھی۔ اُس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ہمایوں سامنے آ جائے تو اُسے جان ہی سے مار دے۔۔۔ ہمایوں سے

اُس کی عزت مزید بڑھ گئی تھی۔

☆☆

بہت دنوں بعد اس صبح ہمایوں گھر سے نکلا تھا۔ شاید اس دن بھی وہ اپنے گھر میں اپنے ہی کمرے میں خود کو قید کئے رکھتا لیکن رات اُس

کے پروفیسر جعفری صاحب کا فون آیا۔ وہ اُسے اپنے کسی کام کے سلسلے میں بلا رہے تھے اور اُس نے آنے کے لیے کہہ دیا تھا۔۔۔ بہت دنوں بعد

جب وہ گھر سے نکلا تو شہر کی نضا اُسے اچھی نہیں لگی تھی، کوئی مہنگی اُس کے دل کو نہیں بھائی تھا۔ وہ دھیرے قدموں سے بس اسٹاپ کی طرف بڑھتا

چلا گیا، نہ کسی چہرے پر نگاہ ڈالی اور نہ راستوں کی خبر رکھی۔ اُس کے ذہن میں کیا سوچ چل رہی تھی، کسی کو اس کے بارے میں اندازہ ہی نہیں تھا۔ وہ

پروفیسر جعفری کے پاس کالج پہنچ گیا تو انہوں نے مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ اُس کا استقبال کیا۔ حال احوال کے بعد پروفیسر نے ایک طرف

بڑھتے ہوئے کہا۔

”آؤ ادھر لان میں سکون سے بیٹھتے ہیں۔“

وہ اُن کے ساتھ کالج ہی کے لان میں ایک تنہا گوشے کی طرف چل پڑا۔ اطمینان سے بیٹھنے کے بعد انہوں نے کہا۔ ”بیٹا! مجھے تمہارے

بارے میں معلوم ہوا ہے کہ پولیس نے تم سے زیادتی کی ہے اس کا بے حد افسوس ہے۔“

”سر! آپ کو کیسے معلوم ہوا۔۔۔؟“ اس نے ویرے سے پوچھا۔

”تمہارے انہی دوستوں سے جو تمہیں وہاں چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ بہت غلط کیا تھا انہوں نے۔“ پروفیسر نے کہہ کر چند لمبے خاموش رہے اور پھر بولے۔ ”دوستی کا معیار ہی نہیں رہا۔ میں سمجھتا ہوں کہ دوست چاہے غلط کرے یا صحیح، ہر حال میں دوست کا ساتھ دینا چاہئے۔ یہ الگ بات ہے کہ دوست کو کسی بھی غلط کام سے روکا جاسکتا ہے۔ وہ دوست ہو ہی نہیں سکتا جو اپنے دوست کو تنہا چھوڑ دے۔“

”جی سر! لیکن بہت سارے لوگ جو اپنے ہی بنائے ہوئے معیار پر پورا نہیں اترتے انہیں کیا کہا جاسکتا ہے؟“ اس نے جتنی رو میں نکلتے ہوئے کہا۔

”جی ہاں! لیکن بہت سارے لوگ انتہائی خود غرض اور پرلے درجے کے احمق ہوتے ہیں! اسی کا نام تو منافقت ہے۔۔۔ خیر ہم نے یہاں معیار کی بات کی ہے تو ایسے معیار اصول یا ضابطے بنا لینا بہت آسان ہوتا ہے لیکن ان پر عمل پیرا ہونا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ایک نگاہ سے دیکھیں تو زندگی انتہائی مختصر ہے لیکن جب یہی بات کسی ایسے شخص سے پوچھی جائے جو کسپری کی زندگی گزار رہا ہے تو اسے یہ زندگی بہت طویل لگے گی۔ درد کی شدت میں تو ایک رات کا شفا مشکل ہو جاتا ہے۔“ پروفیسر نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”جی ہاں سر! اور ضروری نہیں کہ درد کسی ظاہری زخم ہی کا ہو۔ احساسِ عدمِ اطمینان، شرمندگی اور اپنی کم مائیگی کا احساس تو بندے کو ویسے ہی مار ڈالتا ہے۔“

ہمایوں نے تجلی سے کہا تو پروفیسر چونک اٹھے۔ جب انہوں نے بڑے گھمبیر لہجے میں کہا۔

”دیکھو میں زندگی کی نصف صدی گزار چکا ہوں۔ بے شمار تجربات میرے سامنے ہیں۔ میں صرف قانون ہی نہیں پڑھاتا بلکہ قانون اور جرم کی نفسیاتی وجوہ پر بھی نگاہ رکھتا ہوں۔ مجھے احساس تھا کہ پولیس کی یہ زیادتی تمہیں نفسیاتی طور پر تباہ کر دے گی اور اس کے اثرات میں تمہاری ان باتوں سے محسوس کر رہا ہوں۔ میں سمجھ سکتا ہوں کہ اس وقت تمہارے من میں کیا چل رہا ہوگا۔ بیٹے! اس احساس کو اپنے اندر سے نکال دیکھو ورنہ یہ تمہیں دیمک کی مانند چاٹ جائے گا۔“

”کیا ایسا ممکن ہے پروفیسر صاحب۔۔۔؟“ کبلی ہار اس کے لہجے میں طرغور کرتا تھا۔

”ہاں ایسا ممکن ہے۔“ پروفیسر نے اس کے لہجے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ”اس میں انسان کو تھوڑا اخلاقی جرأت سے کام لینا پڑتا ہے۔ دیکھو زندگی گزارنے کے لیے صرف دو راہیں ہیں، حقیقی اور مثبت۔ تیسری کوئی راہ نہیں ہے۔ ہمارے ماحول میں حقیقی اور مثبت دونوں رعبان موجود ہیں۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ ہمارے ارد گرد کے حالات ہی ہمیں یا تو حقیقی راہ پر چلنے کا اشارہ دے دیتے ہیں یا مثبت کا لیکن یہ نہیں دیکھتے کہ نتیجے کے اعتبار سے کون سا رعبان درست ہے۔ بس ہم اندھا دھند بڑھتے چلے جاتے ہیں اور پھر ایک بات اور ہے ہماری! ان کا مقصد بالکل نہیں ہوتا یا اگر ہوتا ہے تو وہ کوئی اعلیٰ و ارفع نہیں ہوتا۔ جس سے کم از کم انسانیت کا بھلا ہو بلکہ اسے مشکل ترین تصور کر کے اسے اپنا ہی نہیں جانتا۔ ہر شخص آسانی تلاش کرتا ہے، شارت کٹ اور موٹا ہے حالانکہ شارت کٹ ہمیشہ خطرات سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔“

”سر! آپ نے بڑی آسانی کے ساتھ مثبت اور منفی رجحان کے بارے میں بتا دیا۔ ہمارے معاشرے میں دن بدن گھٹن بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ ہمارا مجموعی رویہ کچھ اچھا نہیں ہے ہر شخص میں فحش بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ میرا سوال یہ ہے کہ انہیں بالکل ہی نہیں دیکھا جا رہا ہے یہ بھی تو ظلم ہے! جب معاشرے میں ظلم بڑھے گا تو اس کے رد عمل میں کچھ نہ کچھ تو ہوگا۔“

”ہاں ظلم کا رد عمل بغاوت ہوتی ہے۔ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔۔۔ دراصل ہمارے معاشرے میں طبقاتی تفاوت بہت زیادہ ہے۔ جہاں معاشی طور پر لوگ غریب یا امیر ہیں وہاں پر غریب یا امیر ہونے کی نفسیاتی وجہ بھی ہے۔ غریب امیر ہونے کی کوشش میں ہے اور امیر امیر ترین بن جانے کے چکر میں ہے۔ یہ دوڑ ہے اس میں بہت سارے کچلے چلے جا رہے ہیں لیکن کیوں نہ ہم اس دوڑ میں شامل ہی نہ ہوں تب کچلے جانے کا امکان نہیں ہوگا۔“

”آپ کا مطلب ہے کہ ہم معاشرے سے الگ ہو کر بندھ جائیں؟“

”ہاں! میں نے تیزی سے کہا تو پروفیسر مسکرائے اور بڑے قہقہے سے بولے۔“

”میں یہی بات تم سے کہلواتا جا رہا تھا کہ جب ہم معاشرے سے کسی طور پر بھی الگ نہیں ہو سکتے ہیں تو پھر کیوں نہ ہم صحت مند رجحان کے ساتھ مثبت راہ کو چنیں اگرچہ یہ بہت مشکل کام ہے مگر ہمیشہ باصلاحیت لوگ مشکل معاملات ہی کو اہلتے ہیں۔ تم باصلاحیت ہو، ہاں! ایک ذرا سا حادہ معاشرے کا منفی حادثہ ہمیں تو زچھوڑ دے گا۔ کیا تم اتنے کمزور ہو؟“ نہیں! میرے بیٹے انہیں۔ وہ جو کوئی نہیں کر سکتا وہ تم کرو۔ منفی سوچ منفی رجحان اور منفی رویے کو اپنے وجود سے نکال باہر کر ڈیکھی تمہاری جیت ہے۔“

پروفیسر نے انتہائی جذباتی انداز میں کہا تو ہاں! میں نے یوں محسوس کیا جیسے شفاف پانی میں دھیرے دھیرے کوئی رنگ گھلتا چلا جائے جیسے مایوسی کے اندھیرے میں کوئی کرن روشنی نکیرتی چلی جا رہی ہو یا پھر کوئی بے ہوش وجود ہوش میں آتے ہوئے دھیرے دھیرے بڑھتی ہوئی آوازوں کو پہچاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ تب اس نے اچانک کہا۔

”سر! میں مانتا ہوں کہ اچھے مقصد کا سچ اگر من میں بویا جائے تو اسے اپنے خون سے سیراب کرنا پڑتا ہے لیکن سر! تیار اور رشت ہو جانے کے باوجود اگر اس پر کوئی پھل نہ آئے تو۔۔۔؟“

”یہ سوچ ہی غلط ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ درخت ثمر بار نہیں ہوگا۔ اس کا پھل ہمیشہ میٹھا ہوتا ہے اور پھر مقصد بھی تو محبت کی مانند ہوتا ہے جو کسی غرض کے بغیر کی جاتی ہے۔ محبت کے بدلے میں کچھ ماگنا ایک طرح سے غرض ہے اور محبت غرض نہیں ہوتی۔“

”سر! محبت کو بھی تو خون جگر دینا پڑتا ہے۔“

”بالکل۔۔۔ محبت جب عشق میں ڈھلتی ہے تو اس میں اپنا آپ تو رہتا ہی نہیں ہے سب کچھ محبوب کا ہوتا ہے۔ پھر اپنی مرضی کہاں رہ جاتی ہے۔ نہ کوئی خواہش نہ کوئی امید۔۔۔ ہاں! جب مقصد ہوتا ہے تو اسے حاصل کیا جاتا ہے۔ چاہے اس کے حصول کے بعد اس کی قدر رہے یا نہ رہے۔ اپنی زندگی کو با مقصد بناؤ! میرے بیٹے! تم سے بہت ساری امیدیں وابستہ ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ ایک لمحہ کوڑ کے اور پھر کہتے چلے گئے۔

”ہا یوں اتم میرے بہترین سٹوڈنٹس میں سے ایک ہو۔ میں جانتا ہوں تم میں بہت زیادہ صلاحیتیں ہیں انہیں برہاد مت کرو۔“

”میں کب چاہتا ہوں کہ میری صلاحیتیں برہاد ہوں لیکن جب ظلم۔“

”ہمیشہ امتحان میں ہی سوئی ہوئی صلاحیتیں اُجاگر ہوتی ہیں۔ جس طرح کوئی ہاشور ذرا سے اشارے میں سے ہا معنی نکلتا تلاش کر لیتا ہے بالکل ایسے ہی جب تم جیسے حساس شخص پر ظلم ہوتا ہے تا تو بہت زیادہ ٹوٹ پھوٹ ہوتی ہے۔ پھر سٹھکنے میں بہت وقت لگتا ہے لیکن جاہل اسے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ یہ ساری باتیں سمجھتے ہوئے بھی کیا تم ہا یوں ہو جاؤ گے؟ ظلم تو ہوں گے مگر ہم اس معاشرے میں رہتے ہیں اس کے ساتھ برتاؤ کریں گے تو یہاں ظلم ہوگا لیکن کیا ایک کسی کی مانند مر جائیں گے؟۔ نہیں۔ ہم پر اگر ظلم ہوتا ہے تو پھر ظلم کو بھی پتہ چلنا چاہیے کہ وہ کس سے لگایا ہے۔“

اس بار خود پروفیسر بہت زیادہ جذباتی ہو گئے تھے۔ ہا یوں و جیرے سے مسکرا دیا۔

”ٹھیک ہے سراسر انہیں خود کو مضبوط بنانے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔“

”ویل ڈن بیٹے اچھے پوری امید تھی کہ تم میری بات سمجھ جاؤ گے۔ کچھ ہی دنوں میں رزلٹ آنے والا ہے لیکن تم اس کا انتظار مت کرو کل ہی کورٹ چلنا شروع کر دو۔ میں نے سردار اقبال ایڈووکیٹ سے کہہ دیا ہے وہ تمہاری ہر طرح سے راہنمائی کریں گے۔ میرے بہت اچھے دوستوں میں شامل ہیں۔ مجھے پوری امید ہے کہ تم اس پروفیشن میں بہت جلد اپنا نام بنا لو گے۔ بہت محنت سے کام کرنا۔“ پروفیسر نے خوشدلی سے کہا۔

”ٹھیک ہے سراسر انہیں کل سردار صاحب سے مل لوں گا۔“ ہا یوں نے کہا۔

”انہیں کل نہیں آج۔ میں ابھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں چائے بھی وہیں جا کر چکس گے۔“ انہوں نے ہنستے ہوئے کہا تو ہا یوں بھی ہنس دیا۔ اسے دنوں میں وہ پہلی بار دل سے ہنسا تھا۔

ہا یوں نے وہ دن بہت بھر پور گزارا تھا۔ وہ جو جج نا ایسی کی حالت میں گھر سے لکھتا تھا وہاں آیا تو اس کا موڈ بے حد خوشگوار تھا۔ اس نے اپنے والدین کو بتایا وہ بھی خوش ہوئے لیکن جیسے ہی وہ اچھے کمرے میں گیا اتھرائی میں اچانک صفحہ کا خیال اس کے سامنے آ گیا اور اس کے ساتھ ایک سوال تن کر اس کے سامنے آ گیا جو نجانے کب سے اس کے لاشعور میں چھنسا ہوا تھا۔

”ہا یوں اتم اپنا کیریئر بناؤ گے یا پھر صفحہ کو حاصل کرو گے؟ تمہیں دنوں میں سے ایک کو بھولنا ہوگا۔“

اس پر ہا یوں نے چند لمبے سوچا پھر و جیرے سے مسکرا دیا اور زبردست بڑا تے ہوئے بولا۔

”میں صفحہ کو اپنا کیریئر بنا کر ہی حاصل کروں گا۔ یہی میری محبت ہے یہی میرا عشق۔“

اس نے خود کو جو ب دیا تو پھر کوئی سوال نہیں ابھرا گیا اس کا اندر مطمئن ہو گیا تھا۔

☆☆

راحیلہ شام کی ڈیوٹی کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ اس نے یو پیٹھارم پہن لیا تھا اور آنچل کوسر پر بھاری تھی۔ اسی دوران اس نے غور سے خود کو

آئینے میں دیکھا تو پھر دیکھتی رہی۔ اُسے اپنے آپ میں تہذیبی محسوس ہوئی۔۔۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ اسی سوال کا جواب ڈھونڈتے ہوئے اُس نے اپنا آنچل درست کیا اور ہائلک تیار ہو گئی مگر ایک خوشگوار تاثر نے اُسے اب بھی گھیرا ہوا تھا۔ وہ کمرے سے باہر نکلنے سے پہلے اس کا جواب حاصل کر لینا چاہتی تھی ڈیوٹی شروع ہونے میں ابھی وقت تھا لہذا وہ اپنے لیے چائے بنانے لگی۔ اس دوران اُس کا سارا دھیان اُسی تاثر کی جانب ہی رہا۔ پھر جب وہ اطمینان سے بیٹھ گئی اور چائے کا پل لیا تو اُسے جواب مل گیا۔۔۔ پہلے وہ اپنے طور پر چلتی کڑھتی رہتی تھی۔ ہر وقت اپنے آپ کو جلائے رکھنا سکتی ہوئی سوچیں ہر وقت اُسے باہمی کے اندھیرے میں رکھتی تھیں۔ اُسے اپنے آپ سے لڑتے رہنے کے علاوہ اور کچھ بھائی ہی نہیں دیتا تھا۔ سوچ چاہے جیسی بھی ہوا انسانی وجود پر اثر انداز ضرور ہوتی ہے۔ سو وہ ہمیشہ کھلائی ہوئی رہتی تھی۔ کوئی مانے یا نہ مانے عورت بہر حال پھول کی مانند ہوتی ہے ناموافق فضا سے کھلا دیتی ہے مگر جیسے ہی خوشگوار ہوا کا جھونکا آئے تو پھر سے تروتازہ ہو جاتا ہے ایسا ہی اُس کے ساتھ ہوا تھا۔ اُس نے ساری سوچوں کو نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ بوجہ جو انہی سوچوں کی وجہ سے اُس پر رہتا تھا وہ اُس نے اُتار کر پھینک دیا تھا۔ کوئی کیا ہے اُسے اب پروا ہی نہیں تھی۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ اُسے اگر کسی کام سے منع کر دیا جائے تو وہ اُس کے بارے میں مزید سوچتا ہے یہاں تک کہ کبھی کبھی وہ اس پر حاوی بھی ہو جاتا ہے لیکن اگر کسی کام سے منع کرنے کے ساتھ ساتھ کچھ ایسا اُس کے سامنے رکھ دیا جس سے اُس کی توجہ بٹ جائے تو نہ صرف پہلے کام کی اہمیت ختم ہو کر رہ جاتی ہے بلکہ وہ نئے کام کی جانب دھیان دیتا ہے۔ یوں بنا کسی مشکل کے غیر ارادی طور پر وہ منع کیا جانے والا کام بھول جاتا ہے۔ قدرتی طور پر راحیلہ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ جنید کے خیال نے جہاں اُسے پراگندہ کرنے والی سوچوں سے چمٹکا راولا دیا تھا وہاں آنے والے دنوں میں ایک آس اور خوشگوار امید نے سب کچھ بھلا کر رکھ دیا تھا جیسے جنید کا خیال اُسے یکسو کر دینے کے لیے کافی تھا۔ وہ چائے پیتے ہوئے مسکرا دی، اک معمولی سی بات اُس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اُس نے خالی کپ ایک جانب رکھا، کمرے پر اچھتی ہوئی نگاہ ڈالی دروازہ لاک کیا اور ڈیوٹی کے لیے چل دی۔ خوشگوار خیال نے اُسے سرور کیا ہوا تھا ایسے میں ہمارے کیوں اُس کے لبوں پر بڑھا چسپائی کا اُسے جنید مل جائے۔ اگر ایسا ہو گیا تو پھر وہ اُسے اپنے نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دے گی۔ انہی خیالوں میں گم وہ چلتی چلی جا رہی تھی کہ سامنے سے اُسے دوسری سٹاف نرسوں کے ساتھ نرسین بھی آتی ہوئی دکھائی دی۔ راحیلہ کو دیکھتے ہی اُس کے قدم جڑ ہو گئے تھے۔

”راحیلہ تمہارے لیے ایک پیاری سی خوشخبری ہے۔“

”خوشخبری تو بہر حال پیاری ہوتی ہے۔ تم کو کیا بات ہے؟“ اُس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”وہ۔۔۔ وہ لاگاجو نے مجھے دکھایا تھا کیا نام تھا اُس کا۔۔۔ ہاں وہ جنید اداہ میں نے آج یہاں ہسپتال میں دیکھا ہے۔“

”دیکھا ہے مطلب۔۔۔؟“ اُس نے حیرت سے پوچھا۔

”وہ خود تو ٹھیک تھا کہ ہے۔ ایک مریض کو لے کر آیا ہے۔ کچھ دیر پہلے وہ ایمر جنسی میں تھا اب پوچھیں۔۔۔“ نرسین نے تفصیل

بتاتے ہوئے کہا۔

”اوہ۔۔۔“ اُس نے اطمینان کا سانس لیا پھر فریادی۔ ”تم اُس کے بارے میں پوچھو کرتیں اُسے روکتیں۔۔۔“

”مجھے اتنا وقت ہی نہیں ملا وہ خود پریشان تھا۔۔۔ خیر اگر وہ وہاں ہوا تو تمہیں مل جائے گا۔“ نسرین نے کہا اور کھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے

بولی۔ ”اوجاؤ ڈیوٹی پر۔۔۔ پورے دو منٹ لیٹ ہو چکی ہو۔“

نسرین نے احساس دلا دیا تو وہ آگے بڑھ گئی۔۔۔ راحیلہ کو پورا یقین تھا کہ جنید اُسے ضرور ملے گا۔ اُسے اپنی ذمہ داری ہو جانے کا پورا یقین

تھا اور وہ اسی یقین کے سہارے آگے بڑھتی گئی۔

وہ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ امیر جنسی کی طرف چلی گئی۔ بظاہر وہ پرسکون تھی لیکن اس کی نظریں بے تابانہ اُسے تلاش کر رہی تھی۔ اس

کا انداز ایسا ہی تھا جیسے کسی گم ہوئی پسندیدہ شے کے بارے میں اچانک مظلوم ہو جائے اور وہ اُس کی تلاش میں نکل پڑی ہو۔ ممکن ہے کشش اسے ہی

کہا جاتا ہو۔۔۔ اسے اپنی ڈیوٹی کا خیال ہی نہیں رہا تھا۔ وہ بجائے اپنے وارڈ کی طرف جانے کے امیر جنسی کے سامنے آگئی اور پھر اُٹھ چلی گئی۔ وہ

سیدھی وہاں تک پہنچی جہاں مریض کو لایا جاسکتا تھا۔ شام نے ڈھل کر رات کا روپ دھار لیا تھا اس لیے وہاں رش نہیں تھا، اکاؤنٹ کا لوگ تھے۔ اُس نے

ڈیوٹی پر موجود نرس کو دیکھا جو ہاسٹل میں رہنے کے باعث چہرہ شکا ستھی۔ اُس نے نرس کو جنید کا حلیہ بتاتے ہوئے پوچھا تو جواباً وہ بولی۔

”ہاں ایسا لڑکا تھا اور مریض کے ساتھ۔۔۔ تم اُسے آپریشن تھمڑ کی طرف دیکھو مریض کو ادھر ہی لے گئے ہیں۔“

”مریض کیا سیریس ہے؟“ راحیلہ نے دھیرے سے پوچھا۔

”گولی لگی ہے اُسے۔۔۔“

وہ عام سے انداز میں بولی۔ اس پر راحیلہ چونک گئی۔ پھر اپنے ہی خیال میں کھوئی ہوئی آپریشن تھمڑ کی جانب بڑھ گئی وہاں بھی اُسے جنید

دکھائی نہیں دیا۔ وہ بھی سوچ کر پٹ گئی کہ ممکن ہے وہ مریض کو ہسپتال پہنچا کر وہاں سے چلا گیا ہو۔ وہ مایوس ہو گئی اور اسی عالم میں اس وارڈ کی

جانب چل دی جہاں اُس کی ڈیوٹی تھی۔ وہ قدرے سوچھے قدموں سے جا رہی تھی کہ اچانک اُس کی نگاہ ایک طرف لان میں کھڑے جنید پر پڑی جو سیل

فون پر کسی سے باتیں کر رہا تھا۔ راحیلہ کو یوں لگا جیسے کوئی خزانہ ہاتھ لگ گیا ہو، چانک مٹنے والی خوشی کا احساس معمول سے زیادہ ہوتا ہے۔ وہ کھڑی ہو کر

اُسے باتیں کرتا ہوا دیکھتی رہی، پھر اُس کی جانب بڑھ گئی۔ وہ لان سے باہر کھڑی تھی جبکہ جنید روشنی کے پول سے کھڑا تھا۔ وہ بات کر چکا تو اُس کی نگاہ

راحیلہ پر پڑی جو اُس کی جانب پوری تکیسوتی سے دیکھ رہی تھی۔ وہ اُسے پہلی نگاہ ہی میں پہچان گیا تھا اسی لیے وہ آگے بڑھا اور قریب آ کر بولا۔

”آپ۔۔۔؟“ اُس کے لہجے میں شکا ستائی جھلک رہی تھی۔

”ہاں میں۔۔۔ آپ یہاں پر کیا کر رہے ہیں؟“ اُس نے اپنی ساری بے تاملیاں چھپاتے ہوئے لاپرواہی سے پوچھا۔

”ایک ڈنچی کے ساتھ آیا ہوں، وہ آپریشن تھمڑ میں ہے۔ میں یہاں بات کرنے آیا تھا۔“ اُس نے وضاحت سے کہا۔

”کیا ہوا ہے اُسے۔۔۔؟“ راحیلہ نے اُس کے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”بس ڈنچی ہو گیا۔ گولی لگی ہے اُسے۔۔۔ میرا ایک دوست ہے وہاں میں وہ انیاں دے آیا ہوں۔ دیکھیں کیا ہوتا ہے؟“ جنید نے یوں

کہا جیسے وہ اس موضوع پر بات نہ کرنا چاہتا ہو۔

”اچھا میرے لیے کوئی خدمت۔۔۔ میں آپ کے کسی کام آ سکتی ہوں؟“ راحیلہ نے پورے خلوص سے پوچھا۔

”میں نہیں جانتا کہ آپ میرے کسی کام آ سکتی ہیں یا نہیں۔ فی الحال تو۔۔۔“ اس نے جان بوجھ کر فخر و ادھور اچھوڑ دیا۔ پھر جیسے اُسے خیال آ گیا تو وہ چیزی سے بولا۔ ”آپ نے جو اُس دن ایک بات کہی تھی اس نے مجھے بڑا حوصلہ دیا تھا۔ میں آج تک یہ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ آپ نے ایسا کیوں کہا تھا؟“

”ہاں۔۔۔“ راحیلہ نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”میں بھی آج تک یہ سوچ رہی ہوں اور مجھے بھی سمجھ نہیں آ رہی ہے کہ میں نے ایسا کیوں کہا یا تھا؟“

اُس کے یوں کہنے پر جنید چونک گیا اور پھر حیرت سے بولا۔

”کیا یہ سب بات نہیں ہے۔۔۔؟“

”ممکن ہے عجیب ہو لیکن گناہ نہیں ہے۔ ضرور اس کی کوئی وجہ ہوگی جو نہ آپ کی سمجھ میں آ رہی ہے اور نہ میری گرج یہ ہے کہ ایسا ہوا۔ آپ دیکھیں یہ بات سب سمجھ میں آتی ہے؟“ وہ ہلکے سے مسکراتے ہوئے بولی۔

”کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ ہم تھوڑی دیر میں بیٹھیں اور باتیں کریں پھر شاید اس بات کی سمجھا جائے۔“

جنید نے کہا۔ شاید وہ ہسپتال کے اس ماحول سے فرار چاہ رہا تھا۔

”ہاں ایسا ہو سکتا ہے لیکن شاید ابھی نہیں میں ڈیوٹی پر جا رہی ہوں اور آپ کا دوست آپریشن تھیٹر میں ہے پھر کسی وقت۔۔۔“ اس نے خود پر قہر پاتے ہوئے اپنی نسانی جھک کو برقرار رکھا۔

”ٹھیک ہے پھر کسی وقت کیا۔ آپ جا ہیں تو میرا نمبر نوٹ کر لیں۔ جب بھی آپ کے پاس وقت ہو تو مجھے بتا دیجئے گا۔“

”تائیں۔“

یہ کہتے ہوئے اُس نے جیب سے ہال پن نکالا اور اپنی پتھلی پر لکھنے کے لیے تیار ہوئی یوں جیسے وہ اپنی قسمت کی لکیروں میں اسے بھی شامل کر رہی ہو۔ جنید نے اپنا نمبر دے دیا۔ اُس نے پتھلی پر لکھ لیا تو وہ بولی۔

”اچھا خدا حافظ۔!“

”خدا حافظ۔۔۔ لیکن کیا آپ نام نہیں پوچھیں گی؟“ جنید نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”مجھے معلوم ہے جنید ہے آپ کا نام۔۔۔“

”اوہ۔۔۔!“ اُس نے سوچتے ہوئے کہا اور بولا۔ ”۔۔۔ اور آپ کا؟“

”راحیلہ۔!“

اُس نے اختصار سے کہا اور آگے بڑھ گئی حالانکہ اُس کا وہاں سے جانے کو تھکاؤ ل نہیں چاہ رہا تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ وہاں سے چلی گئی اس

احساس کے ساتھ کہ جینا سے جانا ہوا ضرور دیکھ رہا ہوگا۔ اُسے خوشی ہوئی تھی کہ جنید سے اس کا رابطہ ہو گیا ہے۔

☆

رات کے سنانے میں سفید اپنے بیڈ پر بڑی خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ وہ پہلی بار تیور کے ساتھ تجا گئی تھی۔ کئی دنوں سے وہ اسے فارم ہاؤس دکھانے کے لیے کہہ رہا تھا مگر وہ یوں تہمتیں جاسکتی تھی۔ وہ دولت مند ہوجانے کے باعث ایک خاص طبقے میں آگے تھے جنہیں دولت مندوں کی دنیا کہا جاتا ہے۔ لیکن ابھی تک ان کی رگوں میں وہی پرانی روایات اور خیالات گردش کر رہے تھے جو اسے وراثت میں ملے تھے۔

وہ اصل تقسیم ہند کے بعد بہت کچھ تکلیف ہوا۔ کئی شرفا و اپنی شرافت کا لہادہ اوڑھے پتے رہے اور کئی نام نہاد شرفا و نقاب اوڑھے کہ دولت مند بن گئے۔ یوں لوہو بلیوں کا ایک طبقہ اس معاشرے میں ابھرا جس نے روایتی جاگیرداروں، صنعتکاروں اور بیوروکریٹس کے مقابلے میں آنے کے لیے نمود و نمائش کا سہارا لیا۔ خود کو دولت مند ثابت کرنے اور طبقہ امراء میں سے ہونے کے لیے بہت سارے جھکنڈے بھی آزمائے جس کا خاطر خواہ اثر ہوا یا نہیں یہ الگ بات ہے لیکن اس نے اس طبقے کی جدوجہد کو بہت حد تک نمایاں کر دیا۔ یہاں تک کہ انہوں نے اپنی روایات، خانہ دانی حیثیت اور زندگی گزارنے کا سلیقہ طریقہ تک بدل لیا۔ اسی دوران مادیت پرستی کے رجحان نے اپنا کام دکھایا اور یہی طبقہ اس سے متاثر بھی ہوا۔ روایتی جاگیرداروں اور صنعتکاروں کی گرفت اس معاشرے پر سخت سے سخت ہوتی چلی گئی۔ حکمرانی سے لے کر مصیبت تک پر وہ لوگ چھاتے چلے گئے اور پاکستان کی حقیقی عوام جذباتی نعروں، تصوراتی سبز باغوں اور انقلاب کی راہ دیکھتے دیکھتے دوسری نسل بوردھی کر چکی ہے۔ اس سارے قتلے میں درمیان طبقہ اور نو دولتیں نری طرف بھنس چکے ہیں۔ غریب مزید غریب تر ہونا چلا جا رہا ہے اور امیر امیر تر۔ اب یہ دونوں طبقے امیر ہو نہیں سکتے اور غربت کی طرف جانیں سکتے، یہیں سے ایک اور طبقے نے جنم لیا جسے جرائم پیشہ کہا جاتا ہے۔ وراثت کے بغیر دار ہیں۔ ممکن تھا کہ یہ لوگ اگر اپنی تحریک کو مثبت رکھتے اور ان میں کئی مرکزیت ہوتی تو انقلاب کی راہ ہموار ہو سکتی تھی لیکن یہاں بھی بدقسمتی کا سایہ پڑا۔

درمیان طبقے اور نو دولتوں نے کالے دھندے ہی سے اپنے آپ کو بھادی۔ وہ یہ بھول گئے کہ وراثت یہی فنا کا راستہ ہے۔ ایسی ساری گفتگوں کے اثرات ان کے خاندان کے اندرونی معاملات پر بھی پڑے۔ ایک قسمت کے نیچے رہنے والوں کے خیالات، خواب، امیدیں، خواہشیں اور ارادے بالکل مختلف ہیں۔ ان کی آئندہ آنے والی نسل یہ بھول گئی ہے کہ جس ملک کی آزاد فضاؤں میں وہ سانس لے رہے ہیں اس کا حقیقی کلچر کیا ہے۔ وہ کس نام سے وجود میں آیا، کتنی قربانیاں دی گئیں؟۔ لڑکی جو میکنڈ و پلڈ میں دھڑ کر برگر کھاتے ہوئے اپنے پوائے ٹریڈ کے ساتھ یورپ اور امریکہ میں آزادی کی بات کرتی ہے! اسے قطعاً احساس نہیں ہے کہ اس ملک کی خاطر کتنی مصیبتیں لیں اور کتنی غیرت مند عینیوں نے اپنا آپ غم کر لیا۔ یہ قصور کس کا ہے؟ نئی نسل کا بالکل تصور نہیں ہے یہ تصور ان لوگوں کا ہے جن پر بیڈمداری عائد ہوتی تھی کہ وہ پاکستان کی عوام کو پاکستانی قوم

لے یہ کوئی باقاعدہ اجتماعی کوشش نہیں بلکہ انفرادی تھی۔ کرپشن کی راہ دکھائی تو دولت کمانے کی ذمہ داری ہوتی، جس میں دھیرے دھیرے مجبوریاں دہل انداز ہوتی چلی گئیں۔ جاگیرداروں کے خلاف اجتماعی شعور نہ ہونے کے باعث یہ لوگ جاگیرداروں کے چال میں بھٹتے چلے گئے۔ بعد ازاں سرمایہ دار بھی اس میں شامل ہو گئے۔ پاکستان کی تاریخ میں جتنے بھی رکن اسمبلی منتخب ہوئے ہیں، ان میں جاگیردار کتنے ہیں؟ اور ملک کی مجموعی ترقی

عشق تو ہے عشق بتا

کس طبقے کے کھاتے میں گئی ہے، اس سے ساری حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے۔ اس ملک کا اصل مسئلہ کیا ہے؟ کیا ہم نے اس کا تھین کیا؟ اگر کر لیا ہے تو پھر اعلان جہاد کیوں نہیں؟ اصل میں یہی طبقہ اس ملک کا مسئلہ ہیں۔

ہونے کا یقین دیں۔ بلاشبہ یہ دانشوروں کا طبقہ ہے جو اپنا فرض بھول چکا ہے۔ آج اگر کسی نو دہ لٹیے کی بیٹی یہ سوچتی ہے کہ وہ مزید دولت مند کس طرح بن سکتی ہے تو یہ کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں ہے۔ اسے دوہری جنگ لڑنا پڑ رہی ہے۔ اپنی روایت کے خلاف اور جدید تقاضوں کے ساتھ چلنے کی شدید آرزوئیں ڈیپریشن کے ساتھ جرم بھی بڑھ رہا ہے۔ یہی سب کچھ صنفیہ کے دماغ میں تھا۔ وہ اسے اپنی خوش قسمتی تصور کر رہی تھی کہ تیور جیسا دولت مند اس میں دلچسپی رکھتا ہے۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اگر تیور کی یہ دلچسپی برقرار رہی اور وہ خود اسے حوصلہ دے کر پیار اور محبت کی راہ پر لے آئے میں کامیاب ہوگی تو دولت کا ایک خزانہ اس کے ہاتھ لگ جائے گا۔ ایک صنعتکار کا بیٹا جس نے یورپ دیکھا اور اپنے لیے اسے پسند کر لیا یہ اس کے لیے معمولی بات نہیں تھی۔ اسے اپنی راہ پر لانے کے لیے بہت صبر اور تحمل کی ضرورت تھی، کوئی ایک بھی اہل تادم اس کی راہ کو ٹٹی کر سکتا تھا۔ اسے تیور کے بارے میں اس قدر تفصیلی معلومات نہیں تھیں۔ بس اس کے بارے میں اتنا معلوم تھا جو ادھر ادھر سے اُسے سننے کو ملا تھا۔ وہ جیہہ تھا باوقار تھا جس طرح اُس کے ذہن میں اپنے شریک زندگی کے لیے ایک خاکہ سا تھا اس پر وہ پورا اتنا تھا مگر وہ دولت مند کس قدر تھا اس کا اُسے احساس نہیں تھا۔ وہ جو اس کے ساتھ قارم ہاؤس پر گئی تو اسے دولت کی ایک جھلک دکھائی دی۔ وہیں اسے تجسس ہوا کہ یہ مزید کتنا دولت مند ہو سکتا ہے؟ ظاہر ہے ایسی معلومات کے لیے تیور اوقت چاہئے تھا۔ اس وقت صنفیہ یہ بھی سوچ رہی تھی کہ تیور کو تھوڑا عرصہ ہی ہوا ہے برطانیہ سے آئے ہوئے اور ممکن ہے کہ یہ اس کا جذبہ باقی فیصلہ ہو جو کچھ عرصے کے بعد ختم ہو کر رہ جائے یا شاید اسے یہ بھی علم نہ ہو کہ جب اس کے والدین کو معلوم ہوگا تو جس طرح وہ غربت میں جانا پسند نہیں کر رہی ہے اسی طرح اُس کے والدین بھی کم دولت مندوں سے بہولانا پسند نہ کریں۔ جب اس کی حیثیت کیا ہوگی؟ وہ فوری طور پر اس کے لیے ہاں یا نہ کا فیصلہ نہیں کر سکتی تھی اس کے لیے وقت چاہئے تھا تاکہ اُسے معلوم ہو سکے کہ تیور اس کے لیے کتنا سیریس ہے۔ اگر وہ اسے دل سے چاہتا ہے تو پھر محبت کی راہ پر وہ اسے لے کر ضرور چلے گا ورنہ اس راہ پر چلنے سے پہلے ہی وہ اس کا ساتھ چھوڑ جائے گا۔ اس وقت صنفیہ کے دماغ میں یہ بھی چل رہا تھا کہ تیور کو محبت کی راہ پر لانے ہوئے وہ خود کوئیں اس کی محبت میں گرفتار نہ ہو جائے۔ جس طرح وہ اس کی دولت دیکھ کر اُس کی جانب بڑھی ہے، کوئیں وہ اس کا حسن دیکھ کر تو اس کی طرف نہیں لپکا اور پھر کسی پھنوسے کی طرح رں چوس کر اڑ جائے۔ ایسے میں وہ کچھ بھی نہیں کر پائے گی اور سارا نقصان اس کی اپنی ذات کا ہوگا۔ وہ آسمان کو چھوتے ہوئے منہ کے بل آ کرے گی۔ اُس نے اپنے من کو ٹٹولا کیا واقعی ایسا ممکن ہو جائے گا؟ کتنی دیر تک اندر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ شاید وہ تیور سے محبت کر رہی نہیں سکتی تھی کیونکہ اس کی اپنی نگاہ فقط تیور پر نہیں تھی بلکہ اُس کے ساتھ آنے والی دولت پر تھی جو تیور کے حاصل ہوتے ہی اس کی ہو جانے والی تھی۔ اُسے اس راہ پر بہت محتاط ہو کر چلنا تھا۔

اُس کے ذہن میں یہ خیالات بھی آرہے تھے کہ جب وہ تیور سے ابھی نہیں ملی تھی تب اُس کے اپنے خیالات کیا تھے وہ اپنے ہارے میں کیا سوچتی تھی۔ اگر وہ خود ہی تیور کی راہ پر چل رہی ہے تو اُس کے اپنے خواب ادھر سے رہ جائیں گے۔ تیور کے مقابلے میں اُس کی اپنی حیثیت کیا ہے؟ اگر تیور کا معیار فقط حسن ہے تو اگر اُس کا حسن نہ رہے تب پھر اُسے اپنی زندگی کا بوجھ خود اٹھانا پڑے گا۔ وہ دوسروں کی دست نگر

رہے یہ اُس کی انا کے خلاف تھا۔ اُس نے اپنے بارے میں یہ سوچا ہوا تھا کہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد اُس کی اپنی ایک سماجی حیثیت ہونی چاہئے جہاں اُس کا نام ہوا اپنی ایک پہچان ہو لوگ۔ اُسے اس کے سماجی رُتبے سے جانیں۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ اُس کے ارد گرد کا معاشرہ اُس کی صلاحیتوں سے نہیں دولت کے معیار سے اُس کی عزت کرے گا۔ بہت کم لوگ ہیں معاشرے میں جو کسی کی مثبت صلاحیتوں کو سراہتے ہیں ورنہ یہ معیار بن چکا ہے کہ اُس کے سماجی رُتبے سے ہی اُس کی عزت کی جائے۔ جب تک کوئی کسی رُتبے پر ہے اُسے اس کی حیثیت کے مطابق نہ صرف عزت دی جاتی ہے بلکہ اسی قدر خوشامد بھی ہوتی ہے لیکن جیسے ہی اُس کا سماجی رُتبہ ختم ہوا اُس کی کرسی چھیننی وہ عزت کے اس معیار پر نہیں رہتا یہ ہمارا معاشرتی اصول بن چکا ہے اسی لئے بہت سارے لوگ اس معاشرے سے عزت و احترام کے حصول کے لیے تھاب اوڑھنے پر مجبور ہیں۔ وہ چاہتی تھی کہ اُس کا کوئی سماجی رُتبہ ہو۔ چاہے اپنے باپ کا کاروبار ہی سنبھالے یا کوئی حکومتی ملازمت کرے۔ جب تک وہ اپنی تعلیم مکمل نہیں کر لیتی اور اپنا خواب پورا نہیں کر لیتی تب تک وہ تیور سے شادی نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے لئے ابھی تھوڑا وقت درکار تھا اور اس وقت میں ممبر اور برداشت اُس کے اپنے فائدے سے ہی میں تھی۔ اگر تیور اُس سے واقف ہوں تو اسے عزت سے محبت کرتا ہے تو اُس کا انتظار کرے گا۔ وہ اسے مزید حوصلہ دے گی تاکہ تیور کے دل میں اُس کی محبت مزید گہری ہو جائے۔ اس طرح وہ نہ صرف تیور کو پالے گی بلکہ اپنا خواب بھی پورا کرے گی۔ اگر تیور اُسے راہ میں چھوڑ بھی گیا تو کم از کم وہ اپنا خواب تو پورا کرے گی۔

رات دیر سے دیر سے بڑھتی چلی جا رہی تھی اور صبح اپنے ہی خیالوں میں اُبھی ہوئی تھی۔ تیور کے دولت مند ہونے کی تھک نے اُسے نہ صرف بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا بلکہ ایک طرح سے اُسے ڈپریشن میں بھی مبتلا کر دیا تھا۔ اُسے کوئی فیصلہ کرنے میں دشواری ہو رہی تھی کہ آخر وہ کیا کرے؟ — وہ شام سے ہی سوچ رہی تھی اور پھر رات کے دوسرے پہر میں بہت سوچ کر اُس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اُسے کیا کرنا ہے۔ اُسے بہر حال وقت چاہئے تھا سو اُس نے فیصلہ آنے والے وقت پر چھوڑ دیا۔ یہ سوچے ہی اُس نے گہری سانس لی ایک پوچھ اُس کے سر سے اُتر گیا تو وہ سونے کے لیے لیٹ گئی۔

☆☆

ہالوں اپنے کمرے میں پڑا مسلسل سوچ رہا تھا۔ کمرے میں اندھیرا تھا مگر میں مکمل خاموشی اور اُس کی آنکھوں سے نیند غائب تھی۔ اُسے یہ قطعاً احساس نہیں تھا کہ رات بے پاؤں چلتے ہوئے کہاں سے کہاں تک جا پہنچی ہے۔ وہ بس سوچتا چلا رہا تھا اور اُس کی یہ سوچ بالکل غیر اختیاری تھی۔ وہ اپنی زندگی کا ایک اہم ترین دن گزار چکا تھا جس نے اُسے سوچوں کی آماجگاہ بنا دیا تھا۔ ان سوچوں میں جہاں وہ وقتی رہا وہ کاٹھنکار ہو کر رہ گیا تھا وہاں وہ انہی سوچوں میں سے مستقبل کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

صبح جب وہ پہلے دن عداوت جانے کے لیے تیار ہوا۔ سفید قمیص پر اُس نے کالا کوٹ زیب تن کیا تو ایک ایسا احساس اُس کے اندر عجیب لگا گیا جس میں اپنے آپ پر اطمینان ہونے کا یقین ہوتا ہے۔ وہ ناشتے کے لیے برآمدے میں آ بیٹھا تو ماں نے سمجھ اُس کی بلائیں لے لیں اور پھر دیر ساری دُعائیں اپنے رُتبے سے مانگیں۔ اس دن ماں نے بہت پیار سے اُسے ناشتہ کروایا تھا اور پھر جس وقت وہ گھر سے باہر نکلنے لگا تو نرنب لبی

بی نے اپنے پلو میں بندھے چند نوٹ اُسے دیتے ہوئے صدق دل سے کہا تھا۔

”جا میرے بیٹے! اللہ تجھے خوشیوں اور کامیابیوں سے نوازے۔“

اُس نے اپنی ماں کے چہرے کی جانب دیکھا جہاں ممتا کے سارے رنگ پھیلے ہوئے تھے لیکن اُس کی اپنی مٹھی میں وہ مڑے مڑے نوٹ یوں جل رہے تھے جیسے اُس نے انکار سے اپنے ہاتھوں میں لیے ہیں۔ اس دن اُسے اپنی کم مائیگی کا شدت سے احساس ہوا تھا۔ ہمایوں کا دل بھرا آیا لیکن وہ نہیں چاہتا تھا کہ اُس کی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کو اُس کی ماں دیکھ لے اُس نے پورے زور سے اپنی مٹھی بند کی اور وہ مڑے مڑے ہوئے نوٹ بنا دیکھے اپنی جیب میں رکھ لیے۔ اُس کے پاس اچھے پیسے تھے کہ وہ عدالت جا کر پھر واپس آ سکتا تھا۔

خلاف توقع اُسے بہت اچھے انداز سے خوش آمدید کہا گیا تھا۔ گزشتہ دن تکلف بھری ملاقات تھی آج ویسا نہیں تھا ممکن ہے پروفیسر نے اپنے انداز سے مزید سردار اقبال ایڈووکیٹ کو سمجھا دیا ہو۔ وہ جیسے اُس کے انتقال میں تھا۔ اُس نے بہت اچھے انداز میں گفتگو کی حوصلہ دیا اور محنت سے کام کرنے کے بعد اس دنیا میں کامیابی کا نقشہ اُسے بتایا۔ پھر دیگر جو نیئر اور سینئر کیلوں سے اُس کا تعارف کروایا۔

”آج کے لیے اتنا کافی ہے ہمایوں اتم آج اپنے کو لنگلا سے ملوان سے تعارف حاصل کرو۔ ان سے پوچھو کہ کیسے کیسے سٹڈی کیا جاتا ہے۔ یہاں کے ماحول کے بارے میں واقفیت حاصل کرو۔ تم اگر محنت لگن اور دیانت داری سے کام کرو گے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ تمہارا شمار بہترین کیلوں میں نہ ہونے لگے اور ہاں کوئی بھی مسئلہ ہو تو مجھے بتانا۔“

سردار اقبال کی باتوں سے اُسے بہت حوصلہ ملا تھا۔ اگرچہ وہ سارا دن یونٹی تعارف وغیرہ میں مگڑ گیا تاہم ان باتوں میں اُسے بہت ساری باتیں ایسی بھی ملیں جن میں آگے بڑھنے اور بہت کچھ کر سکنے کی نشاندہی موجود تھی۔ شرط صرف یہی تھی کہ وہ مستقل مزاجی سے اپنے کام میں ڈٹا رہے جبکہ اس کے سامنے ماں کا چہرہ تھا جو جوج آتے وقت اُس نے دیکھا تھا اور نوٹ اُس کی جیب میں سگ رہے تھے۔

عدالتی معمولات شروع ہوئے تو ہر بندہ اپنے اپنے کام میں لگ چکا تھا۔ سردار اقبال وہاں سے اٹھ کر کہیں چلا گیا آفس کے باہر مٹھی اپنے کاموں میں لگے ہوئے تھے۔ عدالت کا احاطہ لوگوں سے بھرنا چلا جا رہا تھا۔ ایسے میں ہمایوں اپنے سامنے ایک پرانے کیس کی قائل رکھے اپنے ہی جیسے ایک جو نیئر وکیل سے کیس پڑھنے کے بارے میں سمجھ رہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک اس میں مصروف رہے۔ جو بھی اُس نے سمجھا یا تھا ہمایوں اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔

”جل بس کریں یا راج! آج ہی سارا کچھ سمجھ لیتا ہے۔“ جو نیئر وکیل عابد اللہی نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ بھی ہنس دیا۔ ”جل چائے پیچے ہیں۔“

اُس نے آفری تو ہمایوں بھی اُٹھ گیا۔ احاطہ عدالت میں بنی اس عام سی کینٹین پر وہ چلے گئے جہاں پہلے ہی لوگوں کا رش لگا ہوا تھا۔ وہ چائے کا آرڈر دے کر ایک طرف بیٹھ گئے۔ ان کی گفتگو وہی عام سی تھی جو یہاں کے ماحول کے بارے کی جاسکتی تھی۔ اسی دوران ان سے قدرے قائل پر ایک کروڑ روپے کی جس میں سے ایک بھاری بھاری جسم والا شخص ہر آدھ ہوا۔ اُس نے کاشن کا کھڑکھڑاتا ہوا شلوار سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور
- ✦ ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

سیاہ ہال پیچھے کی جانب گنگھی کر کے جمائے ہوئے تھے۔ کالی صینک کے ساتھ کان میں سونے کا ایک جاس تھا۔ ہلکی ہلکی سیاہ داڑھی اور موٹے موٹے گردن میں سونے کی تین چار زنجیریں ڈالی ہوئی تھی۔ سفید لباس پر میروں گھر کی ویس کوٹ وہ شان بے نیازی سے اتر اور اس سے پہلے چار گارڈ اسلم سمیت گاڑی سے اتر چکے تھے۔ وہ ایک جانب کوچل دینے تو عابدی نے انتہائی طنز یہ انداز میں کہا۔

”بڑی شہور ہے آج کل اس کی۔“

”کون ہے اور آج کل شہور۔۔۔؟“

جانتا رہا میں نے اس سے پوچھا تو عابدیوں نے لنگے لگا جیسے وہ اس سے پہلے ہی خار کھا ہے۔

”تھا ایک تھرڈ کلاس فنڈہ یونیورسٹی میں ہم سے محض ایک سال ہی آگے تھا۔ کوئی مانگے کی سوئرسائیکل نہیں دیا تھا اسے اور آج یہ اپنی لینڈ کروزر میں پھرتا ہے۔“

اس کے یہ کہنے پر ہمایوں یوں متوجہ ہوا جیسے عابد نے اس کی ڈکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ اس نے اس سے تیزی سے پوچھا۔

”ایسا کون سا جادو ہے کہ دنوں میں ہی کاپیلاٹ گئی؟“

”نویار ایسے فنڈہ جسم کے لوگوں کا استعمال کرنے والے تھوڑے ہیں یہاں پر؟ اگر یہ ایک لاکھ کھاتے ہیں تو دس لاکھ کسی اور کی جیب میں جاتے ہیں۔ اس نے ایک سیاسی پارٹی کو ان دنوں میں ہی جو اٹن کر لیا تھا جب یہ یونیورسٹی میں تھا۔ اب ان کی حکومت ہے تو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں۔ قتل ڈکیتی نفسیات فریڈیک میٹنگ اور نجانے کیا کیا۔“ عابد نے ٹھسے کے طے چلے لہجے میں کہا۔

”لیکن عابد! اتنی جلدی اور اتنی تیزی سے یہ کیا کیا۔۔۔؟“

”تم نہ جانے کس دنیا سے آئے ہو یا کیا آگھیں کھلی نہیں رکھتے ہو؟ ایسا کام ایک آدھ بندہ نہیں کرتا۔ پورے گردو ہیں گینگ

بنے ہوئے ہیں اب پتہ نہیں کہ اس کی قسمت اچھی ہے یا خراب بہر حال اسے کوئی گینگ مل گیا ہے اور یہ دنوں میں دولت سے کھیلنے لگا ہے۔“

”کیا نام ہے اس کا۔۔۔؟“ ہمایوں کو ایسے لگا جیسے وہ اس کا سیر ہو۔ ایسا ہی سب کچھ وہ اپنے تصور میں دیکھا کرتا تھا۔ ایسا تب سے وہ

سوچ رہا تھا جب اس نے ایک رات حوالہ میں گزارا تھی۔

”ماجدو ڈرائیج۔“ عابد دھیرے سے بولا۔

”اچھا تو یہ ہے۔“

ہمایوں نے یوں کہا جیسے یہ نام اس کے لیے اجنبی نہ ہو۔ اس کے ساتھ ہی ماجد کے بارے میں سنی ہوئی بہت ساری باتیں اسے یاد آ

گئیں۔ شاید ان کے درمیان مزید بات چلتی مگر چائے آچکی تھی اور وہ چائے پینے لگا۔ اس خاموشی کے دوران ہمایوں نے اپنے اندر ایک خاص قسم کی

سنسنی محسوس کی تھی۔۔۔ جب تک وہ عدالت میں رہا ماجدو ڈرائیج کے بارے میں ہی سوچتا رہا۔ ایسا ہوتا ہے کہ جب کسی کے ذہن میں کوئی تصوراتی

خاکہ ہو اور اسے اگر حقیقی روپ میں دیکھ لیا جائے تو بڑا عجیب سا لگتا ہے۔ اس دن ہمایوں سے تھوڑا بہت کام بھی لیا گیا اور جاتے وقت اسے تھوڑے

سے لوٹ دے دیئے گئے۔

”یہ کیا ہے؟“ اس نے عابدائی سے پوچھا۔

”کچھ نہیں یاد! بس تمہوڑے سے روپے ہیں جو ہم نے کام کیا ہے۔ ہمارا خرچ کہاں سے چلنا ہے۔ یہی تو بات ہے سردار صاحب کی وہ اپنے جو نیرز کا بہت خیال رکھتے ہیں۔“

اس دن اس نے پہلی کمائی اپنی جیب میں ڈال لی اور پھر گھر آ کر وہ روپے اپنی ماں کو دیتے ہوئے بولا۔

”امی ایسے میری پہلی کمائی ہے۔“

”اللہ تجھے بہت دے گا میرے بچے!“

ماں نے وہ روپے یوں پکارتے ہوئے دعاوی جیسے وہ کوئی مقدس شے ہو۔ وہ اپنے کمرے میں گیا اور جیب میں سے ماں کے دئے ہوئے مڑے مڑے نوٹ نکال کر احتیاط سے اپنی الماری میں رکھ دیئے۔ اسے قطعاً کچھ نہیں آئی کہ وہ کیوں ایسا کر رہا ہے۔ وہ کھانا کھا کر سو گیا۔ اس سو پہرے سے بڑے عجیب عجیب سے خواب آتے رہے وہ خواب در خواب میں رہا۔

دو رات دو میرے دھیرے دھیرے گزرتی چلی جا رہی تھی مگر اس کی آنکھوں میں ٹیٹا بھی تک نہیں اترتی تھی۔ اس نے ساری سوچوں کو ایک طرف جھٹک دیا اور پھر اپنے آپ سے ایک سوال کیا کہ وہ اتنی دولت کیوں کمانا چاہتا ہے؟ اس کے ساتھ ہی لمبے کے ہزاروں حصے میں اندر سے آواز آئی تاکہ میں صاف کواپنا سکوں۔ میں اسے نہیں چھوڑ سکتا وہ اگر میری محبت ہے تو میری دشمن بھی ہے نہیں اگر اس سے بدلہ لینا چاہتا ہوں تو وہی میرا مقصد ہے۔ وہی میری آنا ہے اور وہی میری مجبوری۔ صاف کا خیال آتے ہی وہ مجسم اس کی آنکھوں کے سامنے آ گئی۔ لمحوں میں وہ سارا منظر اس کی آنکھوں میں محکم گیا جو کالج کے سامنے ہوا تھا۔ ہالوں نے سب کچھ ذہن سے نکال دیا۔ بس یاد رکھا تو اس کا حسین چہرہ جس پر وہ سو جان سے غذا ہو گیا تھا۔ اس کی نگاہوں میں وہ منظر جم گیا جب وہ کالج گیٹ سے باہر نکلتی تھی بہت عرصے بعد جب اس نے اسے دیکھا تو مہموت رہ گیا تھا۔ پھر بھرے جسم پر کالج یونیفارم کسی ہوئی تھی۔ سیدھے ریشمی ہالوں کو یونہی کھلا چھوڑا ہوا تھا جو دھیرے دھیرے چلنے والی ہوا سے لہرا رہے تھے۔ ستواں ناک کے ساتھ بڑی بڑی تھلانی آنکھیں جن میں کاجل کی ڈور تھی۔ میک آپ سے بے نیاز چہرہ گلابی پتلے پتلے ہونٹ لمبی گردن جس میں ہار یک سی جھنک تھی۔ وہ اپنے غزولہ اٹھیوں والے ہاتھ سے ہالوں کو سنوارتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی چٹاخ کے ساتھ آواز ابھری اور لاشعوری طور پر اس کا ہاتھ اپنے گال پر چلا گیا پھر سب کچھ ٹپٹ ہو گیا۔ چٹاخ کی آواز نے دیا سلائی جیسا کام کیا اور پھر ہر طرف آگ لگ گئی وہ سلگ کر رہ گیا۔

☆☆

راحیلہ نے دھیرے سے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا تاکہ سوئی ہوئی نسرین جاگ نہ جائے اور کمرے میں آ گئی۔ وہ بجائے فوراً یونیفارم تبدیل کرنے کے کرسی پر بیٹھ گئی جیسے بہت تھک گئی ہو۔ ہمیشہ یہی ہوتا تھا کہ جن دنوں اس ناٹنگ میں ان کی ڈیوٹی ہوتی تھی دو دنوں ہی ایک دوسرے کو ڈسٹرب نہیں کرتی تھیں۔ وہ ڈیوٹی سے آنے کے فوراً بعد یونیفارم تبدیل کرتی اور عام لباس پہن کر سو جاتی تھی۔ اس روز وہ کرسی پر بیٹھی

عشق تو ہے عشق بتا

سوچ رہی تھی کہ نسرین نے دھیرے سے کہا۔

”کیا بات ہے۔۔۔ تھک گئی ہو یا کوئی اور بات ہے؟“

راحیلہ نے چمک کر اس کی جانب دیکھا جو سر ہانے پر سر رکھے چادر میں سے منہ نکالنے اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

”آں۔۔۔ ہاں۔۔۔ کچھ نہیں۔“ راحیلہ نے یونہی کہہ دیا اور پھر جوتے اتارنے لگی۔

”کوئی بات تو ہے یا۔۔۔!“ نسرین نے گھڑی پر وقت دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں تو اب سے آدھا گھنٹہ پہلے آ جانا چاہئے تھا۔ یہ اتنی

دیر کہاں لگا دی، خیر تو ہے؟“ وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

”یار اڈیوٹی آف ہونے کے بعد میں نے سوچا ہنڈیکوڈ دیکھ لوں۔۔۔ اس کا مریض تو آئی سی یو میں ہے۔ لیکن وہ خرد وہاں نہیں تھا وہاں کوئی

اور ہی تھا میں نے پوچھا مناسب نہیں سمجھا اور تھوڑی دیر انتظار کے بعد وہاں سے آ گئی۔ بس اس میں دیر ہو گئی۔“ راحیلہ نے بتایا۔

”راحیلہ! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کیوں ہوا کو اپنی مٹھی میں بند کرنے کی ضد کر رہی ہو؟“ ہوا کا کچھ نہیں جائے گا، تمہی خالی ہاتھ رو جاؤ گی

۔۔۔ نسرین نے نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔

”ایسا نہیں ہے نسرین! جب میں یہاں سے گئی تو وہ مجھے ملا تھا۔ اس سے باتیں بھی ہوئیں، فون نمبر دیا ہے اس نے مجھے۔۔۔ وہ کہیں

نہیں جائے گا اور ہی رہے گا میں آپ سے اپنی نکالوں سے اوہ عمل نہیں ہونے دوں گی۔“ راحیلہ نے یوں کہا جیسے وہ نسرین سے نہیں کہہ رہی بلکہ

اپنے آپ کو تسل دے رہی ہو۔

”تم نے شاید میری بات پر غور نہیں کیا، راحیلہ! میں نے اُسے ہوا کہا ہے جس کے مقدر میں سکوت نہیں ہوتا، ہوا ایک جگہ ٹھہری نہیں

سکتی۔“ نسرین نے انتہائی ڈٹکے دل سے کہا۔

”میں بھی نہیں۔۔۔ آخر تم کہنا کیا چاہتی ہو؟“ وہ واقفانہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولی۔

”جس طرح تم نے اُس کے بارے میں مجھے بتایا تھا میں نے اُسے بہت سوچا۔ پھر میں نے خود اپنی آنکھوں سے بھی اُسے دیکھا ہے وہ

کسی اور ہی دنیا کا ہاشمہ ہے، میری جان! وہ ہمارے معاشرے کے بندھنوں میں بندھ کر نہیں رہ سکتا، وہ اتنی سی عمر میں شعلہ جولا ہے تو آگے کیا ہوگا؟

وہ محض جرائم پیشہ ہوتا تو اُس کی واپسی ممکن تھی، وہ ایسا نہیں ہے۔ وہ ایک مقصد کو لے کر نکلا ہوا ہے جہاں سے اُس کی واپسی ممکن نہیں ہے۔“ نسرین کا

انداز اُسے سمجھانے والا تھا۔

”تم ایسا کیسے کہہ سکتی ہو میں اور تم اُس کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟“

راحیلہ نے اُس کی طرف فور سے دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ جیسے خیالوں میں کھو گئی اور پھر جوتے ہونے لگی۔

”ڈاکٹر اور میں بچپن ہی سے ایک سکول میں پڑھے ہیں۔ سب کو یہی معلوم ہے کہ وہ پادری بننے کے لیے نکلا ہے۔ کس ملک میں ہے یہ کسی

کو نہیں معلوم۔ اُس کے گھر والے یہی کہتے ہیں کہ وہ دینی گن شی میں ہے لیکن ایسا قطعاً نہیں ہے۔ اُسے مذہبی جنون تھا۔ میں اُس کے خیالات سے

واقف تھی۔" یہ کہتے ہوئے اُس نے راحیلہ کی طرف دیکھا اور پھر کو خاموش ہوئی اور پھر کہتی چلی گئی۔ "ہر مذہب اُسن کا پرچار کرتا ہے لیکن کون سا ایسا ملک ہے جس کی پہچان مذہب ہے اور وہ حالت جنگ میں نہیں۔ وکٹر بھی اس آگ کا ایسا من بنے چلا گیا ہے تاریخ سے کسی نے سبق نہیں سیکھا۔ میں آج بھی وکٹر کو یاد کرتی ہوں حالانکہ مجھے اُس سے سخت نفرت کرنی چاہئے۔"

"تم نے پہلے کبھی نہیں بتایا 'نسرین'؟" راحیلہ کے لہجے میں بھرپور تھی۔

"کیا بتاتی نہیں کہ وہ اپنی صلاحیتیں مسلمانوں کے خلاف استعمال کرنے جا رہا ہے جنہیں میں پسند کرتی ہوں۔ میں کسی کرپشن لڑکی کے ساتھ رہ سکتی تھی لیکن میرے اور اس کے نظریات میں بہت فرق ہوتا۔۔۔ اچھا نہیں کہ ہم اس موضوع پر بات ہی نہ کریں جو ڈکھ دینے والی ہو، نفرت بڑھانے والی ہو۔ ہم کب یہ سمجھیں گے کہ ہم ان کے مفاد کا ایسا من بن رہے ہیں جن کے بارے میں ہمیں معلوم ہی نہیں ہے۔"

"میں بات بندی کی۔"

"وہی نا وہ بھی شاید ایسا ہی مقصد اپنے دل میں چھپائے پھرتا ہے۔ اُس کا راستہ اور ہے نہ تم اُس کے ساتھ چل سکتی ہو اور نہ وہ تمہارے ساتھ آ سکتا ہے۔ تم اُس سے کوئی آس مت لگا لینا ورنہ بہت بچھتا ڈگی۔" آخری لفظ کہتے ہوئے نسرین کا لہجہ بھینگ گیا تھا۔

"تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگ جو ہوا کی مانند ہوتے ہیں ان کا کوئی پتہ ٹھکانہ نہیں ہوتا اور وہ اپنے ہی کسی مقصد کی خاطر دنیا جہاں بھلائے بیٹھے ہیں مگر کیا وہ لوگ پیار کے قابل نہیں ہوتے؟ کیا ایسا کوئی شخص ہمارے سامنے آ جائے اور وہ شدید زخمی ہو تو کیا ہم اُس کی دیکھ بھال، علاج اور نگہداشت نہیں کریں گے؟ اُسے مرنے کے لیے چھوڑ دیں گے؟ نہیں! ایسے لوگ بھی انسان ہوتے ہیں اور ان بے غیرت منافق اور بے حس لوگوں سے زیادہ اچھے ہوتے ہیں جو دوسروں سے فقط اپنے مفادات کی توقع رکھتے ہیں۔ میں تم سے کوئی مذہبی بحث نہیں کرنا چاہتی اور نہ ہی میرا یہ منصب ہے لیکن مذہب سے بڑھ کر سچائی کے لیے کوشاں رہنا بھی تو زندگی ہے! انسانیت کی بھانپے ورنہ شیطانی تو تمیں انسانیت کو کب کا ختم کر چکی ہو تمیں۔ کیا ہم اخبار نہیں پڑھتے؟ کیا ہم باہر ہمارے ارگرو۔۔۔؟" راحیلہ نے کسی حد تک جذباتی ہوتے ہوئے کہا۔

"تم جذباتی ہو گئیں۔ میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ مذہب کے لیے جنگ لڑنا چاہیے یا نہیں! یہ ساری بحث میں فقط ایک سوال پر ختم کرتی ہوں کہ کیا خدا جنگ چاہتا ہے؟۔۔۔ میں نے اپنے قادر سے بھی یہ سوال کیا ہے وہ مجھے مطمئن نہیں کر سکے۔ ہاں سچائی کے لیے جدوجہد کرنا انسانیت ہے لیکن یہ نفرت سے نہیں محبت سے۔۔۔ یہ سارے لوگ کسے طاقت دکھا رہے ہیں اپنے خدا کو کہ وہ اُس کے لیے ٹھکس ہیں۔ کسی کا گلا کاٹ دینے سے خدا خوش ہوتا ہے؟۔۔۔ نہیں نہیں نہیں سمجھتی۔۔۔ خیر یہ بڑی بڑی باتیں ہیں ہم جیسی بے پارہ و دگا ز کزور اور مجبور لڑکیوں کو کہنی ہی نہیں چاہئیں۔ ہم کہیں گی تو ہمیں ملامت کی جائے گی جس طرح قادر نے مجھے ملامت کی تھی۔ میرے کہنے کا مطلب صرف یہی ہے کہ تم اپنے مستقبل کی فکر کرو۔" نسرین نے تیزی سے کہا۔

"کیا کروں میں اپنے مستقبل کی فکر۔۔۔؟"

"جیسے میں نے سوچا ہے۔ میں یہاں سے فراغت لوں گی تو کیری کروں گی! اپنے پسند کا کوئی مرد تلاش کر کے اُس سے شادی کر لوں گی"

اُسے اور اپنے بچوں کو پالوں گی۔ پھر ایک وقت آئے گا میں مرجاؤں گی۔ بس یہی ہے ہم جیسے لوگوں کی کہانی جو ساری عمر سکتے تڑتے اور گدھے کی طرح مزدوری کرتے ہوئے اپنی زندگی ختم کر لیتے ہیں۔"

نسرین نے ٹھوکر لہجے میں کہا تو راحیلہ ایک دم سے چمک گئی پھر وہ حیرے سے مسکراتے ہوئے بولی۔

"تم مایوسی کی باتیں کر رہی ہو اور مایوس انسان مرنے سے پہلے ہی مرجاتا ہے۔ تمہارے جسم میں ابھی زندگی بہک رہی ہے۔ تم ماحول اور حالات میں خود کو دیکھ رہی ہو اور اسی طرح سوچتی ہو۔ ہم سے زیادہ زندگی اور موت کو کون سمجھ سکتا ہے جن کے سامنے روزانہ کئی انسان اپنی زندگی ہارتے ہیں اور اس دنیا کو چھوڑ جاتے ہیں۔ اسی طرح روزانہ ہمارے سامنے ہی تو زائیدہ بچے اس دنیا میں آ کر سانس لیتے ہیں۔ اس کو بھی چھوڑ ڈھج سے لے کر شام ہو جانے تک کتنے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے ہمارا کتنے روئے ہمیں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ہر انسان اپنی ہی نگاہ سے ہمیں دیکھتا ہے۔ کیا لوگوں کی آنکھوں میں اُن کے ارادے نہیں پڑھ سکتی ہو پھر بھی تم زندگی کو نہ دیکھنے کا لگہ کر دو تو یہ تمہاری کوتاہی ہے۔ کیا ہم ایسا ہی کرتے چلے جائیں جیسا دنیا چاہتی ہے؟ ہمیں اپنے طور پر بھی زندگی جینے کا حق حاصل ہے یہ بات تم کیوں نہیں سمجھتی ہو؟"

راحیلہ ایک دم سے ہی جذباتی ہو گئی تھی۔ اس پر نسرین پوری طرح اٹھ کر بیٹھ گئی اور دھیرے سے مسکراتے ہوئے بولی۔

"ہم تو بات چینی کی کر رہے تھے کہاں زندگی کے خارزاروں میں بھٹک گئے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ چند لمبے خاموش رہی پھر بولی۔ "میں یہ نہیں سمجھتی کہ تم جنید کی طرف نہ برسو۔ دل کے معاملات میں کوئی فصاحت، کوئی سرزنش یا پھر کوئی خوف اثر انداز نہیں ہوتا لیکن میں فقط تم سے اتنا ہی کہوں گی کہ اس تعلق میں کوئی زخم مل جائے تو پھر کسی سے بھی لگہ مت کرنا کہ اس کی ذمہ داری خود ہوگی پھر اس زخم کو ہرگز نہ دیکھو یا اس پر مرہم لگاؤ وہ بھی تمہاری مرضی ہے۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو نسرین! میں ہی اس کی ذمہ دار ہوں گی۔" اس نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا اور پھر تیزی سے بولی۔ "اچھا تم نے بہت سولیا بہت آرام کر لیا۔ تم جلدی سے تیار ہو جاؤ ہم دونوں ہی اس سے ملنے جائیں گی۔"

پارس

رخسانہ نگار عدنان کی خوبصورت تخلیق..... معاشرتی اصلاحی ناول پارس کہانی ہے ایک لائابلی کسن لڑکی کی جس کی زندگی اچانک اُس پر نامہربان ہو گئی تھی۔ یہ ناول ہمارے معاشرے کے ایک اور چہرے کو بھی بخوبی اور واضح طور پر دکھاتا ہے اور یہ پہلو ہے ہائی سوسائٹی اور ان میں موجود برگر ٹیلیو اور نئی نگاری ہوئی نسل۔ پارس ایک ایسے نوجوان کی کہانی بھی ہے جو زندگی میں ترقی اور آگے بڑھنے کے لیے شارٹ کٹ چاہتا تھا۔ قسمت نے ان دونوں کو ملا دیا اور کہانی نے نیا رخ لے لیا۔ پارس ناول کتاب گھر کے پڑھنے والے معاشرتی اصلاحی ناول سیکشن میں پڑھا جا سکتا ہے۔

”نہیں میں نہیں جاؤں گی میری ڈیوٹی دوپہر کے بعد شروع ہوگی میں تمہی جاؤں گی۔ ہاں تمہارے لئے ناشتے کا بندوبست کر سکتی ہوں۔ پراگر تم جانا چاہو تو چلی جاؤ۔“ نسرین نے صاف جواب دیتے ہوئے کہا۔

”تم کیوں نہیں جاؤ گی۔۔۔؟“ راحیلہ نے پوچھا۔

”اس کی بہت ساری وجوہ ہیں سمجھا کرو۔“

یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ گئی۔ اُس کا رخ باہر والے دروازے کی طرف تھا۔ راحیلہ چند لمحوں کے سوچتے ہوئے وہیں پہنچی رہی۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ نسرین کیوں نہیں جانا چاہتی۔ کچھ نہ سمجھتا تو پراس نے سر جھکا کر یونینارم بدلنے کے لیے اٹھ گئی۔ وہ ناشتے کے بعد جنید سے ملنا چاہتی تھی۔

☆ ☆

عالیگیر کی حالت خطرے سے باہر تھی اور اُسے پرائیویٹ روم میں شفٹ کر دیا گیا تھا لیکن ابھی تک اُسے ہوش نہیں آیا تھا۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ یہ ادویات کے زیر اثر سوزا رہے تھوڑی دیر میں ہوش آ جائے گا۔ ذیشان اور جنید دونوں ہی اُس کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اور اُس کے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ اگرچہ ابتداء میں جب ذیشان نے جنید سے یہ کہا تھا کہ اگرعالیگیر ہوش میں آتے ہی قیادت کو مطلع کر دینا ہے یا پھر سیکورٹی پر موجود رکھے ہی بتا دیتے ہیں پھر ان کی ہارٹیشن کیا ہوگی تو ایک لمحوں کے لیے جنید پریشان ہو گیا تھا لیکن تھوڑی سی بحث کے بعد اُس نے خود ہی قیادت کو بتا دیا تھا۔ تب اُسے یہی حکم ملا تھا کہ اس کی زندگی کے لیے پوری کوشش کی جائے اس سے ابھی بہت سے کام لینے ہیں۔ اگر وہ مر گیا تو پھر سارے کام اُنہیں منٹانے پڑیں گے۔ قیادت کی طرف سے حکم تو خاصا طویل تھا لیکن ان کا مدعا یہی تھا جسے سن اور سمجھ کر جنید کو بہت باپوسی ہوئی تھی۔ قیادت کو فقط اپنے کام سے غرض تھی ایک مردہ پٹ گیا تو دوسرا مردہ آگے لے آیا جائے۔ چاہے قیادت کو بھی اس کے کانے کر تو توں کے بارے میں علم تھا اور نہ ایسا سن کر وہ کسی کو تو سزا اور سزا دیتے۔۔۔ جنید جس قدر اس پر سوچتا چلا جا رہا تھا اُس کے سامنے نئے سے نئے پہلو واضح ہو رہے تھے۔ یہ بات تو طے ہے کہ کسی بھی تحریک یا تنظیم کو چلانے کے لیے سرمایے کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ کہاں سے آتا ہے؟ غرض اس ڈرید سے نہیں بلکہ غرض اس سرمایے کے ساتھ آنے والے مفاد سے ہے۔ بلا جواز اور بلا مفاہ کوئی بھی سرمایہ ضائع نہیں کرتا دوسری صورت میں سرمایہ خود چھیننا پڑتا ہے۔ سرمایہ کسی بھی تحریک یا تنظیم کی رگوں میں دوڑنے والا خون ہوتا ہے اگر وہی بند ہے تو قول دھڑکنا بند ہو جاتا ہے اور دماغ کسی قابل نہیں رہتا۔ اُس نے ایک نگاہ عالیگیر پر ڈالی تو اُسے غصا آنے لگا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایسے لوگ کسی گھناؤنی حرکت کے مرتکب ہو سکتے ہیں کسی معصوم لڑکی کی زندگی برباد کرنے کا باعث بن سکتے ہیں۔ اُس نے اپنے طور پر سوچ لیا تھا کہ وہ اس معصوم لڑکی کی کسی حد تک ضرور مدد کرے گا۔ یہ بات اُس نے ابھی تک ذیشان سے شیئر نہیں کی تھی۔ یہی موقع اُسے ٹھیک لگا تو وہ بولا۔

”ذیشان! کیا تمہیں پتہ ہے کہ وہ لڑکی جسے عالیگیر نے۔۔۔“

”ہاں! بس اتنا معلوم ہے کہ انہوں نے نامعلوم المراد کے خلاف ایف آئی آر بہت مشکل سے لکھوائی تھی۔ پھر کچھ نہیں ہوا۔ سنا ہے کہ انہوں نے کسی وکیل سے رابطہ کیا ہے۔“

”وکیل کے بارے میں جانتے ہو۔۔۔؟“

”قاروق چوہدری ہے نام اُس کا اُسے ساری معلومات ہوں گی۔“ ڈیشان نے سوچتے ہوئے کہا۔

”یارا جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔ اُس نے تو اس کے لیے کچھ نہیں کرنا۔ تمہاری بہت دلجوئی تو ہونی چاہئے۔ کم از کم اپنے ضمیر کو تو مطمئن کر لیں۔ ہمیں معلوم نہ ہوتا تو الگ بات تھی۔“

”نہیں تم ٹھیک کہتے ہو ہمیں ہی کچھ کرنا پڑے گا۔“ ڈیشان نے سوچتے ہوئے لہجے میں کہا۔ پھر چند لمبے ذک کے وہ بولا۔ ”جنید اکون کس وقت کیا ہو جائے کسی کو کیا پتہ؟ ہم جو چند دن سے اپنا فیصلہ خود کرنے کی کوشش کر رہے ہیں ایک طرح سے یہ بھی تو تنظیم سے غداری ہے۔“

”اس فیصلے کے پیچھے کوئی ایسی بات تو نہیں ہے تا جس سے ہم انہیں نقصان پہنچائیں۔ قیادت سے ہمارا اختلاف ہو سکتا ہے یہ باتیں ہم بہت کر چکے ہیں۔“ جنید نے پھر سے اپنی بات ذہرا دی۔

”نہیں میں کچھ اور کہنا چاہتا ہوں۔ قیادت سے اختلاف ایک الگ ایٹھو ہے میں عالمگیر جیسے لوگوں کی بات کر رہا ہوں۔ ہماری اختلاف کی وجہ جو بھی رہی ہو ہم اپنا راستہ الگ کرنے کی سوچ رہے ہیں لیکن یہ لوگ تنظیم کے اندر تک اس طرح گھس جاتے ہیں کہ قیادت بھی ان سے بلیک میل ہو رہی ہوتی ہے۔ یہ بجائے تنظیم چھوڑنے کے اس کی آڑ میں اپنا مطلب نکالنے لگتے ہیں۔“

”یہ سب کیسے ہو جاتا ہے جبکہ ہمارا مقصد بہت اعلیٰ و ارفع ہے اس میں اس طرح کی گنجائش نہیں ہے۔“ جنید نے یوں کہا جیسے احتجاج کر رہا ہو۔

”بہت سارے راستے ہیں۔ باقاعدہ فورمز ایک مکان کی طرح ہوتی ہیں جہاں اندر داخل ہونے باہر نکلنے اور اس مکان میں رہنے کے اصول اور قاعدے ہوتے ہیں لیکن تنظیمیں تو ایک کھلا میدان ہوتی ہیں جس میں جب جی چاہئے کوئی آئے اور جب جی چاہے کوئی چلا جائے۔ پھر بنیادی طور پر کب کوئی حامی ہے کون کتنا دشمن بن جائے گا اس کا پتہ اچانک ہوتا ہے۔ بس یہی ایک خامی یا خوبی ہوتی ہے جس پر کوئی تنظیم ختم ہوتی ہے یا زیادہ دیر تک چلتی ہے صرف تربیت میں کمی ہوتی ہے ورنہ عام فورمز سے زیادہ ان میں جان قربان کر دینے کا جذبہ ہوتا ہے۔“

ڈیشان نے اُسے دھیرے دھیرے سمجھاتے ہوئے کہا۔ یہ ساری باتیں اُس کے گمان میں بھی تھیں لیکن یوں جیسے ڈھنڈلی ہوں۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر کافی دیر تک یونہی بیٹھنے کے بعد بولا۔

”اگر یہ یہ کیا تو۔۔۔؟“

”میرے خیال میں یہ ابھی خطرے سے باہر ہے کچھ نہیں ہوگا اسے۔ یہاں سے چلا جائے تو پھر ہماری ذمہ داری نہیں ہوگا۔“ ڈیشان نے اُسے یقین دلاتے ہوئے کہا۔ اس پر جنید کچھ نہیں بولا تو ڈیشان نے مزید کہا۔ ”تم آج ہی اس وکیل سے ملنا میرا مطلب ہے قاروق چوہدری نے اُس سے ہی لڑکی کے بارے پتہ چلے گا۔“

”ٹھیک ہے میں آج ہی کسی وقت اُس سے مل لوں گا اور اُس لڑکی کا پتہ کروں گا۔۔۔“

جنید نے پورے غلوں سے کہا اور پھر سوچنے لگا کہ وہ ایسا کیوں کر اور کیسے کر پائے گا؟ — دونوں کے درمیان خاموشی درآئی تھی۔ کتنے ہی لمبے یونہی گزر گئے۔ تب اچانک عالمگیر کسمایا۔ وہ دونوں جیزی سے اُس کی جانب بڑھے۔ ویرے ویرے اُسے ہوش آتا چلا گیا۔ جنید نے فوراً ڈاکٹر کو بلا دیا۔ اس دوران ڈیٹان اسی کے پاس رہا۔ ڈاکٹر نے آکر اُسے اچھی طرح دیکھا اور پھر بولا۔

”مریض خطرے کی حالت سے باہر ہے۔ اب ایسی کوئی ڈرنے والی بات نہیں ہے، بس احتیاط بہت ضروری ہے۔ آکسیجن ابھی لگی رہے گی، امید ہے شام تک اُن تادریں گے اور ہاں مریض سے زیادہ بات کرنا منع کرنا ہے۔“

ڈاکٹر نے ہدایات دینے چارٹ پر کچھ لکھا اور وہاں سے چلا گیا۔ تب جنید نے فور سے عالمگیر کی طرف دیکھا۔ عالمگیر کی آنکھوں میں نفرت اُبل رہی تھی۔ جیسے اُس کے بس میں ہو تو وہ ابھی اُسے شتم کر دے۔ جنید اُسے یوں دیکھتا پا کر ویرے سے مسکرا دیا۔ انہی لمحات میں عالمگیر نے آکسیجن ماسک بنا کر اُسے کچھ کہنا چاہا۔ چہرے کے تودریوں سے اندازہ یہی تھا کہ وہ اُسے کوئی غلط بات ہی کہنا چاہتا ہوگا لیکن غرا کر رہ گیا۔ ڈیٹان نے فوراً اُس کے ماسک لگایا تو اُس نے پھر سے اُن تادریاں جیسے کوئی گالی اُس کے حلق میں اُٹک گئی اور دیرے بغیر اُسے جین بنا رہا ہو۔ اسی کھٹکھٹ میں دو تین منٹ گزر گئے تو جنید نے آگے بڑھ کر ڈیٹان کو پرے کیا اور خود ماسک لگانا چاہا جسے اُس نے ہاتھ مار کر نفرت سے الگ کر دیا۔ اس پر جنید کو غصہ آ گیا۔ اُس نے فوراً ریل اور نکالا اور اس کے منہ پر رکھے ہوئے انتہائی سرد لہجے میں کہا۔

”ماسک لگاتا ہے یا ابھی گولی تیرے حلق کے پار کروں۔ بہت شوق ہے تاجے مرنے کا میں ماہروں؟“

اچانک پھر سے موت کو سامنے دیکھ کر عالمگیر حیران پڑ گیا۔ اس نے حراحت چھوڑ دی تب جنید نے ماسک اس کے منہ پر لگا دیا۔ ابھی وہ ایسا کر ہی رہا تھا کہ اُسے احساس ہوا جیسے کوئی کمرے کے دروازے پر کھڑا ہے۔ جنید نے مڑ کر دیکھا۔ دروازے کے درمیان میں راحیلہ کھڑی اُسے حیرت سے دیکھ رہی تھی یوں جیسے یہ معجزہ کچھ کر رہا ہوگا۔ ماسک لگایا اور ڈیٹان سے بولا۔

”اے سنبھالنا ڈرا کوئی گز بڑ کرے تو گھاد پادیتا بے غیرت کا۔“

یہ کہہ کر اُس نے ریل والی عداڑ سا اور راحیلہ کے پاس آ گیا۔ چند لمبے اس کے چہرے کو دیکھتا رہا جیسے کچھ پڑھ رہا ہو۔ پتہ نہیں اُسے کوئی تحریر ملی بھی یا نہیں وہ باہر کی طرف لٹکا ہوا بولا۔

”آؤ ہاں چل کر بات کرتے ہیں۔“

وہ دونوں چلتے ہوئے باہر لان میں آگئے جہاں پہلے ہی بہت سارے لوگ تھے۔ کافی دیر بعد اُن میں خاموشی ٹوٹی۔ راحیلہ نے دھیسے سے لہجے میں پوچھا۔

”آپ اُسے کیوں مار رہے تھے؟“ اُس کے لہجے میں خوف تھا۔

”اے۔۔۔ اے تو بہت پہلے مر جانا چاہتے تھا۔ میں اب بھی اُسے مار دینے کے حق میں ہوں مگر۔۔۔“ جنید نے جھلم سے کہا۔

”مگر کیا۔۔۔؟“ وہ تجسس میں بولی۔

”کچھ نہیں۔“ جنید نے تیزی سے کہا پھر چند لمحوں پر چھا۔ ”تم کیوں آئی ہو؟۔۔۔ مجھے فون کر لیا ہوتا۔“

”میں بس یونٹی آگئی تھی۔ سوچا آپ کے مریض ہمارے پوچھاؤں۔“ اس نے گھبراتے ہوئے بہانہ دیا پھر بات بدلتے ہوئے بولی۔ ”ایک بات کی سمجھ نہیں آئی۔ آپ کا لہجہ بتا رہا ہے کہ آپ اس سے نفرت کرتے ہیں لیکن اس کی جان بچانے کے لیے ہسپتال بھی لائے ہوئے ہیں یہ۔۔۔ ایسا کیوں؟۔۔۔“

”تم نہیں سمجھ پاؤں گی۔“ اس نے خود پر تھکا ہوا پاتے ہوئے کہا۔

”چلیں چھوڑیں۔۔۔ یہ بتائیں کہ آپ کا مریض ڈنڈی کیسے ہو گیا تھا اور آپ بدحواس سے۔۔۔ میرا مطلب ہے آپ اس کی۔۔۔“

اس نے بیچکتے ہوئے بات بکھل چھوڑ دی۔ جس پر جنید نے راحیلہ کے چہرے کی جانب دیکھا اور مگر ویرے سے لہجے میں بولا۔

”اُسے میں نے گولی ماری ہے۔۔۔ میں اُسے جان سے مار دینا چاہتا تھا لیکن یہ سچ گیا ہے تو میں نے اُسے مارنے کی بجائے کچھ اور

سوچ لیا ہے۔“

”کیوں۔۔۔ آپ کیوں مارنا چاہتے تھے اُسے۔۔۔“ راحیلہ نے شدید حیرت سے کہا۔

”اُس نے کسی کی عزت پامال کی تھی میں چاہتا ہوں کہ۔۔۔ چھوڑو میں جو بھی چاہتا ہوں۔ تم بتاؤ تم کیوں آئی ہو؟“ اس نے اپنی بات

درمیان میں چھوڑ کر اُس سے پوچھا۔

”بتایا نہیں آپ کے مریض کو دیکھنے آئی تھی۔“ راحیلہ نے جیسے یاد دلایا۔

”دیکھ لیا۔۔۔؟“ جنید نے حتمی انداز میں پوچھا۔

”ہاں دیکھ لیا۔ ایک کام اور بھی تھا آپ سے۔“ راحیلہ ایک لمحے میں فیصلہ کرتے ہوئے تھمتھاتے چہرے کے ساتھ اُس کی

آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”مجھ سے تمہیں کام ہے۔ کیا کام ہے؟“ جنید نے حیرت سے پوچھا۔

”آپ کہیں سکون سے بیٹھ کر بات سننے کا وقت دیں میں اطمینان سے آپ کو بتانا چاہتی ہوں۔“

اس نے کہا تو جنید سوچ میں پڑ گیا پھر چند لمحوں کے بعد بولا۔

”اگر آج تم کو تو سوری مجھے کورٹ جانا ہے۔ شام کے وقت۔“

”بھری ڈیوٹی ہوگی۔ چلیں کل اسی وقت میں آپ کا سینہ انتظار کروں گی۔ پھر کہیں بھی بیٹھ کر بات کر لیں گے۔“ راحیلہ نے اس کی

آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے۔۔۔“

جنید نے وعدہ کر لیا تو راحیلہ چند لمحوں کے بعد اُس کی جانب دیکھتی رہی پھر اُسے خدا حافظ کہہ کر واپس پلٹ گئی۔ جنید وہیں کھڑا چند لمحوں کے بعد چارہا

پھر وہ بھی دیکھے قدموں سے چلتا ہوا کمرے کی جانب چل پڑا۔ اُسے کچھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اُسے کیوں ملتا چاہتی ہے؟

☆

قارم ہاؤس کی اوپری منزل پر کمرہ انتہائی جدید انداز میں سنوارا گیا تھا۔ صفیہ نے جیسے ہی اس کمرے میں قدم رکھا ایک لمحے کے لئے وہ حیرت میں ڈوب گئی۔ پھر فوراً ہی خود پر قابو پاتے ہوئے وہ ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ تیور آگے بڑھا اور اُس نے ریٹھی پر دے سر کا دیئے دور تک کا مضر کھڑکی سے حیاں ہو گیا۔ سبز کھیت ہرے بھرے شاداب درخت، بستی نمبر کے ساتھ کراس کرتی ہوئی سڑک، کھیتوں میں کام کرنے والے لوگ، سونٹھی، ٹوب ویل، چھوٹے کھال اور آڑتے ہوئے پرندے، اُسے یہ منظر بہت خوبصورت لگا تھا۔ وہ جو ایک لمحے کے لیے ویٹرن شائل میں بچے کمرے کو دیکھ کر بہت ہوئی تھی اپنے دلیس کے اس دیہاتی منظر نے اُسے اعتماد بخش دیا تھا۔

”اس کمرے کا سارا سامان مینس یورپ سے لایا تھا، بس فرنیچر یہاں سے بنوانے میں بڑی محنت کرنا پڑی تھی۔“ تیور نے ہیلے پر بیٹھے ہوئے کہا۔

”تیور امنیں کچھلی پار جب آئی تھی اور اس دفعہ بھی آئی ہوں یہاں آتے ہی تم تھوڑا اہنڈ باقی نہیں ہو جاتے ہو جیسے اس جگہ تمہارا ماضی سانس لے رہا ہو؟“ صفیہ نے تجسس سے پوچھا۔

”کہہ سکتی ہو یار۔۔۔!“ تیور نے فوراً ہی اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ پھر چند لمحے سوچ کر بولا۔ ”لیکن ایسا ہوتا نہیں ہے ہر دھرتی کی مٹی اور وہاں کی ہوا میں اپنی انگ تا شہر ہوتی ہے۔ مینس تقریباً چار سال تک رہ چل میں رہا ہوں لندن بڑے فورڈ مطلب وہاں میں کچھ پڑھنے کم اور دنیا کو دیکھنے زیادہ گیا تھا۔ لیکن زیادہ رہا ہوں۔ یہ سب اپنے مزاج کے ہیں، میرا ملک اپنے مزاج کا ہے۔ بہت سارے لوگ آتے جاتے ہیں لیکن میرے خیال میں بہت کم لوگ ایسے فرق کو محسوس کرتے ہوں گے۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو لیکن میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ زندگی یا دوں کے ساتھ تو نہیں گزارا جاسکتی! ایک اجنبی دلیس کا ماحول تم دوسرے ملک میں پیدا کرنے کی کوشش کرو تو اس میں سکون نہیں ہوتا، جتنی بہر حال رہے گی۔“

”تم ٹھیک کہتی ہو صفو! پہلے پھل مجھے جنون تھا کہ یہاں اگر میں وہاں کی طرز پر کوئی عمارت بناؤں گا تو نہ صرف میری خواہش پوری ہوگی بلکہ ایک طرح سے انفرادیت بھی ہوگی لیکن بہت بعد میں مجھے یہ احساس دلایا گیا کہ ایسا احساس کمتری کی وجہ سے بھی ہوتا ہے حالانکہ میں نہیں سمجھتا کہ مجھ میں کسی قسم کا کمپلیکس پایا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ انسان کے لاشعور میں یہ سب چھپا ہوا ہو۔“

اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس سے پہلے کہ صفیہ جوانا کچھ کہتی قارم ہاؤس کے ملازمین جوڑے نے دروازہ کھولا اور لوازمات کے ساتھ پر تکلف چائے لے آئے۔ کچھ دیر برتنوں کی کھٹکنا بہت سی اُپھارہ چلے گئے۔ تیور اُس کے پاس صوفے پر آ بیٹھا۔ صفیہ چائے پیتے ہوئے بولی۔

”میں سمجھتی ہوں، تیور! کہ انسان کے کچھ خواب ہوتے ہیں جنہیں وہ پورا کرنا چاہ رہا ہوتا ہے۔ بعض اوقات یہ خواب شدید خواہش میں بدل جاتے ہیں۔ انسان کو یوں لگتا ہے کہ اگر اُس کے یہ خواب پورے نہ ہوں تو شاید ادمرورہ جائے گا۔ لاشعوری طور پر وہ ان خوابوں کو اپنا مقصد بنا

لیتا ہے۔ مطلب پوری طرح ان خوابوں میں کھو جاتا ہے۔"

"ہاں ایسا ہوتا ہے سنیں نے اپنے ایک ٹیچر سے سنا تھا کہ یہ انسان ہی ہے جو خواب دیکھتا ہے دوسری اور کوئی مخلوق خواب نہیں دیکھتی۔"

وہ دیر سے بولا۔

"یہ کیسے ممکن ہے اور ہمیں کیسے یقین ہو سکتا ہے کہ کوئی اور مخلوق خواب نہیں دیکھتی؟" وہ حیرت سے بولی۔

"اس سے حقیق وہ یہ دلیل دیتے ہیں کہ انسان ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتا ہے۔ غار کی زندگی سے نکل کر اس جدید دور

میں آ گیا ہے کس وجہ سے؟۔۔۔ ایک تڑپ تھی اس کے اندر اور وہ تڑپ کس شے سے پیدا ہوتی ہے؟ یہ خواب ہی ہوتے ہیں نا جو انسان کو آگے ہی

آگے بڑھنے پر مجبور کرتے ہیں جبکہ دوسری مخلوق ابھی تک اس ذکر پر چل رہی ہے۔"

"خواب تو بہت اہم ہوتے نا پھر۔۔۔" صنفیہ نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا اور چائے کا کپ تیسور کی جانب بڑھا دیا۔

"ہاں۔۔۔ لیکن یہ ایک مفرتی خیال ہو سکتا ہے۔ وہ اسے خواب یا "ڈریم" کہتے ہیں۔ میں نے اسی تیسوری کو یہاں کے ایک صاحب

سے ڈسکس کیا تو پچھ مجھے اک نئی بات معلوم ہوئی۔ انہوں نے یہ کہا کہ خواب پیدا ہونے کی وجہ خیال ہے۔ جب خیال ذہن میں آتا ہے تو پھر بہت

ساری صورتوں میں ڈھل جاتا ہے۔ خواہش ارادہ خواب امید اور نجانے کیا کیا۔ مثلاً تاج محل کا وجود نہیں آتا ایک خواب نہیں خیال ہے۔ مناز محل

سے شاہ جہاں کی محبت اس عمارت کا ناسل ہے۔ اسی خیال نے پھر کتنے ہی روپ دھارنے یہ ساری دنیا کے سامنے ہے اور تاریخ کے اوراق میں

م محفوظ ہے۔ اسی طرح بہت ساری مثالیں دی جا سکتی ہیں۔"

یہ کہہ کر اُس نے چائے کا سپ لیا اور اس کی جانب دیکھنے لگا جو اپنے لیے چائے بنا تے ہوئے گہری سوچ میں تھی پھر سر اٹھاتے ہوئے

بولی۔

"یہ خیال کہاں سے آتا ہے نہیں بتایا ان صاحب نے۔۔۔؟" اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

"اُس کی مجھے اتنی کچھ نہیں آئی لیکن ان کا کہنا تھا کہ جس طرح بارش برتی ہے بالکل اسی طرح خیال آتے ہیں جو انسان کی مطابقت سے

اپنی ہیئت تبدیل کرتے ہیں۔ خواہش و ہم امید خوشی اور نجانے کیا کچھ اور پھر انسان اسی طرح چلتا ہے۔ جیسے بارش کا قطرہ زمین پر گرنے سے قبل

تک بالکل خالص ہوتا ہے اور جیسے ہی وہ زمین پر گرتا ہے تو اُسے جس طرح کی زمین میسر آئے اسی طرح کا ہو جاتا ہے۔ ایسا ہی انسان کے ساتھ

ہے۔" تیسور نے گہری تنجیدگی سے کہا۔

"تم نے یہ باتیں کہاں سے سیکھیں؟" صنفیہ نے صوفے سے ٹیک لگاتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے کوئی ریسرچ نہیں کی بس اچھے لوگوں کے پاس بیٹھنے کا اثر ہے کہ ان کی باتیں ذہن میں رہ جاتی ہیں۔" یہ کہتے ہوئے جیسے

اُسے یاد آ یا فوراً ہی بولا۔ "ایک اور بات بھی ہے جو مجھے بڑی عجیب سی لگتی ہے۔ یہاں کے دانشور قسم کے لوگ جب اپنی کسی کمزور بات کو سہارا دینے

کے لیے یورپ اور امریکہ کی بات کرتے ہیں کہ ان کے مقابلے میں یہاں یوں ہے یا وہاں پر ایسے ہو رہا ہے تو یہاں یہ ہے وہ فیروزہ و فیروزہ تو یقین جانو

ان پر ہنسی آتی ہے۔ جمہوریت کی خاص طور پر بات کرتے ہیں۔ کسی بھی دوا شفاء کے قابل کے لیے ان کا ایک جیسا ہونا بہت ضروری ہے۔ ہم سوچتے ضرور ہیں لیکن اس کی سمت درست نہیں۔۔۔ تیمور نے تیزی سے کہا اور ایک سکٹ اٹھا لیا۔

”خیزات کہیں اور طرف لکل گئی میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔“

صفیہ نے سیدھے ہوتے ہوئے محتاط انداز میں کہا تو تیمور نے غور سے اُس کی طرف دیکھا اور انتظار کرنے لگا کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے۔

چند لمبے یونہی گزر گئے تو وہ بولی۔

”کچھلی بار جب میں یہاں آئی تھی تو ہمارے درمیان کچھ باتیں ہوئیں تھیں۔“

”مثلاً کون سی یاد تو دلا دو۔“ ہنستے ہوئے بولا۔

”تم نے کہا تھا کہ ابھی ہم اچھے دوستوں کی طرح انجوائے کریں گے شادی وغیرہ کا چکر ابھی نہیں ہوگا۔“ وہ قدرے جھجکتے ہوئے بولی۔

”آف کورس۔۔۔ مطلب تم چاہ رہی ہو کہ ابھی ہم شادی کے لیے جلدی نہ کریں تو اس پر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ تیمور نے تیزی سے کہا۔

”اور میرے خواب جو میں پورا کرنا چاہتی ہوں کیا تم اس میں میری مدد کرو گے۔ تب تک میرا انتظار کرو گے؟“

”کیوں نہیں صنوا میں تمہارا انتظار کروں گا بلکہ یہ انتظار بھی تو بے معنی سا لگتا ہے۔ ہم پاس پاس ہیں جب چاہے ہیں مل لیتے ہیں بات کر لیتے ہیں۔ اتنی دوری نہیں ہے اور رہی تمہاری مدد کی بات تو میں تمہارے لیے کچھ نہیں کروں گا تو پھر اور کس کے لیے کروں گا؟“

”یہ ہوئی نا بات۔۔۔“ وہ یکدم خوش ہو گئی جیسے اُسے اپنی من کی مراد مل گئی ہو۔

”یہ اچھا ہے تم اگر تم ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ہمیں بہت سا وقت مل جائے گا۔ ہماری جو خوبیاں ہیں یا خامیاں ایک دوسرے پر واضح ہو جائیں گی۔ ہم ایک دوسرے کے لیے اپنے آپ کو بہتر بنانے کی بھرپور کوشش کر سکتے ہیں یوں شادی کے بعد ہم بھرپور لائف انجوائے کر سکیں گے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”بہت شکریہ تیمور! تم نے مجھے سمجھا۔“ صفیہ نے اُس کی طرف پیار بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”تم آن یار! ایک ہی تو مجھے لڑکی پسند آئی ہے اور میں اس کے بھی خیرے برداشت نہ کروں۔“

وہ ہنستے ہوئے بولا تو صفیہ بھسبھ گئی۔ پھر بات بدلتے ہوئے بولی۔

”تیمور! ہم کتنی جلدی ایک دوسرے کے قریب آ گئے ہیں۔ میں کبھی کبھی سوچتی ہوں تو مجھے یہ سب کچھ خواب سا لگتا ہے۔ میں اگر اس دن تانبہ کی پہن کی شادی میں نہ جاتی یا تم ہی کسی وجہ سے نہ آ سکتے تو کیا ہمارے ملنے کا چانس تھا؟۔۔۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کیا آج ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہوتے۔۔۔“ وہ خواب ناک انداز میں بات کر رہی تھی جس پر تیمور نے سنجیدگی کے ساتھ حتیٰ لچھے میں کہا۔

”ہمیں ہر بات اتفاق سے نہیں ہوتی۔ بہت سارے واقعات ماضی سے جڑے ہوتی ہیں اور انہیں کسی نہ کسی منطقی انجام تک پہنچانا ہوتا

ہے۔ بالکل اسی طرح کچھ معاملات ایسے ہوتے ہیں جو مستقبل میں کسی واقعے کی بنیاد بنتے ہیں جنہیں ہم اتفاق کا نام دیتے ہیں۔ اگر ہم بہت غور کریں تو ایک بات بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ یہ اتفاقات یوں لگتے ہیں جیسے یہ پہلے سے طے شدہ ہوں۔ کسی بھی معاملے کو بہت غور سے دیکھ لو۔

”یہ تیسوری بھی تمہیں کسی نے سمجھائی ہوگی؟“

صفیہ نے تہتہ لگاتے ہوئے کہا تو اس پر تیسوری بھی دل کھول کر ہنسا اور اسی مسکراہٹ میں اُس نے کہا۔

”یار اتفاق اپنی جگہ لیکن اسکی باتیں جو دل کو چھو جائیں اور وہ اچھی لگیں تو کم از کم انہیں یاد ضرور رکھ لینا چاہیے۔ وہ آپ کی عقل کو بہر حال بڑھاتی ہیں۔۔۔ اب دیکھو ہم نے اتنی باتیں کی ہیں میں اگر اس کے مقابلے میں یہاں پر پڑی ہوئی قارئین اشیاء کے بارے میں باتیں کروں تو کیا تمہیں یوریت کا احساس نہیں ہوگا؟“ تیسوری نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”تم اگر اس پر بات کرو تو دنیا کے کسی موضوع پر بھی بات کرو مجھے اچھا لگے گا میں کبھی یوریت محسوس نہیں کروں گی۔“ صفیہ ہمارا آلود لہجے میں بولی۔

”تیسوری چند لمحے اُس کی طرف حیرت اور عجز سے دیکھتا رہا پھر کندم بٹنے ہوئے بولا۔“ آپ میں سمجھا شادی سے پہلے میں جیسی بھی باتیں کر لوں تم سونگی اور یوریتیں ہوگی مگر شادی کے بعد قطعاً تم یونگی اور میں سنوں گی۔ وہ کہتے ہیں تا کہ بیوی اور بیوی دی۔۔۔“

”تیسوری میں نے اتنی رومانٹک بات کی جس کا تم نے طیبہ بگاڑ دیا۔“ وہ مصروفی طے میں بولی۔

”تیسوری کا تہتہ بلند ہو گیا پھر بولا۔“ آؤ میں تمہیں قارئین قارئین دکھاؤں۔ اس دن تمہیں دیر ہوگی تھی۔“

”ٹھیک ہے۔“

صفیہ نے کہا اور اٹھ کھڑی وہ بہر حال میں اُسے خوش رکھنا چاہتی تھی۔۔۔ دونوں قارئین قارئین دیکھنے کے لیے کمرے سے نکل گئے۔

☆☆

ہمایوں ٹھیک وقت پر عدالت پہنچ گیا تھا۔ اس وقت تک سردار اقبال اپنے چیمبر میں نہیں آئے تھے۔ پہلے دن کا تجربہ اسے بہت اچھا لگا تھا اور وہ بھی اُن کے دینے ہوئے کام میں مصروف ہو گیا۔ عابد کی اس کے ساتھ اچھی خاصی شناسائی ہو گئی تھی۔ دوپہر سے ڈرا پہلے تک انہوں نے بہت سارا کام منٹا لیا تھا اس لیے گپ شپ کے دوران عابد نے یونگی سرسری سے امتحان میں پوچھا۔

”کہیں تمک تو نہیں گئے ہو؟“

”نہیں یار میں کون سا پھاؤں اچھا رہا ہوں۔“ ہمایوں نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ارے یہ کام پھاؤں اچھا نے سے کیا کم ہے۔ سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ کرنا تمہارے خیال میں ایسے ہی ہو جاتا ہے؟۔۔۔ میری جان! دماغوں پینٹا آ جاتا ہے دماغ کی چولیس بل جاتی ہیں۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”ہاں یہ تو ہے۔۔۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے یار کہ یہاں جنگل کا قانون ہے جو بہت طاقتور ہے۔“

”یہ کیسی فیروگیلا نہ گفتگو کر رہے ہو۔ ایسے خیالات اگر تمہارے ذہن میں ہیں تو انہیں نکال باہر رکھو۔ ہمارا ایسے خیالات سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ ہماری تو یوں سمجھو کہ دوکانداری ہے۔ ہمارے نزدیک ہر شخص مصوم ہے۔ اس کی تائید تو قانون بھی کرتا ہے۔ طوائف اور بے گناہ مصوم لڑکی دونوں برابر ہیں جب تک کہ ان پر ثبوت کے ذریعے کوئی قانون لاگو نہ ہو جائے۔ عدالت ثبوت مانگتی ہے جس کے ثبوت پر ہی وہ فیصلہ کرتی ہے۔ جان لو کہ ملزم اس وقت تک مجرم نہیں ہوتا جب تک اس پر جرم ثابت نہ ہو جائے۔ یہاں پر آنے والا ہر بندہ خود کو بے گناہ ظاہر کرتا ہے۔“ عابد نے اسے اچھی بھلی مرڈنیش کر دی۔

”قانون تو انسانوں کے لیے ہوتے ہیں قانون کے لیے انسان تو نہیں ہوتے۔ ہماری سماجی زندگی میں جب ایسے معاملات ہوں گے کہ جنہیں ثبوت ختم کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے تو پھر یہ سماج۔“

”میں نے کہا تھا یہ ہمارا معاملہ نہیں ہے۔ قانون بھی حرکت میں آتا ہے جب جرم ہوتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ لاقانونیت ہونی چاہئے ایسا نہیں ہے بلکہ میں یہ کہتا ہوں کہ سماج کے ان راستوں کو بند کیا جائے جہاں سے جرائم کو حوصلہ ملتا ہے۔ جب قانون ٹھکنی کرنے والے زیادہ ہوں طاقتور بھی ہوں تو قانون بپارے کی کیا بساط۔۔۔؟“ عابد نے طنز یہ انداز میں کہا پھر سامنے بڑے کاغذات کو سمیٹتے ہوئے بولا۔ ”آؤ چلو آج بچت ہے۔“

کچھ دیر بعد وہ دونوں ایک عدالت کے سامنے کھڑے تھے۔ جہاں کچھ دیر بعد بحث ہونے والی تھی۔ ہمایوں کو وہاں کھڑے ابھی تھوڑا سا وقت ہوا تھا اور اُسے یوں انتظار کرنا پور لگا تھا۔ وکیل، فٹنی مدعی، ملزم سب کھڑے تھے اور ابھی جج صاحب کرسی انصاف پر براجمان نہیں ہوئے تھے۔ تبھی اُس نے جج سے سوچا کہ انصاف کا حصول بھی کس قدر مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ یہ سوچتے ہوئے اُس نے اردگرد دیکھا۔ تبھی اُسے سامنے ایک شناسا چہرہ دکھائی دیا۔ چند لمحے تک اُسے سمجھ نہ آئی کہ اُس نے کہاں دیکھا ہے یہ چہرہ؟ وہ اُسے غور سے دیکھتے ہوئے سوچنے لگا۔ پھر اچانک ایک مہمما کا ہوا۔ اُسے حالات کی وہ رات یاد آگئی جب اُس پر تشدد کیا گیا تھا اور وہ شخص بھی وہیں تھا۔

”مردین اوئے مرو۔۔۔!“ ہازمشت کی طرح یہ فہرہ اُس کے کانوں میں گونج گیا۔ اُس نے پھر اس فہرے پر غور کیا وہ پھر سے اُس کے کان میں بجنے لگا۔ ”مردین اوئے مرو! جو کہا ہے اس پر قائم رہ۔ چار دن ہو گئے ہیں مجھ سے ایک بات بھی نہیں منوا سکے ہیں۔“

جیسے ہی اُسے پوری بات یاد آئی اُس نے عابد کی پرواہ ہی نہیں کی اور تیر کی سی تیزی کے ساتھ اس لڑکے کی جانب بڑھا اور گہری لٹکاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ ہمایوں اس کے چہرے پر دیکھ رہا تھا جس پر حیرت، فہم اور تجسس کے تاثرات تھے پھر چند لمحوں بعد ہی اس کے چہرے پر سے وہ سارے تاثرات ختم ہو گئے وہاں پر شناسائی آتر آئی۔

”تم۔۔۔؟“ اُس نے خامی حیرانگی سے کہا جیسے اس کا یوں ٹل جانا اچھے کی بات ہو۔

”بچپان لیا مجھے۔۔۔؟“ ہمایوں نے پوچھا۔

”تم وہی ہو نا جسے وہ سب انپکڑ اس رات لے کر آیا تھا اُس کریم والے کے ساتھ۔۔۔؟“

جنید نے مزہ لیتے ہوئے پوچھا تو ہمایوں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ اس پر جنید نے زوردار قبضہ لگایا۔ اُسے یہ ہوش ہی نہیں تھا کہ وہ کہاں کھڑا ہے۔

”آؤ ادھر آؤ بیٹھے ہیں۔۔۔“ ہمایوں نے جلدی سے کہا اور کینٹین کی جانب بڑھ گیا جہاں رش نہیں تھا دو خالی کرسیوں پر بیٹھ کر اُس نے شخصاً بھجوانے کا کہہ دیا۔

”تو یہاں کیا کر رہا ہے۔۔۔ یہ کالے کوٹ سے تو لگ رہا تھا کہ تو وکیل ہے تو پھر وہ۔۔۔؟“ جنید نے تجسس سے پوچھا۔

”میں وکیل ہی ہوں نتیجاً جائے گا تو پھر باقاعدہ وکیل بن جاؤں گا اور اس رات۔۔۔“

یہ کہہ کر اُس نے انتہائی اختصار سے وہ بات بتا دی۔ جنید نے پوری توجہ کی اور خاموشی سے سنا اس دوران شخص ابھی آ گیا جسے دھیرے دھیرے سپ لیتے ہوئے وہ پیتے رہے۔ سب کچھ سن کر اُس نے کہا۔

”ہوں یہ اُس انسپکٹر کے بیچے نے بد معاشی دکھائی۔۔۔ خیر یہ تو چلتا ہے ہمارے معاشرے میں۔ ہماری اس پولیس کا فلسفہ یہی ہے کہ عوام پر ظلم کروا سے دبا کر رکھو اور چند خاندانوں کو جو اس ملک کی تقدیر کے فیصلے کرتے ہیں انہیں تحفظ فراہم کرو۔“ جنید نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

”اور تم۔۔۔ تم کیوں وہاں تھے اور اب یہاں۔۔۔ کیا معاملہ ہے؟“ ہمایوں نے پوچھا۔

”میں وہاں کیوں تھا اُسے چھوڑو۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے پھر کسی وقت سناؤں گا۔۔۔ یہاں میں ایک وکیل سے ملنے آیا تھا اُس سے تھوڑا کام تھا۔“

”کام۔۔۔؟“ ہمایوں نے وضاحت چاہی۔

”بس تھا یار۔۔۔؟“ یہ کہہ کر اُس نے بات بدلتے ہوئے کہا۔ ”ویسے تم نے اُس سب انسپکٹر کے بارے میں کوئی کارروائی نہیں کی؟“

”کہاں یار! میرے جیسے لوگ ’غریب غریب کچھ نہیں کر سکتے۔۔۔ پہلے تو میری کسی نے مٹی ہی نہیں تھی پھر کیا پولیس والے اپنے ساتھی کے خلاف کوئی کارروائی کرتے؟ اُلٹا مجھے ہی حالات میں رہنا پڑتا اور پٹائی الگ سے ہوتی۔ ہم جیسے غریبوں کے لیے ممکن نہیں ہے ہم حوصلہ ہی نہیں کر سکتے۔ اپنی عزت بچائیں روٹی پوری کریں یا ان سے لڑائی لیں۔ ہم انور ڈی نہیں کر سکتے یار۔۔۔!“

”کیوں نہیں کر سکتے۔۔۔ کیا تمہارے دو ہاتھ نہیں ہیں ان میں جان نہیں ہے؟“ جنید نے تیزی سے کہا۔

”سب کچھ ہے لیکن کیا میں اپنے گھر والوں کو بھول جاؤں؟۔۔۔ ہاں سنیں بھی دولت مند ہوتا تو کئی ایسے سب انسپکٹر کو خرید کر اپنی جیب میں رکھتا جیسے میں نے کل یہاں ماجد وڈا کچ کو دیکھا ہے۔ وہ۔۔۔“

”کیا۔۔۔ کیا کہا تم نے ماجد وڈا کچ۔۔۔؟“ جنید نے انتہائی حیرت سے تیزی سے ساتھ پوچھا۔

”ہاں کل ہی۔۔۔ میں نے کل اُسے دیکھا ہے۔“ ہمایوں نے عام سے انداز میں کہا۔

”تم جانتے ہو اُسے۔۔۔؟“ جنید نے اسی لہجے میں پوچھا اور ہاتھ میں پکڑی خالی بوس رکھ دی۔

”نہیں! میرا کوئی گ اُسے جانتا ہے! اسی نے مجھے بتایا تھا، پر تم اتنا تجسس کیوں کر رہے ہو؟“ ہمایوں نے اُس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”تم نے پوچھا تھا کہ میں پولیس کے پاس کیوں تھا! صرف اسی کی وجہ سے۔۔۔ تفصیل تمہیں بعد میں بتاؤں گا! کیا تم اُس کے بارے میں

معلومات دے سکتے ہو؟“ جنید نے انتہائی سرد لہجے میں پوچھا۔

”میں اُسے نہیں جانتا۔ بتایا ہے نا! عابد جانتا ہے۔ میں نے تو کل اُسے پہلی مرچ دیکھا تھا۔“ ہمایوں نے صاف لفظوں میں اُسے بتا دیا۔

”دیکھ۔۔۔ کیا نام ہے تمہارا۔۔۔؟“ جنید نے پوچھا۔

”ہمایوں۔۔۔ اُس نے اپنا نام بتایا۔

”ہمایوں! میرا نام جنید ہے۔ تم اگر اس شخص کے بارے میں کلمہ اطلاع دے دو! شاید کو احساس ہوئے بغیر تو میں جنہیں ایک لاکھ روپیہ

دے دوں گا۔“ وہ تیزی سے کہتا چلا گیا۔

”ایک لاکھ۔۔۔؟“ ہمایوں حیرت سے بولا۔

”ہاں۔۔۔ اگر معلومات زیادہ ہوں تو اس سے بھی زیادہ۔۔۔ بولو! کیا کہتے ہو؟“ جنید نے پوچھا تو ہمایوں خاموش ہو گیا۔ جنید نے اُس

کی دکھتی رنگ پر ہاتھ رکھتے مزید کہا۔ ”دیکھ سوچ لے اور یہ میرا نمبر لے لے۔ اگر جواب ہاں میں ہوا تو مالا مال کروں گا۔ یہ جو تو غربت کے رونے

رہتا ہے نا! یہ نہیں ہوں گے۔“

”جنید! میں یونہی وعدہ نہیں کرتی! کلمہ ہوا تو میں تم سے شیئر کر لوں گا۔ اگر وہ مجھے یہاں دکھائی دیا تو میں جنہیں بتا دوں گا۔“ وہ قدرے

بے چارگی سے بولا۔

”ٹھیک ہے۔۔۔ وہ کل کیوں آیا تھا! کس کے پاس آیا تھا۔ تم یہیں سے شروع کر سکتے ہو۔“ جنید نے کہا۔

”وہ میرا کام ہے! لاؤ نمبر۔۔۔“

ہمایوں نے اُس کا موبائل پکڑا! اپنے نمبر ملائے اور نمبر ڈکری لے کر تھوڑی دیر تک وہ وہاں بیٹھ رہنے کے بعد اٹھ گئے۔ جنید نے جیب میں

ہاتھ ڈالا تو ہمایوں نے اُسے روک دیا۔

”نہیں! رہنے دو! میں دے دیتا ہوں۔ تم مہمان۔۔۔“

”تم ہی دینا۔۔۔“ یہ کہہ کر اُس نے جیب سے چند بڑے نوٹ نکالے اور اُسے دیتے ہوئے بولا۔ ”یہ رکھو! تمہارے کام آئیں گے۔

یہاں دولت کے بغیر کچھ نہیں ہوتا۔“

یہ کہہ کر اُس نے قدم بڑھادیے۔ ہمایوں نے بل دیا تو جنید قاسب تھا ابھی وہ اُسے حیرت سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ اُس کا فون بج اٹھا جنید کی کال تھی۔

”اچھا خدا حافظ۔“ منیں نے قہارے فون کا انتظار ابھی سے کرنا شروع کر دیا ہے۔ منیں نہیں چاہتا کہ اب تمہیں اور مجھے کوئی اکٹھا دیکھے۔ خدا حافظ!“

یہ کہتے ہی اُس نے فون بند کر دیا۔ ہمایوں چند لمبے فون ہی کو دیکھتا رہا۔ پھر اسے جیب میں ڈالا اور اس طرف چل دیا جہاں عابد تھا۔ سارا دن وہ ڈسٹرب رہا۔ وہ فیصلہ نہیں کر پارہا تھا کہ کیا کرے؟ ایک جانب اچانک اتنی بڑی رقم ملنے کی توقع تھی مگر دوسری جانب کئی خدشات تھے۔ پونٹیں وہ ماہدو زائج کے بارے میں معلومات حاصل کر بھی پاتا ہے یا نہیں۔ کیا عابد سے جب وہ پوچھے گا تو وہ چونکا نہیں ہو جائے گا؟ بالفرض حال اُسے معلومات مل بھی گئیں اور اُس نے جنید تک پہنچا بھی دیں تو کیا گارنٹی ہے کہ وہ اسے اتنی بڑی رقم دے دے گا اور رقم دے بھی دے تو کیا جنید پر اظہار کیا جاسکتا ہے وہ اسے کسی طرح استعمال بھی کر سکتا ہے۔ یہ اور ایسی کلی سوجھیں سارا دن اُسے پریشان کرتی رہیں لیکن من میں کہیں ایک بات تھی جو اُسے جنید کی بات مان لینے پر آمادہ کر رہی تھی شرط صرف یہی تھی کہ وہ عابد سے سب کچھ اُگلا لے کر وہ ایسا کیوں کرے؟۔۔۔ یہی سوال تھا جس نے اُسے آمادہ کر دیا کہ وہ جنید کے لیے ضرور کام کرے گا۔ اُس کی پہلی ترجیح دولت تھی یہی وہ منتر تھا جس سے منہ کو حاصل کیا جاسکتا تھا۔ منہ اُس کی منزل تھی۔۔۔ اُس نے آنکھیں بند کیں ایک گہرا سانس لیا اور فیصلہ کر لیا۔ اُسے اپنی جدوجہد کی سست مل گئی تھی۔

☆☆

رات ڈھل گئی تھی جب عالمگیر کو ہوش آیا وہ کسمپایا تو جنید نے اُس کی جانب دیکھا اور پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ بہت غور سے عالمگیر کو دیکھ رہا تھا۔ گزشتہ شام جب وہ واپس آیا تھا تب وہ خواب آور دو باتوں کے زیر اثر سو رہا تھا۔ پہلی نگاہ میں تو جنید کو یوں لگا تھا کہ جیسے وہ اس دُنیا سے رخصت ہو گیا ہے۔ اُس نے حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے ڈیٹان سے اشارے کے ساتھ پوچھا تھا کہ اسے کیا ہوا ہے؟

”ٹھیک بہت کر رہا تھا ڈاکٹر نے اسے نشہ کا انجکشن لگا دیا ہے۔ ایک انجکشن اور لگا تو منج تک یہ یونہی سوتا رہے گا۔“

”ٹھیک ہے اس کا علاج ہی یہی ہے۔“

اُس نے لا پر و اسی سے کہا تو ڈیٹان اُٹھے ہوئے بولا۔

”یار! منیں چلتا ہوں۔ رات تم اس کے پاس رہو منج منیں آ جاؤں گا۔“

”ویسے اہم خواہ خواہ اس کی توجہ داری میں لگے ہوئے ہیں۔ قیادت کو اگر اس کی ضرورت ہے تو کسی کو اس کے پاس بھیج دے نہ ہمارا وقت تو بہاوتہ کرے۔۔۔“

جنید نے قدرے غصے میں کہا تو ڈیٹان مسکرایا اور پھر خوشگوار لہجے میں بولا۔

”ہمارا وقت۔۔۔ کیا کر رہے ہیں ہم؟ ادھر بھی تو پڑے ہی رہتا ہے۔“

”ہاں یہ بھی ہے۔“ وہ بھی مسکراتے ہوئے بولا پھر اُسے جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اچھا جاؤ لیکن قیادت سے بات کر لو وہ اس کے پاس بندے بھیج دے۔“

”کر لوں گا بات یا تم آج رات تو رہو نا اس کے پاس۔۔۔“

ذیشان نے کہا اور باہر کی سمت چل دیا تھا۔ تب جنید کے پاس سوچنے کو فطرت عدالت رہ گئی جہاں اُسے اگر مایوسی ملی تھی تو ایک غیر متوقع اُمید بھی بندھ گئی تھی۔۔۔ عالمگیر کسما کر پھر بے سلسلہ ہو گیا تھا۔ جنید اٹھا اور کونے میں رکھی ہوئی پانی کی بوتلوں تک گیا، اُس نے پانی پیا اور پھر واپس آ کر بیٹھ گیا۔ اُس کے دماغ میں پھر سے عدالت ٹھونسنے لگی تھی۔

اس دن جب وہ قاروق چوہدری سے ملا تھا تو اُس نے بہت مشکل سے اُس کی پوری بات سنی تھی۔ اُس کا رویہ یوں تھا جیسے کوئی بہت مشکل اور یورترین سوال کر دیا گیا ہو۔ پھر بھی جب اُس نے اپنا تعارف کرایا تو بات سننے پر مجبور ہو گیا۔ ساری بات سن کر وہ بولا۔

”دیکھئے میرے پاس ایک ایسا کیس آیا تھا۔ لڑکی کے ساتھ واقعتاً زیادتی ہوئی تھی لیکن بہت جلد اُنہوں نے آ کر کیس واپس لے لیا تھا۔ میں نے وجہ پوچھی تو اُنہوں نے یہی بتایا تھا کہ دوسرے فریق سے اُن کی صلح ہو گئی ہے اور لے دے کر معاملہ ختم کر دیا ہے اس لیے وہ کیس کو آگے نہیں بڑھانا چاہتے۔“

”آپ نے کیس دائر کر دیا تھا۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔ لیکن ابھی باقاعدہ سماعت شروع نہیں ہوئی تھی۔“

”آپ کے پاس اُن کا کوئی ایڈریس وغیرہ۔۔۔ مطلب کوئی ایسا اشارہ جس سے اُن کے بارے میں معلومات مل جائیں؟“

”سوری نہیں کچھ نہیں جانتا۔“

”اگر کوشش کی جائے۔۔۔ میرا مطلب ہے میں دو چار دن غمبیر کرتا آپ کے پاس آ جاؤں گا۔“

”میں نے کہا نا سوری۔۔۔ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر پاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔ بہت شکریہ آپ نے مجھے وقت دیا۔“

اُس نے مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا اور اٹھ گیا۔ وہ وہاں سے چپے ہوئے دماغ اور مایوسی کے عالم میں اُٹھ کر آیا تھا۔ وہ پورے غلوں سے اُس لڑکی کی مدد کرنا چاہتا تھا لیکن اب جبکہ اُس کے بارے میں معلوم ہی نہیں تھا تو وہ کیا مدد کر سکتا تھا؟ ایک عالمگیر ہی تھا جس سے وہ پوچھ سکتا تھا لیکن سو فیصد امکان نہیں تھا کہ وہ اُسے بتا دیتا۔۔۔ عدالت کے احاطے میں ہمایوں سے ملاقات اُس کے لیے خاصی حیران کن تھی کیونکہ اُس نے غیر متوقع طور پر ایک خبر سنی تھی۔ ہمایوں کو دو کھیل والے روپ میں دیکھ کر جنید کو اچھا لگا تھا لیکن اُس کے چہرے پر خوف، غربت اور مایوسی کے سائے اپنا تسلط جمائے ہوئے تھے۔ جنید کو اُس کی سادگی کا احساس اس وقت ہو گیا جب اُس نے ماجد وڈرائیج کا نام لیا تھا۔ اُسے احساس ہی نہیں تھا کہ وہ کیا شے ہے۔ اُس نے ہمایوں کو فوراً ہی آفسر تو کر دی تھی جنید کو احساس تھا کہ اگر اُس سے رابطہ ہو گیا تو وہ اس کے بہت کام آسکے گا۔ اگر اُس

نے ہایوں کو تھانے میں نہ دیکھا ہوتا تو شاید ایسی کوئی آفر نہ کرتا یہ اُس کی خوش قسمتی تھی کہ اگر وہ ماجدوڑا گج کے بارے میں کوئی معلومات حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا —

ماجدوڑا گج اُس کے لیے جہاں نفرت کی علامت بن چکا تھا وہاں وہ کئی سمجھوں سے اُس کا ہدف بھی تھا۔ اگرچہ ان دونوں میں دشمنی کی ابتدا یوٹورٹی کے دنوں ہی میں ہو چکی تھی لیکن بڑھتے دنوں کے ساتھ صرف اسی شخص نے ہی ان کی عظیم کو بہت نقصان پہنچایا تھا۔ جنیو کی خواہش تھی کہ وہ ہی اُسے اپنے ہاتھوں سے شتم کرے لیکن ایسا نہیں کر پایا تھا۔ اُس کی سب سے بڑی وجہ یہی تھی کہ وہ اُسے اچھی طرح جانتا تھا۔ اُس کی جڑیں جرائم پیشہ افراد میں زیادہ تھیں۔ پھر جس تیزی سے اُس نے اپنی سیاسی جماعت میں جگہ بنائی تھی اس نسبت سے سیکورٹی میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ قیادت اُسے ترنوالہ ہی سمجھتی رہی لیکن وہ بہت آگے نکل چکا تھا۔ پھر جن دنوں اُس کی پارٹی کی حکومت آئی وہ بجائے سامنے آنے کے بالکل ہی غائب ہو گیا۔ اُس کی سرگرمیاں کیا تھیں اُس کے بارے میں تو کیا معلوم ہوتا تھا وہی لگا ہوں سے اوجھل ہو گیا۔ ہایوں نے جب ماجدوڑا گج کا ذکر کیا تو جہاں اُس کے اندر جوش بھر گیا تھا وہاں احساس شکست کو شتم کرنے کی امید جاگ گئی تھی — کاش اُسے وہ مل جائے۔ یہ سوچتے ہوئے اُس نے واضح طور پر اپنی اگلیوں اور بازوؤں کی پنوں میں انٹھن محسوس کی تھی۔

عالمگیر امینان سے سورا تھا۔ اُس نے وقت دیکھا رات کے دو بج رہے تھے۔ اُسے نیند نہیں آ رہی تھی وہ کمرے سے باہر نکل کر بیٹھ گیا۔ اُسے کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ خود بھی ماجدوڑا گج کو ڈھونڈنے کی کوشش کرے یا ہایوں کی کسی کوشش کا انتظار کرے۔ وہ جس قدر سوچتا چلا جا رہا تھا اس قدر ہی وہ الجھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اُسے یوں لگا جیسے اُس پر دیاؤ تا قابل برداشت ہو رہا ہے سو اُس نے احساس ہوتے ہی ساری سوچوں کو جھٹک دیا اور باہر کھلے لان میں آ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ دیاؤ سے نکل چکا تھا۔ انہی لمحوں میں راحیلہ اُس کی سوچوں میں ڈر آئی۔ وہ دیر سے سے مسکرا دیا اُسے یوں لگا جیسے وہ مجسم اس کے سامنے آ گھڑی ہو۔۔۔ جانے وہ کیا چاہتی ہے؟ اس خیال کے ساتھ اُس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی بلاشبہ کوئی اُلجھن ہے جسے وہ تفصیل کے ساتھ بتانا چاہتی ہے پر مجھے ہی کیوں؟ اس سوال نے اُسے نئی راہ پر ڈال دیا تھا لیکن وہ سوچتا نہیں چاہتا تھا اس لیے راحیلہ کے خیال کو بھی جھٹک دیا۔۔۔ وہ اگر وہیں بیٹھا رہتا تو کوئی نہ کوئی اور سوچ اُسے دسترب کرے گی اس لیے وہ اٹھا اور کمرے میں آ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

اس وقت ڈاکٹر راؤ ظفر کے چاچکے تھے اور ڈیٹان آ گیا تھا جب جنید نے عالمگیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"لو بیٹی ڈیٹان! اب تم جانو اور تمہارا کام۔ میں جارہا ہوں بہت کرب کر لی تیرا روری۔"

"میں نے بات کر لی ہے آج کوئی نہ کوئی آ جائے گا۔ ٹھیک ہے تم جاؤ۔"

اُس نے جنید سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا تو وہاں سے نکل آیا۔ گریڈور سے نکلے ہوئے جنید کے ذہن میں راحیلہ تھی جس سے اُس نے ملنا تھا۔ اُس نے گھڑی پر نگاہ ڈالی وہ تھوڑا ایٹ ہو چکا تھا۔ اُس کے قدم تیز ہو گئے لیکن چند قدم چلنے کے بعد چاچک اُسے خیال آیا کہ وہ کیوں اس سے ملنے کے لیے بے تاب ہے؟ وہ اُس کے لیے محض ایک اجنبی لڑکی ہے اور بس! — کیا حلق ہے؟ بس اتنا ہی کہ اُس نے ایک بار اُسے پانی پلایا تھا اور ایک ایسی بات کہی تھی جس سے اُسے بہت حوصلہ ملا تھا۔ بس یہی تھی یہی نانا اور یہی شناسائی ہے؟ — یہ سوچتے ہوئے اُس کے قدم اُدھیلے پڑ

گئے۔ سچی بات تو یہی تھی کہ اس لڑکی کے لیے وہ اتنا کیوں سوچ رہا ہے۔ وہ مزاک کے کنارے کھڑا ہو گیا۔ اُسے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ وہ راحیلہ سے ملے یا نہیں؟۔۔۔ وہ چند لمبے سوچتا رہا لیکن کسی نتیجے تک نہ پہنچ سکا اور پھر اُسے خیال آیا کہ میں نے اُس سے وعدہ کیا ہے وہ انتظار کر رہی ہوگی۔ کیا تم اپنا ہی کیا ہوا وعدہ نہیں نبھادے گے؟ اپنے آپ سے اس سوال پر وہ دوجیرے سے مسکرا دیا اُسے بہر حال اپنا وعدہ تو نبھانا تھا۔

راحیلہ لان میں موجود تھی اور ادھر ادھر یوں دیکھ رہی تھی جیسے وہ بے یقینی سے کسی کی راہ تک رہی ہو۔ جنید کو اس کی بے چینی کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ دوجیرے قدموں سے چلتا ہوا اس کے پاس جا پہنچا۔ لہ بھر بعد راحیلہ کی نگاہ پڑی تو اُس کا چہرہ کھل گیا۔ پھر بڑے تحمل سے وہ اُس کی جانب بڑھی، قریب آتے ہی اُس نے کہا۔

”میں کبھی آپ کہیں معروف ہو گئے ہوں گے۔۔۔ کیا حال ہے آپ کے مریض کا؟“ راحیلہ کے لہجے میں مرثاوی ٹھکی ہوئی تھی۔

”میرے ساتھ آؤ ہم کبھی بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔۔۔“

جنید نے کہا اور باہر کی جانب چل دیا راحیلہ بھی اُس کے ساتھ چل دیا۔ ہسپتال کے گیٹ پر انہیں ٹیکسی مل گئی۔ جنید کے ساتھ جیسے ہی وہ بیٹھی اُس نے ایک مشہور ریستوران کا نام لے دیا۔

”ہاں آپ یوں تم کیا کہنا چاہتی ہو؟“

ریستوران کے ایک کونے میں اطمینان سے بیٹھنے کے بعد جنید نے راحیلہ کے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تو وہ چند لمبے اُس کی طرف دیکھتی رہی پھر دوجیرے سے بولی۔

”یہ نہیں پوچھیں گے آپ کہ میں آپ ہی سے کیوں بات کرنا چاہ رہی ہوں؟“

”راحیلہ! میں نہیں جانتا کہ تم مجھ سے کیا بات کرنا چاہتی ہو اور کیوں؟۔۔۔ تم جو کہنا چاہتی ہو کہہ دو۔ کم از کم یہ بخشش تو قسم ہو۔“

وہ عجیبگی سے بولا تو چند لمبے خاموش رہی شاید راحیلہ بات کا وہ سراگلاش کر رہی تھی جہاں سے ابتداء کرے پھر اُس نے سر اٹھایا اور کہتی چلی گئی۔

”میں ایک فریب گھر سے تعلق رکھتی ہوں۔ جب تک باپ کا سایہ میرے سر پر تھا، اچھی بھلی زندگی گزار رہی تھی۔ وہ ایک حادثے میں اللہ کو پیارے ہو گئے اور ہم ماں بیٹی کو یوں لگا جیسے ہمارے گھر کی چار دیواری بھی گر گئی ہے۔ یہ میری ماں ہی تھی جس نے بڑے حوصلے بہت اور مضبوطی سے اپنی حفاظت کی محنت کی اور بہت مشکل سے مجھے میٹرک کروایا۔ میں کوئی بچہ نہیں تھی کہ اپنی ماں کا دکھ نہ سمجھ سکتی۔ مجھے اپنے رشتے داروں سے بھی کوئی گلہ نہیں ہے کہ انہوں نے ہمیں کیوں نہ پوچھا اور نہ ہی تقدیر سے شکایت ہے کہ اس نے ہمارے ساتھ ایسا کیوں کیا؟۔۔۔ بہر حال میں یہاں نرس کی ٹریننگ کے لیے آئی۔ وہاں گاؤں میں تو کوئی ایک آنکھ ملتی ہوتی تھی لیکن یہاں تو میں بعض اوقات خود کو تنگ محسوس کرنے لگتی ہوں۔ میں نے اتنا وقت کس طرح گزارا یہ نہیں جانتی ہوں یا میرا خدا لیکن اب جبکہ تمہوڑا سا وقت رہ گیا ہے اور میری محنت کا پھل مجھے ملنے والا ہے تو میری راہ

میں بہت ساری رکاوٹیں کھڑی کی جارہی ہیں۔“

”کیوں — رکاوٹیں کیوں؟“ جنید جواب تک قفل سے ہاتھ نہ ہٹاتا تھا اچانک تیزی سے بولا۔

”اس لیے کہ منٹا لڑکی ہوں میرے آگے پیچھے کوئی نہیں۔ کسی کو یہ ڈر نہیں ہے کہ اگر میرے ساتھ کوئی ظلم یا زیادتی ہو بھی گئی تو انہیں پوچھنے والا کوئی ہوگا۔ منٹا اگر ان کی بات مان لیتی ہوں تو پھر ساری آسانیاں ہیں ورنہ یہ ماحول میرا دشمن ہے۔ ممکن ہے منٹا یہاں سے خالی ہاتھ واپس چلی جاؤں۔“ وہ ہنسی سے بولے۔

”منٹا سمجھ گیا تم کیا کہنا چاہ رہی ہو۔۔۔ مجھے بتاؤ منٹا تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟“ جنید نے سوچتے ہوئے کہا۔

”وہ حوصلہ کہ منٹا یہاں سے خالی ہاتھ نہ جاؤں۔ تحفظ کا وہ احساس جس سے منٹا کم از کم یہ تو سمجھ سکوں کہ اس معاشرے میں سانس لیا جا سکتا ہے۔۔۔“

راحیلہ کے لہجے میں غرت سنگ آٹھی تھی۔ اس سے پہلے کہ جنید کوئی بات کہتا وہ پٹران کے سامنے کھانا چننے لگا۔ وہ واپس چلا گیا تو اس نے پوچھا۔

”کون ہیں وہ لوگ۔۔۔؟“

”کس کس کا نام لوں۔۔۔ اگر آپ اس ماحول کو سمجھیں تو آپ کو میری مجبوری کا اندازہ ہو جائے۔“

راحیلہ نے کہا تو جنید لاپرواہی سے بولا۔

”چلو ساری باتیں ذہن سے نکال کر اس رزق کی طرف توجہ دو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

یہ کہہ کر اس نے پلیٹ سیدھی کی اور کھانے کی جانب متوجہ ہو گیا۔ وہ کافی دیر وہیں بیٹھ رہا۔ اس دوران جنید نے بہت ساری باتیں پوچھیں راحیلہ کے سوالوں کے جواب دیئے۔ ان میں جو ایک تکلف کی لہجہ تھی وہ ختم ہو گئی۔ ویٹر جب برتن اٹھا کر لے گیا اور ان کے سامنے چائے رکھی تو جنید بولا۔

”ایک بات بتاؤ تم نے اپنی مدد کے لیے مجھے ہی کیوں چنا؟“

”اس لیے کہ آپ ہی مجھے مرد لگے ہو۔“ راحیلہ نے بلا جھجک کہا تو وہ ایک دم سے چونک گیا۔ راحیلہ نے مزید کہا۔ ”مرد سے میرا مطلب غیرت اور عزت کا جسے احساس ہوتا ہے۔ منٹا جو کسی ایسے مرد کا رستہ دیکھتے دیکھتے تک گئی تھی آپ کی صورت میں وہ مجھے دکھائی دیا۔ منٹا مانتی ہوں کہ مجھے آپ کی ضرورت ہے آپ کو مجھ سے کوئی سروکار نہیں ہے لیکن منٹا نے انسانیت کے نام سے آپ سے مدد چاہی ہے اور میرے یقین نے مجھے دھوکہ نہیں دیا ہے۔“

”منٹا اگر تمہارے معیار پر پورا نہیں اترتا تو۔۔۔؟“

”منٹا سمجھی نہیں۔۔۔؟“

”دیکھو— تم شاید میری زندگی کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی ہو۔ مجھے کوئی پتہ نہیں کہ میں یہاں سے اٹھ کر اس رہے ستوران سے باہر جا بھی سکوں گا یا نہیں۔ میں ہوا کی مانند ہوں اور۔“

”میں ہوا کو قابو بھی نہیں کرنا چاہتی لیکن اتنا چاہتی ہوں کہ کم از کم جس کے اس ماحول سے چھٹکارا تو ملے اور میں تو اس قابل بھی نہیں ہوں کہ اس کے عوض آپ کو کچھ دے سکوں۔“

راحیلہ نے بے بسی سے کہا تو جنید سوچ میں پڑ گیا۔ اُسے یہ سمجھ تو آ رہی تھی کہ وہ کیا مدد مانگ رہی ہے لیکن ایک اجنبی لڑکی سے کوئی وعدہ وہ بہر حال نہیں کر سکتا تھا۔ وہ جس راہ پر چل رہا تھا اس میں کسی کا پرتو کیا اپنے سارے پر بھی اعتبار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ آپ جبکہ وہ اُس سے ٹکرائی گئی تھی تو دیکھنا یہ تھا کہ وہ سچ کہہ رہی ہے یا کسی کے لیے کام کر رہی ہے؟— یہ سوچتے ہی اُس نے کہا۔

”ٹھیک ہے میں تم سے وعدہ نہیں کرتا لیکن جب بھی ہوسکا میں تمہاری مدد کروں گا۔۔۔ تمہارے پاس کل فون ہے؟“

”میں جو یہاں سے تھوڑے بہت پیسے لیتی ہوں اس میں سے اپنی ماں کو بھی بھیجتی ہوں۔ میں اتنی بڑی میاں نہیں کر سکتی۔۔۔“

راحیلہ نے دھیرے سے کہا۔۔۔ جنید نے ویٹر کو اشارہ کیا پھر اپنا پرس نکالتے ہوئے بولا۔

”ہمارے درمیان رابطے کی ایک ہی صورت ہو سکتی ہے کہ تم مجھے فون کر لیا کرو۔ میں تمہیں کچھ رقم ادھار دے دیتا ہوں اس سے تم ایک کل فون خرید لیتا تاکہ مجھ سے رابطہ رکھ سکو۔“

”ادھار۔۔۔ میں کبھی نہیں؟“

”اس میں نہ بگھنے والی بات کون سی ہے۔ ادھار تو ادھار ہوتا ہے نا۔۔۔؟“

”لیکن میں آپ کو داتا۔“

”لوٹا تو پڑیں گے لیکن جب تمہارے پاس ہوں گے لوٹا دینا۔ فی الحال یہ دیکھو۔“

اُس نے پرس میں سے چند بڑے نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھادئے تو راحیلہ نے اُس کی جانب حیرت سے دیکھا اور انکار میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

”نہ نہیں۔ میں لے لوں گی آپ فکر نہ کریں۔“

”لے لو یا نا ادھار دے رہا ہوں۔“

اُس نے کچھ اس طرح کہا کہ راحیلہ ایک دم سدھ پڑی۔ پھر فوراً ہی خود پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

”آپ بس میری مدد کرو دیجئے گا لیکن اس طرح نہیں۔“ اُس نے صاف انکار کر دیا۔

”تمہاری مرضی۔“

جنید نے وہ نوٹ واپس پرس میں رکھ لیے۔ تجھی ویٹر بل لے کر آ گیا۔ اُس نے بل دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس سے پہلے کہ راحیلہ اٹھتی اُس

کا سیل فون بج اٹھا۔ جنید نے نمبر دیکھ کر فوراً کال ریسیو کر لی اور بولا۔

”یوٹوڈیشیاں؟“

”وہی ہوا جس کا ذکر تھا عائشہ مرگیا ہے۔۔۔“

”مرگیا۔۔۔“ اس نے شدید حیرت سے کہا۔ پھر ماحول کا احساس کر کے ڈیجرے سے بولا۔ ”مگر کیسے؟“

”وہی۔۔۔ اس نے آکسیجن ماسک ہٹا دیا۔ ڈاکٹر کے آنے تک وہ۔۔۔“

”چلو یہ قصہ بھی ختم ہوا۔۔۔ اب تم کہاں ہو؟“

”میں ہسپتال ہی میں ہوں۔۔۔ کچھ لڑکے لینے کے لیے آرہے ہیں اسے اُن کے حوالے کر کے چلا جاؤں گا۔۔۔ تم کہاں ہو؟“

”میں ادھر اپنے گھر۔۔۔“

”ٹھیک ہے شام کو ملتے ہیں۔۔۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔“

اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ عائشہ اس قدر راجح پن کرے گی۔ عائشہ کی ضد تو اس کے ساتھ تھی مگر نبھانے کیوں جنید کو یہ بات ہضم نہیں ہو پارتی تھی۔ اس نے فون جیب میں رکھا اور راجحہ کو اٹھنے کا اشارہ کیا پھر دونوں باہر چلے آئے۔

”راجحہ! اب تم جاؤ۔۔۔“

یہ کہتا ہوا وہ کسی اجنبی کی طرح دوسری سمت چل دیا۔ تھوڑے فاصلے پر اُسے رکشہ ملا وہ اس میں بیٹھا۔ اس نے مڑ کر بھی نہیں دیکھا کہ راجحہ اُسے جاتا ہوا دیکھ رہی ہے۔

☆☆

خسنہ اور خسن آراء

خسنہ اور خسن آراء اور حاضر کی مقبول ترین مہینہ **عمیرہ احمد** کی 4 تحریروں کا مجموعہ ہے جس میں ایک کہانی حنا اور خسن آراء پہلی بار آپ کے سامنے آ رہی ہے۔ عمیرہ احمد کا TV کے لئے یہ پہلا ٹی وی سیریل بھی تھا اور یہ TV کی تاریخ کے سب سے تیز ترین ٹی وی سیریلز میں سے ایک تھا۔۔۔ اپنی قلم کے لحاظ سے یہ آپ کو بہت متاثر کرے گا۔ مگر انسانی فطرت اس سے زیادہ حیران کن اور متاثر ہے۔

خسنہ اور خسن آراء کتاب گھر پر دستیاب ہے جسے فاول سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

شام نے اپنے سائے پھیلا دیئے تھے۔ صغیہ اپنے کمرے سے باہر جانے کے لیے اٹھ چکی تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ لان میں اُس کی ماں کا چائے پر انتظار کر رہی ہوں گی۔ ایسا کبھی کبھار یا چھٹی کے دن ہوتا تھا جب اُس کا باپ اور بھائی اُن کے ساتھ شام کو مل بیٹھتے ورنہ بس صبح ناشتے کے وقت ہی ملاقات ہوتی تھی۔ وہ بھی اپنی ماں کو اتنا وقت نہیں دے پاتی تھی اور جب سے اُس کی زندگی میں تیمور آیا تھا یہ وقت اور زیادہ سٹ گیا تھا۔ اگر سُلٹی نہ ہوتی تو اس گھر میں اُس کی ماں زینون بی بی تجمائی کا فکار ہو چکی ہوتی۔ یہ سب کچھ سوچتی ہوئی وہ اپنے کمرے سے نکلی اور لان کی طرف بڑھی۔ اُس کا موڈ بہت خوشگوار تھا۔ اُس نے دیکھا لان میں اُس کی ماں اور سُلٹی دونوں بیٹھی ہوئی ہیں۔ وہ گنگنائی ہوئی اُن کے پاس چلی گئی اور پھر بیٹھتی ہی ہوئی۔

”اے ماما! جلدی سے چائے پیادیں۔“

”چائے تو نہیں کے ہی لیکن آج تم سے میں نے کچھ باتیں بھی کرنی ہیں۔“ زینون بی بی نے بڑے تحمل سے کہا۔

”ایسی کون سی اہم باتیں ہیں۔؟“ اُس نے لا پرواہی سے پوچھا۔

”یعنی ایک ماں اور بیٹی کا رشتہ بہت ہی نازک اور بڑا ہی اہم ہوتا ہے۔ نازک اس لیے کہ اگر وہ اپنی اولاد پر توجہ نہ دے تو بہت سارے بگاڑ پیدا ہو جاتے ہیں اور اس کا اثر اولاد کے کردار پر پڑتا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ جب تک ماں اور بیٹی سبیلوں کی مانند ایک دوسرے سے تعلق نہ رکھیں تو دونوں میں ذہنی فاصلہ بہت بڑھ جاتا ہے۔ اور اہم اس لیے ہوتا ہے کہ ہمارا معاشرہ بیٹی کی تربیت کا ذمہ دار ماں کو سمجھتا ہے۔ اگر خدا خواست کہیں کوئی حادثہ ہو جائے تو انگلی ماں کی طرف ہی اٹھتی ہے۔۔۔“ زینون بی بی نے دھیرے دھیرے بہت ہی پیار سے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”لیکن ماما! یہ سب آپ مجھے کیوں بتا رہی ہیں؟“ وہ تیزی سے بولی۔

”اس لیے کہ یہ ساری باتیں تمہیں سمجھانے کی ضرورت ہے اور یہ میں بہت دفعہ پہلے بھی تمہیں سمجھا چکی ہوں مگر تم پر اثر نہیں ہوتا۔“

”صنیں بھی نہیں۔؟“ وہ لا پرواہی سے بولی۔

”صنیں نہیں چاہتی کہ تمہارے کردار پر کوئی دھبہ لگے یا کوئی ہمارے گھر کی جانب انگلی اٹھائے۔ میں نے اگر تم پر اعتماد کیا ہے تو اس اعتماد

کو برقرار رکھو۔“

”ماما! آپ کیا پہیلیاں ڈال رہی ہیں۔۔۔ آپ کی صحت تو ٹھیک ہے نا؟“ اُس کے لہجے میں طو آتر آیا تھا۔

”شٹ آپ صغیہ! تمہیں ماں سے بات کرنے کی تیز بھی نہیں رہی۔“

سُلٹی نے کھلی ہار لب کھولے تو صغیہ نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔

”ارے ایسی کیا بات ہو گئی ہے کون سا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔“ وہ بولی۔

”تم اتنی بھولی ہو گئیں چھٹی تم بن رہی ہو۔“ سُلٹی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

”ماما! اتنا میں آخر بات کیا ہے؟“ صغیہ نے اپنی ماں سے پوچھا۔

”تم مجھ سے یہ کہتی ہو کہ مجھے کچھ پڑنا ہے، میں پڑھنا چاہتی ہوں اور بہت پڑھنا چاہتی ہوں لیکن تم ہماری آنکھوں میں دھول جھونک رہی ہو۔ کیا تعلق ہے تمہارا تم سے۔“

زینون بی بی نے غصے میں کہا تو صفیہ ایک بار اندر سے مل گئی لیکن اس کا اظہار نہ کرتے ہوئے وہ بولی۔

”اچھا تو یہ بات ہے۔ ماما! وہ میرا بہت اچھا دوست ہے۔“

”کس قدر بے غیرت اور منہ پھٹ ہو۔ اُسے تم اپنا دوست کہہ رہی ہو، غیر مردوں کو تم اپنا دوست کہہ رہی ہو؟“ زینون بی بی یوں ہڈ پانی انداز میں بولی جیسے اُس کا سارا قہقہہ اُڑ گیا ہو اور وہ خود پر قابو نہ رکھ پائی ہو۔

”ماما! ہمارے طبقے میں اسے کچھ غلط تصور نہیں کیا جاتا۔ اب آپ کہیں گی کہ ہمارے دور میں ایسا نہیں ہوتا تھا ہماری یہ روایت نہیں ہے، وغیرہ وغیرہ تو سنیں۔ وہ آپ کا دور تھا آپ کا ہاتھ نہ کہن تھا۔ یہ میرا دور ہے اور میں اپنی مرضی سے بیٹھنا چاہتی ہوں۔“

”کیا تیرے دور میں ساری اخلاقی قدریں ختم ہو گئی ہیں۔ دیدوں سے حیا کا پانی ڈھل جاتا ہے، کیا تیرے دور میں خاندان کی کوئی عزت نہیں ہوتی؟“

زینون بی بی نے کہا تو صفیہ بڑے آرام سے بولی۔

”ماما! نہ اخلاقی قدریں ختم ہوئی ہیں نہ دیدوں میں حیا۔ مجھے اپنے خاندان کی عزت اسی طرح عزیز ہے جیسے آپ کو۔۔۔ اب مجھے نہیں معلوم کہ آپ کو تیمور کے بارے میں کس نے کیا بتایا ہے اور کس رنگ میں ساری باتیں بتائی ہیں لیکن یہ یاد رکھیں، میرا اُس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”غلط تعلق۔۔۔ اسے نامہارا انتہائی میں کسی غیر مرد کے ساتھ تمہارا مل بیٹھنا کوئی غلط تعلق ہی نہیں ہے؟“

”نہیں ہے۔۔۔ میں کوئی چھوٹی موٹی یا عام سی لڑکی نہیں ہوں کہ جسے کوئی بھی مرد اپنی راہ پر لاسکتا ہے۔ میں پو پھمتی ہوں کہ یہ سب آپ کو کس نے بتایا؟“ یہ کہتے ہوئے اُس نے سہلی کی جانب دیکھا۔

”مجھے کوئی ضرورت نہیں یہ جاننے کی کہ تم کیا کرتی پھر رہی ہو۔“ سہلی اُس کی نگاہوں کا مطلب سمجھتے ہوئے بولی۔

”تم جانتی ہو کہ اگر تمہارے باپ اور بھائی کو تمہارے لہجھن معلوم ہو گئے تو کیا ہوگا؟“ زینون بی بی نے خوف بھرے لہجے میں کہا۔

”وہ اچھا سمجھیں گے اور اگر آپ کو بھی سمجھنا ہے تو پایا سے بات کر لیجئے گا وہ آپ کی طرح ناراض نہیں بلکہ خوش ہوں گے۔“

صفیہ نے کہا اور چیزی سے اٹھ گئی۔ زینون بی بی ہونٹوں کی طرح اس کی طرف دیکھتی رہ گئی، اُسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اُس کے باپ کو بتائے یا نہیں؟ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اُسے یہ دن بھی دیکھنا پڑے گا سو جس ایک دم سے ٹھنک گئیں تھیں۔ اسے لگا جیسے رگوں میں دوڑتا ہوا خون اسکی آنکھوں میں سمٹا رہا ہے۔ وہ چاہتے ہوئے بھی لٹ نہ سکی۔ اچانک اُس کا سر گھومنا شروع ہو گیا اور وہ کرسی پر جمبول گئی اور اسی لمحے سہلی کی چیخ فضا میں بلند ہو گئی۔

”آئی۔۔۔ آئی! کیا ہو گیا آپ کو پلیز ہوش کریں۔ کوئی ڈاکٹر کو بلائے۔“

سُلی ہڈیانی انداز میں چیخ رہی تھی تبھی صفیہ نے پلٹ کر دیکھا اور حیرت سے ٹھٹک کر رہ گئی۔ اگلے ہی لمبے اُسے صورت حال سمجھ میں آ گئی۔ وہ اپنی ماں کے پاس تیزی سے آئی جو کرسی پر بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔

”تم سنبھالو سمنیں پانی لے کر آتی ہوں۔“

صفیہ نے کہا اور تیزی سے کچن کی جانب بھاگی۔ اتنی دیر میں گھر کے دونوں ملازم وہاں آ گئے۔ سُلی انتہائی پریشانی میں اپنی ماں کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن زخون بی بی ہوش ہی میں نہیں آ رہی تھی شاید اُسے بہت گہرا صدمہ ہوا تھا جس کے باعث یہ بے ہوشی اس قدر طویل ہو گئی تھی۔ صفیہ پانی لے آئی اور اپنی ماں کے چہرے پر چھینٹے مارے۔ جب اُس نے قدرے ہوش سنبھالا مگر جو کئی اُس کے سامنے صفیہ کا چہرہ آیا جو اُسے پانی پلانے کی کوشش کر رہی تھی ایک دم سے زخون بی بی کا چہرہ مگر گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی اُس کا بدن بھر سے بے جان سا ہونے لگا۔ ایسی کیفیت میں وہ دونوں بخش خوف زدہ ہو گئیں۔

”جاؤ جلدی سے پاپا کو فون کرو۔“

سُلی نے صفیہ سے کہا تو وہ اسی لمحے فون تک جا پہنچی پھر چٹو منٹ بعد آ کر ہوئی۔

”پاپا کو آنے میں تھوڑا وقت لگ جائے گا۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ ماما کو فوراً ہسپتال لے جائیں۔۔۔ دفتر سے یہاں تک کا قاصد بھی تو بہت ہے۔“

”تو پھر جاؤ ڈرا تھیر سے کہو فوراً گاڑی نکالے۔ بلکہ تم جاؤ۔“ اُس نے ایک ملازم سے کہا۔ دونوں بخش پھر سے اُسے ہوش میں لانے لگیں مگر یہ بے ہوشی نوٹے میں ہی نہیں آ رہی تھی۔

تقریباً چھ منٹ بعد زخون بی بی ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں تھی اور ڈاکٹر اُسے فریسنٹ وے رہے تھے۔ کافی دیر بعد زخون بی بی کو ہوش آ گیا۔ اس وقت صفیہ وہاں نہیں تھی بلکہ باہر کارڈیورس میں تھی۔

”دیکھیں آج آپ انہیں ہیٹس ہسپتال میں رہنے دیں۔“ ڈاکٹر نے سُلی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ سب ہلڈ پریشی کی وجہ سے ہوا ہے۔ اچھا کیا آپ انہیں بروقت ہسپتال لے آئی ہیں ورنہ اس سے کچھ بھی ممکن تھا۔“

ڈاکٹر یہ کہہ کر بڑھ گیا اور دوسرا سٹاف زخون بی بی کی دیکھ بھال میں لگ گیا تبھی کارڈیورس میں کھڑی صفیہ نے سُلی کو اشارے سے بلا یا وہ اُس کے پاس چلی گئی تو صفیہ نے پوچھا۔

”کیا حال ہے ماما کا۔۔۔؟“

”ہلڈ پریشی کی وجہ سے ایک ہوا تھا۔ اُن کا خیال ہے کہ یہ دوبارہ بھی ممکن ہے اس لیے تم رحم کرنا اور امی کے سامنے مت آنا بلکہ تم یہاں سے چلی جاؤ۔“ سُلی نے دہیدے دم سے کہا۔

"میں نے ایسی کہا بات کہہ دی تھی صحیح تو کہا تھا۔۔۔ ویسے ہی ماما کو مجھ سے چڑ ہے۔" صفیہ نے خود پر ہات آتے دیکھ کر کہا۔

"آئیں تم سے چڑ نہیں! حیا اور شرم کے مارے یہ حال ہوا ہے ان کا۔۔۔" صفیہ کو جتنا تے ہوئے سہلی بولی۔

"تم ماما کی بڑی خیر خواہ بن رہی ہو اور میں ان کی دشمن ہوں یا وہ لوگ! انہیں پیارے ہیں جن کا نام سنتا میں پسند نہیں کرتی۔ کیا میں اپنی

بات بھی نہیں کہہ سکتی۔۔۔"

"کو ڈاور اس کا نتیجہ بھی دیکھ لیا ہے تم نے۔۔۔ خدا کے لیے رحم کرو اور جاؤ یہاں سے۔۔۔"

سہلی نے حقارت سے کہا تو صفیہ تھملا کر رہ گئی۔ اُسے اپنی ہنگ پر بہت غصہ آیا تھا۔

"اگر تم ماں بیٹی کو وہ لوگ پسند ہیں تو تم کیوں نہیں بیانی جاتیں ان کے ہاں مجھے کیوں قربان کیا جا رہا ہے؟" صفیہ تنگ کر بولی۔

"یہ وقت اس طرح کی باتوں کا نہیں اور نہ ہی یہ جگہ ہے۔ میں تمہاری منت کر رہی ہوں کہ جاؤ یہاں سے یہ ساری باتیں بعد میں ہو

جائیں گی۔"

سہلی نے کہا اور پلٹ کر اپنی ماں کے پاس چلی گئی۔ صفیہ تھوڑی دیر وہاں رہی پھر ڈرا سچور کے ساتھ گھر چلی گئی۔ اُسے یقین تھا کہ اُس کا

باپ تھوڑی دیر بعد وہاں پہنچ جائے گا۔

☆ ☆

"راحیلہ! تمہیں کیا لگتا ہے وہ تمہاری مدد کرے گا۔۔۔؟" نسرین نے بیڈ پر بیٹھ کر نکلی اپنی گود میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

"میرا دل کہتا ہے کہ وہ ضرور میری مدد کرے گا۔" راحیلہ نے اُس کی طرف دیکھا اور اپنے بیڈ پر پٹھتے ہوئے کہا۔

"وہ کیوں کرے گا تمہاری مدد۔۔۔؟" نسرین نے یوں کہا جیسے وہ بات تو راحیلہ سے کر رہی ہو لیکن سمجھا خود کو رہی ہو۔ "دیکھو یہ مدد ایسے تو

نہیں ہے کہ بازار سے کوئی چیز خرید کر دے دی جائے جیسے اُس نے تمہیں کہا کہ سیل فون لے لو اور اُس نے روپے دینے کی آفر کی۔ وہ تمہاری مدد

کرے گا تو اُسے اس ہسپتال کے پورے نیٹ ورک سے دشمنی لینا چڑے گی۔ جو کم از کم ایک مقصد میں حلق ہیں کہ لڑکیوں کو اپنی راہ پر لے آئیں

اور اپنے چال میں پھنسا لیں۔ ہوس اور لالچ کا یہ نیٹ ورک تو ڈنا اُس کے لیے مشکل ہوگا۔ یہ مشکل اس لیے بھی زیادہ ہوگی کہ وہ یہاں کے ماحول

سے واقف نہیں ہے یہاں کا حصہ نہیں ہے۔ وہ اکیلا کیا کر سکے گا یہاں پر۔۔۔؟" آخری لفظ کہتے ہوئے نسرین بہت زیادہ جذباتی ہو گئی تھی۔

"تم ٹھیک کہتی ہو نسرین! اگر اُس نے میری مدد کی تو اُسے بہت مشکل ہوگی۔ میں یہ بھی مانتی ہوں کہ یہاں کا نیٹ ورک بہت مضبوط ہے

لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ ایک لڑکی کو نہ بچا سکے۔"

"وہی نہیں کہہ رہی ہوں کہ کیوں وہ اتنی مشکل میں کیوں پھنسے گا۔ وہ ان سے دشمنی مول کیوں لے گا؟۔۔۔ یہ لوگ تو اپنی ہوس اور لالچ

کے لیے لڑیں گے اُسے ختم کرنے کی کوشش کریں گے۔"

"نسرین! اگر اُس نے میری مدد نہ کرنی ہوتی تا تو وہ صاف کہہ دیتا۔ اُسے کوئی مجبوری نہیں تھی۔ وہ مجھے آس ہی نہ دلاتا۔ اُس نے جس

طرح مجھے حوصلہ دیا ہے میرا دل کہتا ہے کہ۔۔۔“

”تمہارا دل کہتا ہے نا تم تو چاہو گی کہ کوئی بھی تمہاری مدد کرے۔ تمہیں ضرورت ہے اس وقت۔ اگر تمہیں اس وقت مدد کی ضرورت نہ

ہوتی تو کیا ہم اس طرح بات کر سکتے یا تم اس کی یوں طلب گار ہوتیں۔ بالکل اسی طرح آخر اسے کیا ضرورت ہے؟“

”میرا خیال ہے کہ وہ انسانیت کے ناتے مہری مدد کر رہا ہے۔“ راحیلہ نے ایک کمزوری دہل دی۔

”تم خود بھی جانتی ہو راحیلہ کہ یہ دنیا کچھ لاد اور کچھ دو کے اصول پر ہی نہیں کار بند بلکہ جین لینے پر بھی یقین رکھتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم

بحیثیت قوم یا سوسائٹی ایک ایسی ڈگر پر چل گئے ہیں جس میں ہر جانب عدم اعتماد کی فضا بن گئی ہے۔ تمہارا رویہ ان ہسپتال کے مافیاء کے ساتھ سخت رہا

ہے تو یہی حراست کام آتی رہی ہے۔ تم اپنی بھانجے کے لیے اور وہ اپنے لالچ اور ہوس کے لیے لڑتے رہے ہیں۔ آخر کب تک۔۔۔ اور یہ تمہارا فرد اگر

تمہاری مدد کو آتا ہے تو کیا وہ تم سے کچھ نہیں چاہے گا؟“

”تم بالکل ٹھیک کہتی ہو نسرین لیکن کیا ہم محض مفروضوں پر اور حسی سوچ کا اظہار کرتے ہوئے بات نہیں کر رہی ہیں۔ کیا اتنا کم ہے کہ

اس نے مجھے حوصلہ دے دیا اندھیرے میں روشنی کی کرن۔۔۔“ راحیلہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

”اصل میں اس سوال کرنے کا مقصد یہ نہیں ہے راحیلہ کہ میں تمہیں مایوس کروں یا کسی کی تہمت پر شک کرنا میرا مقصد ہے۔ میں نے تمہیں

صرف احساس دلانا ہے کہ اگر کل وہ تم سے اس کا بدلہ یا ریٹرن مانگ لیتا ہے یا اس کے چہرے پر سے نقاب سرک جائے اور تم اسے ڈاکٹر جمیل کے جیسا ہی

پاؤ تو پھر تمہارا ری ایکشن کیا ہوگا؟“ نسرین نے اپنے اصل مقصد پر آتے ہوئے وضاحت کی۔

”دیکھو نسرین! یہ تو وقت بتائے گا کہ کون کیا ہے؟ میں سمجھتی ہوں کہ مجھے اس پر شک نہیں کرنا چاہئے بلکہ اس کے بارے میں خوش گمان

ہی رہوں تو یہ میرے لیے اور میرے حوصلے کے لیے بہت اچھا ثابت ہو سکتا ہے۔ اگر وہ مجھے اس سٹور سے نکال کر ہی کوئی بدلہ یا ریٹرن مانگتا ہے تب

دیکھا جائے گا۔۔۔“

”اوکے۔۔۔ اگر تم اس کے خیال ہی سے خود کو مضبوط محسوس کر رہی ہو تو یہ اچھی بات ہے لیکن بندہ اندر سے مضبوط ہو تو وہ نہ صرف زیادہ

دیر تک حراست کر سکتا ہے بلکہ وہ لیے حرم سے تک لڑ بھی سکتا ہے۔“ راحیلہ نے اس کے چہرے پر دیکتی ہوئی روشنی دکھ کر کہا۔

”اچھا زیادہ اوٹ پناگ باتیں مت کرو۔ جلدی سے تیار ہو جاؤ ہم جا کر سیل فون لے آئیں۔“ راحیلہ نے اسے یاد دلایا تو وہ اٹھ

گئی۔

وہ دونوں بازار میں تھیں۔ انہیں چونکہ سیل فون کے بارے میں اتنی معلومات نہیں تھیں اس لیے دونوں ہی نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ چند

دکانیں محوم پھر کر ہی کوئی فیصلہ کریں گی۔ انہیں کافی دیر ہو گئی تھی اور ابھی تک انہوں نے سیل فون نہیں خریدی تھا۔ اس وقت وہ دونوں ایک دوکان کی

طرف بڑھ رہی تھیں کہ انہیں وہی سٹورزس دکھائی دی جو راحیلہ سے اس کے کمرے میں ملتے آئی تھی۔

”واؤ! یہ جوڑی آج کدھر محوم رہی ہے؟“ اس نے مسکراتے ہوئے خوشدلی سے پوچھا۔

”اسے ایک میل فون خریدنا تھا وہی پسند کرنے لگی ہیں۔“ نسرین نے بھی اسی کے انداز میں جواب دیا۔

”یہ کون سی بڑی بات ہے۔ آؤ ابھی خرید لیتے ہیں۔“

اس نے کہا اور ان کے ساتھ بڑھ گئی۔ کچھ ہی دیر میں اس نے قدرے مہنگا میل فون سیٹ پسند کیا اور راحیلہ کے سامنے رکھتے ہوئے

بولی۔

”کیا تمہیں یہ پسند ہیں۔۔۔؟“

”پسند تو ہے لیکن یہ میرے بجٹ سے زیادہ ہے۔“ اس نے قیمت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اسے کوئی بات نہیں باقی میں دے دیتی ہوں، جلد چھوڑ دو یہ نہیں ہی تمہیں گنت کر دیتی ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ دکاندار کی جانب متوجہ ہونے لگی تھی کہ راحیلہ نے فوراً کہا۔

”نہیں۔۔۔ آپ کوئی دوسرا کم قیمت والا دیکھ لیں، پلیز۔۔۔؟“

اس کے یوں کہنے پر سینئرز نے چند لمحوں کے چہرے پر دیکھا اور پھر خاموشی سے ایک کم قیمت والا میل فون نکال لیا۔ راحیلہ نے

اثبات میں سر ہلا دیا۔ سینئرز کے چہرے پر باہمی آن ٹھہری تھی، نسرین اس کے چہرہ پر ہنسنے میں پوری طرح متوجہ تھی۔ وہ تینوں دکان سے نکلیں

تو شام کے سامنے واصل رہے تھے۔ راحیلہ کے ہاتھ میں میل فون تھا۔

”آؤ تمہوڑا کھانی لیں۔“

سینئرز نے کہا۔ جس پر راحیلہ انکار کرنے ہی والی تھی کہ نسرین نے فوراً کہا۔

”ننگی پوچھ کر تو نہیں کرتے۔۔۔ چلیں۔“

جب راحیلہ اسے دیکھتی رہی وہ گئی۔ ان کے قدم ایک ریستوران کی جانب اٹھ گئے، سہولت سے بیٹھنے کے بعد سینئرز بولی۔

”میں نے اس لیے اجازت لی تھی کہ کہیں راحیلہ متحذ کر دے۔“ اس کے لہجے میں شگہ بول رہا تھا۔

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں، میں تو ہوش وقت پر پہنچنے کی وجہ سے کہہ رہی تھی۔“

راحیلہ بات کو سمجھتے ہوئے بولی تو سینئرز نے قدرے تکی سے کہا۔

”ہوش اور وقت۔۔۔ سارے قاعدے قانون کا نذر پر ہی اچھے لگتے ہیں۔ انہیں اگر استعمال کرنے کی لوبت آئے تو صرف کمزوروں

پر ہی کہئے جاتے ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ چونک گئی پھر جلدی سے بولی۔ ”بولو کیا کہا نا پسند کرو گی؟“ اس نے اپنے سامنے دھرا ہوا مینو اٹھا کر پوچھا۔

”آپ اپنی پسند کا ہی منگوا لیں۔“ نسرین نے مسکراتے ہوئے کہا پھر آراؤ وغیرہ دینے کے بعد بات کی ابتدا نسرین ہی نے کی۔ ”وہیئے

میڈم! ایسے قانون بنانے کا فائدہ پھر۔۔۔؟“

”قانون تو بہتری کے لیے ہی بنائے جاتے ہیں مگر قانون جب قانون بنتا ہے جب اس پر ٹھیک طرح سے عمل ہو۔ جب قانون نافذ کرنے

والے ہی غلط کریں تو اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔ آپ جو قانون نافذ کرنے والوں کا پسندیدہ ہوگا وہ پھار ہے گا اور راحیلہ جیسی اس کی زد میں آ جائیں گی۔" وہ اپنی رو میں کھتی چلی گئی۔

"— آ جائیں گی — مطلب؟" نسرین نے فوراً اس کی بات پکڑتے ہوئے پوچھا۔

"میں دو دن سے یہ سوچ رہی تھی کہ راحیلہ کو اس بارے میں بتاؤں یہ اس کی خوش قسمتی ہے کہ مجھے یوں مل گئی ہے تو میں نے سوچا اب بتاتی ہوں۔"

"کیا بتانا چاہ رہی تھیں آپ اور کیوں تہذیب میں تھیں؟" راحیلہ نے فوراً پوچھا۔

"یہی کہ تم بہت زیادہ محتاط رہو۔ ڈاکٹر جمیل و حیرے و حیرے بہت کچھ تمہارے خلاف اکٹھا کر چکا ہے۔ اس میں کچھ سچ ہے اور کچھ فرضی الزامات جنہیں سچ جوہر کر دیا جائے گا۔ یہی وہ حکمت ہوں گے جب دو تم سے اپنی بات متواتر نہیں کے یا پھر تمہیں یہاں سے نکال دیا جائے گا۔"

"مطلب اس کے بارے میں پھندا تیار کر لیا گیا ہے؟" نسرین نے پوچھا۔

"معاذ اللہ کیا ہوتا ہے وہ ڈراما جوہری پر بہت زیادہ مزادے یا پھر بہت زیادہ جرم پر بھی چشم پائی کر جائے۔ اصل میں آپ ڈاکٹر جمیل نے اسے اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا ہوا ہے۔" اس نے اپنی بات واضح کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہئے؟" راحیلہ نے تیزی سے پوچھا۔

"یہ تمہارا اپنا ذاتی فیصلہ ہے۔ دیکھو میں اعتراف کرتی ہوں کہ میں اس باغی کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی میں ان کی خواہشات کے ساتھ بہ گئی اور آج تک انہی کی خواہشات کی بھینٹ چڑھی ہوئی ہوں۔ میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔ تم جانتی ہو گمراہ کے نتیجے میں ہمیشہ نقصان کمزور ہی کا ہوتا ہے۔" وہ صاف لفظوں میں کہتی گئی۔

"دوسرے لفظوں میں آپ کا خیال یہ ہے کہ میں ان کی بات مان لوں؟" راحیلہ نے پوچھا۔

"نہیں قطعاً نہیں میں نے یہ بالکل نہیں کہا۔ میں نے تو اپنا خیال ظاہر کیا ہے۔ کرو وہی جو تم چاہتی ہو فیصلہ تمہارا ہے۔" یہ لفظ ابھی اس کے منہ ہی میں تھے، ویرٹن کا دایا ہوا آرزو لے آیا تو وہ بولی۔ "چھوڑو۔۔۔ کیا ہوگا کیا نہیں ہوگا۔ ابھی تو کھاؤ بیٹو۔"

یہ کہتے وہ ہنس دی جبکہ راحیلہ سوچ میں پڑ گئی اور پھر فیصلہ کن انداز میں بولی۔

"میں لڑوں گی آخری حد تک لڑوں گی۔ میں یہاں سے خالی اصرام لے کر جانے والی نہیں ہوں۔"

اس کے لہجے میں ایسی مضبوطی تھی کہ وہ دونوں ہی چونک گئیں۔ انہیں احساس ہو گیا تھا کہ وہ کسی بھی حد تک جا سکتی ہے۔

☆☆

ہمایوں اپنے سامنے دور تک پھیلا ہوا آسمان دیکھ رہا تھا۔ سرٹی بادل کہیں کہیں ٹکڑیوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ سورج مغرب کی جانب

جنگ گیا اور مغربی افغان گیندے کے پھول جیسا رنگ لیے ہوئے تھا جس میں نارنجی رنگ کی آمیزش ہوتی ہے۔ ہایوں کا دھیان آسان پر بھری اس خوبصورتی کی طرف نہیں تھا بلکہ اپنے دماغ میں ابھرنے والی سوچوں کو کسی ایک کھتے پر لانے کی کوشش میں مصروف تھا جس نے اس کے پورے بدن میں ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔ قوت کیسی بھی ہو وہ انسان کے اندر تہذیبی ضرور پیدا کرتی ہے۔ یہ قوت چاہے اس کے دگ پٹھوں میں طاقت بن کر اپنا آپ منواری ہو یا بھری راز کی ہو۔ ہر اطلاع ایک جیسی اہمیت نہیں رکھتی۔ بعض اوقات ایسی خطرناک اطلاعات بھی ہوتی ہیں کہ جن سے انسانی زندگی داؤ پر لگ جاتی ہے۔ اس وقت وہ بھی اسی گفتگو میں تھا۔ ایک جانب انسانی زندگی تھی اور دوسری جانب دولت تھی۔ فیصلہ ہاں اور نہیں میں تھا لیکن اگلے درمیان بھی ایک بات تھی اور وہی بات اُسے پریشان کر رہی تھی۔ ماجد ڈرائیج کے بارے میں اسکے پاس صدقہ اطلاع تھی پورا ہفتہ وہ اسی ٹوہ میں رہا تھا۔ جب اُس نے ماجد ڈرائیج کے بارے میں معلومات لینا شروع کی تھی اس وقت تک اُسے بھی خبر نہیں تھی کہ وہ اتنی جلدی اسکے بارے میں جان لے گا۔ اُس نے ابتدا عابد اٹھی سے ہی کی تھی۔ اُس نے عام سے انداز میں پوچھا تھا کہ وہ ماجد کے بارے میں اتنی نفرت کیوں رکھتا ہے؟

”وہ بے غیرت ہے، فتنہ ہے وہ۔ اُسے احساس ہی نہیں ہے کہ کسی کی عزت کیا ہوتی ہے۔ اُس نے میرے دوست کو صرف اس لیے مارا تھا کہ اُس نے ماجد کو وقت پر بہتے کیوں نہیں پہنچایا تھا۔ یہ جو یونیورسٹی اور کالجوں پر اپنا ہولڈ جھا کر رکھتے ہیں مفاد پرست عناصر انہیں استعمال کرتے ہیں اور یہ اپنی مہاشیوں کے لیے طلب و طالبات سے روپے پیسے چینیٹے ہیں۔ اپنے ہی قاعدے قانون بنا کر انہیں مارتے پینٹتے ہیں۔ میرے دوست کو اُس نے اس قدر مارا تھا کہ وہ دو ہفتے ہسپتال میں رہا اور پھر ایسا دل برداشتہ ہوا کہ یونیورسٹی ہی چھوڑ کر چلا گیا۔“

”اب کہاں ہوتا ہے وہ۔۔۔؟“ ہایوں نے پوچھا۔

”پتہ نہیں۔۔۔ آخری بار مجھے پتہ چلا تھا کہ وہ ملک سے باہر جانے کی کوشش میں ہے پھر کوئی پتہ نہیں۔ اُس نے تو شرم کے مارے سب رابطے ہی ختم کر دیئے تھے۔ مجھے ایک اچھا دوست کھوجا جانے پر بہت ڈکھ ہے اور یہ ابھی تک دندنا تا پھرتا ہے۔“ عابد نے اتمہائی تھی سے کہا۔

”کیوں۔۔۔ یہ کیوں دندنا تا پھرتا ہے یہ کبھی پکڑا نہیں گیا؟“

ہایوں نے یونیورسٹی سے اعزاز میں پوچھا تو وہ تلخ سی مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے بولا۔

”ارے پکڑے تو وہ جاتے ہیں جن کا کوئی نہیں ہوتا۔ ماجد جیسے لوگوں سے کئی خبیث لوگوں نے قائدہ لیٹا ہوتا ہے۔ قبضہ چھڑوانا ہو یا کہیں قبضہ کرنا ہو کسی کو خوف زدہ کرنا ہو وغیرہ وغیرہ۔ وہی کام جو فتنوں کا ہوتا ہے اور یہ سب ملی بھگت سے ہو رہا ہے۔ سب کے سامنے دندنا تے پھرتے ہیں ایسے لوگ، کون پکڑتا ہے انہیں؟“ عابد نے طحیہ لہجے میں کہا۔

”یہ چھوٹے موٹے فتنہ ان پر قانون گرفت نہیں کر سکتا؟“ ہایوں نے اُسے شدید تھی۔

”واقعی ان کی کوئی حیثیت یا وقعت نہیں ہوتی لیکن گرفت میں اس لیے نہیں آتے کہ پکڑنے والے بہت سارا مفاد لے کر چشم پوشی کرتے ہیں ان سے اور ان کے پیچھے کسی اور کا مفاد ہوتا ہے۔“ عابد نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”کیا ہماری سوسائٹی اس قدر کمزور ہو چکی ہے کہ ایسے مفاد پرست لوگوں کو چشم نہیں کر سکتی؟“

”بالکل۔۔۔ بالکل کمزور ہو چکی ہے اتنی کمزور کہ وہی مفاد پرست لوگ باقی لوگوں کو ختم کرنے کے درپے ہیں۔ اب ماجد ہی کو دیکھ لو۔

کل تک بھوکا بیچ غنڈہ تھا لیکن آج اس کی شان ہی مرالی ہے۔ دیکھا نہیں تھا تم نے۔؟“

”دیکھا تھا۔“ ہمایوں نے انتہائی اختصار سے جواب کہا۔

”وہ بہت مضبوط ہو چکا ہے۔ بہت بڑا گھر، دولت، سیکورٹی، طاقت اور اب تو وہ اپنا سیاسی قد بھی بنا رہا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ وہ کل

ہمارے علاقے سے منتخب ہو کر ہمارا ہی نمائندہ قرار پائے۔“ عابد نے پھر تکی سے کہا۔

”یہاں کیا کرنے آتا ہے۔۔۔ مطلب، کوئی جرم سرزد ہو گیا ہوگا؟“ ہمایوں نے پوچھا۔

”حقائق نے ایک کیس دائر کیا تھا، مقصد ان کا یہی تھا کہ اس کیس میں اسے سزا ہو جائے اور الیکشن لڑنے کے لیے قانونی طور پر محذور ہو

جائے۔ دونوں طرف سے زور لگ رہا ہے لیکن جہاں تک میرا خیال ہے یہ نہی ہو جائے گا اور پھر وقت آنے پر الیکشن لڑ سکے گا۔“

”کس کے پاس ہے پیشی اور کب۔۔۔؟“

”یہ علم نہیں کہ پیشی کب ہوگی۔۔۔“ یہ کہہ کر اس نے وہ جگہ بتائی جہاں کیس چل رہا تھا، پھر پوچھا۔ ”لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”اس لیے کہ اگر تمہیں اس سے اتنی نفرت ہے تو تم کیوں نہیں فریق بن جاتے۔ اس کے مخالف وکیل کو تختہ تختہ دو۔“

ہمایوں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا تو عابد ایک ذمہ سوج میں پڑ گیا پھر کچھ دیر بعد بولا۔

”بات تو تم ٹھیک کہتے ہو لیکن میں ایک خاندان رکھتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ جذباتی ہو گیا۔ ”بس یہی وجہ ہے اور صرف میرے

ساتھ ہی نہیں، بہت سارے لوگوں کے ساتھ وہ یہی سوج کر مار کھاتے چلے جا رہے ہیں۔۔۔ چھوڑ دو تم کس بحث میں پڑ گئے ہیں۔“ عابد نے موضوع

سے ہٹتے ہوئے کہا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

ہمایوں کو اس کے بارے میں نہایت اہم بات معلوم ہو گئی تھی اسے مصدقہ کیسے بنانا تھا، لیکن سب سے زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی۔ اس

نے احتیاط سے کام لیا اور اس جگہ تک رسائی حاصل کر لی جہاں اس کا مقدمہ چل رہا تھا۔ پوری طرح تصدیق کر لینے کے بعد اس شام وہ گھر سے ذرا

فاصلے پر موجود پارک میں تھا۔ وہ جنید کو یہ مصدقہ اطلاع دے سکتا تھا اور اسے پورا یقین تھا کہ جنید اس کے ساتھ کیا کرنے والا ہے لیکن جو بات اسے

پریشان کر رہی تھی وہ یہی تھی کہ اس کا اپنا کیا ہوگا؟ کیا جنید اسے واقعتاً دولت دے دے گا یا وہ بھی یونہی استعمال ہو جائے گا اور اگر خدا نخواستہ جنید بکڑا

گیا تو؟۔۔۔ یہیں پر آ کر اس کی اپنی ہمت جواب دے رہی تھی۔ کافی دیر تک وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ بھی اچانک اس نے سب کچھ ذہن سے

بھٹک دیا۔ اس کے دماغ میں صفیہ کا خیال آ گیا جسے محض دولت کی ضرورت تھی۔ اس تک رسائی صرف اور صرف دولت کی وجہ سے ہو سکتی تھی۔

جلدی دولت کمانے کے جو شارات کٹ ہیں ان میں رسک بھی اتنا ہی زیادہ ہوتا ہے۔ اگر وہ رسک نہیں لے سکتا تو کبھی آگے نہیں بڑھ سکتا، اسے صفیہ

سے دست بردار ہونا پڑے گا۔۔۔ ”ہمیں نہیں کمزور نہیں ہوں۔“ اس نے جیسے خود سے کہا جس میں بہت شدت تھی۔ تب پھر اس نے ساری

سوچ کو ایک طرف رکھ دیا۔ کبھی کبھی انسان کتنا خود غرض ہو جاتا ہے اس کی تمام تر بچہ اس کے اندر چلنے والی خواہشیں اور امیدیں ہی ہوتی ہے

ہمایوں پر بھی صفیہ کے حصول کی خواہش چھا گئی تھی۔

”ہیلو۔۔۔ ہمایوں بات کر رہا ہوں۔“ رابلہ ہوتے ہی اُس نے جنید کی آواز پہچان کر کہا۔

”ارے ہاں کیا حال ہے تمہارا۔۔۔؟“

”میں ٹھیک ہوں۔۔۔ تم نے ایک کام میرے ذمے لگایا تھا۔“

”ہاں میں تمہاری طرف سے شکر ہوں۔“

”تو وہ کام ہو گیا ہے۔۔۔ کل اُس کی پیشی ہے وہ عدالت میں ضرور آئے گا۔ کل اُس کا فیصلہ ہو جانے والا ہے اور یہ بھی بتادوں کہ اُس کا

مستقل کوئی لٹکانہ نہیں ہے۔“

”خیر پکی ہے۔۔۔؟“

”بالکل پکی۔۔۔۔“

”کیا تم مجھے بتا سکو گے کہ کل وہ کس وقت عدالت آئے گا اور اُس کے ساتھ کتنا لاڈلنگر ہے؟“

”بتادوں گا۔۔۔“

”ٹھیک ہے کل بات ہوگی۔۔۔“

اُس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ ہمایوں کو یوں لگا جیسے کوئی بہت بڑا بوجھ ذہن سے ہٹ گیا ہو۔ وہ بہت خوشگوار انداز میں گھر کی جانب چل دیا شاید ایسا کر کے اُس کے اندر کبھی تسکین ہو گئی تھی۔

اگلے دن جب ہمایوں عدالت میں آیا تو اُس کے اندر خاصی الجھل مچی ہوئی تھی اُسے خود پر بڑی مشکل سے قابو ہو رہا تھا۔ وہ جمیر میں تو آ گیا لیکن اس کا سارا دھیان باہر اٹھنے ہی میں تھا جہاں لوگوں کا رش بڑھ چکا تھا اور کاروبار عدالت شروع تھا۔ وہ بہت محتاط تھا اور اس کی ساری توجہ خود پر تھی کہ کہیں اُس سے کوئی ایسی بات سرزد نہ ہو جائے جس سے کسی کو شک پڑ جائے۔ اُسے معلوم تھا کہ اس کیس میں اُس کی تھی بڑی ذمے داری ہے۔ وہ اٹھا اور کیٹین پر چلا گیا جہاں سے کافی قاصلے پر داہلی دروازہ تھا۔ اُسے بیٹھے ہوئے وہاں خاصی دیر ہو گئی یہاں تک کہ اُس پر مایوسی چھانے لگی تھی کہ اچانک اُس کی نگاہ ایک کار پر پڑی جس میں سے ماہد و ڈانچ اُتر رہا تھا۔ اُسے خود پر بہت غصہ آیا وہ اب تک کسی لینڈ کروزر کا تھی انتظار کر رہا تھا۔ ماہد کے ساتھ چار لوگ تھے جو چند قدم ہمارت تک اُس کے ساتھ گئے اور پھر وہیں کھڑے ہو گئے ماہد اکیلا اندر چلا گیا۔ جی ہمایوں نے جنید کے نمبر ڈائل کر دیئے۔

”تمہارا کام ختم ہے تم جاسکتے ہو۔ میں سنبھال لوں گا۔“

جنید نے اُسے کہا اور فون بند کر دیا۔ اُسے وہاں سے چلے جانا چاہئے تھا لیکن وہ بیٹھا رہا جیسے اُس میں سکت نہ ہو۔ وہ اٹھنا چاہ رہا تھا کہ

عابد ہیں آ گیا۔

”ارے تم یہاں بیٹھے ہو خیریت تو ہے نا۔۔۔؟“

”طبیعت ٹھیک نہیں یہاں بیٹھ کر خود کو بہلا رہا ہوں۔“ اس نے فوراً ہی بہانہ بنا دیا۔

”چلو اچھی سی چائے پیجے ہیں۔“

عابد نے بیٹھے ہوئے کہا اور چائے کا آرڈر دے دیا پھر دونوں باتوں میں مصروف ہو گئے۔ لاشعوری طور پر ہمایوں کا دھیان ادھر ہی تھا۔ وہ چار لوگ وہیں ہی کھڑے تھے اور ماجد ابھی تک باہر نہیں آیا تھا۔۔۔ اس وقت وہ چائے پی چکے تھے جب ماجد باہر نکلا۔ اُسکے چہرے پر خوشی کا تاثر تھا وہ تیزی سے گاڑی میں آ کر بیٹھ گیا اور چند لمحوں میں اُس کے ساتھی بھی آئے تو گاڑی چل دی۔ ہمایوں نے گہرا سانس لیا تو عابد نے کہا۔

”اگر طبیعت زیادہ خراب ہے تو گھر چلے جاؤ۔“

”کچھ دیر اور دیکھتا ہوں پھر چلا جاؤں گا۔“

بے اختیار اُس کے منہ سے نکلا اور پھر وہ دونوں چیمبر کی جانب چل دیے۔ ابھی وہ چیمبر سے تھوڑے ہی قاصلے پر تھے کہ اچانک فضا دھماکے سے گونج اٹھی۔ اس کے بعد ہوائی فائرنگ ہوئی اور یکدم خاموشی کے بعد چیخ و پکار ہونے لگی۔ لوگ ایک ایک جانب دوڑنے لگے۔ اُن کے چیمبر سمیت کسی لوگ باہر آ گئے تھے۔ اگلے چند لمحوں میں یہ اطلاع پھیل گئی کہ ماجد وزرا کی قتل ہو گیا ہے۔ یہ سنتے ہی ہمایوں کے پورے بدن میں سنسنی کی ایک سرد لہر دوڑ گئی۔

☆☆

مشرقی افق دھیرے دھیرے سفید ہو گیا تھا اور وہاں پر موجود سفید بادل زردی مائل ہو رہے تھے۔ گنجان شہر میں موجود تیسری منزل کی چھت پہ پڑی چار پائی پر جنید کی آنکھوں میں رات کٹ گئی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ چند دنوں ہی میں حالات کتنی تیزی سے بدلے ہیں۔ وہ خواہش جو پوری نہیں ہو پاری تھی۔ اچانک پوری ہو گئی جس کی ابھی اُسے توقع تک نہیں تھی جیسے ماجد وزرا کی جہمی وہ شخص تھا جس کی اُسے تلاش تھی۔ ایک وقت تھا کہ وہ اُس کے سامنے تھا لیکن وہ اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ پھر جنید خود ایسی راہ پر چل نکلا تھا جس کی کوئی منزل نہیں تھی۔ ایسا گنجان راستہ جس میں موت کہیں بھی اُس کے گلے لگ سکتی تھی۔ انہی دنوں میں اُس نے ماجد کو تلاش کرنے کی بہت کوشش کی مگر وہ اُسے نہیں ملا۔ یہ وہی وقت تھا جب ماجد یونیورسٹی کے مہظر سے غائب ہو چکا تھا جب جنید نے سوچ لیا تھا کہ جب کبھی وہ اُس کے سامنے آیا تو وہ اس سے اپنا بدلہ ضرور چکانے گا۔ ہمایوں نے جو اچانک اس کا ذکر کیا تو سارے ہی زخم ہرے ہو گئے۔ اگرچہ اُسے یقین نہیں تھا کہ وہ ہمایوں کی وجہ سے ماجد تک پہنچ جائے گا لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ جسے ہم ناواقف آدمی سمجھ رہے ہوتے ہیں وہی سب سے بڑا واقف راز ہوتا ہے۔ جنید کو اس چھوٹی سی عمر میں ہی بہت سارے تجربات سے واسطہ پڑ چکا تھا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ ساتھ چلنے والے لوگوں میں سے کوئی اُس پر یو اور تان کر کھڑا ہو جاتا اور جسے وہ دشمن سمجھ رہا ہوتا وہی اُن کی جان بچانے کی کوشش کرتا۔ نیت پر شک کرنا تو معمولی سی بات تھی اور کوئی اُس کے لیے جان تک سے گزر جانے کے لیے تیار ہوتا تھا۔ ہمایوں کو وہ ایک معمولی سامرا سمجھ رہا تھا جس نے اُس کی بڑی مشکل حل کر دی۔ اُس نے عدالت کے باہر ایسا حال بچھا یا تھا جس سے ماجد بچ نہ

سکا۔ جنید کا انتقام پورا ہو چکا تھا۔ جس وقت ماجد ورنج کی لاش اُس کے سامنے پڑی تھی اس وقت اُسے سمیل بہت یاد آیا تھا۔ وہی اُس کا ایسا کزن تھا جو اُس کے سارے رازوں پر پردہ ڈال دیتا تھا جو کزن کم اور دوست زیادہ تھا۔ اُسے ماجد نے اس لیے قتل کر دیا تھا کہ وہ مخالف طلبہ تنظیم کے لیے سرگرم کیوں ہے۔

ماجد ورنج کے قتل کی خبر پورے شہر میں جھل کی آگ کی مانند پھیل گئی۔ اس واردات میں جنید اکیلا نہیں تھا۔ شام ہونے تک وہ اپنی قیادت کے دو ستر ممبروں کے سامنے تھا۔

”آخر تم نے اُسے قتل کیوں کیا۔۔۔؟“

یہ تھا سوال جو اُس سے کیا گیا وہ دونوں رکن اُس سے جواب طلب کر رہے تھے۔

”یہ میرا ذاتی معاملہ تھا جس کے لیے میں آپ کے سامنے جواب دہ نہیں ہوں۔“

”تمہارا یہ جواب اطمینان بخش نہیں ہے جنید اعظم میں ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم کسی کو بھی قتل کرو۔ عالمگیر اگر ہسپتال میں چل بسا ہے تو اس کے ذمہ دار بھی تم ہو۔ تمہارا یہ منصب نہیں ہے کہ تم لوگوں کو قتل کرو۔“

”میرا منصب ہے یا نہیں لیکن ماجد کے معاملے میں اگر اعظم میں نہ بھی ہوتا تو میں نے اُس سے انتقام لیتا تھا۔ اُس نے میرے بھائی کو قتل کیا تھا۔ وہ آپ ہی کی تنظیم کا رکن تھا کیا کیا تھا آپ نے۔ کوئی مقدمہ کوئی سزا؟ بس آپ کی طرف سے پوسٹر چھپ گئے اُس کی موت کو بھی آپ لوگوں نے کیش کرایا۔“

”اور عالمگیر کے معاملے میں۔۔۔؟“

”ہر بندے کو اپنے بچاؤ کا حق حاصل ہے۔ میں اُسے قتل کرنے نہیں گیا تھا میری نیت یہ تھی کہ اور تھی لیکن اُس نے میری بات نہیں سنی ڈیٹان اس کا گواہ ہے۔“

”ڈیٹان۔۔۔ کہاں ہے ڈیٹان کیا وہ تمہارے حق میں گواہی دے سکتا ہے؟“

”کیوں نہیں دے گا۔ وہ ہمارا ساتھی ہے ابھی آپ فون کر کے اُسے پوچھ سکتے ہیں۔“

”تو چلو ملاؤ اُس کا نمبر۔“

جنید نے فون نکالا اور ڈیٹان کے نمبر ملائے لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔

”وہ آپ تم سے کبھی بات نہیں کر سکے گا کیونکہ وہ اس ملک کو چھوڑ کر جا چکا ہے۔“

”کیا مطلب۔۔۔؟“

”ہمیں اُس کا نہیں پتہ لیکن یہی پتہ چلا ہے کہ وہ اس ملک میں نہیں ہے۔۔۔ عالمگیر کا قتل تم دونوں پر ہے وہ بھاگ گیا اور تم من مانی کر رہے ہو جو تنظیم کے اصولوں سے ندراری ہے۔“

”کیا آپ مہری نیت پر شک کر رہے ہیں۔۔۔؟“

”کوئی شخص بھی حرف آخزنہیں ہے۔ ہم تمہیں ایک موقع دے رہے ہیں۔ ڈیٹان کے بارے میں پتہ کرو اور عالمگیر کے بارے میں کوئی

فہمں جواز ہے تو تازہ ذور نہ۔۔۔“

”۔۔۔ ورنہ مجھے قتل کرو یا جائے گا یہ بات میں ابھی طرح جانتا ہوں۔“

”صرف تین دن ہیں تمہارے پاس۔۔۔ اپنی پوزیشن صاف کرو ہم بھی کوشش کر رہے ہیں اور ہاں یہ وارننگ ہے تمہیں کہ اب تم کوئی

سمن مانی نہیں کرو گے۔“

وہ وہاں سے وارننگ لے کر اسی گھر میں آ گیا۔ وہ یہی سوچ رہا تھا کہ یہ کیسی تھی ہے جو سلجھ نہیں رہی؟ کیا عالمگیر غلط تھا یا ڈیٹان اُسے

استعمال کر گیا ہے؟ جو کچھ بھی تھا ان دونوں ہی کے درمیان تھا اور اُسے یہ تھی محض تین دنوں میں سلجھنا تھی۔ پوری رات وہ انہی پہلوؤں پر سوچتا رہا

لیکن کچھ بھی تو پتے نہیں پڑا اس کا دماغ دُکھنے لگا تھا۔۔۔

انسان کے اندر فطری ردِ عمل بھی پایا جاتا ہے جیسے ہی کوئی سوچ اُبھرتی ہے تو اس کے ساتھ ایک دوسری سوچ بھی اُبھرتی ہے جو بالکل اس

کے متضاد ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ کوئی ایک سوچ رہتی ہے لیکن دوسری متضاد سوچ برابر اپنا آپ منوانے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔ انسانی دماغ کسی

وقت بھی سوچ سے خالی نہیں رہ سکتا۔ اس طرح جنید کے دماغ میں رات بھر ایک ہی مرکز کے گرد نہ جانے کتنی سوچیں گھومتی رہیں۔ آخر کار وہ موضوع

جس نے ذہن کو تھکا کر رکھا وہ تھا وہ محو ہونے لگا اور اس کے ساتھ راحیل کا تصور اُبھر آیا جس کے ساتھ ہی خوشگوار بیت کا احساس ڈر آیا۔۔۔ راحیل!

وہ بھی کسی سستی سے کم نہیں تھی۔ بلاشبہ وہ ایک ایسی لڑکی تھی جس کا حسن کسی کو بھی اپنی طرف متوجہ کر سکتا تھا۔ اُسے پورا یقین تھا کہ وہ اُس کے ساتھ تعلق

چاہتی ہے لیکن اس کی نوعیت کیا ہو سکتی ہے شروع شروع میں اُسے خود سمجھ نہیں آئی تھی۔ چند ملاقاتوں تک اُسے خود پتہ نہیں چل رہا تھا کہ راحیل آخر

چاہتی کیا ہے۔ اس کا چہرہ اور آنکھیں اُسے ایک خاص سمت کی طرف اشارہ دیتی تھیں اور وہ سمجھ نہیں سکتا تھا کہ ایسا کیوں ہے؟ پہلی ملاقات سے لے

کر آخری ملاقات تک اگر اُس نے راحیل کو آگے بڑھنے کا موقع دیا تھا تو صرف اسی وجہ سے۔۔۔ آخری ملاقات میں جو اُس نے اپنے بارے میں

بتایا اور اُسے مدد چاہی تب اُسے اندازہ ہوا کہ معاملہ کچھ اور بھی ہو سکتا ہے لیکن ایک اُن کہا احساس بھی اس کی باتوں میں لپٹا ہوا تھا جس سے سوالیہ

نشان اُبھرتے تھے۔ کیا وہ فقط مدد ہی چاہتی ہے یا اس جذبے کا اظہار بھی جو اس کی آنکھوں سے چمک رہا ہوتا ہے یا پھر ایسا کچھ بھی نہیں ہے معاملہ

ہی کچھ اور ہو سکتا ہے جس کی اُسے توقع بھی نہ ہو۔ کیا ہو سکتا ہے؟ یہی سوال اُس کے سامنے آ کر تن گیا۔ اُس کا دماغ کچھ بھی سوچتا نہیں چاہ رہا تھا

اس لیے وہ اٹھا اور چھت سے نیچے آ گیا۔ اُس نے شاور لیا، ناشہ کیا اور لمبی تان کر سو گیا۔ دوپہر کے بعد اُس کی آنکھ کھلی تو وہ بہت حد تک فریش تھا۔

اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ باہر نکلے لیکن کہاں جائے؟ یہ اُس کے ذہن میں قطعاً نہیں تھا۔ وہ ایسی چار دیواری سے گھلن گھسوں کرنے لگا تھا جس میں وہ تھا

اور ایک مزید لڑکا سلطان جو اُس کے کھانے پینے کا انتظام کرتا تھا۔ وہ تیار ہوا اور باہر نکل گیا۔ اُس کی جیب میں بھاری رقم تھی۔ بڑی سڑک پر آ کر اُس

نے فون نکالا اور ہمایوں کے نمبر ملائے۔

”میں جنید بات کر رہا ہوں۔“

”ہوں بولو۔“ دوسری طرف سے انتہائی عطا انداز میں کہا گیا۔

”مجھے کہیں ملو۔“

”کہاں پر۔“ اس کا انداز ویسا ہی تھا۔

”جہاں تم مناسب سمجھو۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔“

یہ کہہ کر اس نے اپنے گھر سے ذرا قافلے پر ایک پارک کا نام بتا دیا اور پھر تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ دونوں اس پارک کے ایک سنگی بیچ پر آ

پہنچے۔

”کیا بات تھی۔“ وہ یوں نے جنید کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں اپنا وعدہ نبھانے آیا ہوں۔۔۔ یہ لڑتھماری توقع سے زیادہ دم ہوگی۔“ اس نے اندرونی جیب سے ایک خاکی رنگ کا پھولا ہوا

لقافہ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

”جنید! اسے واپس رکھ لو۔“ وہ یوں نے ویرے سے کہا۔

”واپس رکھ لوں۔۔۔ مطلب؟“ وہ قدرے حیران ہوتے ہوئے بولا۔

”تم یہ مت سمجھنا کہ میں کسی خوف کی وجہ سے ایسا کر رہا ہوں! ایسا نہیں ہے۔ میں تمہارے کام آ گیا! یہی بہت بڑی بات ہے۔“

اس نے کہا تو جنید چند لمبے اس کی جانب دیکھتا رہا اور پھر مسکراتے ہوئے بولا۔

”اصل بات بتاؤ! تم چاہتے کیا ہو؟“

”میں جو چاہتا ہوں اس میں دولت سب سے اہم چیز ہے۔ میں دولت مند بننا چاہتا ہوں۔“

”یہ کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں بیارے! اس معاشرے کی اکثریت ایسا ہی چاہتی ہے لیکن یہ تضاد کیوں ہے میں تمہیں اچھی خاصی رقم سے

رہا ہوں اور تم انکار کرتے ہوئے دولت مند بننے کی خواہش کا اظہار کر رہے ہو۔“ یہ کہتے ہوئے وہ چونک گیا اور فوراً ہی بولا۔ ”ہاں! اگر تم یہ کہو کہ

میں تمہیں کوئی ایسا راستہ بتا دوں تو ایسا ممکن نہیں ہے مجھے بھی نہیں معلوم۔“

”پھر تمہارے پاس اتنی دولت کہاں سے آتی ہے؟“

”یہ میری نہیں کسی اور کی ہے۔۔۔ اور ہاں! تم اگر میرے ساتھ شامل ہو جانے کی سوچ رہے تو بھی ممکن نہیں ہے۔ میں کسی اور دنیا کا پاسی

ہوں۔“

”چلیں ٹھیک ہے ہمارے درمیان جو بھی ہوا نہیں! اسے بھول جاتا ہوں۔ آج سے ہم اجنبی۔۔۔“

”تمہارا پرالم کیا ہے۔۔۔ تاؤ شاید کوئی راستہ نکل آئے؟“

جنید کے یوں کہنے پر ہالیوں نے انتہائی اختصار کے ساتھ صفیہ والا معاملہ بتا دیا۔ سب کچھ سن لینے کے بعد جنید نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”میں اس کے دل میں تمہارے لیے محبت تو پیدا نہیں کر سکتا۔۔۔ ویسے اے تم سے نفرت کیوں ہے؟“

”میں نے کبھی ایسا کوئی کام کیا نہیں جس سے وہ میرے ساتھ نفرت کرے۔ اس کی نفرت صرف غربت سے ہے اے تمہارے دنوں میں یہی پایا

ہے میں نے اور یہ غربت مٹانا میرے بس کی بات نہیں یہ ہے اور اسے ختم کرنے کی کوئی راہ بھی نظر نہیں آتی۔“

”۔۔۔ اور تم سمجھتے ہو کہ دولت ہی سے اس کا دل جیت سکتے ہو۔“

”جینا۔“

”لیکن تم نے یہ کبھی سوچا ہے کہ جب تک تم دولت مند ہو جاؤ گے اس وقت تک۔۔۔ کیا نام بتایا تھا تم نے۔۔۔ ہاں تیسرا اس وقت تک

تو وہ صفیہ کو لے آئے گا۔۔۔ دولت حاصل کرنے کا جتنا بھی شارت کٹ طریقہ ہو اس میں وقت تو لگتا ہے آجیازے!“

”ہاں۔۔۔ اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ جب میں صفیہ کو حاصل ہی نہیں کر سکتا تو پھر اس دولت کا مجھے کیا کرنا۔۔۔ میں نے رات بہت

سوچا تھا اسی لیے منع کر رہا ہوں۔“

”وہ کھنڈ اس دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔ کوشش بہر حال کر ڈو۔۔۔“

”سارے راستے بند ہیں اس وقت تک بند ہیں جب تک صفیہ کے دل کا دروازہ نہیں کھل جاتا۔ اس پر چاہے دولت کی دستک ہو یا پتھر

کی۔۔۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو۔۔۔ خیر تم اس رقم کو رکھو۔ کبھی کام آئے گی۔۔۔ میں نے تمہارے لیے پلان سوچا ہے، فرصت ملی تو میں ضرور تم سے

ڈسکس کروں گا۔ نئی اہمال تو میں خود بخش گیا ہوں۔“

”وہی واجد کے معاملے میں۔۔۔؟“ ہالیوں نے تیزی سے پوچھا۔

”نہیں۔۔۔ کچھ اور معاملہ ہے۔“ اس نے لاپرواہی سے ارد گرد دیکھتے ہوئے کہا اور پھر لفاظی اس کی جانب بڑھا دیا۔

”کیا میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں؟“ ہالیوں نے لفاظی لیتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

”پتہ نہیں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ چونک گیا۔ اس کے ذہن میں خیال آیا کہ وہ اب تک عالمگیر اور ڈیشان کے معاملے میں الجھن کا شکار

رہا ہے اس سے ہٹو کر کے دیکھے شاید کوئی نئی بات سامنے آ جائے۔ یہی سوچ کر اس نے کہا۔ ”آؤ کسی ریسٹوران میں چلتے ہیں۔ وہاں

کھانا۔“

”تم پاگل ہو۔۔۔ کیا تمہیں یہ خوف نہیں کہ پکڑے جاؤ گے؟“

”مجھ پر خشک ہو گا تو۔۔۔ نکل سے اس کے مخالف لوگوں کو پکڑا جا رہا ہے میرا تو اس کا حساب کتاب ہی بہت پرانا تھا۔۔۔ خیر وہاں سے

کھانا لیتے ہیں اور کسی محفوظ ٹھکانے پر بات کرتے ہیں۔“

”کھانے کے بعد جنید واہس اسی گھر میں ہمایوں کے ساتھ آ گیا تھا۔ وہاں اُس نے امیتان سے اسے طویل داستان سنائی۔ وہ بہت غور سے سنتا رہا۔ وہ جب ساری بات کہہ چکا تو اُس نے ہمایوں کی طرف دیکھا۔

”جنید! اس میں صرف ایک بات سے ساری الجھن دور ہو جائے گی۔ وہ تم جس وکیل سے ملے تھے۔“

”ہاں وہ قاروق چوہدری۔۔۔!“

”بات وہیں جا کر گرم ہو گئی ہے۔ وہ بتا سکتا تھا کہ لڑکی کون ہے۔ ذیشان ہی نے بتایا تھا نا اُس کے بارے میں اور تم نے بھی تصدیق نہیں کی۔ کیا واقعی ایسا کوئی معاملہ ہوا تھا؟ اس کی تصدیق ضروری تھی۔۔۔ دیکھو دو باتیں ہی ہو سکتی ہیں۔ واقعہ ہوا یا نہیں ہوا۔ چونکہ بات قاروق چوہدری پر شتم ہوئی آگے نہیں چلی تو ہونے یا نہ ہونے کی تصدیق وہیں ہوگی۔“

”سنیں کچھ گیا ہوں۔۔۔ قاروق چوہدری یا تو لڑکی سے طوائے اور معاملے کی تصدیق ہو پھر میرا موقف قیادت کے سامنے درست ہوگا اور اگر ایسا کچھ بھی نہیں ہے تو ذیشان مجھے استعمال کر گیا ہے اور بلاشبہ وہ۔۔۔ حالیکہ۔۔۔ کوئل کر چکا ہے۔“ جنید کو جیسے ہی بات کچھ میں آئی وہ نرمی طرح چونک گیا۔ وہ کتنی ہی دیر تک خاموش بیٹھا یہی سوچتا رہا۔ پھر ہمایوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تم نے میرا بہت بڑا مسئلہ حل کر دیا ہے۔“

”تو پھر مجھے اجازت۔۔۔؟“ ہمایوں نے پوچھا۔

”ہاں تم جاؤ سنیں وہ بارہم سے رابطہ کروں گا۔ میرے فون کا انتظار کرنا۔“

”اؤکے۔۔۔“

اس نے اٹھ کر ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ جنید اسے باہر تک چھوڑنے آیا مگر اُس کا سارا دھیان اسی طرف تھا جس کی نشاندہی ہمایوں نے کی تھی اُس پر بہت کچھ واضح ہوتا چلا جا رہا تھا۔

☆☆

صنیہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھی۔ اُس کی ساری توجہ سامنے دھرے ٹی وی اسکرین پر تھی جہاں فیشن سے متعلق پروگرام چل رہا تھا۔ صنیہ ان خاتون کپڑوں کے بارے میں بتا رہی تھی کہ فیشن میں آج کل کیا ان ہے اور کیا آؤٹ صنیہ پوری توجہ سے دیکھ رہی تھی۔ اُسے پتہ ہی نہیں چلا کہ کب اُس کا باپ ڈرائنگ روم میں آ گیا ہے۔ چند لمبے بعد جب اُسے احساس ہوا تو اُس نے والیم کم کر دیا اور باپ کی جانب متوجہ ہو گئی۔

”آپ کو دیر نہیں ہو گئی آج۔۔۔ اور بھائی نہیں آئے؟“

”وہ کچھ دیر تمہاری ماں کے پاس رُک گیا ہے سنیں بھی وہیں تھا۔“ اصغر علی نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

”میں آپ کے لیے پانی لاتی ہوں۔“ اُس نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

”نہیں رہنے دو۔۔۔ ابھی کھانا کھاؤں گا۔“ یہ کہہ کر اُس نے صفیہ کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ ”تم بیٹھو میں نے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔“ اُس نے کچھ اس انداز میں کہا جس کی صفیہ کو فوری طور پر کچھ نہیں آسکی۔ وہ اندر سے لرز گئی تھی لیکن اُس کے باپ کے انداز میں غصہ یا سختی نہیں تھی۔ وہ دیر سے سے بیٹھ گئی اور اپنے باپ کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ چند لمحوں سوچتے رہنے کے بعد بولا۔ ”یہ تیور کون ہے؟“

اُس کے باپ کا لہجہ اس طرح تھا کہ جیسے اُس سے پوچھتا ہے کہ تمہیں بلکہ معلومات لے رہا ہوں اس پر صفیہ کو قدرے حوصلہ ہوا۔

”پاپا! آپ مجھ سے جو بھی پوچھیں گے سنیں آپ کو بالکل سچ بتاؤ گی لیکن یہ ذہن میں ضرور رکھئے گا کہ آپ کی بیٹی اپنا اچھا بھلا خوب جانتی ہے۔“ وہ بولی۔

”ٹھیک ہے۔۔۔ میں نے جو پوچھا ہے وہ بتاؤ؟“

”پاپا! وہ شہر کے ایک بہت بڑے انڈسٹریل کا بیٹا ہے آپ بھی انہیں جانتے ہیں۔ شیخ عزیز الرحمن وہ اُن کا بیٹا ہے۔ وہ زیادہ عرصہ برطانیہ میں رہا ہے ابھی کچھ عرصہ پہلے وہ یہاں آیا ہے۔ میری اُس کی ملاقات تانبہ۔“

”کیا وہ تمہارے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔۔۔؟“

یوں باپ کے اچانک پوچھنے پر وہ قدرے کڑ بڑا گئی اور ہکلاتے ہوئے بولی۔

”سچ سچ۔۔۔ جی ہاں۔۔۔“

”جس طرح مجھے معلوم ہوا ہے کیا اس طرح اُن کے خاندان کو بھی تمہارے بارے میں معلوم ہے؟“

”ہے نہیں۔۔۔ میری اس موضوع پر اُس سے کبھی بات نہیں ہوئی۔“

”بیٹی! تم زیادہ کر جس گھر میں جانا چاہ رہی ہو اُس گھر کے بارے میں اُس کے افراد اور اُن کے خیالات بارے میں تمہیں کچھ پتہ نہیں ہے۔ تم نے اُس سے یہ پوچھنا گوارا نہیں کیا کہ اُس کے والدین تمہیں قبول کریں گے بھی یا نہیں؟“

”سنیں نے ابھی اس لیے نہیں پوچھا ہے پاپا! کہ وہ نور شادی چاہتا ہے مگر میں ابھی نہیں جانتی۔ ہمارے درمیان ابھی یہی بات چل رہی ہے۔“

”تم ابھی کیوں نہیں شادی کرنا چاہو گی؟“

”اس لیے پاپا! کہ میں ابھی پڑھنا چاہتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ کے ساتھ بزنس میں آؤں۔ میں اپنا آپ منوانا چاہتی ہوں۔“

”اور اس پر تیور کارڈ عمل کیا ہے؟“

”وہ میری بات مانتا ہے۔ اُس نے شادی کا معاملہ میری مرضی پر چھوڑ دیا ہے۔“

اصغر علی نے بیٹی کی زبانی یہ بات سنی تو ایک لمحے کے لیے وہ پریشان ہو گیا اُس کے منہ سے ایک سرو آہ برآمد ہوئی۔ اُسے لگا جیسے وہ اعصاب پر سے کنٹرول کھودے گا تاہم اُس نے بہت مشکل سے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”بیٹی! میں ماننا ہوں کہ تم اپنا اچھا بھلا خوب سمجھتی ہو، مگر میں ہوا اور دنیا کو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں لیکن تم یہ مانو گی کہ تم ابھی نا سمجھ اور نا تجرب کار ہو۔ تم نے ابھی گھر اور کالج کی دنیا کے علاوہ کچھ نہیں دیکھا جبکہ یہاں قدم قدم پر پھندے ہیں۔“

”پاپا! تیمور ایسا نہیں ہے۔۔۔“

”میں ماننا ہوں کہ وہ ایسا نہیں ہوگا لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ اس لیے ہے کہ یہاں قدم قدم پر دھوکا دیا جاتا ہے۔“

”پاپا! تیمور کے پاپا اس کو بہت چاہتے ہیں وہ اس کی بات نال ہی نہیں سکتے۔ وہ بھٹکر ہے کہ میں ہاں کروں اور وہ اپنے گھر والوں سے بات کرے۔“

”۔۔۔ اور تم ابھی وقت چاہتی ہو۔۔۔ دیکھو بیٹی! ارنس کی دنیا میں صرف آج پر لگا رکھی جاتی ہے جو کل گزر گیا سو گزر گیا اور ابھی جو کل آنے والا ہے اس نے ابھی آنا ہے۔ ہمارے پاس چانس ہے کہ اسے خوبصورت بنائیں مگر ہم ہر شے کو ارنس کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتے۔۔۔“

”پاپا! آپ اس خاندان کو جانتے ہیں وہ دولت مند، محترم اور باعزت خاندان ہے اور پھر تیمور بہت اچھا ہے۔“

”تم اپنی بات کو ذرا برابری ہو جبکہ میری بات سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہی ہو۔ ایک جانب تم اپنا آپ منوانے کی بات کر رہی ہو اور دوسری جانب تیمور کے خاندان کی خوبیاں بھرا رہی ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم ایسا کیوں کہہ رہی ہو۔ تم ان دونوں آپشنز پر چھٹے ہوئے یکسوئی قائم نہیں رکھ سکتی ہو۔ تمہیں ایک آئین بہر حال چھوڑنا پڑے گا۔“

”مگر پاپا! مجھے کوئی ڈشوری پیش نہیں آ رہی ہے۔ میں۔۔۔“

”میں پھر کہہ رہا ہوں۔ وہ بہت اچھا خاندان ہی لیکن ہمارا معاشرہ اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ تمہارا نام اس کے ساتھ آئے اور لوگ کھلم کھلا اس پر اظہار کریں۔ ہم کسی مغربی معاشرے میں نہیں رہ رہے ہم جتنے بھی ماڈرن ہو جائیں لیکن ابھی مشرقیت ہمارے اندر ہے۔ کوئی باپ یہ سب برداشت نہیں کر سکتا۔“

”مغربی کالجیو دیرے دیرے تلخ ہونے لگا تھا لیکن جیسے ہی اسے احساس ہوا تو فوراً خود پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ ”میں نے تحمل اور پیار کے ساتھ اس لیے تم سے گفتگو کی ہے کہ تم ان حالات پر غور کرو۔ میں تم پر کسی بھی قسم کے دباؤ کے حق میں نہیں ہوں۔ میں تمہاری مرضی کو اولیت دوں گا لیکن اس شرط کے ساتھ کہ تم اپنے اور اپنے خاندان کا وقار بہر حال پیش نظر رکھو گی۔“

”پاپا! پلیز۔۔۔ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا جس سے میری یا میرے خاندان کی عزت پر حرف آئے۔“

”مگر تم لوگوں کی زبان نہیں کھلا سکتی ہو۔ جس طرح یہ چانس ہے کہ وہ تمہارے ساتھ تعلق نبھائے گا اسی طرح یہ چانس بھی تو موجود ہے کہ وہ تمہیں چھوڑ بھی سکتا ہے۔ ایسا کیا حق ہے تمہارے پاس؟“

”میں مانتی ہوں پاپا! میرے پاس اس وقت کوئی حق نہیں ہے۔“

”تو ایسے حالات میں تمہیں کیا کرنا چاہئے۔۔۔؟“

”پاپا! مجھے تمہوڑا سا موقعہ دیں۔ میں ایک بار تیمور سے بات کروں۔ اس کے بعد جیسا آپ چاہیں گے ویسا ہی ہوگا۔۔۔“

”فیصلہ تم نے کرنا ہے۔ اگر تم ابھی شادی کے حق میں ہو تو میں تمہارا بھرپور ساتھ دوں گا اور اگر نہیں تم میرے ساتھ بزنس میں آنا چاہتی ہو تو پھر تمہیں سب کچھ بھلانا ہوگا۔“ یہ کہہ کر اُس نے اپنی آواز کو مزید نرم بناتے ہوئے کہا۔ ”میری تجربہ کار لگا ہیں یہ دیکھ رہی ہیں کہ وہ خاندانِ دولت میں ہم سے کہیں زیادہ ہے۔ ہمیں امیر ہونے کا غرور نہیں ہوا لیکن وہ کم از کم تین لاکھوں سے امیر ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ تیور کا ذہن کیا ہے۔ ممکن ہے ذہ بہت کھلے ذہن کا ہو لیکن میں باپ ہونے کے ناتے تمہیں سمجھا رہا ہوں کہ یہ بنا تا بہت مشکل سے ہونے کا امکان ہے۔“

”لیکن پاپا! اگر ہو جائے تو— میں کوشش—“

”تم اپنی کوشش کر دو کچھ لیکن بات وہی ہے کہ اپنے خاندان کی عزت کو داؤ پر مت لگانا۔ میں ان والدین میں سے نہیں ہوں جو اپنی جوان اولاد پر پابندیاں لگاتے اور انہیں بے گناہ پر آمادہ کر دیتے ہیں۔ تمہاری ماں جو سوچ رہی ہے میں اس سے بھی متعلق ہوں اس لیے مجھے اُس کے سامنے بھی شرمسار نہ کرنا۔ میں فیصلہ تم پر چھوڑتا ہوں تم خوب سوچ لو۔“

”پاپا! یہ تو آپ یقین رکھیں میں اپنی عزت اور عصمت کے معاملے میں خالص مشرقی ہوں۔ میں سمجھتی ہوں کہ آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔ میں آپ ہی کی بات مانوں گی— آپ بتائیں میں کیا کروں؟“

”نہیں— میں تم پر ذرا سا بھی دباؤ نہیں ڈالوں گا میں نے کہا تھا تم سوچ لو اور مجھے بتادو۔“

اصغر علی نے تھی انداز میں کہتے ہوئے اس کی جانب دیکھا اور پھر اٹھ گیا۔ وہ اپنے کمرے کی جانب چلا گیا تھا جبکہ صفیہ گہری سوچ میں ڈوب گئی تھی۔ اُسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ اُس کا باپ اس قدر قہر اور نرمی کے ساتھ اس سے بات کرے گا اور اسے سمجھائے گا۔ اُس نے بجائے پابندیاں لگانے اور اپنا حق جتانے کے فیصلہ اس پر چھوڑ دیا تھا کہ وہ جو چاہے— اُسے سوچنا تھا اور پھر اپنا فیصلہ دینا تھا۔ چند لمحے کے لیے تو اُسے یوں لگا جیسے تیور اس سے بہت ڈور چاچکا ہے لیکن اُس کے باپ کی بات بھی بالکل درست تھی سو اس نے تیور سے آخری بار تھی بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ طے کر کے وہ اٹھ گئی۔

☆☆

راحیلہ دھیرے دھیرے آہستہ قدموں سے ہاسٹل وارڈن بیگم شمیم کے کمرے کی جانب بڑھ رہی تھی۔ اُسے پورا یقین تھا کہ اُسے کچھ اچھی بات سننے کو نہیں ملے گی۔ اُسے اپنی سینئر نرس سے معلوم ہو گیا تھا کہ اُسے اپنی راہ پر لانے کے لیے جال بک کر دیا گیا ہے۔ تھوڑی دیر قبل جب اُسے بیگم شمیم کی طرف سے بلاوا آیا تھا وہ اسی وقت سمجھ گئی تھی کہ کیا ہونے والا ہے مگر بہت سوچ کر اُس نے یہ طے کر لیا تھا کہ اُسے کیا کہنا ہوگا۔

”میں اندازہ آ سکتی ہوں؟“

راحیلہ نے دھیمی آواز سے کمرے کے اندر آنے کی اجازت چاہی۔ اس پر بیگم شمیم نے جو میز کے دوسری طرف کاغذات پر دھیان دینے بیٹھی تھی سزاٹھا کر جھٹکے کے پیچھے سے اُسے دیکھتے ہوئے سر ہلایا۔ راحیلہ چلتی ہوئی اُس کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ بیگم شمیم نے اُسے سر سے پاؤں تک دیکھا اور پھر قدرے کرحشت لہجے میں بولی۔

”اچھا تو یہ تم ہو۔۔۔ راحیلہ ہی نام ہے تا تمہارا؟“

”جی، میرا نام ہی راحیلہ ہے۔“ اس نے انتہائی قہقہے اور شائستگی سے کہا۔

”تمہارے بارے میں بہت ساری شکائتیں آ رہی ہیں۔ پہلے تو مجھے قضا رہائی کہا گیا تھا جسے میں نے نظر انداز کیا لیکن اس بار مجھے

باقاعدہ چٹھی ملی ہے۔“ بیگم شمیم نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا الزامات لگائے گئے ہیں مجھ پر۔۔۔؟“

راحیلہ نے اسی قہقہے سے پوچھا تو بیگم شمیم نے چونک کر اسے دیکھا۔

”سڑکی اس کا مطلب ہے تم جانتی ہو کہ تم پر الزامات لگ سکتے ہیں۔ اس کا مطلب۔۔۔ تمہیں اندازہ تھا کہ تمہارے خلاف ایسا۔۔۔“

”میڈم! آپ پلیز مجھے الزامات تو بتائیں آخر میں نے کیا کیا جرم کئے ہیں؟“

”تمہارا روپ ٹھیک نہیں، تم ڈیوٹی سے اکثر غائب رہتی ہو۔ سینئرز کو نظر انداز کرتی ہو اور اپنے فرائض ٹھیک طرح سرانجام نہیں دیتی ہو۔

تمہاری شفقت کی وجہ سے دوسری بیویوں کی جان کو خطرہ بھی لاحق ہوا۔“ بیگم شمیم نے فرد جرم پڑھ کر سنا دی۔

”میڈم! کیا آپ نے تحقیق کر لی ہے کہ ایسا ہی ہوا ہے؟“

راحیلہ نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔ جس پر بیگم شمیم نے بات کی تہ تک جھنجھٹے ہوئے راحیلہ کو دیکھا پھر تہدیوں پر غل ڈالتے

ہوئے بولی۔

”یہ میرے فرائض میں شامل نہیں ہے کہ جو کچھ تم لوگ ہسپتال کے اندر کرو سکتے اس کی تحقیق کرتی پھرو۔ میری حدود ہوسٹل کی چار دیواری

ہے۔ ہسپتال انتظامیہ نے یہ چٹھی مجھے اس لیے بھیجی ہے کہ مجھے بھی اطلاع ہو سکے اور میں تمہیں بتا سکوں کہ تم خود پر لگے الزامات کا دفاع کر سکو۔

تمہیں انتظامیہ کے سامنے جا کر اپنی پوزیشن صاف کرنا ہوگی ورنہ پھر تمہارے خلاف فیصلہ ہو جائے گا۔“

”ٹھیک ہے مجھے اطلاع ہوگئی۔ یہ بتا دیجئے کہ مجھے کب ہسپتال انتظامیہ کے سامنے پیش ہونا ہوگا؟“ اس نے عام سے انداز میں کہا۔

”راحیلہ! تم اس چٹھی کو بہت معمولی لے رہی ہو۔ یہ آن ریکارڈ معاملہ ہے اگر اس پر ایکشن ہوا تو تمہیں یہاں سے نکالا جاسکتا ہے۔“

بیگم شمیم نے کہا۔

”کوئی بات نہیں۔ جو جرم کرتا ہے اسے سزا ضرور ملنی چاہئے۔ یہ میں ہوں یا کوئی اور ہو۔ میں اگر یہاں سے نکال دی جاؤں گی تو کیا میں

انتقام بھی نہیں کر سکتی کہ جو بھیا تک چہرے ہیں اور ان پر جو بڑا خوبصورت نقاب چڑھا ہوا ہے میں وہ بھی نہا تاں کر سکو۔ میں بھی جانتی ہوں اور آپ کو

بھی معلوم ہے کہ مجھ پر یہ سارے الزام جمونے ہیں۔ میں آپ سے کوئی انتقام نہیں کروں گی۔ آپ جو چاہئے کر سکتی ہیں۔ انتظامیہ جو چاہئے کر سکتی

ہے لیکن پھر مجھے بھی اپنی مرضی کرنے کا پورا حق ہوگا۔“

”بہت بولتی ہو تم اداسی ہی تمہارا رویہ بہت خراب ہے۔ تم میرے سامنے اس طرح بول رہی ہو تو ڈاکٹرز سے کس طرح بات کرتی ہوگی۔“

تمہیں پتہ ہے کہ مجھے اس قدر اختیار ہے میں تمہیں یہاں سے باہر پھینک سکتی ہوں۔"

"آپ ایسا کر سکتی ہیں میں نے کب روکا ہے۔ ہر شخص اپنے اختیار کے نشے میں ہے آپ بھی ہو سکتی ہیں۔ نکال دیں مجھے مگر یہ یاد رکھیں

کہ رات گئے تک جو لمبی لمبی گاڑیاں ہوٹل کے باہر آ کر رکتی ہیں وہ ضرور آنا بند ہو جائیں گی۔"

"تم اس قدر۔۔۔ اس قدر زبان دراز ہو۔"

"میں نہیں بچ کہہ دی ہوں میڈم آج آپ مجھے یہ الزامات کی فہرست بتا رہی ہیں میں اگر اپنا ضمیر مار دوں تو آپ ہی مجھے نوازشات

کی فہرست سنا سکیں گی۔ آپ مجھے ہوٹل سے باہر پھینک دیں لیکن اگر آپ میں ضمیر نام کی کوئی شے ہوئی تو آپ کو یہ احساس ضرور ہوگا کہ آپ

نے اندھیرے مزید گہرے کیئے ہیں۔"

"انتظامیہ نے تم پر جو چارج لگائے ہیں وہ بالکل ٹھیک ہیں۔" یہ کہہ کر وہ ہلکے ہلکے ہنسی ہنستے ہوئے بولی۔ "وہ اس طرح ٹھیک ہیں کہ تم اس

ماحول میں مس فٹ ہو تمہیں یہاں ہونا ہی نہیں چاہئے تھا۔ تمہارے جیسی لڑکیاں سوائے سرد روکے اور کچھ نہیں ہوتیں۔"

"ٹھیک ہے۔ جب انتظامیہ مجھ سے یہ سوال کرے گی تو میں وہیں جواب دے دوں گی۔"

راحیلہ نے واضح انداز میں کہا تو حکیم شیم مسکرا دی اور پھر بولی۔

"ممکن ہے ایسا سوچ ہی نہ آئے اور تم یہاں سے جانے پر مجبور ہو جاؤ۔"

"ممکن ہے سب کچھ ممکن ہے یہ بھی ممکن ہے کہ میں نہیں رہوں اور آپ لوگ مجھے نہیں رکھنے پر مجبور ہو جائیں۔"

راحیلہ نے انتہائی اطمینان سے کہا تو کھلی بار حکیم شیم کے ماتھے پر سوچ کے واضح آثار اُبھرے۔ اس کا چہرہ حیرت کا تاثر دینے لگا تھا۔

"کیا کر لو گی تم۔۔۔؟" اس نے تھرا آواز میں پوچھا۔

"رہو عمل۔۔۔ ظاہر ہے میں رہو عمل ہی کر سکتی ہوں اور وہ کچھ نہیں کر سکتی جس کی وجہ سے مجھ پر چارج ہیں۔" راحیلہ نے آرام سے کہا۔

"ٹھیک ہے بہت جلد تمہیں فیصلے سے آگاہ کر دیا جائے گا۔ اب تم چا سکتی ہو۔"

اس نے تذبذب سے کہا تو راحیلہ مڑی اور دھیرے قدموں سے چلتی ہوئی واپس چلی گئی۔

وہ اپنے کمرے میں بیڈ پر پڑی سوچ رہی تھی اس کی زندگی کا مشکل ترین مرحلہ آ گیا تھا۔ وہ یہ بات اچھی طرح سمجھتی تھی کہ میڈم کا یوں

اپنے آفس میں بلا کر بات کرنا واضح طور پر دھمکی تھی اور وہ یہ چاہتے بھی تھے کہ راحیلہ اپنی ذات میں کچھ ہلک پیدا کرے جس سے یہ اشارہ ملے کہ وہ

ان کی بات مان جائے گی مگر اس نے صاف لفظوں میں انہیں یاد کر دیا کہ اسے یہاں سے چلے جانا منظور ہوگا لیکن وہ اسے اپنی ڈگر پر نہیں چلا

پائیں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ وہ ان کے فیصلے پر رد عمل کا اظہار کرے گی حالانکہ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ صرف ایک

ہینڈ کا آسرا تھا پھر نہیں کہ وہ اس کی مدد کر بھی سکتا ہے یا نہیں؟ لیکن وہ اس کی احسان مند تھی کہ اسی کی وجہ سے اسے حوصلہ مل گیا تھا۔ اس نے فون اٹھایا

اور فون میں موجود اکوڑے نمبر کو ڈائل کر دیا تو دوسری طرف سے اس نے پہچانتے ہوئے کہا۔

”بولو۔۔۔ کیا حال ہے راحیلہ۔۔۔؟“

”میں ٹھیک ہوں۔“

”لیکن تمہارا لہجہ نہیں بتا رہا ہے کہ تم ٹھیک ہو۔۔۔ بولو کیا بات ہے؟“

جنید نے کہا تو اس نے ساری رودادوں سے سنا دی۔ سب کچھ امینان سے سننے کے بعد جنید نے کہا۔

”گھبراؤ مت، کل کا دن تمہارے لیے بہت بڑی تبدیلی لے آئے گا۔ تم امینان سے سو جاؤ۔۔۔ ڈیوٹی کس وقت ہے تمہاری؟“

”چھ نہیں کب اور کہاں۔۔۔“ اس سے بولا نہیں جا رہا تھا، وہ کسی اور دنیا میں پہنچ گئی تھی۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“ جنید نے دھیرے سے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔۔۔“ وہ ہلرتے ہوئے لہجے میں بولی۔

”کچھ تو ہے تم یوں۔۔۔“ جنید نے جان بوجھ کر فخر و ادھر اور اچھوڑ دیا۔

”بس یہی سوچ رہی ہوں کہ کیا ہے زندگی اور کتنا بے بس کر دیتی ہے یہ زندگی، کیوں ہم مرتے رہتے ہیں اس زندگی کے لیے۔۔۔“ اس

نے گلو گیر لہجے میں کہا۔

”اوہ۔۔۔ میں نے کہا تھا، گھبراؤ نہیں۔ آپ سو جاؤ۔۔۔ اللہ حافظ۔“ جنید نے اسے حوصلہ دیا۔

”اللہ حافظ۔“

اس نے دھیرے سے کہا اور پھر فون بند کر دیا۔ راحیلہ نے فون سکرین پر دیکھتے ہوئے ایک طویل سانس بھری، پھر فون ایک طرف رکھا اور

آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو پونچھے ہوئے لپٹ گئی۔ اسے ایک روشن صبح کا انتظار تھا جس میں چاقی کھڑ کر سامنے آ جائے۔

☆☆

کھلی ہوئی کھڑکی میں سے چاندنی آ کر اس کے کمرے میں باکا اُجالا کیٹے ہوئے تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہر شے اس چاندنی میں

چمکتا جا رہی ہے۔ صفیہ اپنے بیڈ پر پڑی خود بھی اس ماحول کا حصہ لگ رہی تھی لیکن اس کے دماغ میں اپنے باپ سے ہونے والی گفتگو گونج رہی تھی۔

اس کے باپ نے کس قدر تحمل بردہاری اور صبری کے ساتھ اس سے سبھا یا تھا۔ یقیناً ممکن تھا کہ وہ اس پر تکی کرتا، اس کا بھی رویہ اس کی ماں کے جیسا ہوتا اور

اس کے اندر بے قیامت جنم لے لیتی۔ اس کے باپ نے جو نرم رویہ پانا یا تھا اس کا مطلب یہ بھی نہیں تھا کہ وہ آئندہ بھی ایسا ہی طرز اپنائے۔ اگرچہ اس

کا لہجہ نرم تھا لیکن اس کے اندر روکتی ہوئی آگ وہ محسوس کر چکی تھی۔ کوئی بھی غیرت مند مشرقی باپ یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کی بیٹی یوں کسی غیر

مرد کے ساتھ تہائیوں میں ملاقات کرے اور دیکھ اس کا اظہار بھی کرے۔ صفیہ کے ذہن میں بلاشبہ اپنے باپ کے بارے میں ایسا تاثر تھا جس کی وجہ

سے اس نے بہت کچھ کہہ دیا تھا۔ بہر حال یہ اس کے لیے ایک ایسا مناسب موقع تھا کہ کوئی حتمی فیصلہ کر سکے۔ یہ فیصلہ اس کی اپنی ذاتی زندگی کے

لیے بھی بہت اہم تھا۔۔۔

زندگی میں بہت سارے ایسے مقامات آتے ہیں جب انسان خود کو پوری دنیا میں تنہا محسوس کرتا ہے۔ اس وقت اُسے شدت سے کسی اپنے کا ساتھ ہونے کی طلب محسوس ہوتی ہے۔ ایسے میں اگر دور دور تک کوئی اُسے اپنا دکھائی دے تو یہ کیفیت احساسِ محرومی میں بدل جاتی ہے۔ تنہا ہو جانے کا احساس اور اس کی شدت میں جوڑ دکھ ہوتا ہے وہ عام حالات سے کئی زیادہ ہوتا ہے۔ اگرچہ مشرقی روایات میں کچھ باتیں ایسی ہیں جن سے بندہ تکلیف محسوس کرتا ہے۔ اسے اپنی حدود متعین کرنا پڑتی ہیں اور ایک خاص دائرے میں ہی رہنا پڑتا ہے لیکن یہی مشرقی روایات اپنے اندر ایسی خوبصورتیاں بھی رکھتی ہے کہ بندہ خود کو کبھی تنہا محسوس نہیں کرتا۔ فطری طور پر جس طرح کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا پڑتا ہے اسی طرح مشرقی سماج میں بھتیوں کے لیے چھوٹی چھوٹی قربانیاں دینا پڑتی ہیں۔ محبت اور قربانی کے لین دین میں کوئی مول تول نہیں ہوتا مگر یہی ایک انسان کو دوسرے انسان کے ساتھ جوڑ کر رکھتی ہے۔ دراصل مشرقی سماج ”روئے“ کی بنیاد پر ہے۔ سماج میں جس قدر روئے اچھے خوبصورت اور غلوں بھرے ہوں گے سماج اُتھایا مضبوط ہوگا۔ اس میں خود فرضی کہیں نہیں ہوتی اور قربانی دینے کا حوصلہ بہت زیادہ ہوتا ہے لیکن اسی مشرقی سماج میں اگر خسی روئے آ جائیں تو پھر اس سماج کی مضبوطی باقی نہیں رہتی اور انسان تنہائی کی جانب بڑھنے لگتا ہے۔ فرد کی تنہائی پورے معاشرے کو تنہا کر کے رکھ دیتی ہے یہی وہ دیکھ میں جو کسی بھی سماج کو کھوکھلا کر کے رکھ دیتی ہے۔ اس وقت صنفِ بھی ایک ایسے ہی کرب سے گزر رہی تھی۔ مشرقی معاشرے میں ایک ماں اور بیٹی کا تعلق سیلیوں جیسا ہوتا ان میں کبھی جزیمن کیپ نہیں آسکتا۔ ماں جس طرح چاہے بیٹی کی تربیت کر سکتی ہے مگر جب دونوں میں بہت دوری ہو تو ایسے میں باہر سے آنے والے خیالات رو یہ تبدیل کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ سلی اپنی ماں زینون بی بی کے بہت قریب رہی تھی لیکن صنف ایسا نہ کر سکی۔ ان کا اپنا خاندان جب تبدیلی کے مرحلے سے گزر رہا تھا صنف نے سب سے زیادہ اس تبدیلی کو اپنایا جس کے نتیجے میں وہ بہت دور ہو گئی تھی اور آج تنہائی کا شکار ہو کر اُبھنوں میں گھری ہوئی تھی۔ یہاں بھنیں باپ کے نرم روئے میں واضح طور پر سرزنش اور والدہ کا تنہا ہو کر ہسپتال میں پڑے ہونا تھا لہذا دے کر اگر وہ کسی کو اپنا بھری تھی تو وہ فقط تیسور تھا۔ وہ چند لمبے سوچتی رہی اور پھر قریب پڑے فون کو اٹھا لیا۔ اُس نے نمبر دیش کیئے دوسری جانب تیل جاتی رہی۔

”ہیلو۔۔۔ تم صنفو!۔۔۔ اتنی رات گئے؟“ اُسے تیسور کی آواز سنائی دی جس میں حیرت تھلی ہوئی تھی۔

”ہنس دل کیا اور فون کر دیا۔۔۔ ابھی کون سا اتنی رات ہو گئی ہے تم سو رہے تھے کیا؟“ اُس نے ایک ہی سانس میں بہت کچھ کہہ دیا۔

”نہیں نہیں سو نہیں رہا تھا۔ ایک بہت دلچسپ فلم دیکھ رہا ہوں ٹی وی پر۔“ اُس نے تیزی سے کہا۔

”مطلب تم بڑی ہو؟“ اُس نے قدرے لاپرواہی سے کہا۔

”ارے نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ میں بھی دراصل پور پور رہا تھا اس لیے ٹی وی آن کر دیا۔۔۔ اوسنیں بند کر دیا ہوں۔“ اُس نے چند لمبے

تھمبر کے پھر کہا۔ ”ہاں اب یولو۔۔۔؟“

”انسان پور کیوں ہو جاتا ہے۔“ صنف نے یونہی بات چڑھانے کے لیے کہہ دیا۔

”میرے خیال میں جب اُسے اپنی پسند کا ماحول نہ ملے۔“ تیسور نے یونہی روانی میں کہا پھر چوکتے ہوئے بولا۔ ”تم پور ہو رہی تھیں

کیا۔۔۔؟“

”ہاں بھی اور نہیں بھی۔۔۔ شاید میں بوز نہیں ہو رہی ہوں بلکہ خود کو تجھ محسوس کر رہی ہوں۔“ اس نے حسرت سے کہا۔

”تمہاری ابھی ابھی شمار آلود گھٹکوں لگتا ہے کہ معاملہ کچھ اور ہے وہ نہیں جو اس وقت تمہاری زبان پر ہے۔“ وہ قدرے خوشگوار اور مذاق

میں بولا۔

”ہاں تیور! میں آج ایک فیصلہ کر لینا چاہتی ہوں۔“ وہ حتمی لہجے میں بولی۔

”کون سا فیصلہ۔۔۔؟“ اس نے خوشگوار حیرت سے کہا۔

”مجھے تم سے شادی کر لینا چاہئے یا پھر تمہیں بھول کر اپنے خوابوں کی تعبیر کے لیے کوشش کرنی چاہئے؟“ سفید نے منہ بولا لہجے میں

کہا۔

”ارے! یہ تمہیں اچانک کیا ہو گیا ہے؟۔۔۔ میں مانتا ہوں کہ تم بہت کچھ کرنا چاہتی ہو لیکن یہ مجھے بھول جانے کی بات کہاں سے آگئی؟“

اس نے حیرت سے پوچھا۔

”تیور! تم نہیں جانتے۔ اس وقت مجھے یہ فیصلہ کرنا ہے ورنہ میں خود کوٹ، کپوٹ کا فنکار ہو جاؤں گی۔“ اس کا لہجہ بیگانہ ہوا تھا۔

”یہ تم واقعی بہت سیریس بات کر رہی ہو؟۔۔۔ چلو ٹھیک ہے۔ ہم بہت سہولت کے ساتھ بہت سوچ کر فیصلہ کر لیتے ہیں لیکن۔۔۔“ وہ

کہتے کہتے زنگ گیا۔

”لیکن کیا۔۔۔؟“ وہ تیزی سے بولی۔

”لیکن یہ میری جاں! کہ جب تم نے پچھلی بار مجھ سے بات کی تھی تب میں نے تمہیں کہہ دیا تھا کہ جو تم چاہو۔ تم نے خودی تو شادی دیر سے

کرنے کے لیے کہا تھا اور میں نے مان لیا تھا۔ اب ایسی کون سی القاد آ پڑی کہ تم اس قدر جلد فیصلہ کرنے پر مجبور ہو گئی ہو؟“ تیور نے آنکھیں ہوئے

پوچھا۔

”وہ کوئی بھی وجہ ہو لیکن کیا یہ خیال غلط ہے؟“ وہ قدرے تیز لہجے میں بولی۔

”نہیں غلط نہیں۔“ اس نے مانتے ہوئے کہا پھر چند لمحوں سوچتے رہنے کے بعد سنجیدگی سے بولا۔ ”تمہیں اپنے خوابوں کی تعبیر کے

لیے کتنا وقت درکار ہے؟“

”اس بارے تو میں کچھ نہیں کہہ سکتی اور یہی سب سے بڑی الجھن ہے۔“ وہ ہیرے سے بولی۔

”وہی الجھن اگر بتاؤ گی تو پتہ چلے گا۔۔۔؟“ تیور نے کہا۔

”میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہی ہے کہ میں ایک بزنس وومن کے طور پر پہچانی جاؤں۔ میں اپنے اس خواب سے دستبردار

نہیں ہو سکتی۔ ظاہر ہے اس کے لیے ابھی وقت چاہئے لیکن اس دوران نہ تم انتظار کر سکتے ہو اور نہ ہی ہمارے ارد گرد لوگ ہمیں یہ اجازت دیں گے کہ

عشق کا ہے عشق بتا

ہم ایک دوسرے کے ساتھ تعلق رکھ پائیں۔" اس نے بہت آرام سے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"جب تم اور میں راضی ہیں مانتے ہیں تو دوسروں کو پھر کیا ہے؟" تیمورا بچھے ہوئے بولا۔

"نہیں تیمورا تم میں اور مجھ میں کوئی ایسا تعلق نہیں ہے جس کی بنیاد پر میں فخر سے اپنے لوگوں کو اپنے معاشرے کو بتا سکوں۔ تم سوچو یہ

معاہدہ صرف تمہارا اور میرا نہیں ہے بلکہ دو خاندانوں کا بھی ہے۔" اس نے اپنی بات بہت آرام سے کہہ دی۔

"اوہ نہیں سمجھا۔۔۔ تم سیدھے کہو کہ ہم میں کوئی مضبوط تعلق ہونا چاہئے جسے ہمارا معاشرہ بھی تسلیم کرے اور ہم انہیں فخر سے بتا سکیں۔"

دوساری بات سمجھتے ہوئے بولا۔

"بھی بات ہے۔۔۔" وہ دوجہرے سے بولی۔

"اؤکے۔۔۔ مجھے بس ایک ہفتہ دو مہینے اپنے والدین کو اپنی خواہش بتانا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ہمارا ساتھ بہت جلد ہو جائے گا۔

رہی برنس وومن کی بات تو انکا سرمایہ ہے میرے پاس تم کوئی سا بھی برنس کر سکتی ہو۔ ممکن ہے ہم دونوں۔۔۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کیا ایسا ممکن ہے۔۔۔؟" وہ قدرے حیرت سے بولی۔

"کیوں نہیں۔۔۔ تم بس مجھ پر اعتماد رکھو اور مت گھبراؤ۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

تیمور نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا تو صفیہ کے ذہن پر چھایا ہوا غبار ڈھل گیا۔ وہ خوشگوار موڈ میں اس سے باتیں کرتی رہی پھر فون

بند کر کے جب وہ سونے کے لیے لیٹی تو بہت سارے سہانے سنے اس کی آنکھوں میں تیر رہے تھے۔

رات کا آخری پہر شروع ہوئے کوئی اتنا زیادہ وقت نہیں ہوا تھا۔ پوش کالونی میں گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا میرتی قمقمے روشن تھے اور سڑکیں

سنسان تھیں۔ کالونی میں چند سیکورٹی گارڈ مختلف جگہوں پر منتعین تھے۔ ایسے میں ایک کار بنگلے کے سامنے ڈکی اور اس نے ہارن دیا۔ اگلے ہی لمحے

گیٹ کھل گیا۔ گاڑی سیدھی پورچ میں جا کر رکی۔ اس میں سے پہلے ڈاکٹر جمیل باہر آیا جس کے ساتھ ہی ایک سیاہ پوش بھی باہر نکلا اور دونوں ایک

ساتھ جڑے ہوئے اندر کی جانب چل پڑے۔ ڈرائنگ روم میں پہنچتے ہی سیاہ پوش نے اپنا ریو اور ڈاکٹر جمیل کے پہلو سے ہٹا لیا۔

"کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو۔۔۔؟" ڈاکٹر جمیل کی تھرائی ہوئی آواز نکلی جس میں خوف گھلا ہوا تھا۔

"میں کون ہوں یہ جاننے کی تمہیں ضرورت نہیں۔ میں جو تمہارے ساتھ کرنے آیا ہوں تمہیں صرف اسی پر دھیان دینا ہے۔" جمیل نے

انتہائی جھل سے سرد لہجے میں کہا۔

"کیا۔۔۔ چاہتے ہو تم۔۔۔ کیا کرو گے۔۔۔؟" ڈاکٹر نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"میں چاہتا تو تمہیں کالونی سے باہر ہی کہیں راتے میں قتل کر دیتا وہ میرے لیے زیادہ آسان تھا۔ میں یہاں تمہیں کچھ سمجھانے آیا ہوں۔

تعاون کرو گے تو تمہیں قتل کیے بنا چلا جاؤں گا ورنہ اس ریو اور سے نقلی ہوئی گولی کسی بھی وقت تمہارے جسم کو چھید سکتی ہے۔" وہ دوجہرے سے بولا۔

”سمجھانے آئے ہو۔۔۔؟“ ڈاکٹر بے چینی سے بولا۔

”ہاں لیکن میرا انداز کچھ الگ سے ہیں۔۔۔ اٹھو اپنے بیڈروم تک چلو۔“

”دیکھو میں رقم اپنے گھر میں نہیں رکھتا۔ زیورات بھی لا کر میں ہیں۔ تمہیں یہاں سے کچھ اتنا زیادہ نہیں ملے گا۔ تم نے جو لوٹنا ہے وہ لو اور

چلے جاؤ۔۔۔“ اُس نے جنید کے چہرے کی طرف دیکھا جو نقاب میں تھا۔ شاید وہ اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

”تم میرے نہیں مانو گے۔۔۔“ یہ کہتے ہوئے اُس نے زوردار انداز میں اُس کے چہرے پر تھپڑ مار دیا۔ جس سے اُلٹ کر وہ صوفے پر جا

پڑا۔ ڈاکٹر کا جو تھوڑا بہت اعتماد بحال ہو چکا تھا وہ ختم ہو کر رہ گیا۔ اُس کی آنکھوں سے خوف چھلکنے لگا۔ جنید نے اُسے گریبان سے پکڑ کر اٹھایا تو ڈاکٹر کا

جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ ”چلنے ہو یا۔۔۔؟“

اُس کے یوں کہنے پر ڈاکٹر بنا کچھ کہے آگے بڑھ گیا۔ وہ دھیرے دھیرے سیزر حیاں چڑھنے لگا یہاں تک کہ وہ اپنے بیڈروم کے سامنے آ

زکا۔ اُس نے دھیرے سے دروازہ کھولا۔ کمرے میں مدہم لائٹ تھی اور سامنے بیڈ پر اُس کی بیوی سو رہی تھی۔ جنید نے ریوٹور کا دستہ ڈاکٹر کے سر پر

دے مارا وہ ڈراما سا جھولتا جنید نے اُسے قہام کر زمین پر ڈھیر کر دیا۔ ڈاکٹر کی طرف سے اطمینان کرنے کے بعد اُس نے جیب سے ٹائٹلیون کی ریشی

ٹکالی اور اُس کے ہاتھ باندھ دیئے۔ پھر اُسے گھسیٹتے ہوئے بیڈ کے پاس لے آیا۔ اُس کی بیوی اطمینان سے سو رہی تھی۔ جنید نے کپڑوں کی الماری

کھولی اور اس سے اپنے مطلب کے کچھ ایسے کپڑے نکالے جن سے وہ اُس کی بیوی کو باندھ سکے۔ چند لمحوں کی کوشش کے بعد اسے مطلوبہ رد مال اور

چادریں مل گئیں۔ جنید نے اُس کی بیوی کو بھی باندھ دیا۔ وہ حیران تھا کہ اُس کی بیوی کس طرح بے ہوشوں کی مانند سو رہی ہے۔ انہیں وہیں چھوڑ کر وہ

کمرے سے باہر نکلا اور دوسرے کمرے میں چلا گیا جہاں ڈاکٹر جمیل کی بیٹی سو رہی تھی۔ جس وقت جنید نے اُسے ہاتھ لگا یا وہ جاگ گئی اور اُسے دیکھتے

ہی خوف زدہ انداز میں چختا جا ہا مگر جنید نے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور اُسے باندھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اُس نے اچھی خاصی مزاحمت کی لیکن

آخر کار وہ اُسے باندھنے میں کامیاب ہو گیا پھر اُسے لے کر ڈاکٹر کے بیڈروم میں آ گیا اور اُسے بیڈ پر پھینک دیا۔ وہ خوف بھری نگاہوں سے اُسے

دیکھ رہی تھی۔ ڈاکٹر ابھی تک بے ہوش پڑا تھا جبکہ اُس کی بیوی کی آنکھیں یوں شمارا لگو تھیں جیسے وہ جاگتا جا رہی ہو لیکن آنکھیں نہ کھل رہی ہوں۔

جنید نے سائینڈ ٹیبل پر دھرا ہوا پانی کا جگ اٹھایا اور ڈاکٹر پر اُلٹ دیا۔ وہ کراہتا ہوا اٹھ گیا۔ اُس کی آنکھوں میں خوف کے سائے تھے لیکن جیسے ہی

اُس نے اپنی بیوی اور بیٹی کو بندھا ہوا دیکھا وہ وحشت زدہ سا ہو گیا۔ اُس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ جنید نے کہا۔

”خاموش! صرف میری سنو۔ جب کوئی بات پوچھوں تب جواب دینا۔“ یہ کہہ کر وہ بھی ماں بیٹی کے پاس بیڈ پر ہی بیٹھ گیا اور بولا۔ ”میں

نے تمہیں کہا تھا کہ اگر میں نے تمہیں قتل ہی کرنا ہوتا تو اب سے کچھ دیر پہلے ہی کر دیا ہوتا۔ یہاں لا کر ایسا منظر دکھانے کا آخر میرا مقصد کیا ہے یہ نہیں

پوچھو گے؟“

”ک کیا مطلب ہے تمہارا۔۔۔؟“

”بہت واضح۔۔۔ میں اگر اس وقت تمہاری نگاہوں کے سامنے تمہاری بیٹی کو کپڑوں سے آزاد کروں تو کیسا لگے گا۔۔۔؟“ اُس نے کہا

تو یہی کی آنکھیں کل گئیں۔ وہ بھی وحشت زدہ ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”تم۔۔۔ تم ایسا نہیں کر سکتے۔“

”کیوں نہیں کر سکتا؟ اس وقت یہ میرے اختیار میں ہے۔ چلو میں ایسا نہیں کرتا۔ تمہاری بیوی۔“

”خدا کے لیے مجھے بتاؤ تم چاہتے کیا ہو۔؟“

”میں کیا چاہتا ہوں۔ یہ اسی وقت پتہ چلے گا۔“ کہ پہلے تمہاری بیٹی یا بیوی۔“

”یہ ظلم مت کرو۔۔۔ بتاؤ؟“

وہ اونچی آواز میں بولا تو جنید نے پھر ایک تھپڑ اس کے منہ پر جڑ دیا اور کہا۔

”میں نے یہ سب اس لیے نہیں کیا کہ میں تمہیں آسانی سے چھوڑ دوں۔ بتاؤ پہلے بیٹی یا بیوی۔؟“

اس پر اس کی بیٹی سر مارنے لگی وہ چارہ رہی تھی کہ اس کا منہ کھول دیا جائے لیکن جنید نے اس کی بیوی کا منہ کھول دیا۔

”تم ایسا کیوں چاہ رہے ہو اس کے سامنے۔“ اس نے اپنے شوہر کو طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں اس کے سامنے۔۔۔“

”کیوں کیوں۔۔۔؟“ ڈاکٹر تیزی سے بولا۔ ”تم یوں کسی کی عزت پا مال نہیں کر سکتے۔“

”اور ان کی کوئی عزت نہیں ہوتی جو بے چاری مجبور اور بے بس ہوتی ہیں۔ ان کی کوئی حرمت نہیں ہوتی جن کے ساتھ تم اس عمر میں

مشق لڑانے کی کوشش میں ہو اور اگر وہ تمہاری بات نہیں مانتی ہیں تو انہیں ڈیل وڈسوا کرتے ہو ان پر ظلم کرتے ہو۔“ جنید حد درجہ جذباتی ہو گیا۔

ڈاکٹر کی آنکھیں حیرت اور وحشت سے پھلتی چلی جا رہی تھیں۔ ”میں تمہاری بیٹی کو لے کر جا رہا ہوں۔ میں بھی اس سے مشق لڑاؤں گا اور وہی کچھ کروں

گا جو تم ان مجبور اور بے بس لڑکیوں سے کرتے ہو۔“

”نہیں تم مجھے اتنی بڑی سزا نہیں دے سکتے۔“ ڈاکٹر نے کراہتے ہوئے کہا۔

”یہ نوجوان ٹھیک کہہ رہا ہے۔۔۔“ اس کی بیوی نے اچانک کہا۔ ”یہ تمہارے اعمال کی سزا ہے میں ساری زندگی تمہیں سمجھاتی رہی ہوں

لیکن تم نہیں مانے۔ آخر میں ہار گئی ہوں مبر کیا ہے میں نے۔ دیکھو آج کوئی تمہاری بیٹی کو اٹھانے آ گیا ہے۔“

”میرے اعمال کی سزا مجھے ملنی چاہئے۔“ وہ کراہا۔ ”میں سمجھ گیا ہوں کہ تم کیا چاہتے ہو۔ مجھے گولی مار دو۔“

”اس طرح تو تم ایک بار ہی مر جاؤ گے۔۔۔ تمہیں روز مرنا ہوگا۔ تم جب بھی کسی ایسی لڑکی کو دیکھو گے جس پر تم نے ظلم کیا ہے اس میں

تمہیں اپنی بیٹی دکھائی دے گی۔“ یہ کہتے ہوئے جنید نے اس کی بیٹی کے بازو سے قبضہ چھاڑ دی۔ ”یہ لڑکی اکثر! اسے لے جاؤں یا یہاں تمہارے

سامنے ہی اسے برباد کروں۔“

”مجھے گولی مار دو۔۔۔ خدا کے لیے مجھے گولی مار دو۔۔۔“ ڈاکٹر ہڈ پانی انداز میں چیخا۔

”اس وقت تک نہیں جب تک۔۔۔“ اس نے فخر و ادھر اچھوڑا اور دوسرے بازو سے کیس پھاڑ دی۔

”جو ہونا تھا ہو گیا۔۔۔ پلیز مجھے موقع دو۔ میں آئندہ کبھی ایسا نہیں کروں گا۔ میری بیٹی پر ظلم نہیں کرو۔“

”تمہاری بیٹی آسمان سے اترتی ہے کیا اور وہ کسی کی بیٹیاں نہیں ہیں؟“ یہ کہتے ہوئے اس نے بیٹی کو بازوؤں سے پکڑا اور پیچھے تالین پر پھینک دیا۔ وہ بے حس و حرکت تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ وہ اپنے باپ کے گناہوں کی جینٹ چڑھنے والی ہے اسلئے اس نے ذرا سی بھی مزاحمت نہیں کی۔

”مجھے معاف کر دو۔۔۔ خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔۔۔“ ڈاکٹر کراہے ہوئے مسلسل کہہ رہا تھا۔

”تمہارے جیسے لوگ جو اپنی دولت اور رُجے سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں تا ان کے ساتھ یہی سلوک ہونا چاہئے جو تم لوگ دوسروں کے ساتھ کرتے ہو۔ تم لوگ سوچتے ہی نہیں کہ تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی ہو سکتا ہے۔ کسی مجبور کی زندگی تنگ کرنے والے اسی وقت سمجھتے ہیں جب ان کی زندگی تنگ کر دی جائے۔۔۔ یوں ہی مظلومیوں کو دکھاؤں یا اسے لے جاؤں؟“ جنید یوں بکھر گیا تھا جیسے اس پر کوئی جھوٹی کیفیت طاری ہو گئی ہوگی ہے۔

”کوئی ایسا راستہ ہے جس سے تم مجھے معاف کر سکتے ہو۔۔۔؟“

”ہاں ہے۔۔۔ ابھی فون کرنا اپنے ان بڑوں کو جو تمہارے ساتھ شریک بدم ہیں اور انہیں بتاؤ کہ تمہارے سامنے تمہاری بیٹی کے ساتھ

کیا ہونے والا ہے۔“

”مجھے مارو۔۔۔“

وہ چیخا ہوا آگے بڑھا اور اپنا سر بیڈ پر دے مارا۔ شاید چوٹ بہت زیادہ شدید تھی اس لیے وہ بے ہوش ہو گیا۔ جنید چند لمحوں کے لیے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر چشم زدن میں اٹھا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ وہ وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ وہ بنگلے کی کچھلی طرف گیا اور وہاں سے دیوار پھاڑ کر سڑک پر آ گیا۔ سیکورٹی گارڈز سے بچ کر گھانا اس کے لیے اتنا مشکل نہیں تھا۔ اس کے اندر ایک امینان اتر آیا تھا اسے پورا یقین تھا کہ جس طرح اس نے ڈاکٹر کو اس کے گمرہ الوں کے سامنے ڈسبل کر دیا ہے وہ یا تو خوشی کر لے گا یا پھر ساری زندگی تک اسے نہیں اٹھائے گا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ کچھ لوگ بے غیرت قسم کے ہوتے ہیں۔ اگر ڈاکٹر ان میں سے ہوا تو وہ اسے گولی مار دے گا۔ یہی سوچتے ہوئے وہ اندھیرے کی جانب بڑھتا چلا گیا۔ جس طرح وہ کالونی سے باہر جانے کے لیے قدم بڑھا رہا تھا اس کے اندر اٹھا ہوا طوفان کم ہوتا چلا گیا۔ اس نے تھوڑے دیکھا راجیلہ کی آنسو بھری آنکھوں میں خوشی بھر گئی تھی۔ وہ چہرہ جس پر خوف کے سائے مسلط تھے ان پر امید کے دیے روشن ہو گئے تھے۔ اسے یوں لگا جیسے پہلی بار اس نے بہت اچھا کام کیا ہو۔۔۔ جنید کے اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔

☆☆

ہالیوں کی آنکھوں سے نیند اڑ چکی تھی۔ وہ ساری رات یہی سوچ رہا تھا کہ آخر وہ کس سمت چل پڑا ہے۔ اگرچہ منیہ کا حصول اس کی زندگی کا سب سے بڑا مستعد بن چکا تھا لیکن پھر بھی وہ اس کے معاملے میں اتنا یوں کیوں ہے؟۔۔۔ اسے جنید کی کہی ہوئی بات یاد آ رہی تھی کہ جب

عشق کا ہے عشق بتا

تک وہ اس معیار کا دولت مند ہوگا اس وقت تک مصفیہ کو تھوڑا سا لالہ چاچکا ہوگا۔ اُسے یہ احساس تھا کہ جب اُس نے مصفیہ کے حصول کے لیے دولت مند ہونے کا سوچا اور اس راہ پر آ گیا تو دولت بھی آنا شروع ہوگئی تھی لیکن یہ شارٹ کٹ بھی اُسے مصفیہ تک نہیں پہنچا سکتا تھا۔ اچانک اُس کی زندگی میں ایک شور مچا ہوا گیا تھا اتنی آوازیں اُس کے اندر جمع ہوگئی تھیں کہ کسی ایک آواز کی بھی اُسے سمجھ نہیں آتی تھی۔ وہ جب بھی مصفیہ کا تصور کرتا اُس کے اندر اک ہوک اُٹھتی تھی اور یہی ہوک فخر و بین جاتی۔ آوازوں کا شور یوں بڑھتا جیسے کئی سارے لوگ کسی فحش پر ماتم کناں ہوں۔ کوشش کے باوجود بھی کوئی حسین خیال نہیں آتا تھا۔ ایسا اس لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ اس کے لیے ایک لا حاصل خواہش کی مانند بن کر رہ گئی تھی۔۔۔ کیا وہ پار جائے گا؟ یہی ایک سوال تھا جس کا وہ سامنا نہیں کر پاتا تھا۔ وہ اپنے اندر کی عدالت میں ایک مجرم کی سی حیثیت سے آکھڑا ہوتا اور خود ہی فرد جرم سنانے لگتا۔ اُس نے آپ تک جو حوصلے اور جدوجہد کی کہانیاں اور داستانیں پڑھ رکھی تھیں اُسے وہ سب جھوٹ لگتا۔ فقط خواہش وہ وہ چاہے جس قدر رشیدیہ ہو اُس کا کچھ بھی فائدہ نہیں ہوتا جب تک وقت اور حالات سازگار نہ ہوں۔ آج اُس کے پاس ڈیڑھ روٹ دولت ہو تو وہ مصفیہ کو چند دنوں میں رام کر سکتا ہے لیکن دولت کوئی ایسی شے تو نہیں جو اس کی خواہش پر اس کے قدموں میں آجائے۔ وہ خود ہی یہ سارے دلائل دیتا اور بکھرا پنے ہی اندر کے زنداں میں جا کر اندر جبرے کوشے میں بندھ جاتا۔۔۔ "میں نے تمہارے لیے ایک پلان سوچا ہے۔" اُسے جنید کی بات بھرا یا اُس کی تھی مگر کیا کرے گا وہ اپنے پلان کا جس کے کرنے کے بعد بھی وہ مصفیہ کو حاصل نہیں کر پائے گا۔ وہ بھی سوچ سکتا ہے۔ اس کے پاس بھی دماغ ہے لیکن پھر وہی بات کہ اس کے اور مصفیہ کے درمیان دولت ہی حائل ہے۔ ساری رات اُس کے اندر یہی جنگ رہی تھی کہ وہ سب کچھ بھول جائے مصفیہ کو اور اس کے حصول کے لیے جو اُس کا خود سے وعدہ تھا اُسے بھی بھول جائے۔ ایک نازیل زندگی گزارے جیسے ایک عام آدمی زندگی گزارتا ہے۔ اس کے لیے ایک سیدھا سادا راستہ تھا جس پر وہ باآسانی چل سکتا تھا یہی سوچتے ہوئے سوال اُبھرتے کہ کیا پھر بھی وہ مصفیہ کو بھولائے گا؟ من میں موجود خواہش کو کچل کر نکال باہر کر سکے گا؟ اگر وہ ایسا نہیں کر سکتا تو پھر وہ نازیل زندگی بھی نہیں گزار سکتا لیکن اگر وہ مصفیہ کی راہ پر چلتا ہے تو سوائے مایوسی کے اسے کچھ بھی نہیں ملنے والا تھا۔ یہی سوچتے ہوئے اسے ساری رات ہوگئی تھی۔

ہمایوں کو شدید پیاس محسوس ہوئی تو وہ اٹھا اور کچن تک گیا پانی پیا اور واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ جب اُسے خیال آیا کہ جنید نے جو اُسے لقاؤ دیا تھا اس میں موجود رقم اُس نے دیکھی ہی نہیں کم از کم دیکھ تو لے۔ وہ اپنی الماری کی جانب بڑھا وہ لقاؤ اٹھا اور کھول کر دیکھا۔ اس میں ابھی خاصی رقم موجود تھی۔ ایک خوشگوار تاثر اُس کے اندر گھل گیا۔ اُس نے وہ بارہ لقاؤ اسی جگہ رکھ کر الماری بند کر دی اور اپنے پیڈ پر آ کر لیٹ گیا۔

"ساری رات تم نے مایوسی کی باتیں کرتے ہوئے گزار دی ہے۔ کیا فائدہ ہوا؟" جنید بھی گھوٹائی؟

"میں نے جان کے نیند نہیں گھوٹائی سوچوں میں گھرا رہا ہوں۔ یہ عالم سوچیں جان چھوڑیں گی تو سکون ملے گا نا۔"

"سکون۔۔۔ وہ تو ساری زندگی نہیں مل سکتا۔"

"ارے حالات ایسے ہوں نا تو مل جاتا ہے۔ جب بندے کا وقت ہی نہ اچل رہا ہو تو پھر کسی سے بھی گھر نہیں بنتا۔"

"تم جب تک مایوسی میں سوچتے رہو گے تمہارا کچھ نہیں بن سکتا۔ دیکھو چند دن پہلے تم دولت کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ کتنی

عشق کا ہے عشق بتا

صحت کی ہے تم نے اور تم اپنی دولت کے مالک ہو جو کبھی تم نے دیکھی بھی نہیں تھی اور یہ کیا تم نے وقت اور حالات کی زت نگار مگی ہے یہ مایوس اور بزدل لوگوں کا کام ہوتا ہے۔“

”میں نے تو بزدل ہوں اور نہ مایوس۔ اگر ایسا ہوتا تو میں بھی دوسرے لوگوں کی طرح ڈر کر کچھ بھی نہ کرتا۔ مجھ میں حوصلہ ہے میں دولت اکٹھی کر سکتا ہوں۔“

”تو میری جان! اس طرح حالات کو بھی اپنی دسترس میں لے سکتے ہو۔ سارے کام دولت سے نہیں ہوتے کچھ کام ایسے ہوتے ہیں جہاں عقل استعمال کرنا پڑتی ہے۔“

”ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔ جنیڈ کو اگر دوسرے استعمال کر سکتے ہیں تو میں کیوں نہیں۔ جس طرح اُس نے مجھے استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔ دولت کے عوض تو میں اُسے جذبات کی مار دوں گا دوستی بناؤں گا اُس سے۔۔۔ مجھے صرف اسی پر اتکا نہیں کرنا چاہئے اس جیسے چوٹیں کتنے ہوں گے۔“

”تم بالکل غلط ٹریک پر سوچ رہے ہو اُسے بھرمانہ ذہنیت کہتے ہیں۔ تم ایک معزز پیشے سے وابستہ ہو اور۔۔۔“

”ہر پیشہ معزز ہے۔ چاہے کوئی بازار میں بیٹھ کر جوتے کا نکھتا ہو یا پھر انسانی زندگی کو بچانا۔۔۔ پیشہ نہیں ہوتا لیکن اس کی آڑ میں جو ظلم کرتے ہیں وہ وہی غلط ہے۔ آج کا ساج اگر ایسا ہے اور اس سلاب میں اگر میں بھی بہ جاؤں تو کیا ہے مجھے اپنی زندگی مانا چاہئے۔“

”یہ خود غرضی ہے۔ تم اگر ساج میں بگاڑ کا باعث نہیں بن رہے ہو تو یہ بھی ایک طرح سے بھلائی ہے۔“

”مجھے ساج کی باتیں مت بتاؤ۔ میں نے اچھائی کے لیے ظلم کے خلاف آواز اٹھائی تو میرے ساتھ کیا ہوا؟ میرے باپ کے پاس دولت نہیں ہے تو رشتے ناتے احسانات اور سب کچھ ختم۔ ہماری وجہ سے ان کی بے عزتی ہوتی ہے۔ ہمارے ساتھ ہی کیوں جواب ہے کوئی تمہارے پاس؟“

”تو پھر تمہارا جو تہی جا ہے کرو۔“

”ہاں میں کروں گا۔ میں وقت اور حالات کو اپنی دسترس میں کروں گا۔ میں وہ سب کچھ کروں گا جو میرا تہی جا ہے گا۔“

”کیا یہ تمہارا حتمی فیصلہ ہے۔؟“

”ہاں یہ میرا حتمی فیصلہ ہے۔ میں نہیں ڈروں گا۔ جو میرے معاشرے نے مجھے دیا ہے میں اسے وہی کچھ لوٹاؤں گا۔“

اُس نے جواہا کہا تو پھر اس کے جواب میں اُس کے اندر سے کوئی آواز نہ ابھری۔ وہ جو ساری رات قنوطیت زدہ سوچیں سوچ رہا تھا اُس نے مایوسی کو بھٹک کر پرے پھینک دیا تھا۔ اُس نے خود کو ہلکا پھلکا محسوس کیا تو مسکرا دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اب اُس کے لیے ون رات کا فرق مٹ چکا تھا۔

☆☆

صبح ہو چکی تھی۔ اُبھرتے ہوئے آفتاب نے دھرتی پر روشنی پھیلا دی تھی۔ راحیلہ اپنی ڈیوٹی پر آن موجود ہوئی تھی۔ رات دیر تک جاگتے رہنے کا خمیر اُس کی آنکھوں میں تھا لیکن پھر بھی وہ پورے ہوش و حواس کے ساتھ اپنی ڈیوٹی دے رہی تھی۔ اس وقت اُس کی ڈیوٹی پرائیویٹ واڈز میں تھی۔ وہ مریضوں کو میڈیسن دینے کے لیے اپنی ساتھی نرس کے ساتھ تھی۔ ایک کمرے میں داخل ہوئی تو ایک ادھیڑ عمر خاتون سے سامنا ہوا جو آنکھیں بند کیے لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی آمد کا احساس کر کے خاتون نے آنکھیں کھول دیں تو راحیلہ نے اُس پر نگاہ پڑتے ہی بے اختیار سوچا کہ میری ماں بھی اتنی عمر کی ہے اور اسی طرح دکھائی دیتی ہے۔ راحیلہ کے سن میں ماں کا خیال آیا تو چند لمحوں کے لیے وہ خود سے غافل ہو گئی۔۔۔ نجانے اس وقت میری ماں کیا کر رہی ہوگی۔“ اس خیال کے ساتھ ہی اُس کا دل بھر آیا۔ اس وقت تک وہ خاتون کے پاس پہنچ چکی تھی تب اُس نے خاتون کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

”کیسی ہیں آپ۔۔۔؟“

اُسے اپنا ہی لہجہ اچھی لگا۔ اُسے یوں لگا جیسے وہ اپنی ماں کے ساتھ اپنا سیت بھرے احساس کے ساتھ بات کر رہی ہے۔ اس پر خاتون نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے بولی۔

”میں ٹھیک ہوں۔۔۔“

”بہت اچھا۔۔۔“ یہ کہتے ہوئے اُس نے سائڈ ٹیبل پر پڑا ہوا چارٹ اٹھایا اور اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”آپ زیتون بی بی۔۔۔“

”جی۔۔۔“

اُس نے جواب دیا تو راحیلہ نے میڈیسن لیس اور زیتون بی بی کے ہاتھ پر رکھ دیں۔ اسے پانی کی ضرورت تھی راحیلہ نے قریب پڑے کٹر میں سے پانی دیتے ہوئے پوچھا۔

”آپ کے ساتھ کوئی نہیں ہے۔۔۔؟“

”ہے میری بیٹی، میں کٹن باہر ہوگی۔“

زیتون بی بی نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے میڈیسن پھا تک لیس اور پھر چند گھنٹہ پانی پی کر گلاس واپس کر دیا۔ راحیلہ چارٹ پر لکھنے میں مصروف ہو گئی تو دوسری نرس نے انکیشن لگا دیا۔

”بی بی! میں کب یہاں سے جا سکوں گی۔ میں ٹھیک ہوں اب۔۔۔“ زیتون بی بی نے پوچھا۔

”اماں جی! یہ بات میں آپ کو کیسے بتا سکتی ہوں یہ تو اکثر ہی بتا سکیں گے وہ ماؤنٹر پر آئیں تو ان سے پوچھ لیجئے گا۔“ راحیلہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”دیے تو آپ ٹھیک ہیں، ممکن ہے کہ آج ہی آپ گھر چلی جائیں۔“ اُس نے حوصلہ دیا۔

”تم مجھے اچھی لگی ہو۔ میں آج چلی گئی تو پھر تم سے ملاقات نہیں ہوگی۔“

”۔۔۔ اور اگر آپ ادھر رہیں تو میں آپ سے کپ شپ کرنے آ جاؤں گی۔“ راحیلہ نے ہنستے ہوئے کہا اور واپس چارٹ رکھتے ہوئے

باہر جانے لگی۔

”سنو! تم کیا واقعی میرے پاس کچھ دیر بیٹھ سکتی ہو؟“ زیتون بی بی نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”جی ہاں! لیکن دوسرے مریضوں کو دیکھنے کے بعد۔“

”میں تمہارا انتظار کروں گی۔“

زیتون بی بی نے کہا اور آنکھیں بند کر لیں۔ راحیلہ وہیں جا رہی تھی تو مسلمی کمرے میں داخل ہوئی۔

”امی کو میڈیسن دے دیں آپ نے۔“

”دے دیں! لیکن آپ ان کا دھیان رکھئے۔“

راحیلہ نے کہا اور باہر چلی گئی۔

وہ عام حالات میں اتنی باتیں نہیں کیا کرتی تھی لیکن نبھانے کیوں وہ اس دن بھی مریضوں سے اسی طرح بات کرتی رہی۔ شاید وہ اپنے اندر کے کسی خوف کو دور کرنا چاہ رہی تھی یا خود کو بہلا رہی تھی۔ جنید سے باتیں کرنے کے بعد اسے بہت حوصلہ ہوا تھا شاید وہ لاشعوری طور پر کسی منتہی نتیجے کا انتظار کر رہی تھی۔ ڈیوٹی پر سٹیشن فون لانا منع تھا لیکن اس دن وہ اپنے ساتھ لے آئی تھی اور اسے ”خاموشی“ پر لگا کر چھپا لیا تھا۔ اسے پوری اُمید تھی کہ جنید کا فون ضرور آئے گا! انہی خیالات اور احساسات کے ساتھ وہ ہر کمرے میں جاتی، خوشگوار باتیں کرتی ہوئی وہاں اس جگہ آگئی جہاں نرسز بیٹھی تھیں۔ ان کا کام تقریباً ختم ہو گیا تھا۔ اب کسی ایمر جنسی کی صورت میں مریض کو دیکھنے یا پھر گپ شپ کے علاوہ انہیں کوئی اور کام نہیں تھا مگر اس دن راحیلہ کو باتوں میں محروم نہیں آ رہا تھا۔ وہ خیالوں ہی خیالوں میں بھی جنید کی طرف دھیان دے دیتی اور کبھی اپنی ماں کی یاد سے آجاتی۔ اس دن نبھانے سے اپنی ماں اس شدت سے کیوں یاد آ رہی تھی شاید اس کی ہچڑھتوں بی بی تھی جو اس کی ماں سے بہت حد تک مشابہ تھی۔ اس نے سوچا کہ جب ڈاکٹر راؤ ڈنڈ کر جائیں گے تو پھر وہ کچھ دیر کے لیے اس کے پاس ضرور جائے گی۔ وہ انہی خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ اچانک اسے داخلی راستے پر ڈاکٹر جمیل دکھائی دیا اس کے ساتھ بیگم شیم کی تھی۔ دونوں نے دور ہی سے اسے دیکھا اور پھر جیڑھتوں سے اس کی جانب آنے لگے۔ ڈاکٹر جمیل اور بیگم شیم کی آمد کوئی معمول کی بات نہیں تھی۔ پہلی بات تو یہ کہ ان کا اکٹھے ہونا ہی غیر معمولی تھا اور پھر یوں آنا کسی طوفان کا پیش خیمہ ہی ہو سکتا تھا۔ بلاشبہ اس کی ساتھی نرسز کو راحیلہ کے بارے میں سب معلوم تھا اس لیے وہ اپنے چہرہ پر سوالیہ نشان لینے ان دونوں کی جانب دیکھ رہی تھیں۔ راحیلہ کی نگاہیں بھی ان دونوں پر تھیں۔ ڈاکٹر جمیل نے تو اپنی ڈیوٹی پر آنا تھا ساتھ میں بیگم شیم کا آنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ یہ وہی تھی جس نے اسے انجام اچھا نہ ہونے کے بارے میں دھمکیاں دیں تھیں۔ راحیلہ ہر طرح سے اپنا ذہن بنا چکی تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اس نے اپنی عزت کی لاج رکھنی ہے ہاتی سب کچھ چاہے اس سے چھین لیا جائے۔ جب انسان کوئی حتمی فیصلہ کر لیتا ہے اور اس فیصلے پر لٹ جانے کا اس میں حوصلہ بھی ہو تو وہ بے خوف ہو جاتا ہے۔ ایسی ہی کیفیت اس وقت راحیلہ کی بھی تھی۔ چند قدم کا فاصلہ تھا جو دونوں ملے کر کے اس کے پاس آچکے تھے۔ ڈاکٹر جمیل آگے تھا اور بیگم شیم اس سے ایک قدم پیچھے تھی ڈاکٹر جمیل نے اس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

”راحیلہ تم ذرا میری بھڑک آؤ تم سے کچھ بات کرنی ہے۔“

اس کا لہجہ اگرچہ عام سا تھا لیکن اس میں خوف کی تھر تھراہٹ واضح تھی۔ اس پر راحیلہ نے چمک کر اس کی جانب دیکھا اور نفرت سے

بولی۔

”ویسی ہی باتیں ہمیں تم روزانہ کرتے ہو۔ دوستی پیار محبت کی باتیں اپنی پہنچ کے بارے میں معلومات کوئی ہی دھمکی یا بھراؤ کوئی نیا

سبز باغ دکھانا چاہتے ہو؟“ اس کے لہجے میں گویا آگ بھری ہوئی تھی۔

”نہیں نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ تم آؤ تو بتانا ہوں نا۔“ وہ گھبراتے ہوئے بولا یا شاہد دوسری نرس بھی یہ سب سن رہی تھیں۔

”تمہیں بتاؤ کیا بتانا چاہتے ہو اور یہ جو میڈم آپ کے ساتھ آئی ہیں ضرور کوئی ہی دھمکی دیں گی مجھے۔۔۔ ان سب کے سامنے دیں مجھے

دھمکی تاکہ یہ بھی خوف زدہ ہو جائیں یہ بھی وہی کچھ کریں جو تم جیسے لوگ چاہتے ہیں۔“

اس نے نفرت بھری نگاہوں سے بیگم شیم کی طرف دیکھتے ہوئے ڈاکٹر جمیل سے کہا۔ تب بیگم شیم آگے بڑھی اور چار بھرے لہجے میں

بولی۔

”تم غلط سوچ رہی ہو راحیلہ! میں نے تم پر لگے ہوئے الزامات کی تحقیق کی ہے وہ سب غلط ہیں۔ میں تمہیں یہی بتانے آئی تھی کہ تم

آرام سے رہو کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔“

”اتنی جلدی۔۔۔ میڈم! اتنی جلدی تحقیق ہو بھی گئی۔ بہت تیز نیٹ ورک ہے آپ کا، تحقیق کرنے کا یا آپ بھی اس ڈاکٹر کے نیٹ ورک

سے تعلق رکھتی ہیں؟“ راحیلہ جیسے بھڑکی۔

”سنو ٹرکی! اگر تم صاف صاف ہی سننا چاہتی ہو تو۔۔۔“ یہ کہہ کر بیگم شیم نے قدرے ٹھسے میں کہا۔ ”اگر تم پر کوئی الزام لگا بھی ہے تو ڈاکٹر

جمیل کی ہی وجہ سے ختم بھی ہو گیا ہے ورنہ جس ذمہ پر تم بات کر رہی ہو اتنی آگ اگل رہی ہو یہ میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ اگر رہنا ہے تو آرام

سے رہو نہیں رہنا تو مجھے یہاں سے نکالنے کے بہت طریقے آتے ہیں۔“

”تو میڈم آپ وہ طریقے آزما لیں۔“ راحیلہ نے صاف انداز میں نفرت اور ٹھسے بھرے لہجے میں کہا۔

”اؤ نہیں۔ میڈم! آپ چھوڑیں غصہ۔ یہ لڑکی تو پاگل ہے آپ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں۔“ ڈاکٹر جمیل نے بات بڑھتی دیکھ کر

تیزی سے کہا۔

”یہ آگ تمہی نے لگائی ہے ڈاکٹر جمیل! ورنہ اس جیسی جیو نیٹیاں تو میں ویسے ہی اپنی چنگی میں مسل دوں۔ اس کے پر کلل آئے ہیں تو کیا

ہوا؟“ بیگم شیم کا غصہ ہی ٹھنڈا نہ ہوا۔

”میں بھی جانتی ہوں تم کس ذمہ پر بات کر رہی ہو۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا تاکہ میری جان چلی جائے گی میں مرجاؤں گی کوئی بات نہیں

لیکن کیا تم سلامت رہو گی تمہاری یہ چنگی؟۔۔۔ جاؤ چلی جاؤ اور اپنے طریقے آزماؤ میں بھی دیکھتی ہوں کہ تم کیا کرو گی۔“ راحیلہ نے شدید نفرت سے کہا۔

”میڈم! کیا کر رہی ہیں آپ؟ میں نے آپ سے کیا درخواست کی تھی؟“ چھوڑیں۔ پلیز! آپ میری طرف دیکھیں۔“ ڈاکٹر جمیل منت پر اترا آیا۔

”میں ڈاکٹر صاحب! میں تو اس لڑکی کے بھلے کے لیے کہہ رہی ہوں۔ خود چل کر بتانے آئی ہوں کہ تم پریشان نہ ہو سب ٹھیک ہے جبکہ اس کا حراج ہی آسانوں پر ہے۔ یہ اگر ایک بد معاش پال سکتی ہے تو میرے ہاتھوں میں نبھانے ایسے کتنے بد معاش ہیں۔ اس کی خبر بھی نہ ہوگی کسی کو۔۔۔“ میڈم نے غصے میں کہا! اسے راحیلہ کا رویہ بہت برا لگا تھا۔

”تم میرا بھلا مت چاہو اور اپنے بد معاشوں سے کہہ دو کہ میری خبر تم کرویں! اگر صحت ہے تو۔۔۔“ راحیلہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”راحیلہ کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ جس سے بیگم شمیم ایک دم سے خوف زدہ ہو گئی۔ بلاشبہ وہ ایک گھاک عورت تھی! اس قدر آگ کو وہ سمجھتی تھی۔ وہ تو ڈاکٹر جمیل کے کہنے پر معاملہ رفع دفع کرنے کے لیے ’تھوڑا دبا کر‘ سمجھا کر بات ختم کرنے آئی تھی لیکن راحیلہ کا رد عمل دیکھ کر اسے نہیں لگتا تھا کہ بات معمولی سے اعزاز میں سلجھائی جا سکتی ہے پھر بھی اپنی عزت کا پاس رکھتے ہوئے بولی۔

”ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب! آپ کہتے ہو تو میں اسے چھوڑ دیتی ہوں ورنہ یہ اس قابل ہے نہیں۔ آپ بھی نبھانے کس کس کی سفارشیں کرتے لگ جاتے ہیں۔“

یہ کہہ کر وہ واپس پلٹے گئی تب ڈاکٹر نے کہا۔

”کوئی بات نہیں آپ نے بہر حال کوئی ایکشن نہیں لینا۔۔۔“

”مت کرو سفارشیں ڈاکٹر! یہ نہ ہو کہ میں ابھی تمہارا گریبان پکڑ لوں۔“

راحیلہ نے اس ڈرامہ بازی کو دیکھتے ہوئے زخمی شیرینی کی مانند کہا تو ڈاکٹر جمیل ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

”میں تمہارا مجرم ہوں راحیلہ! مجھے معاف کر دو۔ آئندہ کبھی کوئی بات نہیں ہوگی یہ چند سنیے تم میری شکل بھی نہیں دیکھو گی، تمہیں جو تکلیف اور اذیت ہوئی نہیں اس پر معذرت خواہ ہوں۔“

”میں تمہیں معاف نہیں کروں گی۔۔۔ ہاں! اگر تم اپنی شکل نہ دکھاؤ تو میں اپنی نفرت اپنے سینے ہی میں دہالوں گی! سمجھا لینا اپنے پیسے دوسروں کی بھی۔“

اس نے آخری فقرہ کہتے ہوئے بیگم شمیم کی جانب دیکھا جس کے تھلانے کے اثرات اس کے چہرے پر واضح تو ہوئے لیکن وہ بولی کچھ نہیں پھر ڈاکٹر واپس پلٹ گیا۔ بیگم شمیم بھی اس کے پیچھے ہی چل دی۔ وہ دونوں چند قدم ہی بڑھے تھے اور راحیلہ اپنے آپ میں آ رہی تھی کہ اس کی نگاہ ذرا سے فاصلے پر کھڑی زینون بی بی پر پڑی جو اس کی جانب بہت غور سے دیکھ رہی تھی! نبھانے وہ کب آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

”آپ۔۔۔ آپ کب آئیں؟“ راحیلہ نے اس کی جانب بڑھتے ہوئے پوچھا۔

”ابھی کچھ دیر پہلے بی بی۔۔۔! زینون بی بی نے یوں کہا جیسے وہ خود خیالوں میں کھوئی ہوئی ہو اور اس سے بات کر رہی ہو۔“

”فرمائیے میں کیا خدمت کر سکتی ہوں؟“ راحیلہ نے پوچھا۔

”میں اپنے گھر جا رہی تھی۔ سوچا تم سے ملتی جاؤں لیکن یہاں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ زک گئی پھر ویرے سے اٹھتے ہوئے بولی۔

”تھوڑی دیر پہلے تمہارا زوپ اتنا اچھا لہجہ جس نے مجھے یہاں تک آنے پر مجبور کر دیا اور اب ان دونوں سے اسکی باتیں۔۔۔ یہ کیا ہے بیٹی؟“

اُس کے یوں کہنے پر راحیلہ کا من ایک دم سے بھر گیا۔ اُسے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اُس کی ماں اس کے سامنے آ کر اُس سے پوچھ رہی ہو۔ اُس کا دل چاہا کہ زینون بی بی کے گلے لگ کے ساری بات کہہ دے اپنے من کا سارا بوجھ اتار چکے۔ ماں کے گلے لگ کر اپنا دکھ کہہ دینا کتنا سکون بخش ہوتا ہے۔ یہ وہی جان سکتے ہیں جن کی مائیں ہوں اور اُن ماؤں کا اتنا حوصلہ ہو کہ وہ سارے دکھ اپنے دامن میں سمیٹ لیں۔ راحیلہ کی ماں تو ویسے ہی دکھوں بھری زندگی گزار رہی تھی وہ چاہے ہوئے بھی اپنے دکھ اُسے نہیں بتا سکتی تھی۔

”کیا بات ہے بیٹی۔۔۔؟“

زینون بی بی نے پھر پوچھا تو وہ چونک کر اپنے آپ میں آ گئی۔ وہ لہجوں میں نجانے کہاں سے کہاں جا پہنچی تھی۔ اُس نے اپنی آنکھوں میں نمی محسوس کی اُسے زینون بی بی کا چہرہ دُعا دلا دکھائی دیا تھا۔

”کوئی بات نہیں نا جی اِس جی رومی۔“ راحیلہ نے ویرے سے کہا اور جھلی کی پشت سے اپنی آنکھیں پونچھ لیں۔

”چلو اپنا دکھ مجھے نہ بتاؤ لیکن ایک وعدہ کرو مجھ سے۔“ زینون بی بی نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”ہاں۔۔۔؟“ راحیلہ نے اشتیاق سے کہا۔

”مجھ سے ملنے ضرور آؤ گی جب بھی میں تمہیں بلاؤں۔“ زینون بی بی نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

”جی ضرور۔۔۔ میں آپ کو اپنے فون نمبر دے دیتی ہوں۔“

راحیلہ نے اُس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر ایک چھوٹے سے کاغذ پر اپنا نام اور نمبر لکھ کر اُس کی جانب بڑھا دیا۔ زینون بی بی نے وہ لیا اور ایک گہری نگاہ ڈالتے ہوئے واپس پلٹ گئی جیسی اُس کی ساتھی نرس نے کہا۔

”راحیلہ! تم نے تو کمال کر دیا۔ بیڈ انکڑ اور میڈم۔ کیا جاؤ کیا ان پر۔۔۔؟“

”بھرا کوئی جاؤ نہیں ہے۔“

راحیلہ نے کہا اور اپنے ہی خیالوں میں کھوئی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ایک دم سے اُس کے دماغ میں اتنے خیالوں نے پورش کر دی تھی کہ اُسے سمجھ ہی نہ آئی کہ وہ کس پر سوچے؟ اسی لیے سارے ہی خیالوں کو ذہن سے نکال کر وہ یوں سمٹ کر بیٹھ گئی جیسے اس پوری دُنیا سے لاقاطع ہو گئی ہو۔

☆☆

اگرچہ تیمور سے بات کر کے صنفی کچھ مطمئن ہو گئی تھی نجانے اُسے پوری طرح یقین کیوں نہیں آ رہا تھا۔ اُسے صرف تیمور کے خاندان سے خوف تھا۔ اگر انہوں نے ہی اُسے قبول نہ کیا تو پھر کیا فائدہ ہے تیمور کی ہو جانے کا؟ مان لیا کہ اُس کا تھوڑا بہت بزنس ہے لیکن اتنا نہیں جتنا وہ اپنے

عشق کا ہے عشق بتا

خوابوں میں دیکھتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے ذہن میں یہ سوچ پروان چڑھ رہی تھی کہ اگر اس کے خاندان سے اُسے قبول نہ کیا تو ان دونوں کو ایک نئے سرے سے ذمگی کی شروعات کرنا ہوں گی جس کے لیے انہیں بڑی جدوجہد کرنا پڑے گی۔ مگر یہ ایک طرح سے ٹھیک بھی تھا اُسے اپنا آپ منوانے کا بہت اچھا موقع مل جائے گا۔ اس دن کالج سے آ کر منیہ! انہی سوچوں میں کھوئی رہی تھی لیکن وہ کسی منطقی فیصلے پر نہیں پہنچ سکی تھی۔ سارا دن کالج میں انہی سوچوں میں گھری وہ واپس گھر آ گئی۔ اُسے یہ جان کر خوشی ہوئی تھی کہ ماما ہسپتال سے گھر واپس آ گئی ہیں۔

”ماما! کیسی طبیعت ہے آپ کی۔۔۔؟“ اُس نے ڈرائنگ روم میں بیٹھی زینون بی بی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ٹھیک ہوں۔۔۔“ اُس نے وچیرے سے جواب دیا۔

”اما! آپ مجھے سمجھنے کی کوشش کریں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا آپ ذرا بھی پریشان نہ ہوں۔“ وہ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے وچیرے

سے بولی۔

”بی بی! تم جانو اور تمہارا باپ! آپ میں تمہارے کسی بھی معاملے میں نہیں آؤں گی۔“ ماما نے بھی وچیرے سے کہا۔

”تو آپ ناراض ہیں؟“ اُس نے پوچھا۔

”ناراض تو انہوں سے ہوا جاتا ہے تم نے ثابت کر دیا ہے کہ تم میری بیٹی نہیں ہو۔“ ماما نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے لرزتے لہجے میں

کہا۔

سی ٹاپ

سی ٹاپ۔ منظرِ کلیم کی عمران سیریز کا ایک ناول ہے جس میں پاکیشیا کا ایک انتہائی اہم سائنسی فارمولا ہدپ کی مجرم تنظیم کے ہاتھ لگ گیا ہے جسے خریدنے کے لئے امریکہ، یورپ اور اسرائیل سمیت تقریباً تمام سپر پاورز نے اس مجرم تنظیم سے مذاکرات شروع کر دیئے۔ گو یہ مجرم تنظیم عام بد معاشوں اور فنڈوں پر مشتمل تھی لیکن اس کے باوجود تمام سپر پاورز اس تنظیم سے فارمولا حاصل کرنے کے لئے اسے بھاری رقم دینے پر آمادہ تھیں حتیٰ کہ عمران اور پاکیشیا سیکرٹ سروس کو بھی اس فارمولے کے حصول کے لئے اس تنظیم سے ہار بار سودے بازی کرنا پڑی اور بھاری رقم دینے کے باوجود فارمولا حاصل کرنے میں ناکام رہی۔ اس کے باوجود وہ اسے مزید قوت دینے پر مجبور ہو جاتی تھی۔ ایسا کیوں ہوا۔ کیا عمران اور پاکیشیا سیکرٹ سروس ایک عام سی مجرم تنظیم کے مقابل بے بس ہو گئے تھے؟ ہر لحاظ سے ایک منفرد کہانی، جس میں پیش آنے والے حیرت انگیز واقعات کے ساتھ ساتھ تیز رفتار ایکشن اور بے پناہ سٹینس نے اسے مزید منفرد اور متاثر بنا دیا ہے۔ **سی ٹاپ** کتاب گھر پر دستیاب۔ نئے ناول سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

”ماما! یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ۔۔۔؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں بیٹی! ارشے احترام کے ہوتے ہیں مان ہو تو یہ قائم رہتے ہیں ورنہ یہ کپے دھاگے کی مانند ٹوٹ جاتے ہیں۔ یہ ارشے تحفظ کا احساس دیتے ہیں نرم اور عشق ہی چھاؤں ہوتے ہیں اور جب یہی میسر نہ ہو تو گھر ارشے نہیں ہوتے“ بس مجبور ہاں ہوتی ہیں۔ ”ماما نے یوں کہا جیسے یہ سب کہتے ہوئے اسے بہت دکھ ہوا ہو۔

”آپ اس طرح کیوں سوچتی ہیں؟۔۔۔ میں آپ کی بیٹی ہوں۔ ہم دونوں بھی چاہیں تو اس سے انکار نہیں کر سکتے تو پھر اس قدر سختی کیوں؟“ وہ رو ہانسو ہوتے ہوئے بولی۔

”میں تم سے بحث نہیں چاہتی“ منیہ! ہاں یہ چاہوں گی کہ تم مجھے تباہ چھوڑ دو۔“

ماما نے اُجسبت بھرے لہجے میں کہا تو منیہ اس کی طرف حیرت سے دیکھتی رہ گئی۔ چند لمحے وہ یونہی ساکت سی رہی پھر اٹھ کر تیزی سے اپنے کمرے کی جانب چلی گئی۔

ماما کے رویے نے اُسے بہت دکھ دیا تھا۔ وہ ایک دم سے اچنبھی ہو گئی تھی جیسے ان کی کوئی لفظی عین نہ ہو یہاں تک کہ اُس نے اپنی بیٹی ماننے سے انکار کر دیا ہے۔ منیہ کی کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں غلط ہے؟۔۔۔ ماں کے خدشات اپنی جگہ“ لیکن اُس نے کچھ بھی لفظ نہیں کیا تھا۔

اگر وہ اپنی زندگی بنانے کے لیے جدوجہد کر رہی ہے تو اس کی حوصلہ افزائی ہونی چاہئے۔ وہ اُس کی ماں ہے۔ اُسے سمجھنا چاہئے کہ جسے میں پسند نہیں کرتی ہوں جس سے نفرت ہے مجھے تو پھر بار بار اسی کا ذکر کیوں کرتی ہیں۔ اس کی اپنی سوچ ہے زندگی گزارنے کے بارے میں اس کا اپنا نظریہ ہے۔ بدلتے ہوئے زمانے میں کس طرح زندگی گزارنا ہوگی یہ انہیں نہیں معلوم۔ وہ تو اپنی گزار چکی ہیں انہیں تو اپنی اُمی روایات کے بارے میں

معلوم ہے جس زمانے میں وہ جی رہی تھیں۔ اب وہی سب کچھ مجھ پر مسلط کرنا چاہیں تو میں اسے کیسے قبول کر لوں؟ گھر کی چار دیواری میں رہنے والی ماں کو کیا معلوم کہ دنیا کے ساتھ چلنے کے لیے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے۔۔۔ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایسی زندگی گزارے کہ جس طرح عام لڑکیاں

پہلے تو چھاپر ملنے کی امید میں تنگی رہتی ہیں اور پھر جیسا بھی گھر مل جائے اسی کو بھاننے کے چکر میں اپنے آپ پر جبر کرتی ہوئی زندگی گزارتی ہیں۔ وہ ایسی زندگی گزارنے کی قائل ہی نہیں تھی جس میں دوسروں کا دست بگر ہنا پڑے۔ وہ زندگی میں جدوجہد کی قائل تھی یہاں تک کہ وہ دوسروں کو اپنا

دست بگر بنالے۔ اُسے اپنے ہونے کا پوری طرح احساس تھا۔ اگرچہ اس کے پاس نوٹوں کی دولت بہت زیادہ نہیں تھی لیکن حسن کی دولت تو اس کے پاس تھی جس سے وہ ہر ممکن حد تک فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔ تیمور اس کے حسن کا گرویدہ ہو گیا تھا وہ حسن کی طاقت کو آزمانا چاہتی تھی مگر ان باتوں کا وہ

اظہار کرتا ہی نہیں چاہتی تھی کیونکہ اسے پورا یقین تھا کہ یہ باتیں اس کے گھروالوں کی سمجھ میں نہیں آنے والی ہیں۔ وہ اپنے خوابوں کو حاصل کر لینا چاہتی تھی جس میں ہمایوں جیسے لوگوں کی قطعاً گنجائش نہیں تھی جبکہ اس کی ماما ان کا ذکر کر کے اسے ڈسٹرب کر کے رکھ دیتی تھی اسے یوں لگتا جیسے وہ

اُڑان بھرتا چاہتی ہے لیکن اُس کی ماما اس کے پاؤں میں زنجیریں ڈال رہی ہے۔۔۔ وہ اپنے خیالات میں کھوئی ہوئی تھی کہ فون بیل نے اُسے چونکا دیا۔ اُس نے نسرود دیکھا تو وہ تیمور کا تھا۔

”بولو۔۔۔“ اس نے دیکھے سے لہجے میں یوں کہا جیسے آہ بھری ہو۔

”کیا بات ہے صفوا تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا کیا ہوا ہے؟“ تیمور نے تیزی سے کہا جیسے اس کی ذرا سی تکلیف پر وہ غرپ اٹھا ہو۔

”بس کیا بتاؤں۔۔۔ میں بہت ڈسٹرب ہوں سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ کیا کروں؟“ وہ اسی لہجے میں بولی۔

”سمجھ میں نہیں آ رہا ہے مطلب؟۔۔۔ خیر تم یوں کرو کہ ایک ایسے سے سچ کے لیے آ جاؤ وہیں باتیں ہوں گی۔“ تیمور نے کہا۔

”میں بھی کچھ ایسا ہی سوچ رہی ہوں تیمور! میں تم سے تھوڑی باتیں کرنا چاہتی ہوں۔“ وہ مایوس لہجے میں بولی جیسے وہ بہت پریشان

←

”اس لیے نا!۔۔۔ مجھے بس ذرا سی دیر ہوگی تمہیں فون کرنے میں میرا خیال ہے کہ تم ابھی گھر پہنچی ہوگی اور ابھی تک سچ نہیں کیا ہوگا۔“

تیمور نے اندازے سے کہا۔

”ہاں ایسا ہی ہے۔“ اس نے پھر دیکھے سے لہجے میں جواب دیا۔

”تو بس پھر تم جلدی سے آ جاؤ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر تیمور نے ریسٹوران کا نام بتایا۔

”میں آ رہی ہوں۔۔۔“

صفیہ نے کہا اور فون بند کر دیا۔ اس نے جلدی سے کالج پوٹینٹارم اتاری۔ موسم کی مناسبت سے خوبصورت سا ڈریس پہنا اور پہنائی ہلکا سا

میک اپ کیا اور خود ہی گاڑی لے کر نکل گئی۔

ریستوران کے ایک نیم تاریک سے گوشے میں وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ تیمور نے ویٹر کو اشارہ کر دیا تھا تاکہ اس کے

آرڈر کے مطابق کھانا لے آئے۔ چند تمہیدی باتوں کے بعد اس نے پوچھا۔

”صفوا! پہلی بات تو یہ بتاؤ کہ تم ڈسٹرب کیوں ہو۔۔۔؟“

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ میں تمہیں کیسے بتاؤں۔۔۔ میرا خیال ہے رات جو ہم نے فون پر بات کی تھی اس سے اندازہ ہو جانا

چاہئے کہ میں ڈسٹرب کیوں ہوں۔۔۔؟“ صفیہ نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”وہ نہیں نے تمہیں رات ہی بتا دیا تھا کہ میں اپنی ماما سے بات کروں گا وہ پاپا سے بات کریں گی اس میں تھوڑا وقت تو لگے گا۔۔۔“ اس

نے سمجھانے والے انداز میں حریف کیا۔ ”تمہارے فون کے بعد میں بہت دیر تک سوچتا رہا ہوں۔ میں نے سوچا ہے کہ چاہے جتنا وقت لگ جائے۔

مہینہ دو مہینے یا اس سے تھوڑا زیادہ وقت پہلے ہماری گفتگو ہونی چاہئے۔ اس کے بعد ہم دونوں اشتراک میں برنس شروع کر دیں گے۔“

”ایسا کیوں۔۔۔؟“ صفیہ نے دیکھے سے پوچھا۔

”اس لیے میری جان اکہ دونوں طرف سے والدین کی ہمیں سپورٹ حاصل رہے گی! انکا اعتماد شامل ہوگا ہمارے ساتھ اور پھر تمہارے امتحان

ہو جائیں تو اس طرح کے معاملات دیکھ سکیں گی۔ میں نہیں چاہتا کہ ہماری ذرا سی غلطی یا جلد بازی سے معاملہ خراب ہو جائے۔“ اس نے آہستہ آہستہ کہا۔

”تمہاری بات دل کو گنتی ہے اور مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے۔ تیمور! لیکن مجھے کسی بھی اُنہونی سے ڈرنا لگتا ہے۔“ اُس نے لرزتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”کیا— کیا ڈر ہے تمہیں؟“ تیمور نے حیرتی سے پوچھا۔

”میری ماما— تم اُن کے بارے میں نہیں جانتے ہو۔ وہ پرانے خیالات کی ہیں! انٹینس سے زیادہ وہ ہر شے ناتوں پر اعتماد کرنے والی ہیں۔ مینٹل کل سے ہی ڈسٹرب ہوں۔ چاہے میری مامات ہاسپٹل میں تھیں۔۔۔“ اُس نے ذکی لہجے میں بتایا۔

”کیا وہ ہاسپٹل میں تھیں— کیا ہوا تھا اب کسی ہیں؟“ تیمور نے تشویش سے پوچھا۔

”انٹینس تمہارے اور میرے بارے میں معلوم ہوا تو یہ صدمہ برداشت نہیں کر سکیں۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی ہیں کہ میں اس تم سے ملوں۔ یہ سننے ہی وہ بے ہوش ہو گئیں اور پھر انہیں ہاسپٹل لے جانا پڑا— آج تو اُنہوں نے مجھ سے بات بھی نہیں کی۔“ صیف نے لگاؤ میں جراتے ہوئے کہنے سے کہا۔

”اوہ تو یہ معاملہ ہے۔۔۔“ تیمور نے سوچتے ہوئے کہا پھر چند لمحے توقف کے بعد بولا۔ ”اس کا مطلب ہے ہمیں اور بہت زیادہ محتاط ہونا پڑے گا— خیر تم فکر نہ کرو۔ میں سب دیکھ لوں گا۔“

”تیمور! اگر دیر ہو گئی تو ممکن ہے وقت ہمارے ہاتھ سے نکل جائے۔۔۔“ صیف نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے خوف زدہ انداز میں کہا۔

”نہیں! ایسا نہیں ہو سکتا۔“ وہ حوصلہ دیتے ہوئے بولا پھر سوچ بھرے لہجے میں پوچھا۔ ”تمہارے پاپا—؟“

”وہ میرے ساتھ ہیں اور میری ہر بات ماننے میں جگتے ہیں۔ یہ جو میں اپنے خوابوں کی بات کرتی ہوں تو صرف اسی وجہ سے۔۔۔ میں اگر اپنا بزنس نہیں کر سکیں تب بھی میں اُن کے ساتھ شامل ہو جاؤں گی۔ انٹینس مجھ پر حد درجہ اعتماد ہے۔“ وہ قدرے حوصلہ مند لہجے میں بولی۔

”تو پھر تم کیوں گھبراتی ہو؟— سب ٹھیک ہو جائے گا! اب یہ سارا معاملہ مجھ پر چھوڑ دو۔ تم بس اپنے کالج کا کانسٹبل ایئر مکمل کرو۔ تمہاری ماما کو ہمارے ملنے پر اعتراض ہے تو ہم اتنا زیادہ نہیں بیٹیں گے اور انٹینس معلوم بھی نہیں ہونے دیں گے۔ تم اس دوران اُن کا بھی اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ اُس نے عام سے انداز میں بھرپور یقین سے کہا۔

”صنیں بہت گھبرا گئی تھی تیمور تمہاری باتوں نے مجھے بہت حوصلہ دیا ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”تم بھی ہنسی مسکراتی ہوئی اچھی لگتی ہو— اپنے سارے غم مجھ سے دو۔“

تیمور نے اُس کی جانب بجا بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اسی اثنا میں ویران کے لیے کھانا پختہ لگا تو وہ اس طرف متوجہ ہو گئے۔

☆☆

جنیڈا اپنے کمرے میں لیٹا ہوا تازہ اخبار پڑھ رہا تھا۔ اگرچہ شام ہونے کو آگئی تھی لیکن وہ ابھی تک اپنے کمرے ہی سے نہیں نکلا تھا۔ اُس

کے لیے کھانا بنانے والا لڑکا سلطان کئی بار آ کر پوچھ چکا تھا کہ وہ اس کے لیے کھانا بنائے یا نہیں؟ ہر بار وہ اسے یہی کہہ دیتا کہ تھوڑی دیر بعد بتائے گا۔ اسل میں اس کے دماغ میں دو طرح کی باتیں چل رہی تھیں۔ اس کا اپنا جی چاہ رہا تھا کہ وہ باہر نکلی نغمہاں لٹکے اور کسی کے ساتھ خوب جی بھر کے ہاتھ کرے۔ سب سے پہلا نام اس کے ذہن میں راحیلہ ہی آیا تھا لیکن تھوڑی دیر سوچنے کے بعد اس کا دل نہیں مانا۔ آج صبح وہ سو رہا تھا جب راحیلہ کا فون آیا تھا۔ اس نے نیند بھری آنکھوں سے نمبر دیکھا اور پھر شمار آلود آواز میں کہا۔

”ہاں بولو راحیلہ۔۔۔؟“

”آپ سو رہے ہو۔۔۔؟“

”ہاں سو رہا تھا جب سووں گا دیر سے تو اٹھنا بھی دیر ہی سے ہوگا۔ تم بولو؟“ اس نے آنکھیں بند کیے ہی کہا۔

”میں بھد میں کروں گی۔۔۔“ راحیلہ نے جلدی سے کہا۔

”ارے نہیں بولو۔۔۔“

اس نے تیزی سے کہا تو راحیلہ نے ڈاکٹر جمیل اور نسیم شیم کے آنے کے بارے میں پوری تفصیل سے بتایا۔

”مجھے اُمید ہے کہ آپ وہ دو بارہ تمہیں جگ نہیں کریں گے۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”لگتا تو یہی ہے لیکن کیا کسی انسان کی خصلت بھی بدل جایا کرتی ہے۔۔۔؟“ راحیلہ نے ڈھکی دل سے سوال کیا۔

”میں اس بارے میں نہیں جانتا لیکن جو اس کے ساتھ ہو گئی ہے اگر اس کے باوجود بھی اس نے اپنا رنگ دکھایا تو اپنی جان سے ہاتھ دبو بیٹھے گا یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔“ وہ انتہائی سرد لہجے میں بولا۔

”خیر میں نے آپ کو بتانا تھا آپ آرام کرو میں بھد میں فون کروں گی۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔“

جنید نے کہا اور پھر فون سر ہانے رکھ کر سو گیا۔ اور اب اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ راحیلہ کو فون کرنے اسکے ساتھ کسی بھی اجھے سے ریسٹوران میں بیٹھ کر کھانا کھائے لیکن اسکے ساتھ جنید کے ذہن میں یہ خیال ابھرتا کہ ابھی راحیلہ کے شکر یہ کہے کو چھوٹے گھنٹے کی گھنٹے گزرے ہیں اور وہ اسے بلا لے۔ وہ کیا سوچے گی کیا یہ بیہودگی نہیں ہے کہ اک ذرا سے احسان کے بدلے میں وہ اس کی رفاقت چاہے؟ اپنے خمیر کی سرڈش پر اس نے اس بابت سوچنا ہی چھوڑ دیا لیکن دل لگاتا رہا اسے اس کا ہاتھ مختلف بہانے اور دلیلیں دے رہا تھا اور وہ مسلسل اسے نظر انداز کرتا چلا جا رہا تھا۔

جنید کے ذہن میں دوسرا شخص ہمایوں تھا۔ وہ اسے بہت کام کا آدمی معلوم ہوا تھا اس کے ذہن میں وہ بہت سارے کام کر سکتا تھا۔ اگرچہ یہ بات اس نے بہت پہلے بھانپ لی تھی لیکن ماہر ڈانچ کے قتل کے بعد وہ اس کی نگاہوں میں بہت زیادہ اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ جنید کو احساس ہو گیا تھا کہ ہمایوں پے ہوئے طبقے سے تعلق رکھتا ہے جسے اپنی تمام تر خواہشوں کو پورا کرنے کا ایک ہی راستہ دکھائی دیتا ہے اور وہ ہے دولت۔ دولت ہمایوں کی کمزوری تھی۔ اس نے ہمایوں کے بارے میں جو پلان سوچ رکھا تھا وہ بہت ضروری ہو گیا تھا کیونکہ جنید کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ ڈیٹان اس

عشق کا ہے عشق بتا

کے ساتھ ہاتھ کر گیا ہے۔ دراصل وہ اسے استعمال کرتے ہوئے عالمگیر کو قتل کرنا چاہتا ہے مگر ان سب باتوں کی کوئی دلیل، جواز یا کوئی منطقی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ جو وہ اپنی قیادت کے سامنے پیش کر سکے۔ اب اس کے سامنے فقط ایک ہی ٹارگٹ تھا اور وہ تھا فاروق چوہدری! جس کو سوچ کر ساری بات گم ہو گئی تھی۔

”سرتی! اسوج غروب ہونے لگا ہے اب تو تادیں۔ یا پھر بازار سے کھانا لے آؤں۔“

سلطان نے بے چارگی سے پوچھا تو جنید نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اؤ یا رابلس چند منٹ دے دے میں ابھی بتا دیتا ہوں۔“

یہ کہہ کر اس نے ہائیوں کے نمبر تلاش کر کے اسے پل کرایا۔ چند لمحوں بعد اس نے فون رسیمو کر لیا اور کہا۔

”یولین جنید بھائی۔۔۔؟“

”کیا کر رہے ہو اور کہاں ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”کچھ بھی نہیں گھر پہ ہوں۔“ ہائیوں نے جواب دیا۔

”تو پھر یوں کرو گھر سے نکلو۔ میں بھی آ رہا ہوں اسی پارک میں پھر کبھی نکل چلیں گے۔“ جنید نے سچایا۔

”ٹھیک ہے میں آ رہا ہوں۔۔۔“

اس نے کہا تو جنید نے فون بند کر دیا۔ پھر سلطان کو آواز دے کر کہا کہ تم اپنے لیے مٹا لویا بازار سے لے آؤ جو دل چاہے میں باہر جا رہا ہوں۔

”مجھے بھی یہی اندازہ تھا کہ آپ باہر ہی جائیں گے۔“

سلطان نے کہا تو وہ مسکرا دیا پھر تیار ہونے کے لیے اٹھ گیا۔

رات بھیک گئی تھی جب وہ دونوں ایک اوپن ایئر ریسٹوران کے ایک گوشے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ پارک سے لے کر وہاں آنے تک ان کے درمیان یونہی عام سی باتیں ہوتی رہی تھیں۔ جنید نے جب آرڈر دیا اور خاموشی سے اپنے خیالات میں گسوور ہاتھاک ہائیوں بولا۔

”ویسے خیریت ہے جنید بھائی! آپ نے مجھے یوں بلایا۔؟“

اس کے یوں کہنے پر جنید نے چونک کر ایک نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی۔ اس کا لہجہ، تم سے آپ پر آ جانا بڑی تہدیلی تھی۔ سو وہ چند لمحوں

یونہی دیکھتا رہا پھر بولا۔

”میرے جسے بندے کے ساتھ خیریت کہاں ہوتی ہے۔ ہم وہ لوگ ہیں جن کے پاؤں میں نہ صرف پتھر ہوتا ہے بلکہ انٹیکس یہ تک خبر نہیں

ہوتی کہ اگلے لمحے میں کیا ہونے والا ہے۔ خیریت، سکون اور اطمینان جیسے لفظ ہمارے لیے اجنبی ہوا کرتے ہیں۔“

”آپ تو بہت مایوس دکھائی دے رہے ہیں۔“ ہائیوں نے دھیرے سے کہا۔

”میں نہیں نہیں ہوں یاد اسیا دانا تو اب تک منوں مٹی کے مچے پڑا ہوتا۔ ویسے کسی کو بھی خبر نہیں ہے کہ اس نے یہ دنیا کب چھوڑ جانی ہے لیکن مہری دنیا میں ایک خوش گمانی تو ہے جو سکون سے بیٹھے نہیں رہتی۔“ جنید نے مسکراتے ہوئے کہا پھر چند لمبے توقف کے بعد بولا۔ ”خیر چھوڑوان ہاتوں کو۔ تمہیں شاید یاد ہوگا کہ میں نے تمہیں کہا تھا میرے پاس تمہارے لیے ایک پلان ہے؟“

”ہاں کہا تو تھا۔“ ہمایوں نے ذبذبے جوش سے کہا۔

”میں چاہتا ہوں کہ وہ تم سے کہہ دوں۔ تمہاری کچھ میں آئے تو مجھے بتانا۔“ وہ دھیرے سے بولا۔

”آپ کہیں تو۔۔۔“ ہمایوں نے تیزی سے کہا۔

”دیکھو ہمایوں! دولت اس دنیا کی اہم ترین حقیقت ہے۔ اس میں تصور کسی کا نہیں پوری دنیا ہی مادیت کی پیٹ میں آگئی ہے۔ ہر شے کو دولت ہی کے معیار پر پکا جا رہا ہے۔ اب ضروریات زندگی صرف اس شخص کے لیے محدود ہو کر رہ گئی ہیں جس کے پاس آسائش خریدنے کی استطاعت نہیں۔ ہمارے پسے ہوئے طبقے کے لیے تو یہ دولت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ ہماری ضروریات خواہشیں اور خواب اس سے جڑے ہوئے ہیں۔“ جنید یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

”یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ ہمایوں نے اس کی تائیدی۔

”جن حالات سے تم گزر رہے ہو اس میں دولت کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ تمہاری چاہت کے درمیان دولت ایک عفریت کی مانند آن کھڑی ہے جو تم دونوں میں سے کسی ایک کو لٹک جائے گی۔۔۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟“ جنید نے اس کے چہرے کی جانب دیکھ کر پوچھا۔

”بالکل۔۔۔ شاید میں دولت کی اتنی تمنا نہ کرتا میں بھی ایک عام انسان کی طرح بوجہی زندگی گزارنے کی جدوجہد کرتا رہتا لیکن۔۔۔“

جنید نے اس کی بات کا نچے ہوئے تیزی سے کہا۔ ”لیکن وہ تمہاری پہنچ سے بہت دور ہوگئی صرف اس وجہ سے کہ وہ دولت مند ہیں۔“

”بالکل اس میں کوئی شک نہیں۔“ ہمایوں نے اعتراف کیا۔

”بلا شرم اپنی راہ سے یہ روکات دور کرنا چاہتے ہو گے؟“ جنید نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”ہاں میں دولت حاصل کرنا چاہتا ہوں مگر مجھے معلوم ہے کہ ان حالات میں اگر میں جائز ذرائع سے دولت حاصل کرنا چاہوں تو نہیں کر سکتا۔“ ہمایوں نے ہاتھ کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”میرے پاس جو پلان ہے اس میں کوئی ناجائز بات نہیں ہے اور نہ ہی میں تمہیں اپنی راہ پر چلنے کے لیے کہوں گا مگر تمہیں اپنا پورا وقت اسی میں لگانا ہوگا۔ جو پلان میں تمہیں دینا چاہتا ہوں پھر اس کے سوا کچھ اور نہیں ہونا چاہئے۔“ جنید نے دھیرے سے کہا۔

”آپ بتائیں تو کسی میں اپنا آپ وقت کروں گا۔“ ہمایوں نے اپنا تجسس دہاتے ہوئے کہا۔

”اس وقت تمہاری وکالت کوئی حیثیت نہیں رکھتی یہ بھی تعلقات کی بنیاد پر چلتی ہے۔ تمہارا ٹیلیس ابھی تمہیں وہ مقام نہیں دے گا جو فی زمانہ وکالت کے لیے چاہئے ہوتا ہے۔“ جنید اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔

”یہ سب دولت ہی سے ممکن ہے اور میرے پاس۔“ ہمایوں نے کہا۔

”مہری جان! وہی بتانے جا رہا ہوں۔ تم خود کو عوام میں مقبولیت کے لیے تیار کر لو وہ سب سوچو اور ان پر عمل کرو جس سے تمہیں عوامی مقبولیت حاصل ہو۔ فریب لوگوں کے مستحق لوگوں کے کام آؤ۔ ان کے لیے مفت میں لڑاؤ حجاج کا کوئی موقع نہ جانے دو۔ شہر میں ہونے والی کوئی تقریب ہو اس میں تمہیں پیش پیش ہونا چاہئے۔ ایک پریشر گروپ بنا لو جو انتظامیہ پر دباؤ ڈال سکے۔ مطلب تمہیں تمہیں ایک سیاستدان کے رُوب میں دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”تمہیں اور سیاست۔؟“ ہمایوں پریشان سا ہو گیا۔

”ہاں تم اس حلقے کی سیاست کرو۔ وہ جو سیاستدان اپنے انتخابی پوسٹروں پر جموٹے نعرے لکھتے ہیں نا جیسے بے لوث خدمت بے خوف قیادت وغیرہ۔ بس تمہیں ویسا ہی تاثر دینا ہے۔“ جنید نے اُس کے چہرے پر بدلتے ہوئے رنگوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”جنید بھائی! سیاست بھی انسان ہی کرتے ہیں اور جو رنگ ڈھنگ اس وقت سیاست کے ہیں وہ کچھ اور ہی چیز ہے لیکن تمہیں۔“

”تم جو کہنا چاہتے ہو تمہیں اسے سمجھ رہا ہوں۔ تم اس میں خرچ ہونے والی رقم کی پرواہ نہیں کرنا وہ تمہیں دوں گا لیکن کسی بھی کہیں بھی اور کسی سے بھی میرا ذکر نہیں ہوگا۔ اب تمہارا مجھ سے یہ سوال ہونا چاہئے کہ تمہیں ایسا کیوں چاہتا ہوں؟“

”ہاں۔۔۔ یہ تو ہے؟“ ہمایوں نے کہا۔

”تو پھر جان لو تمہیں اس شہر پر مسلط منافق سیاستدانوں کا توڑ کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تم میں ہمت ہے میرے ساتھ اپنا مقصد بھی حاصل کرنا چاہتے ہو تو آؤ میدان میں آ جاؤ۔“ جنید نے اُسے چیلنج کرتے ہوئے کہا۔

”تمہیں اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔“ ہمایوں نے جب یہ لفظ کہے تو اُس کے دماغ میں صفیہ کا مارا ہوا تھپڑ گونج گیا تھا۔ اس کی بازگشت ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ پولیس کے ہاتھوں بے عزت ہو جانے کی غلطی نے اُسے بحال کر کے رکھ دیا۔

”تمہارا اور میرا رابطہ فون پر رہے گا۔ مجھے جس قدر تمہارا کام دکھائی دے گا تمہیں اس قدر تمہیں رقم فراہم کرنا چلا جاؤں گا اور ممکن ہے ہمارا یوں ملنا آثری ہاری ہو۔“ جنید نے دھیرے سے کہا۔

”تمہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔“ ہمایوں تیزی سے بولا۔

”ممکن ہے ایسا نہ ہو لیکن تم یہی سمجھو۔“ جنید نے اس پر واضح کر دیا۔

”ٹھیک ہے جنید بھائی! تمہیں تیار ہوں۔“

ہمایوں نے حتمی لہجے میں کہا تو جنید نے اپنی جیکٹ کے اندر ہاتھ ڈالا اور ایک پھولا ہوا لفافہ اُس کے سامنے رکھ دیا۔

”اسے اٹھا لو۔۔۔ اور ہاں یاد رکھنا جس دن بھی تم نے مجھے دھوکا دینے کی کوشش کی اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔“

”تمہیں ان معاملات کو سمجھنا ہوں۔“ ہمایوں نے وہ لفافہ اپنی جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

”ایک بات اور ہے، ہمایوں! تم فاروق چوہدری کے بارے میں تو جانتے ہو۔ بات وہیں ختم ہوئی تھی اس کے بارے میں تصدیق کرنی ہے۔۔۔ بولو یہ کام کر سکو گے؟“ جنید نے پوچھا۔

”یوں نہیں اس سے تصدیق آپ ہی کریں۔۔۔ آپ خود ہی تو کہتے ہیں کہ میرا تعلق آپ سے ثابت نہیں ہونا چاہئے اس طرح تو میں سامنے آ جاؤں گا۔۔۔ ہاں فاروق چوہدری کے بارے میں معلومات آپ کو مل جائیں گی۔“

”بہت خوب۔۔۔“ جنید نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ ”تم نے اتنی ہی ایک بات اپنے ذہن میں رکھی۔ تم اس کے بارے میں معلومات دو، میں اس سے جلد مل لینا چاہتا ہوں۔“

”یہ کام تو سمجھیں ہو گیا۔“ ہمایوں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

پھر اس خوالے سے وہ اس وقت تک آپس میں باتیں کرتے رہے جب تک کھانا سامنے نہیں آ گیا۔۔۔ آدمی سے زیادہ رات گزر چکی تھی جب وہ دونوں وہاں سے نکلے۔ جنید اپنا خواب ہمایوں کے سپرد کر کے قدرے پرسکون ہو گیا تھا اب بس اس کے نتیجے کا اُسے انتظار بہت مہر و تحمل سے کرنا تھا۔

☆ ☆ ☆

شکنبہ

فلکیہ ناول پاکستان میں ہونے والی تخریب کاری کے پس منظر میں لکھا گیا ہے ہمارے ہاں گذشتہ کچھ سال سے ”ٹریک ٹو ویلوسی“ کا غلط فہمی کچھ زیادہ ہی زور شور سے چلایا جا رہا ہے۔ یاد رکھنا جاتا ہے کہ مجسموں کے جوڑنگ آلود و رازے کلکتہ میں نہیں کھول سکیں وہ شاید عوام بلکہ عوام بھی نہیں دانشور خواتین و حضرات اپنی مسافتی سے کھولنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

لیکن..... اس ٹریک ویلوسی کی آڑ میں کیا گھناؤنا کھیل رچایا جا رہا ہے بھارتی اجمیلی جنس ایجنسیاں ”بھولے بادشاہوں“ کو کس کس طرح اپنے جال میں پھانسی ہیں اور ان سے کیا کام لیا جاتا ہے۔ یہی اس ناول کا موضوع ہے۔

ایک اور بات عام طور پر کہی جاتی ہے کہ پاکستان اپنے ہاں ہونے والے ہر واقعے کی ذمہ داری ”را“ پر ڈال دیتا ہے۔ یہ بات کس حد تک سچ ہے؟ کس حد تک جھوٹ؟ شاید ان سوالات کے جواب بھی آپ کو اس ناول کے مطالعے سے مل جائیں۔ مجسموں کی آڑ میں منافقوں کا وندہ کون چلا رہا ہے؟ دشمن کی سازش کیسے انجام پاتی ہے اور اس سازش کا کارکن انجام دینے میں کیسے بن جاتے ہیں میں نے یہی بتانے کی کوشش کی ہے۔ یہ ناول کتاب گھر کے ایکنٹن ایڈیٹور جاسوسی سیکشن میں پڑھا جا سکتا ہے۔

”راحیلہ! مجھے کچھ میں نہیں آ رہا ہے کہ آخر تم چاہتی کیا ہو۔“؟

لسرین جوزف نے دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے اپنے بیڈ پر بیٹھ گئی۔ راحیلہ چند لمبے خاموش رہی پھر دو درخلاؤں میں گھورتی ہوئی بولی۔
 ”لسرین! یقیناً تمہیں کچھ نہیں آ سکتی کیونکہ تم اسے کھنا ہی نہیں چاہتی ہو۔ کبھی کبھی میرا دل کرتا ہے کہ ہر طرف آگ لگا دوں۔ کچھ بھی نہ رہے لیکن پھر سوچتی ہوں کہ اس سے کیا ہوگا بہت سارے بے گناہ لپیٹ میں آ جائیں گے۔ میں جویا ک گاؤں کی دیوی ڈارپوک سی لڑکی یہاں شہر میں آئی ہوں تو مجھے جیسے کا حق کیوں نہیں دیتے۔ اب اگر میں نے انہیں کچھ کہہ دیا ہے تو گنہگار ہو گئی ہوں۔ بہت اچھا انصاف ہے تمہارا۔“؟

آخری لفظ کہتے ہوئے اُس کے لہجے میں تلخی آ گئی تھی۔

”تم میری بات کا غلط مطلب لے گئی ہو۔ میں صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ جب وہ اپنی غلطی کا اعتراف کر رہے تھے تب تم بھی تمہارا عمل دکھاتیں۔“ لسرین نے دہے ہوئے لفظوں میں کہا۔

”ہاں۔۔۔ مصلحت کا تقاضا تو یہی تھا کہ میں خاموش رہتی لیکن کیا کروں میں اپنی سوچ کا جو میرے تن بدن میں آگ لگا دیتی ہے۔ اُن کا چہرہ دیکھتے ہی میرے اندر آگ بھڑک اُٹھتی ہے۔“ راحیلہ نے خودکلامی سے انداز میں کہا۔
 ”اس آگ پر قابو پاؤ۔ زمانے کا کچھ بھی نہیں جانا“ تم خود جل کر راکھ ہو جاؤ گی۔ ہمارا یہاں پر زیادہ سے زیادہ تین چار سیٹے قیام ہوگا پھر ہم نے چلے جانا ہے اس لیے خود پر قابو رکھا کرو۔ یہ وقت بھی گزر جائے گا۔“ لسرین نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔
 ”ہاں مجھے ایسے ہی کرنا چاہئے۔“ راحیلہ نے پھر خودکلامی کے سے انداز میں کہا۔

”جس طرح ڈاکٹر ٹیمپل نے آ کر معذرت کر لی ہے اور اس کے ساتھ میڈم نے بھی تو میرا نہیں خیال کہ اب کوئی مزید بات ان کی طرف سے ہوگی۔ ویسے یہ سارا کام جدید ہی کا ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ اس نے کیا کہا ہوگا جو ڈاکٹر اس قدر ٹھکے پر مجبور ہو گیا؟“ لسرین نے حیرت سے پوچھا۔
 ”اس بارے میری اس سے بات ہی نہیں ہوئی اور میں جانتی ہوں کہ وہ مجھے کچھ بھی نہیں بتائے گا ورنہ وہ فون کر کے کسی رد عمل کے بارے میں پوچھ چکا ہوتا۔“ راحیلہ نے دھیرے سے کہا۔

”ویسے حیرت ہے اتنی جلدی یہ سب ہو گیا اور اس سے بھی زیادہ مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ وہ تمہاری مدد کرنے پر راضی کیسے ہو گیا؟“
 لسرین کو اب تک ایسا کوئی اشارہ نہیں مل رہا تھا جس سے وہ اپنا اطمینان کر سکتی۔

”تم ایسا کرو اُس سے خود ہی پوچھ لیانا۔ میں تمہیں یقین سے کہتی ہوں کہ مجھے نہیں پتا۔“ راحیلہ نے قدرے خوشگوار انداز میں کہا اور مسکرائی۔

”میں یارا حیرت تو ہوتی ہی ہے۔ تم نے بھی تو اُس سے نہیں پوچھا۔“

وہ دھیرے سے بولی تو راحیلہ کو ہنسی کا لہجہ یاد آ گیا۔ اُس نے کس قدر غرا کے کہا تھا کہ اگر اب اُس نے کوئی ایسی حرکت کی تو اپنی جان سے جائے گا۔ اُسے خاموش پا کر لسرین بولی۔

”ویسے تمہیں ایک بار اس سے مل لینا چاہئے اس کا شکریہ تو ادا کرو تا کم از کم۔“

”ہو تا تو ایسے ہی چاہئے لیکن اس نے کبھی ایسا اظہار نہیں کیا۔ نسرین انجانے مجھے کیوں یہ گمان ہوتا ہے کہ وہ عام سائنس ہے اس میں کوئی خاص بات ہے۔ کیا ہے؟ میں خود نہیں جانتی۔“ راحیلہ نے خود گلامی کے سے انداز میں کہا۔

”ہاں یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے۔ کوئی یومی اپنی زبان کا پاس رکھتے ہوئے مد نہیں کروتا۔ زندگی کے ان تلخ تجربات نے مجھے یہی سکھایا ہے اسی لیے شاید میں اب تک شک میں جھتا ہوں۔“ نسرین نے بھی اسی کے سے انداز میں کہا۔

”بات کچھ بھی ہو نسرین اس نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ مرد ہے۔“ راحیلہ نے کسی خیال کو ذہن میں لا کر مسکراتے ہوئے کہا۔

”آج آف ہے نا؟۔۔۔ تم یوں کرو کہ اس سے ملو اس کا شکریہ ادا کرو۔ ممکن ہے وہ یہ بتا دے کہ اس نے یہ سب کیسے کیا؟“ نسرین کو اب تک وہی تجسس ہو رہا تھا۔

”اس سے ملنے میں کوئی حرج نہیں لیکن میں تمہیں یہ بتا دوں کہ وہ کبھی ایسی بات نہیں کرے گا۔ ویسے میرا دل بھی چاہتا ہے کہ اس سے ملوں اس کا شکریہ ادا کروں۔“

راحیلہ نے کہا تو نسرین تیزی سے بولی۔

”تو منع کس نے کیا ہے فون کرو اسے۔“

تجسس راحیلہ نے فون اٹھایا اور فون میں محفوظ واحد نمبر کو پیش کر دیا۔ تھوڑی دیر تک ہو جانے کے بعد اس نے فون اٹھایا، ٹیک سلیک کے بعد اس نے پوچھا۔

”سور ہے تھے آپ۔؟“

”ہوں۔ سوائے سونے کے اور کام ہی کیا ہے؟“ جنید نے غماز آلود لہجے میں کہا۔

”اور میں ہمیشہ آپ کو جگا دیتی ہوں۔“ راحیلہ شرمیلی سے بولی۔

”کوئی بات نہیں۔۔۔ ویسے فون کس لئے کیا تھا؟“

جنید نے پوچھا تو راحیلہ چند لمحوں تک گڑبڑا گئی پھر حوصلہ جمع کرتے ہوئے بولی۔

”میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔“

”کب۔؟“ جنید نے پوچھا۔

”آج۔۔۔ واجب آپ چاہیں۔“

وہ تیزی سے بولی تو جنید نے چند لمحوں سوچے رہنے کے بعد کہا۔

”ٹھیک ہے دوپہر کے وقت میں تمہیں بتا دوں گا کہ تم کہاں آؤ گی۔“ اس کا لہجہ عام سا تھا چند بات سے عاری جس میں ذرہ بھر تجسس

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

نہیں تھا۔

”کہیں آپ کو وقت تو نہیں ہوگی؟“ راحیلہ نے پوچھا۔

”نہیں۔۔۔ بس تم اپنا خیال رکھنا۔“

جنید نے یوں کہا جیسے وہ اسے سمجھا رہا ہو۔ پھر الوداعی مکالموں کے بعد فون بند کر دیا گیا۔

دوپہر کے بعد جنید نے جس جگہ کے بارے میں بتایا تھا وہ وہاں پر موجود نہیں تھا جبکہ راحیلہ وقت پر وہاں پہنچ گئی تھی۔ وہ چند لمبے انتظار کرتی رہی پھر اس نے فون کرنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اس کا فون بج اٹھا۔ راحیلہ نے کال ریسرو کی اور پوچھا۔

”آپ ابھی تک یہاں نہیں پہنچے ہیں۔“

”میں چند منٹ تک پہنچ جاؤں گا تم مشرق کی جانب بیدل چلو۔“

جنید نے اتنا کہا اور فون بند کر دیا۔ راحیلہ نے فون بیگ میں ڈالا اور مشرق کی جانب چل دی۔ ابھی وہ چند قدم ہی چلی ہوگی کہ ایک کار بالکل اُس کے قریب آن رکی۔ راحیلہ نے اس میں جھانکا تو ڈرائیور تک سیٹ پر جنید موجود تھا۔ وہ عام شلو اور قمیص کی بجائے پینٹ شرٹ میں ملبوس تھا پہلی نگاہ میں وہ پہچانا ہی نہیں جا رہا تھا۔ راحیلہ کار میں بیٹھ گئی۔

”آپ تو پہچانے ہی نہیں جا رہے ہیں۔“ سلام و ڈعا کے بعد راحیلہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”یار! کبھی کبھی میرا بھی دل کرتا ہے کہ میں جنتیلمین بن جاؤں۔۔۔ کیا اچھا نہیں لگ رہا ہوں؟“ جنید نے سامنے سڑک پر نگاہ رکھتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں! میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ آپ اچھے لگتے ہیں۔۔۔ دراصل آپ کو پہلی بار ایسے لباس میں دیکھا ہے نا!“ راحیلہ نے وضاحت کی۔

”اڈا اچھا۔۔۔ خیر جوڑو ان باتوں کو اب مجھے تفصیل سے بتاؤ، وہ بارہ پھر کوئی بات تو نہیں ہوئی ان کی طرف سے۔۔۔؟“ جنید نے

پوچھا۔

”نہیں۔۔۔ بلکہ دوسروں کا بھی سلوک مجھ سے اچھا ہو گیا ہے۔“

یہ کہہ کر اُس نے پھر سے پوری تفصیل کے ساتھ ساری بات بتا دی۔ اس دوران جنید ڈرائیور تک کرتا رہا یہاں تک کہ شہر سے باہر نکل آیا اور بائی وے پر موجود ایک رستوران کے سامنے گاڑی روک دی۔

”آؤ آج تمہیں مختلف قسم کا کھانا کھلاتا ہوں۔“

جنید نے کہا اور گاڑی سے باہر آ گیا۔ راحیلہ اُس کے ساتھ چلتی ہوئی ایک گوشے میں جا بیٹھی جہاں اُن کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں تھا۔ اس وقت راحیلہ کو احساس ہوا کہ وہ رستوران والے جنید کو اچھی طرح جانتے ہیں تب اُس نے پوچھ ہی لیا۔

”یہ آپ کو جانتے ہیں؟“

”ہاں بہت اچھی طرح۔“ جنید نے انتہائی سنجیدگی سے کہا پھر چند لمبے توقف کے بعد بولا۔ ”یہاں میں اس وقت آتا ہوں جب مجھے کسی سے کوئی خاص بات کرنا ہوتی ہے۔“

”آپ کا مطلب ہے آپ مجھ سے کوئی خاص بات۔۔۔؟“ راحیلہ نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں۔۔۔“ جنید نے کہا اور پھر کہتا ہی چلا گیا۔ ”راحیلہ! میرے جیسے بندے کی زندگی کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ مجھے کب کوئی گولی بدن چمید جائے یا پھر میں سلاخوں کے پیچھے ہوں۔ میرے جیسے لوگ کسی کے ساتھ وعدہ بھی نہیں کر سکتے۔ میں بھی کوئی وعدہ نہیں کر سکتا اس لیے کہ مجھے خود پر یقین ہی نہیں ہے۔“

”یہ آپ مجھ سے کیوں کہہ رہے ہیں۔۔۔؟“ راحیلہ نے وحیرے سے پوچھا۔

”ان دنوں میرے پاس سوائے سوچنے کے اور کوئی کام نہیں ہے۔ میں نے تمہارے بارے میں بھی بہت سوچا ہے۔ یہ ڈاکٹر وغیرہ کوئی شے نہیں ہیں جو شخص بھی چہرے پر نقاب بجا کر رکھتا ہے، تاہم میرے بزدل ہونا ہے کیونکہ اپنی بزدلی کو چھپانے کے لیے نقاب اڑھتا ہے۔ ایک سوچ یہ ہے کہ اگر میں نہ ہوں تو پھر کون تمہیں ان لوگوں سے بچائے گا۔“

راحیلہ نے بات کا سچے ہوئے کہا۔

”جنید! آپ نے جتنا میرے لیے کر دیا اتنا ہی بہت ہے۔ میں اُن سے کوئی انتقام لینا نہیں چاہتی اور نہ ہی میں اس مقصد کے لیے آپ سے ملی ہوں۔“

”تم میری بات نہیں سمجھتی ہو۔۔۔ تم نے اگر اس پروفیشن میں رہنا ہے تو اپنا تاثر خراب مت کرو۔“ اُس نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ میں دیہائی کروں گی جیسا آپ چاہتے ہیں۔“ اُس نے وحیرے سے کہا۔

”میری بات سنی گئی۔“ جنید نے پوچھا۔

”نہیں۔۔۔ لیکن آپ سے اجنبیت کا احساس ضرور ہوا ہے۔“ راحیلہ نے صاف کہہ دیا۔

”تم اگر میرے لیے اجنبیت کا احساس رکھو تو اچھا ہے۔ میں نے تمہیں پہلے ہی بتا دیا ہے کہ میرا کوئی بھروسہ نہیں ہے اور میں یہ سب کچھ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ جیسے ایک چوکیدار پہرہ دیتے ہوئے اُدھی آواز میں صدا لگاتا ہے کہ جاگتے رہنا میں بھی کچھ ایسے ہی جذبوں کو محسوس کرنے لگا ہوں۔ ہم جیسے لوگوں کی گفت میں ایسا تب ہوتا ہے جب بندہ بزدل ہو جاتا ہے۔“

”کیا آپ میرے لیے کوئی جذبہ پانے من میں محسوس کرتے ہیں؟“ راحیلہ نے حیرت سے پوچھا۔

”میں سمجھتا ہوں کہ کسی بھی مرد کی زندگی میں نسوانی احساس اپنی کشش ضرور رکھتا ہے۔ مجھے تم اچھی لگتی ہو مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔ ایک اپنائیت کا احساس ہے تم سے۔“

جنید نے مضبوط لہجے میں یوں کہا جیسے اُسے بہت کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا ہو۔ راحیلہ اس پر چند لمبے خاموش رہی اور پھر وہ بھی اسی

مضبوط لہجے میں بولی۔

”میں سمجھ رہی ہوں کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے ملنا اور پھر ملنے رہنا اس کا کوئی نہ کوئی نتیجہ تو سامنے آئے گا۔ شاید آپ

ڈرتے ہیں کہ یہ ملاقاتیں کہیں محبت کا رنگ لے آئیں۔ یہی کہنا چاہتے ہیں نا آپ۔“

”ہاں۔۔۔ میں ڈرتا ہوں۔ یہ جذبہ ہم جیسے لوگوں کو رس نہیں آئے گا۔ شاید یہ ہمارے مقدر میں نہیں ہے یا پھر ہم ہی اس کے لیے نہیں
ہے۔“ جنید نے اُس کے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ کہتے ہیں تو آج کے بعد میں آپ سے ملنا تو کیا آپ کو فون کال بھی نہیں کروں گی البتہ آپ نے جو احسان مجھ پر کیا ہے اسے
میں ہمیشہ یاد رکھوں گی۔۔۔ میں چند ماہ تک ادھر ہوں پھر پلٹ کر گاؤں چلی جاؤں گی۔ اس کے بعد کہیں بھی جہاں سے مجھے نوکری مل گئی۔“ اُس
نے ہنسیکے ہوئے لہجے میں وجرے سے کہا۔

”مطلب تم۔۔۔ نوکری کرو گی۔ جہاں بھی جانا پڑے۔“ جنید نے یوں بے ترتیب سی بات کہی جیسے کہنے کو اس کے پاس کچھ بھی نہ

ہو۔

”نوکری ہی کے لیے تو یہ سارا جھنجھٹ پال رہی ہوں۔۔۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہم یہ دن کس طرح گزار رہے ہیں۔ ورنہ میری طرح کی
لڑکیاں ان دنوں میں کیا کیا خواب نہیں رکھتیں اور کیا میرا دل چاہتا ہے کہ میں ایسے غیبی بندے کی باتیں سنوں؟۔۔۔ یہاں بہت سارے اچھے
لوگ بھی ہیں۔ ورنہ مندر دل ہیں بھدروی کرتے ہیں تو وقت اچھا گزار رہا ہے ورنہ عذاب ہے یہ سب۔“
”گھر میں اور کون کون ہے۔“ جنید نے ہنسی بار پوچھا۔

”یہاں میں اور گاؤں میں میری ماں جو اپنا وقت نجانے کیسے گزار رہی ہے۔۔۔ جنید صاحب! جس طرح آپ یہ محبت و فیروہ کے چوٹیلے
انورہ نہیں کر سکتے اسی طرح میں بھی نہیں کر سکتی۔ مجھے معلوم ہے کہ میری ماں نے مجھے کس طرح پالا ہے میٹرک تک تعلیم کس طرح دلوائی ہے۔ یہ تو
بھلا ہو میری استانی تھی گا جس نے میری مدد کی پھر سکول بھی تو قریب ہی کے گاؤں میں تھا۔۔۔ کسی قسمت ہے جنید صاحب ہماری ادھر گاؤں میں
میری ماں لوگوں کی باتیں سنتی ہے کہ بیٹی نرس بن رہی ہے یا کیا کر رہی ہے اور ادھر میں۔“ راحیلہ کہتے ہوئے اچانک رووی آتسوؤں کو اُس نے
پلکوں پر ہی روک لیا تھا۔

”اس دنیا میں بہت سارے لوگ ایسے ہیں جو نجانے اپنی زندگی کس قدر مشکلات میں گزارتے چلے جا رہے ہیں ان میں سے ایک تم بھی
ہو۔ میں نے تو آج تک یہی سیکھا ہے کہ اگر سید سے سہاؤ نہیں ملتا ہو تو جین لوڈس بندے میں حوصلہ ہونا چاہئے۔“ جنید نجانے کیوں اُسے آزمانے
پر رٹا ہوا تھا اس لیے ایک نئی بات کہہ دی۔

”حوصلہ تو مجھ میں بھی بہت ہے جنید صاحب! لیکن وہ طاقت نہیں ہے۔ میں تو اپنا حوصلہ اپنی جان پر ہی آزما تی چلی آئی ہوں برداشت کی
آخری حدود کو چھوا ہے میں نے لیکن میرے پاس طاقت نہیں ہے۔ دو سو سال نہیں ہیں ورنہ میں بھی ڈاکٹر بن سکتی ہوں یا کچھ بھی اور۔۔۔ سب سے

عشق تو ہے عشق بتا

بڑی بات یہ ہے جنید صاحب! میں لڑکی ہوں۔ اس معاشرے میں اکیلی اور تنہا لڑکی کو کس نگاہ سے دیکھا جاتا ہے آپ بھی سمجھتے ہیں۔“

لفظ ابھی اُس کے منہ ہی میں تھے کہ میٹر کھانے لے کر آ گیا۔ دو تین چکروں میں اس نے سامنے پڑی میز بھر دی تب جنید نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

”سب کچھ بھول کر اس وقت صرف کھانے پر دھیان دہن باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔“

کھانے سے فراغت کے بعد جنید نے مل دیا اور پھر اپنا پرس واپس جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔

”تاؤ تمہارا گاؤں کتنی دور ہے؟“

”گاؤں۔۔۔ مطلب کیا آپ وہاں جائیں گے؟“ راحیلہ ایک دم سے گھبرا گئی۔

”ہاں تو کیا حرج ہے۔ میں تمہارا گاؤں دیکھنا چاہتا ہوں۔“ اُس نے راحیلہ کے چہرے پر غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”جنید صاحب! لے جانے کو نہیں ابھی آپ کو لے جاؤں لیکن جب ہم وہاں سے واپس آ جائیں گے تو میری ماں کو ان بہت سارے سوالوں کا جواب دینا پڑے گا جن کے بارے میں اُسے پتہ بھی نہیں ہوگا۔ مجھے اپنی ماں کے اس ڈکھ کا احساس ہے اُس کے علاوہ مجھے آپ کو وہاں لے جانے میں کوئی ڈر نہیں ہے۔“

”وہ تمہاری روم میٹ ہے تاؤ اُسے بھی ساتھ لے لو۔“ جنید نے دھیرے سے کہا۔

”ہاں شاید اس طرح بات تین جائے۔“

راحیلہ نے کہا اور پھر اپنے فون سے ہاسٹل کا نمبر ملانے لگی۔ تموڑی ہی کوشش کے بعد نمبر مل گیا۔

”خیر تو ہے راحیلہ۔۔۔“ نسرین نے پریشان لہجے میں کہا۔

”خیر ہی ہے بس تم جلدی سے چند منٹ کے اندر اندر تیار ہو کر گیٹ پر آؤ کہیں جانا ہے۔“ راحیلہ نے تیزی سے کہا۔

”کہاں جانا ہے تاؤ تو۔۔۔؟“ وہ پوچھنے لگی۔

”کہہ دیا تاؤ جلدی کرو۔“

راحیلہ نے کہا اور فون بند کر دیا پھر فون بناتے ہوئے بولی۔

”وہ آئے گی، ہمیں گیٹ پر مل جائے گی۔“

”چلو پھر چلیں۔“

جنید نے کہا اور دونوں اٹھ کر گاڑی تک پہلے گئے۔ جس وقت گاڑی مین روڈ پر تیز رفتاری سے دوڑنے لگی تو راحیلہ نے اپنے گاؤں کے بارے میں تفصیل سے بتا دیا۔

☆☆

ہمایوں آف ڈے ہونے کی وجہ سے گھر پر ہی تھا۔ ناشتہ اُس نے گھر والوں کے ساتھ کیا تھا اور پھر اس کے بعد وہ اپنے کمرے میں ہی موجود تھا۔ جب سے جنید نے اُسے ایک راستہ دکھایا تھا اس لمحے ہی سے وہ پوری توجہ اور یکسوئی سے اسی سے متعلق سوچتا چلا گیا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہیں ہوا تھا۔ نجانے رات کا کون سا پہر تھا جب اُسے نیند آئی تھی اور صبح کے بعد اُس نے ہاتھ دھو کر غسل کیا اور کھانے کی صورت بھی دے دی تھی تاکہ اُس کے ذہن میں پوری طرح نقش ہو جائے، بس اب ان میں حالات پر رونے تھے جو آنے والے وقت میں ان کے سامنے آنے والے تھے۔

انسانی کیفیات بھی کیا عجیب رنگ رکھتی ہیں۔ قنوطیت طاری ہو جائے تو پھر اتنی تیزی سے اس راہ پر بھاگتا ہے کہ پھر سوائے موت کے اور کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا لیکن جو نئی اپنی اُمیدیں خواہشیں اور خواب پورے ہو جانے کا احساس ہوتا ہے تو پھر تیزی سے زندگی کی جانب پلکتا ہے۔ سوچ کی راہ پر وہ کامیابیوں کے نئے نئے نشان ڈھونڈنے کے لیے سرگرداں ہو جاتا ہے۔ اتنی دور تک کہ منصوبے بنا لیتا ہے کہ جہاں تک اُسے پہنچ جانے کی اُمید بھی نہیں ہوتی۔ اس وقت ہمایوں بھی کچھ ایسی ہی کیفیت میں مبتلا تھا۔ اُمید کی ہلکی سی کرن نے اس کی زندگی میں آجالا بھر دیا تھا۔ اُسے یہ احساس اچھی طرح تھا کہ جنید نے یونہی اس پر دولت خرچ کرنے کا نہیں سوچا بلکہ اس کے مقاصد ہوں گے۔ اگر وہ ان مقاصد کو پورا کرتا ہے تو ہی اس کے خواب اپنی تعبیر پا سکیں گے۔ ورنہ وہ یونہی کڑھتا چلتا اور بے بس سے زندگی گزارتا رہے گا۔ اس سے اچھا ہے کہ وہ کسی کے مقاصد میں استعمال ہو جائے اس طرح کم از کم وہ اپنے مقاصد کے لیے توجہ و جدوجہد کر پائے گا۔ اس راہ میں زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا وہ قانون کی گرفت میں آجائے گا یا کسی گولی کی نذر ہو جائے گا۔ اس زندگی سے تو اچھا ہے کہ وہ یوں ایک باری شعلے کی مانند جل کر بجھ جائے کم از کم ذہنی اذیت تو نہیں ہوگی۔

”ہمایوں پھر اتم ٹھیک تو ہو صبح سے کمرے میں بند ہو۔“

اُس کی ماں نے کمرے میں آ کر کہا تو وہ اپنے خیالات سے چونکا۔ چند لمحے اُسے سمجھ ہی نہ آ سکی کہ اُس کی ماں نے کہا کیا ہے اسی لیے

بولی۔

”آئیں امی! بیٹھیں۔“

اس نے کہا تو ماں اُس کے پاس کرسی پر بیٹھتی ہوئے بولی۔

”آج کل تم اتنے مصروف کیوں ہو؟“

”امی! میں محنت نہیں کروں گا تو پھر زیادہ سے زیادہ کیسے کما پاؤں گا۔“ اُس نے اپنی ماں کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن اس قدر محنت کہ ون رات کا فرق مٹ جائے۔۔۔ میں نے رات بھی دیکھا تھا تمہارے کمرے کی جی جمل رہی

تھی۔“ اُس کی ماں نے پریشانی سے کہا۔

”محنت تو ایسے ہی ہوتی ہے نا امی! اور پھر وکالت کا پیشہ تو ایسا ہی ہے کہ اس میں ساری عمر بڑھتا پڑھتا ہے۔ کیسے تیار کرنے پڑتے ہیں

اور پھر بہت کچھ۔“ اُس نے مسکراتے ہوئے اپنی ماں کو مطمئن کرنے کے لیے کہا۔

”ٹھیک ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم اپنی صحت کا بھی خیال نہیں کرو۔ صحت ہوگی تو کام ہوگا۔!“

متا بھرے لہجے میں اُس کی ماں نے کہا تو ایک لمحے کے لیے اُسے اپنے جھوٹ پر شرمندگی محسوس ہونے لگی لیکن اگلے ہی لمحے اُس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”میں اپنی صحت کا خیال رکھوں گا۔ اب خوش۔؟“

”تمہارا بھائی اب لوکری لگ جائے گا۔ تم بھی کمانے لگے ہو۔ اب ہمارے سارے دلدادہ دور ہو جائیں گے۔ میں بھی اپنے فرائض سے سرخرو ہو جاؤں گی۔“ اُس کی ماں نے مستقبل میں جھانکتے ہوئے کہا۔

”امی! کم از کم آپ کو میرے بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نہ صرف اپنا بوجھ خود اٹھاؤں گا بلکہ آپ لوگوں کے لیے بھی بہت کچھ کرنے کی خواہش ہے میرے دل میں۔ میں ابھی بہت محنت کرنا چاہتا ہوں۔ ابھی تو مجھے عدالت جاتے ہوئے تھوڑا سا عرصہ ہوا ہے۔“ ہاویوں نے اپنی ماں کو سمجھاتے ہوئے کہا وہ سمجھ گیا تھا کہ اُس کی ماں کیا کہنا چاہتی ہے۔

”بیٹا! تیرے باپ نے بہت محنت کی ہے۔ اُس نے اپنا کم اور دوسروں کا زیادہ سوچا ہے۔ تیرے چاچا اگر ساتھ۔۔۔“

”اُن کے بارے میں آپ کبھی نہیں سوچنا آپ نے۔۔۔ میں نے انہیں اپنے دل و دماغ سے نکال باہر کیا ہے۔ ہم اُن کے سہارے کے بغیر اپنے پیروں پر کھڑے ہو گئے ہیں اور وہ دن دور نہیں آئی! جب آپ کی ساری خواہشیں پوری ہو جائیں گی۔ آپ نے کسی سے بھی کوئی امید نہیں رکھنی تھیں اور بھائی ہیں نا۔!“

ہاویوں نے حوصلہ بھرے لہجے میں کہا تو اُن کے درمیان خاموشی چھا گئی دونوں ہی مستقبل میں اپنی امیدوں کو پورا ہو جانے کو دیکھ رہے تھے۔ سچی ماں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

”چل! اب اٹھ جا، تھوڑی دیر اپنے باپ کے پاس بھی بیٹھ جایا کر۔“

”جی! چھانسیں ابھی آتا ہوں۔ بس یہ ذرا کاغذات سمیٹ لوں۔“

اُس نے سعادت مندی سے کہا تو اُس کی ماں باہر نکل گئی۔ اُس نے اپنے کاغذات پر ایک ٹکاہ ڈالی پورے منصوبے کو ایک ٹکاہ سے دیکھا اور فون نکال کر اُس نے جنید کے نمبر پر کال کر دی۔ تھوڑی دیر بتل جاتی رہی پھر اُس نے فون ریسور کر لیا۔

”ہاں بولو۔۔۔؟“

”کیا آج ملاقات ہو سکتی ہے؟“

”گنا ہے تم نے کچھ کام کر لیا ہے۔“

”ہاں! میں نے بہت سوچ لیا ہے۔ کس طرح کیا کرنا ہے یہ بھی میں نے طے کر لیا ہے۔“

”تو پھر اس میں ملاقات کی کیا ضرورت ہے بس اپنا کام شروع کرو۔“

”نہیں۔۔۔ اس میں بہت ساری باتیں شیئر کرنی ہیں۔ آپ کو بھی معلوم ہونا چاہئے کہ میرا ٹریک کیا ہوگا۔“

”چلو ٹھیک ہے۔۔۔ اس وقت تو میں شہر سے باہر ہوں کسی کام چارہ ہوں۔ واپس آتے ہی تمہیں کال کروں گا اگر زیادہ دیر نہ ہوگی تو“

ویسے امکان ہے کہ میں مغرب تک واپس آ جاؤں گا۔“

”میں انتظار کروں گا۔“

یہ کہہ کر الوداعی باتوں کے بعد اُس نے فون بند کر دیا پھر اٹھ کر باہر چلا گیا۔ اُس نے سوچ لیا تھا کہ وہ تھوڑی دیر اپنے باپ کے ساتھ گزار

کر باہر نکل جائے گا تاکہ عابد الہی سے گپ شپ کر سکے۔ اس نے اپنے منصوبے میں اُسے بہت زیادہ اہمیت دی تھی وہ اس کے بہت نزدیک آچکا

تھا۔

☆ ☆

راحیلہ کے گاؤں پہنچ جانے تک ان میں تقریباً خاموشی ہی رہی تھی۔ نسرین نے کوئی ایسی بات نہیں کی تھی جس سے کسی بحث کو بنیاد مل سکتی

راحیلہ ہی جنید کو راستہ بتاتی رہی تھی۔ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ سوچ رہی تھیں کہ گاؤں پہنچنے کے بعد حالات کیا رخ اختیار کریں گے؟ نسرین کو اتنا

احساس نہیں تھا لیکن راحیلہ کو نبھانے کیوں خوف سا محسوس ہو رہا تھا۔ اس دن جنید کا انداز ہی مختلف تھا۔ راحیلہ کو یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ اسے چاہئے

کی یا آزمانے کی کوشش میں ہو یا پھر یہ سب اس کا وہم ہو۔ وہ کوئی حتمی فیصلہ نہیں کر پائی تھی اسی گفتگو میں وہ لوگ گاؤں چاہنے لگے تھے۔

وہ عام گاؤں کی طرح ہی ایک گاؤں تھا۔ کچے کچے گھر اسی طرح کچی کچی گلیاں جن میں کھیلنے ہوئے بچے جو کار کی آمد پر چونک گئے تھے

اور اپنا کھیل چھوڑ کر اس جانب متوجہ ہو گئے کہ کون آیا ہے۔ شہر سے نکلنے وقت راحیلہ کو احساس نہیں تھا کہ کس قدر گھبراہٹ ہوگی۔ وہ شرمندہ سی

گھبرائی ہوئی سی تھی۔ جنید اس کی ہل ہل بدلتی کیفیت کو دیکھ رہا تھا یہاں تک کہ ایک خستہ حال سے دروازے کے باہر راحیلہ کے کہنے پر جنید نے

گاڑی روک دی۔

”یہ میرا گھر ہے۔“ راحیلہ نے دہرایے سے کہا۔

”تو پھر چلو اندر تمہارا اپنا گھر ہے۔“ جنید نے کہا۔

”میں اپنی امی کو کیا بتاؤں گی کیا کہہ کر تعارف کراؤں گی؟“ راحیلہ نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”کہہ دینا کہ نسرین کا بھائی ہے اور یہ آگے کہیں شہر میں گئے تھے تو میں بھی ساتھ آگئی۔“

جنید نے اُس کی مشکل حل کر دی۔ اس کے یوں کہنے پر نسرین نے جنید کی طرف یوں دیکھا جیسے اس نے بہت بڑا احسان کر دیا ہو۔ وہ

تینوں گاڑی سے نکل کر گھر کے اندر چلے گئے۔ سامنے ہی ایک جھلکا سی چار پائی پر ایک بوڑھی سی عورت خستہ حال کپڑوں میں لمبوس بنری بنا رہی تھی۔

اُس نے یوں تینوں کو آتے دیکھا تو وہ گھبرائی ہوئی سی کھڑی ہو گئی۔ راحیلہ جاتے ہی اُس کے گلے لگ گئی۔ بوڑھی عورت نے ان تینوں کو پیار دیا۔

اتنے میں راحیلہ اندر سے ایک چار پائی نکال کر لے آئی جس پر جنید اور نسرین بیٹھ گئے۔

”دھیے! تم اس طرح اچانک آئی ہو خیر تو ہے نا؟“ ماں نے تشریح سے پوچھا۔

”اماں! خیرت ہی ہے۔ یہ دونوں اگلے شہر گئے تھے مسنیں بھی تم سے ملنے کے لیے ان کے ساتھ آگئی ہوں اور ابھی مسنیں نے چلے جانا ہے۔“ راحیلہ نے بمشکل جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

”ہائیں! اتنی جلدی— یہ بھلا کیا بات ہوئی؟“ ماں نے حیرت سے کہا۔

”بس! امی! اچھی کہاں ملتی ہے اور اب دن بھی کتنے رہ گئے ہیں۔ میرا کورس مکمل ہو جائے گا تو مسنیں آ جاؤں گی۔“

راحیلہ نے دھیرے سے کہا۔ جنید بہت غور سے اُن کی باتیں سن رہا تھا۔ اس دوران ماں نے اُٹھ کر چائے پینے کی کوشش کی تو جنید نے ہی روک دیا مگر تھوڑی دیر تک یونہی باتیں کرتے رہنے کے بعد راحیلہ ہی نے اپنی ماں سے کہا۔

”اچھا! امی! اب میں چلتی ہوں، مغرب سے پہلے مجھے ہاسٹل واپس بھی پہنچانا ہے۔“

”اچھا! دھیے! امیں! تو تیری راہ دیکھ رہی ہوں، کب تیرا کورس ختم ہوا اور میری بڑھی جان کو سکون مل جائے۔“ اب تم نے آنا کب ہے؟“ اُس کی ماں نے پوچھا۔

”جلدی آؤں گی، بلکہ کوشش کروں گی کہ اگلے ایک دو مہینوں میں آ جاؤں۔“

راحیلہ نے کہا اور باہر کی طرف جانے لگی۔۔۔۔۔ جنید بہت غور سے ان کے گھر کی خستہ حالی دیکھ چکا تھا۔۔۔۔۔ واپس جاتے ہوئے جب وہ گاؤں سے نکل کر بڑی سڑک کو ملانے والی چھوٹی سڑک پر آئے تو راحیلہ نے بہت ہی عجیب سے لہجے میں جنید سے کہا۔

”چہ نہیں! جنید! آپ کیا چاہتے ہو لیکن میں یہ ضرور جانتا جا ہوں گی کہ میری حقیقت جان کر آپ کو کیا لگا؟“

”مسنیں جانتا تھا کہ تم مجھ سے یہ سوال ضرور کرو گی لیکن میں تمہیں اس کا جواب ابھی نہیں دوں گا چند دن بعد تمہیں اس کا جواب مل جائے گا۔“ جنید نے اطمینان سے سڑک پر دیکھتے ہوئے کہا۔

”مسنیں نہیں سمجھی آپ کیا کہنا چاہتے ہو؟“ راحیلہ جواب چاہنے پر مصر رہی تو وہ بولا۔

”تمہیں ابھی سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں ہے دھیرے دھیرے سب سمجھ آ جائے گا۔ بس تم میرے لیے دعا کرنا کہ اللہ مجھے اتنی عمدے دے کہ کم از کم تمہارے کسی کام آ جاؤں۔“

”جنید! مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہی کہ۔۔۔“

راحیلہ نے کچھ کہنا چاہا جس پر جنید نے ٹوک دیا۔ ”مسنیں نے کہا نا! اسے چھوڑو۔ کوئی اور بات کرو۔“

”چلیں مسنیں بات کرتی ہوں۔“

نسرین نے کہا تو جنید نے اُس کی طرف بیک مرمر میں دیکھا اور کہا۔

”ہاں بولو۔۔۔ کیا کہنا چاہتی ہو؟“

”میں جو پوچھوں گی میری بات کو نہیں ٹالنا۔“ نسرین نے ایک ماں سے کہا۔

”چلو نہیں نالوں گا۔“ جنید نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”آپ نے اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ آپ کو اتنی عمر مل جائے کہ آپ راحیلہ کے کام آ جائیں۔ پوچھنا میں یہ چاہتی ہوں کہ آخر

کیوں۔۔۔ آپ کیوں ایسا چاہتے ہیں؟“ نسرین نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”کہنے کو تو میں کہہ سکتا ہوں کہ اس نے مجھ سے مدد مانگی تھی اور میں اس کی مدد کر رہا ہوں لیکن نہیں یہ بات نہیں ہے۔“ نسرین!

تمہیں نہیں معلوم کہ اس کا ایک فقرہ مجھے کس قدر حوصلہ دے گیا تھا، پہلی بار کسی نے مجھے انسان سمجھا تھا۔ میں کئی دنوں سے وحشیانہ تارچہ کا شکار تھا

میری کوئی حالت نہیں تھی۔ اس وقت میں کمزور پڑنے کی حالت میں تھا جب اس کے ایک فقرے نے مجھ میں نئی جان بھروی۔ اگر اس وقت تشدد مجھ

پر مزید بھی کر لیا جاتا تو بلاشبہ میں سہ جاتا لیکن قسمت اچھی تھی کہ دوبارہ اُن کے ہاتھ نہیں آیا۔۔۔ نسرین اندہ جانے کیوں یہ جب بھی میرے سامنے

آئی ہے میرے حوصلے بڑھانے کا باعث بنی ہے۔ میں اس کی صرف اس لیے عزت اور احترام کرتا ہوں۔“ جنید نے دھیرے دھیرے تفصیل سے

بتا دیا۔

”اور احترام نہیں کرتے مجھ پر۔“ راحیلہ نے شکوہ بھرے لہجے میں کہا۔

”احتمالاً تو میں اپنے سامنے پر بھی نہیں کرتا۔“ جنید نے سنجیدگی سے کہا۔

”میں تو کہہ رہی ہوں شاید میں نہ جان سکوں کہ آپ کس راہ کے مسافر ہیں۔۔۔ کیا اس راہ کے راہیوں کو محبت سے آشنا کی نہیں ہوتی؟“

نسرین نے لرزتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”یہ محبت ہی تو ہے نسرین! جس کے باعث ہم اُن راہیوں کے راہی ہیں جس پر چلنا بہت ہی مشکل ہے۔ ہماری محبت اللہ کے لیے ہے

اور نذرت بھی اللہ ہی کے لیے ہے۔ تم اگر اسلامی تعلیمات سے واقف ہو گئیں تو شاید تمہیں یہ سوال کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی اور جس محبت کی

بات تم کرتا چاہتی ہو تو وہ بھی ممکن ہے۔ ہم انسان ہیں۔ ہمارے سینے میں بھی دل ہے لیکن تمہیں اس میں مسئلہ پن کہیں دکھائی نہیں دے گا۔“ جنید

نے اُسے سمجھایا۔

”آپ عورت کی محبت کو کس نگاہ سے دیکھتے ہیں؟“ نسرین نے اطمینانی تجسس سے پوچھا۔

”عورت کی پاکیزہ محبت کسی بھی مرد کے لیے حوصلے کا باعث ہوتی ہے۔ ماں، بہن، بیوی یا بیٹی جب کسی مرد کے لیے دُعا کرتی ہے تو اس میں

خلوص نیت کی شدت ہوتی ہے اور اللہ پاک دُعا کو داپس نہیں لوٹاتا۔ یہ میرا ایمان ہے۔ اب تم جانتا چاہو گی کہ میں راحیلہ کی مدد کیوں کرتا چاہتا ہوں؟“

”یہی تو میں پوچھنا چاہ رہی ہوں۔“ نسرین نے جلدی سے کہا۔

”تمہارے ہسپتال میں کتنی لڑکیاں ہیں جو کام کر رہی ہیں۔ یہی میرے حوصلے کا باعث کیوں بنی ہے؟۔۔۔ یہ قدرت کا ایک اشارہ ہے

اس کے ذریعے ایک عالم شخص کو ضمیر کی عدالت میں لگا کر دیا اور ایسے ہی بے غیرت لوگوں نے ہمارے معاشرے کو عذاب بنا کر رکھ دیا ہوا ہے جو

بظاہر تو بڑے معزز ہوتے ہیں مگر حقیقت میں انتہائی کرپہ اور مکروہ ہوتے ہیں۔ ایسے یہ ہے کہ نہ کوئی قانون ان کا کچھ بگاڑ سکتا ہے اور نہ ہی یہ کسی گرفت میں آتے ہیں۔ "جنید ہات کرتے ہوئے ہلڑی سے اتر گیا پھر خود ہی احساس کرتے ہوئے بولا۔ "میں کسی اور جانب چلا گیا راحیلہ تو میرے لیے قدرت کا ایک اشارہ ہے۔ دوسری بات یہ ہے ہم جیسے لوگوں کو فقط دعائیں چاہئے ہوتی ہیں۔ دولت کے ڈبیر ہمارے قدموں میں پڑے رہتے ہیں۔ وہ لوگ جو مستحق لوگوں سے بھی زمین لیتے ہیں وہ لوگ ہمیں دولت پیش کرنے کے لیے بڑی خواہش رکھتے ہیں۔ اگر یہی دولت کسی کے کام آجائے تو میرا کیا جاتا ہے۔"

"جنید! کیا یہ آپ کی تربیت کا اثر ہے؟" نسرین نے دھیرے سے پوچھا۔

"موت کو کئی بار سامنے دیکھ چکا ہوں اس لیے زندگی کو نہیں جس نگاہ سے دیکھتا ہوں اس کا شاید تم احساس بھی نہیں کر سکتیں۔ شاید تم لوگوں کو میری باتیں کوئی ظلم یا ڈرامہ لگیں یا پھر محبت کا پلندہ۔ تم جو بھی سوچو مجھے اس سے کوئی غرض نہیں لیکن وہ حقیقت جو نہیں دیکھ چکا ہوں اس کا تم احساس کر بھی نہیں سکتی ہو۔ کیا تم نے کسی سنسناتی ہوئی کوئی کو اپنے قریب سے گزرتے ہوئے محسوس کیا ہے جو ایک اچھا اور اچھا ہو تو موت دے دے؟" جنید نے پوچھا۔

"نہیں ایسا تو تجربہ نہیں ہے۔" نسرین نے کہا۔

"تو پھر بہت ساری باتیں زمانہ نکھادتا ہے۔ حالات اور تجربات سوچنے کا اپنا ڈھنگ دے دیتے ہیں۔"

جنید نے کہا تو نسرین خاموش ہو گئی۔ وہ بہت کچھ سمجھتے ہوئے بھی کچھ نہیں سمجھتی تھی اور ایسا ہی حال راحیلہ کا تھا اسے اپنے وہ سوال فنیول معلوم ہوئے جو وہ اب تک اس سے کرنے کی کوشش میں تھی۔ پھر ان کے درمیان خاموشی چھا گئی سڑکتا چلا گیا مغرب سے ڈرا پہلے وہ اپنی اپنی سوچوں میں کھوئے شہر پہنچ گئے۔ پھر ہسپتال سے قدرے قاصد پر جنید نے گاڑی روک دی۔ جب گاڑی سے اترتے ہوئے راحیلہ نے جنید کی طرف دیکھا اور بولی۔

"جنید! ضروری نہیں ہے کہ محبت میں انسان کی منزل ناوی جسم ہی ہو شاید آپ نے بھی میری محبت کو ای رنگ میں دیکھا ہے میں اقرار کرتی ہوں کہ مجھے آپ سے محبت ہے میں آپ سے محبت کرتی رہوں گی چاہے آپ اس لمحے کے بعد مجھے ملیں یا نہ ملیں اور مجھ پر اعتماد کریں یا نہ کریں۔"

جنید اس کی طرف غور سے دیکھتا رہا۔ اس کی نگاہیں راحیلہ کے چہرے پر تھیں۔ وہ اتر گئی تو نسرین اس سے پہلے سڑک پر تھی۔ دونوں کی نگاہیں ملیں اور جنید نے گاڑی آگے بڑھا دی اور دونوں ہاسٹل کی جانب پیدل ہی چل دیں۔

☆☆

مغرب کے بعد اندھیرا پھیلنا شروع ہو گیا تھا صغیرہ اس وقت شہر سے دور تیمور کے ساتھ فارم ہاؤس پر تھی۔ وہ دونوں آنسنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے درمیان خاموشی حاکم تھی۔ صغیرہ کے چہرے پر مایوسی کے سائے پڑے ہوئے تھے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ تیمور سے

عشق کا ہے عشق بتا

کیا کہے۔ سچی تیور نے خاموشی توڑی۔

”اس قدر مایوس کیوں ہو گئی ہو؟“

”وہی ہوانا جس کا ذکر تھا۔ یہی بات آپ مجھے فون پر بھی بتا سکتے تھے۔ یہاں لانے کی اور پھر اتنی تمہید باندھنے کی کیا ضرورت تھی؟“

صفید نے برف جیسے سرد لہجے میں کہا۔

”میں تمہیں ایک ڈیم یہ بتا کر شاک نہیں دینا چاہتا تھا لیکن تم پریشان نہ ہو۔ آج اگر میرے والدین نہیں مان رہے ہیں تو میں بھی اپنی ضد کا پکا

ہوں انہیں منانوں گا۔“ تیور نے دھیرے سے کہا۔

”آپ اپنی غلطی کو مانیں کہ آپ نے انہیں وہی طور پر تیار کئے بغیر یہ بات کہہ دی حالانکہ آپ نے مجھ سے یہ وعدہ کیا تھا کہ چاہے میری

دو مہینے لگ جائیں مگر آپ۔۔۔“

صفید نے مزید کچھ کہنا چاہا تو تیور نے بات کا منہ ہوتے کہا۔ ”میں صاف مجھے ان سے یہ بات کرنا پڑی تھی۔ میں شاید ابھی بات نہ کرتا

لیکن انہوں نے خود بات کی۔ وہ میری منگنی کرنا چاہتے ہیں۔ شاہ ایہ وہی ایٹ کے ڈائریکٹر کی بیٹی شاہ سے میں اُسے پسند نہیں کرتا۔“ اُس نے وضاحت

کی۔

”ظاہر ہے اُس کے لیے بات تو پہلے ہی سے چل رہی ہوگی۔“ صفید نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

”پتہ نہیں کب سے چل رہی ہے یا انہی دنوں میں کوئی بات ہوئی ہے میں اُس کے متعلق بالکل نہیں جانتا البتہ اس سارے معاملے میں

دو باتیں ایسی ہیں جن سے میں اُمید رکھتا ہوں کہ میں اپنی بات منوانوں گا۔“ تیور نے حوصلہ بھرے انداز میں کہا۔

”کون سی باتیں۔۔۔؟“ اُس نے چہرے سے پوچھا۔

”پہلی بات تو یہ ہے کہ ابھی فقط میری ماما نے مجھ سے بات کی ہے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا ہے کہ میری رائے کیا ہے یہ پوچھنے کے

لیے پاپا ہی نے انہیں کہا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مجھ سے پوچھا گیا اپنی رائے مسلمانوں کی۔ میں نے انکار کر دیا ہے اور مجھے پوری اُمید ہے کہ

ایسا نہیں ہوگا کہ میری منگنی وغیرہ کے لیے ہاؤڈا والا جائے۔ یوں معاملہ چند گھنٹوں کے لیے ٹل گیا ہے۔“

”یہ نہ ہو کہ آپ اپنی خوش گمانوں میں رہیں اور معاملہ ہاتھ ہی سے نکل جائے؟“ صفید نے دھیرے سے کہا۔

”میں صاف ایسا نہیں ہو سکتا۔ مجھے بس تمہارے ساتھ کا یقین ہونا چاہئے کیونکہ یہی میرا حوصلہ ہے۔“ یہ کہہ کر اُس نے چند لمحوں کے بعد پھر

کہا۔ ”تم بھی مجھ سے یہی سوال کرنے کا پورا پورا حق رکھتی ہو کہ کیا میں ساتھ بھاؤں گا؟ میں نے بہت سوچا تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ میں

تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مگر جاؤں گا میں صاف۔۔۔!“ تیور نے آخری لفظ کہتے ہوئے شدت جذبات سے کہا۔

”مجھے آپ پر بھروسہ ہے تیور!“ صفید نے اندر سے پھلتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”میں نے سوچا ہے کہ تمہیں یہ احساس ضرور دوں کہ میں نے تمہیں ہی اپنا شریک زندگی بنانا ہے۔ ابھی تم نے پوچھا تھا کہ میں آخر

تمہیں یہاں کیوں لے کر آیا ہوں تو اسی لیے مصفو۔۔۔!“ یہ کہہ کر وہ اٹھا اور قریب کی دیوار میں بنی الماری کو کھولنے لگا اس میں سے ایک بڑا سا سفید لغاف نکالا اور اسے مہر پر لارکھا پھر اس میں سے کاغذ نکال کر صفیہ کے سامنے رکھ دیئے اور کہا۔۔۔!“ اسے پڑھو۔۔۔“

”یہ کیا ہے۔۔۔؟“ صفیہ نے حیرت سے پوچھا۔

”یہ دو طرح کے کاغذات ہیں۔ ان میں جو فونو کاپی والے کاغذات ہیں وہ میری دولت اور میرے کاروبار کی پوری پوری اسٹیٹمنٹ ہے۔ انہیں دیکھ لو اور یہ جو دوسرے اصل کاغذات ہیں ان کے مطابق تم میرے کاروبار میں آمدے کی شراکت دار ہو۔ میں نے اپنے آمدے کاروباری اٹانے تمہیں سچ دیئے ہیں۔ یہ ساری تفصیل ہے اسے پڑھ لو اور جہاں پر نشان لگے ہوئے ہیں کئی پنسل سے وہاں دستخط کرو تا کہ کاغذات مکمل ہو جائیں۔۔۔“

تیور نے اس طرح جذباتی لہجے میں کہا جیسے وہ اسے اپنی محبت کا یقین دلا رہا ہو۔ صفیہ اس پر پھٹی پھٹی لگا ہوں سے کبھی کاغذات کو اور کبھی تیور کو دیکھ رہی تھی۔ پھر جیسے اسے ہوش آ گیا وہ لڑنے سے ہونے لہجے میں بولی۔

”یہ۔۔۔ یہ سب آپ نے۔۔۔ میرے لیے کیا؟“

”ہاں، مصفو! میں تمہیں یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میں نے تم سے صرف وعدے نہیں کئے۔ تم میرے کاروبار میں آمدے کی شراکت دار ہو۔ میرے والدین نے تمہیں اپنی بہو مان لیا تو ٹھیک ہے ورنہ ہم اپنی نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔ تم دستخط کرو۔“ تیور نے اپنی جیب سے ایک قیمتی قلم نکال کر اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

”تیور! مجھے یقین آ گیا ہے کہ میں آپ کے لیے بہت اہمیت رکھتی ہوں۔ اب ان کاغذات کو درمیان میں مت لاؤ۔“ صفیہ جذباتی ہو گئی تھی۔

”نہیں! ایسا نہیں ہوگا تم ان پر دستخط کرو اور قانونی طور پر میرے کاروبار کی شراکت دار بن جاؤ۔ مجھے بھی اطمینان ہوگا۔ میں اسے اپنے والدین کو بھرپور وکیل کے طور پر دکھا دوں گا اور اگر خدا نخواستہ مجھے کچھ ہو گیا یا مجھے کچھ عرصے کے لیے واپس رچل بھی جانا پڑا تو کم از کم تم کاروبار کی دیکھ بھال کر سکو۔ تم مت سوچو کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں! بس دستخط کرو۔“

”تیور! نہیں۔۔۔“

صفیہ نے ہچکچاتے ہوئے کچھ کہنا چاہا تو تیور نے قلم اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ پھر صفیہ نے کاہٹتے ہوئے ہاتھوں سے چند کاغذات پر دستخط کر دیئے۔

”اب تم قانونی طور پر میری پارٹنر ہو۔۔۔ آج تم کاروباری پارٹنر ہو کل میری زندگی میں لائف پارٹنر ہوگی۔“ تیور نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

”تیور! مجھے یہ سب عجیب سا لگ رہا ہے۔“ صفیہ نے دیر سے لیکن دے بد بے جوش سے کہا۔

”لیکن چند دن بعد تمہیں یہ عجیب نہیں لگے گا اور ہاں یہ ابھی میرے والدین کے علم میں نہیں ہے۔ اسے میں خود ہی ان کے سامنے لاؤں گا، تم بھی ابھی ذکر مت کرنا اپنے والدین سے۔ بس جلدی سے اپنے فائل امتحان دے لؤ پھر تم باقاعدہ آفس آیا کرنا۔“ اس نے یوں کہا جیسے آنے والے دنوں کا خیال کر کے ہی فرحت محسوس کر رہا ہو۔

”تیور! آپ کتنے اچھے ہیں۔“

صنیہ نے اپنی لگا ہوں میں دنیا بھر کی محبت سمیٹ کر اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔
وہ مسکرا دیا پھر کھڑکی سے باہر دیکھ کر بولا۔

”باہر اندھیرا خاصا کھیل گیا ہے۔ اب ہمیں چلنا چاہئے۔ ابھی شہر تک جاتے ہوئے بھی وقت لگے گا تمہارے گھر والے پریشان ہوں گے۔“

وہ ہو جانے کے احساس ہی سے صنیہ کے دماغ سے خوارا ترنے لگا، وہ ایک دم سے چمک گئی۔ پھر گھر جانے کے لیے بے چین ہو گئی۔

شہر کی جانب پلٹتے ہوئے تیور نے گاڑی کی رفتار تیز کی ہوئی تھی مگر صنیہ کو اس کا احساس نہیں تھا۔ اس کی نگاہ میں تو وہ کاغذات پھڑپھڑا رہے تھے جنہیں وہ ابھی دیکھ چکی تھی اور پھر ان پر دستخط کیسے تھے۔ اسٹینٹ کی آخری رقم کے ہندے اس کے دماغ میں ناچ رہے تھے۔ وہ کبھی بڑے ہو جاتے اور کبھی بہت باریک۔ وہ کئی بار انہیں آدھا کر چکی تھی۔۔۔ دولت کا شمار بھی بہت عجیب ہوتا ہے اور پھر بیٹھے بیٹھے شغف میں ہاتھ آنے والی دولت میں جو خوشگوار حیرت ہوتی ہے، وہ سوچوں کو بدل کر رکھ دیتی ہے۔ اچانک دولت مند ہو جانے کے احساس نے اس میں توانائی بھری تھی۔ وہ جو کچھ دیر سے اس پر مایوسی چھا ہوئی تھی، بھانے کہاں تحلیل ہو کر رہ گئی تھی۔ اسے اب تیور بہت اچھا لگ رہا تھا۔ جس نے اس کی محبت میں اپنا آدھا کاروباری اثاثہ اس کے نام کر دیا تھا۔ یہی سوچے سوچے اسے یہ خیال آنے لگا کہ تیور اس سے کتنی اور کس قدر محبت کرتا ہے، ان لحاظ سے پہلے اسے کہاں بھی نہیں تھا۔ اسے بھرپور یقین ہو گیا تھا کہ وہ اس کے لیے اچھے والدین سے اپنی بات منوا کر ہی رہے گا۔

”صنو! کہاں کھو گئی ہو۔؟“

تیور نے پوچھا تو وہ اپنے خیالات سے چمک گئی پھر مسکراتے ہوئے بولی۔

”یہی سوچ رہی تھی کہ آپ مجھ سے کس قدر محبت کرتے ہیں۔“ اس کے لہجے میں یقین جھلک رہا تھا۔

”یہ تو کچھ بھی نہیں ہے میرا دل چاہتا ہے کہ اپنا سب کچھ تم پر اردوں۔“ اس تم دیکھتی جاؤ وقت اپنے اندر کیسے کیسے حالات رکھتا ہے۔“

یہ کہہ کر وہ چند لمبے خاموش رہا پھر مضبوط لہجے میں بولا۔ ”حالات جیسے بھی ہوں تمہارا ساتھ میرا حوصلہ ہے، صنو! میں ان سارے حالات سے خود نپٹ لوں گا۔“

”میں ہر قدم پر آپ کے ساتھ رہوں گی تیور!“

صفیہ فارا کو دلچسپی میں بولی۔ تیمور نے حسرت آمیز لہجے میں کہا۔

”کاش! تمہارے پاس وقت ہوتا تو ہم ان لمحات کو سٹیلا برین کرتے۔ کسی اوجھے سے ریسٹوران میں بیٹھ کر کھانا کھاتے، کچھ دیر مزید

ہمارا ساتھ رہتا۔“

”تو اس میں اتنی حسرت کی بات کیا ہے۔ دیر تو ہو چکی ہے۔ مہینے فون کرو جی ہوں، کچھ دیر اور سہی۔“ صفیہ نے خوش ہوتے ہوئے

کہا۔

”ذکیرہ لڑا کر کوئی پرابلم نہ ہو تو۔۔۔“ تیمور بولا۔

”پرابلم ناما میں وہ تو اب بھی جاؤں گی تو بہت ساری باتیں سنائیں گی۔ خیر آپ اپنی پسند کے کسی بھی ریسٹوران میں چلیں۔“

صفیہ نے اپنا منہ بیہوش دیا تو تیمور نے اپنی گاڑی کی رفتار مزید تیز کر دی۔ اس کی ساری توجہ جلد از جلد شہر پہنچ جانے پر تھی۔

جس وقت وہ شہر کے معروف ریسٹوران کے سامنے پہنچے تو وہاں رنگوں بھری روشنیوں کا عجیب حشر دکھائی دے رہا تھا۔ دونوں کے

چہرے پر تمازت بھر دینے والی خوش دمک رہی تھی صفیہ کے تو ایسے ہی قدم زمین پر نہیں لگ رہے تھے۔ تیمور گاڑی لاک کر رہا تھا کہ صفیہ کی نگاہ

ریسٹوران کے سین دروازے پر پڑی جہاں سے ہمایوں ایک اجنبی شخص سے باتیں کرتا ہوا باہر نکلا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی صفیہ کے من میں آگ سی بھر

گئی۔ اُس نے نفرت سے اپنا منہ پھیر لینا چاہا لیکن اس وقت تک ہمایوں کی نگاہ اس پر پڑ چکی تھی۔ صفیہ نے واضح طور پر دیکھا وہ ایک دم سے گزریا

کر رہ گیا تھا۔ اُس کی یہ کیفیت بس دو چار لمحوں ہی رہی پھر اُس نے خود پر قابو پالیا۔ صفیہ نے شطہ بارتنگا ہوں سے اُس کی جانب دیکھا تا کہ تھوڑی

بہت ہی سہی اُس کی نفرت کا اندازہ ہمایوں کو ہو جائے۔ شاید ان نگاہوں میں دولت کا شمار بھی تھا۔ یوں جیسے نگاہوں سے چلائے جانے والے نفرت

کے تیر دولت کے شمار بھرے زہر میں ڈوبے ہوئے ہوں۔ جب ان کی نگاہیں مل ہی گئی تھیں ایک دوسرے کو دیکھ ہی لیا تھا تو صفیہ نے اپنا چہرہ پلٹ لینا

مناسب نہیں سمجھا بلکہ نفرت بھری نگاہوں سے اُسے دیکھتی رہی یہاں تک کہ وہ قریب سے گزر گیا۔

”آؤ صفو!“

تیمور نے کہا تو وہ چلے گئے ہوئے ریسٹوران میں داخل ہو گئی۔ اُس کے دماغ پر ہمایوں کی آنکھیں گز گئیں تھیں۔ اُس کے من میں دھیرے

دھیرے غصہ اُبلتا چلا جا رہا تھا کہ خوشی کے اس موقع پر اس منہ کی صورت دیکھنا پڑی جس سے وہ شدید نفرت کرتی ہے پھر اُس نے سب کچھ

بھلانے کی کوشش کرتے ہوئے تیمور کا بازو تھام لیا۔

☆☆

”یہ تم اچانک اتنے ڈسٹرب کیوں ہو گئے ہو۔۔۔؟“ جنید نے ہمایوں سے اس وقت پوچھا جب وہ گاڑی نکال کر ریسٹوران سے بڑی

سڑک پر اُٹھے تھے۔

”ڈسٹرب؟۔۔۔ نہیں تو۔۔۔؟“ ہمایوں ایک دم جھوٹ بول گیا۔

”یار تمہارا رنگ چہرے پر اڑی ہوئی ہوائیاں اور یکدم سر جھما جانے کی کوئی نہ کوئی توجہ دہی ہوگی اور نہ تھوڑی دیر پہلے تک تو تم چمک رہے تھے۔ تم اپنا پلان تانے کے لیے پُر جوش تھے یہ اچانک تمہیں چپ کیوں لگ گئی ہے۔ کوئی جن بھوت دیکھ لیا ہے تم نے۔۔۔؟“ جنید نے یونہی خواہ خواہات پر حاتے ہوئے کہا تاکہ ہاویوں بھی کچھ بول سکے۔

”کچھ نہیں، بس یونہی۔۔۔ بندے کو اتنا بولنا بھی تو نہیں چاہئے۔“ ہاویوں نے واقعاً سر جھمائے انداز میں کہا۔

”تم اگر نہ تانا چاہو تو یہاں لگ بات ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ تم اس لڑکی کو دیکھ کر خاموش ہو گئے ہو جو ہمیں ریستوران کے گیٹ پر ملی تھی۔ بلکہ گلابی رنگ کا جس نے سوٹ پہن رکھا تھا، میرا خیال ہے کہ اس کے ساتھی نے اس کا نام بھی پکارا تھا، غائب مٹو۔۔۔“

جنید نے ایک ٹکا ہاویوں کے چہرے پر ڈالتے ہوئے کہا تو اس نے ایک طویل سانس لی اور بولا۔

”آپ کا اندازہ ٹھیک ہے جنید، وہی میری منزل ہے اور وہی میرا مقصد۔“

”تو اس کے ساتھ وہ تیمور تھا؟“ جنید نے تیزی سے کہا۔

”ممکن ہے وہی ہو کیونکہ میں نے اسے پہلی بار دیکھا ہے اور وہ بھی اس صورت حال میں۔“ ہاویوں کے لہجے سے جیسے ڈھواں نکل رہا ہو۔

”فہرڈ ایک منٹ باقی بات پھر کرتے ہیں۔“ جنید نے ڈیش بورڈ پر پرجے ہوئے سو بائل فون کو اٹھایا۔ پھر اس میں سے نمبر دیکھ کر پیش کر

دیئے۔ اس دوران وہ ڈرائیونگ بھی کرتا جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد کال مل گئی تو وہ کار کا نمبر بتاتے ہوئے پھر ریستوران کا نام بتا کر بولا۔ ”وہ اس کے سامنے کھڑی ہے۔ ممکن ہے اس کا ٹاک جلدی اٹھ جائے یا در سے بہر حال تم وہاں پہنچو اور اس بندے کو نگاہ میں رکھو۔ اس سے بہت ضروری کام ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے چند لمحے دوسری طرف سے سنا اور پھر فون بند کر دیا۔

”یہ کیا کر رہے ہیں آپ۔۔۔؟“ ہاویوں نے کہا۔

”یہ میرا کام ہے، اسے مجھے دیکھئے دو۔“

جنید نے کہا اور پھر خاموش ہو گیا۔ اس نے اپنی گاڑی کی رفتار بڑھا دی تھی۔ ان دونوں کے درمیان اس وقت تک خاموشی رہی جب تک

وہ پارک نہیں آ گیا جہاں سے وہ ریستوران جانے کے لیے نکلے تھے۔ گاڑی پارکنگ میں لگانے کے بعد وہ دونوں اندر چلے گئے۔ پارک میں اتنا رش نہیں تھا لیکن پھر بھی وہ ایک تہا سے پُر سکون گوشے میں جا بیٹھے۔

”تو میں کہہ رہا تھا کہ۔۔۔“

ہاویوں نے بات کرنا چاہی تو جنید اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ”ہاویوں! تمہارے کسی بھی پلان کی اس وقت تک کوئی اہمیت یا وقعت

نہیں ہے۔ جب تک تم اپنے جذبات پر کنٹرول نہیں پالیتے۔ اچانک اس کی سامنے آ جانے پر تمہارا رنگ کیا، تمہارے تو اطوار ہی بدل گئے ہیں۔ اب اگر کبھی تمہیں اس سے بات کرنا پڑ جائے تو تم کیا کرو گے، قہر توہرکانہو گے اس کے سامنے۔۔۔؟“ جنید کے لہجے میں تھہر تھا۔

”آپ نہیں سمجھتے! اسے دیکھ کر میری حالت کیا ہوگئی ہے۔ مان لیا جائے کہ میرے اور اس کے درمیان کوئی جذباتی تعلق نہیں ہے لیکن رشتہ داری تو ہے۔ میں کس طرح برداشت کر پاؤں کہ وہ کسی غیر کے ساتھ یوں آوارہ گردی کرتی پھرے۔ میرا ضبط دیکھو جنیڈ! کہ میں نے اس شخص کا گریبان نہیں پکڑا اور میری بے بسی کہ میں صفیہ کو کچھ بھی نہیں کہہ سکا بلکہ بے غیرتوں کی طرح اسے غیر مرد کے ساتھ دیکھ کر وہاں سے آ گیا ہوں تو کیا پھر بھی مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوگا؟“ ہمایوں جیسے پت پڑا تھا۔

”اس حالت میں بھی تم خود پر قابو رکھنے کی کوشش کر ڈیہاں تک کہ تمہارے ساتھ کھڑا شخص بھی تو کیا تم خود بھی محسوس نہ کر سکو۔ میں جانتا ہوں کہ انسان بہت حد تک بے بس ہو جاتا ہے خون بھی جوش مارتا ہے لیکن ہمایوں! حقیقت کیا ہے؟ یہ کتہہ بہر وقت تمہارے سامنے رہنا چاہئے۔“ یہ کہہ کر وہ چند لمبے خاموش رہا پھر بولا۔ ”چلو مجھے ایک بات بتاؤ۔ تم اس لڑکی کے لیے کس حد تک جذباتی ہو؟“

”عشق کی حد تک۔۔۔ اس کا حصول میرے لیے عشق کی حد تک چاہیے۔“ ہمایوں نے دھیرے سے کہا۔

”میں سمجھا نہیں تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“ جنیڈ نے وضاحت چاہی۔

”آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟“ ہمایوں نے گویا ہتھیار ڈال دیئے۔

”تم اس لڑکی سے عشق کرتے ہو یا اس کے حصول میں اس قدر رُو ب گئے ہو کہ تمہارا مقصد عشق کی حد تک چاہیے؟“ جنیڈ نے بات کھولتے ہوئے کہا۔

”وہ لڑکی بذات خود کوئی چیز نہیں ہے اس سے بھی خوبصورت بہت ساری لڑکیاں ہیں اور ایک حد تک ایک خاص قافلے پر رہی ہیں لیکن اس صفیہ کے ساتھ میرے حالات کچھ اس طرح سے بن گئے ہیں کہ اس کا حصول میرے لیے زندگی اور موت جیسی تمنا بن کر رہ گیا ہے۔ میں اسے حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ ورنہ میرا اس دنیا میں ہونا یا نہ ہونا برابر ہے۔“ ہمایوں کا لہجہ سنگ رہا تھا۔

”تو بات صاف ہوئی تمہیں اپنے مقصد سے لگن ہے۔“ جنیڈ نے یوں کہا جیسے خود کلامی کر رہا ہو پھر دھیرے سے بولا۔ ”دیکھو ہمایوں! میں یہ قطعاً تلخ نہیں کروں گا کہ تمہارا مقصد ٹھیک ہے یا نہیں، تم جانو مگر میں بات تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں! اسے بھی سمجھنے کی کوشش کرو۔ کسی بھی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کسی سب سے اہم چیز ہے۔ تم اگر ڈرا ڈراسی بات پر متشدد ہو جاتے رہے تو اپنے اعصاب پر بھی کنٹرول کھودو گے۔ ابھی تمہاری راہ میں کوئی مشکل یا دشواری نہیں آئی اس سے بھی بڑی بڑی رکاوٹیں تمہاری منتظر ہیں۔“

”میں کیا کروں اس کا چہرہ دیکھتا ہوں تو میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔“ ہمایوں نے پھر بے بسی سے کہا۔

”خود پر قابو رکھنا ہوگا۔ تم نے ایک رات میں پان تیار کر لیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اب تم اس میں کامیاب بھی ہو جاؤ گے۔ اس وقت تم اکیلے ہو نہیں بھی نہیں ہوں تمہارے ساتھ تو کیا تم نے ان ساری مشکلات کا تصور کیا ہے جو اس راہ میں آتی والی ہیں۔ میدان سیاست میں قدم رکھنے جا رہے ہو تو مقابلہ کن لوگوں سے ہے۔ ان جاگیرداروں سے جن کا کوئی ضمیر نہیں ہے اور وہ لوگ ہمیں کے لوگوں کا خون کھا کر انہما پر مسلط ہیں۔ وہ تمہیں اپنی راہ میں کیسے دیکھ سکتے ہیں۔ منافع خور سرمایہ داروں سے سامنا رہے گا جنہیں فقط اپنے سرمایے سے غرض ہوتی ہے اور وہ

انسانی بدن تک ہیشیوں میں جموٹک دیتے ہیں۔ کھانتے ہوئے لوگ مر جاتے ہیں لیکن انہی کی مشینوں کا ایجنٹ بنے رہنے پر مجبور ہیں۔ نوو لپٹے ہیں جن کی ناچانز کمائی ان کی رگوں میں خون بن کر دوڑتی ہے تو ان کا روم روم پکا رہتا ہے کہ وہ خود بھی ناچانز ہیں۔ ایسے لوگوں کے درمیان بہتے خود دلال ناؤٹ، فنڈے اور بد معاش بھی ہیں۔ ان سب کا مقابلہ کر سکو گے؟ — دولت کا حصول بہت آسان ہے۔ اٹھو آؤ میرے ساتھ اور ذہن میں طے کر لو کہ اتنی رقم حاصل کرنی ہے ایک رات میں حاصل کرو جتنا ہوں۔ جس وقت تمہارے ہاتھ میں دولت آئے گی لوگ تمہاری جانب متوجہ ہو جائیں گے لہذا خود کو مضبوط بناؤ اس طاقت کے لیے اپنے آپ کو تیار تو کرو جسے تم حاصل کرنا چاہتے ہو۔“

جنید نے طویل بات بڑے ہی جذبہ بانی انداز میں کی تو ہمایوں کی جیسے آنکھیں کھل گئیں۔ اس نے دھیرے سے کہا۔
 ”میں جانتا ہوں جنید بھائی کہ میرے ارد گرد ماحول کیا ہے۔ بس اس کے لیے جذبہ بانی ہو جاتا ہوں لیکن اب نہیں۔“
 ”اچے سن میں اس آگ کو سلگائے رکھو۔ اسے بچنے مت دینا بہت کام آئے گی اور سنو۔“ یہ کہہ کر جنید نے اسے اپنی جانب متوجہ کیا پھر بولا۔
 ”عشق کا مطلب ہی اپنے ہدف پر ہمہ وقت نگاہ رکھنا ہے خود کو ڈوبنا پڑتا ہے۔ میرا نہیں خیال کہ تمہیں عشق کے معنی معلوم ہوں گے۔“
 جنید نے کہا تو ہمایوں بے تابی سے بولا۔

”بس جنید بھائی، بس۔ میں کچھ گیا ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔“
 ”تو بس تم اپنے سارے پلان اپنے پاس رکھو۔ تمہیں کیا کرنا ہے کیسے کرنا ہے اس کا فیصلہ تم ہی نے کرنا ہے۔ دولت کی راہیں کس جانب جاتی ہیں تمہیں خود بخود معلوم ہو جائے گا۔ آؤ اب چلیں۔“

اس نے کہا اور اٹھ گیا۔ دونوں دھیرے دھیرے قدموں سے چلتے ہوئے بیرونی دروازے کی جانب چل پڑے۔
 ”قاروق چوہدری سے کب ملنے کا ارادہ ہے؟“ ہمایوں نے سرسری انداز میں پوچھا۔
 ”تم نے اس کے بارے میں بنیادی باتیں متا دی ہیں، تاہم جب میں مطمئن ہو گیا تو اس کا یا ممکن ہے اس سے ملنے کی نوبت ہی نہ آئے۔“ اس نے عام سے لہجے میں کہا پھر اپنا فون نکال کر اس کے نمبر پر کال کر دی۔
 ”تھوڑی دیر بعد رابطہ ہو گیا تو اس نے پوچھا۔“ ہوں کیا پتہ چلا۔ وہ دونوں وہیں پر ہیں یا وہاں سے چلے گئے ہیں تمہیں ملے؟“ یہ کہہ کر وہ دوسری طرف سے تفصیلات منتقل ہا پھر فون بند کر کے بتایا۔
 ”دونوں ابھی وہیں ہیں۔“ خیر اب اس کی نگاہ میں رہیں گے اور اس تیمور کے بارے میں پوری تفصیل معلوم کرنا پڑے گی۔ چلو یہ بھی ہو جائے گا۔“ اس نے خود کلامی والے انداز میں کہا اور پھر بیرونی دروازے کی جانب تیز قدموں سے چلنے لگا۔

☆☆

رات کا آخری پہر چل رہا تھا۔ راحیلہ بدیم ہی روشنی میں جائے نماز بچھائے اس پر بیٹھی دعا مانگ رہی تھی اس نے کچھ دیر پہلے ہی نوافل پڑھے تھے اور اس وقت وہ دل ہی دل میں رَبِّ کے حضور دعا گو تھی۔ اس کے لب پر ایک ہی دعا تھی کہ اے زندگی اور موت دینے والے رَبِّ العزت! تو جنید کی زندگی کی حفاظت کرنا جو بھی کوئی شر اس کے نزدیک آئے اسے دور کر دینا۔ میں جانتی ہوں کہ موت کا ایک وقت مہین ہے مگر اس

کی زندگی کسی غلط راہ پر تمام نہ ہو اُس کے دل میں جو درد مند دل ہے اُس کو حیرت زدہ بنا دے۔ وہ پورے جذب سے ڈعا مانگ رہی تھی۔ ایسے میں نسرین نے اپنے بیڈ پر کروٹ لی تو اُسے ہول سا دکھائی دیا۔ اُس نے غور سے دیکھا تو راحیلہ دکھائی دی۔ فوری طور پر اُس کی سمجھ میں نہیں آ سکا کہ وہ کیا کر رہی ہے اس لیے تشویش زدہ لہجے میں پوچھا۔

”اے راحیلہ! کیا کر رہی ہو۔۔۔؟“

اس پر جواب نہ ملا تو وہ جلدی سے اٹھی اور لائٹ آن کر دی جیسے ہی اُس کی نگاہ جائے نماز پر پڑھی ہوئی راحیلہ پر پڑی تو ساری بات سمجھ گئی تب تک راحیلہ نے بھی منہ پر ہاتھ بھیرے اور اٹھ گئی۔

”کیا ہو گیا ہے تمہیں۔۔۔؟“ راحیلہ نے دھیرے سے پوچھا۔

”میں ڈر گئی تھی سنیں نے سمجھا تمہیں کچھ ہو گیا ہے۔“ نسرین نے صاف گوئی سے کام لیا۔

”مجھے کیا ہوتا ہے۔۔۔ خیر سو جاؤ اب۔۔۔“ راحیلہ نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”لیکن اس وقت تم کون سی خصوصی ڈعا مانگ رہی ہو؟“ نسرین نے بھی اپنے نستر پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”نسرین! اگر کوئی کسی پر احسان کرے یا اُس کی مدد کرے تو اس کا بدلہ کیسے دیا جائے تم بتاؤ ذرا۔۔۔؟“ راحیلہ نے دھیرے سے کہا۔

”ظاہر ہے اُس سے بہت اچھا سلوک کر کے۔“ نسرین نے جواب دیا۔

”تم جانتی ہو کہ میرے پاس نہ دولت ہے اور نہ طاقت سنیں ایک بے بس لڑکی ہوں۔ میں ہنیدہ کے احسان کا بدلہ اس طرح نہیں دے سکتی جس طرح اُس نے میری مدد کی ہے۔ میرے پاس تو اک ڈعا کا وسیلہ ہے جو میں اُس کے لیے کر سکتی ہوں وہ میں پورے غلوں اور جذبے سے کروں گی۔“ راحیلہ نے اُسے سمجھاتے ہوئے دھیرے دھیرے کہا۔

”ہاں تم ایسا کر سکتی ہو۔“ یہ کہہ کر وہ ڈرائز کی پھر بولی۔ ”ایک بات سچ بتانا راحیلہ! کیا تم ہنیدہ سے محبت کرنے لگی ہو؟“

”ہاں اُس سے مجھے قطعاً انکار نہیں ہے۔ میں اُس سے محبت کرتی ہوں اور کرتی رہوں گی۔“ اُس نے صاف اعداؤں میں کہہ دیا۔

”لیکن راحیلہ! مجھے نہیں لگتا کہ وہ تم سے محبت کرے گا یونہی پتھروں سے سر پھوڑنے والی بات ہے۔“ نسرین تشویش سے بولی۔

”یہ تمہاری سوچ ہے اور میں اس پر ایسا کچھ نہیں کہوں گی کہ تم نے ایسے کیوں سوچا مگر یہ ضرور کہوں گی کہ جب وہ مجھے نہیں ملتا تھا سنیں نے اُسے نہیں دیکھا تھا تب تک میرے من میں ایسا کوئی جذبہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ کبھی کسی سے کوئی کشش محسوس نہیں ہوئی۔ وہ جو اندر سے صدا اٹھتی ہے وہاں ہر طرح سے سنا تا تھا لیکن جیسے ہی ہنیدہ کا چہرہ میرے سامنے آیا تو میں سمجھتی کہ یہ سب کیسے ہو گیا! بس اب مجھے وہی ہر طرف دکھائی دیتا ہے۔“ راحیلہ نے یوں کہا جیسے وہ نسرین کو نہیں اپنے آپ کو اپنا احوال سنا رہی ہو۔

”تم ایسی کسی راہ پر کیوں جانا چاہتی ہوں جس کی کوئی منزل ہی نہیں ہے۔ اُس نے خود کہا ہے کہ اُس کی اپنی زندگی کا کوئی اعتبار نہیں۔۔۔“

وہ کہہ رہی تھی کہ راحیلہ نے بات کا تہہ دی۔ ”کیا ہماری زندگیوں کا اعتبار ہے؟ کیا ہمیں یقین ہے کہ آج صبح کا سورج دیکھ جائے گی۔ نہیں

نا! تو پھر اس میں پریشان ہونے والی کیا بات ہے؟“

”وہ تم پر اعتبار بھی تو نہیں کرتا ہے نا!۔۔۔ اگر اُسے تمہاری بات پر اعتبار ہوتا تو وہ کبھی گاؤں جا کر تمہاری سچائی کو جاننے کی کوشش نہ کرتا۔“

”تو پھر کیا ہوا۔۔۔ میرے خیال میں اچھا ہوا اسے میری سچائی کا یقین آ گیا کہ میں نے قلم بیانی کر کے اُس کے احساس کو نہیں نہیں

پہنچائی۔“ وہ میرے سے بولی۔

”مجھے اس بات کی سمجھ۔۔۔“

”تم کوئی بات مت سمجھو نسرین! بس مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔“

راحیلہ نے واضح طور پر کہا تو نسرین کو اچھا نہیں لگا مگر اس نے اظہار نہیں کیا بلکہ سلجھے ہوئے لفظوں میں بولی۔

”خیر اس وقت تو تمہیں اُس کی محبت کا بخار چڑھا ہوا ہے۔ جب اترے گا تو میں اس وقت پوچھوں گی کہ تم نے کبھی کسی سے محبت کی

تھی؟“

”نسرین! میری جان! ہم آئے دن محبت کی کہانیاں سنتی ہیں لیکن کبھی اس پر غور کیا ہے کہ یہ محبت کیا بلا ہے؟ تم نے نہیں سوچا اور نہ اس پر

کبھی غور کیا ہے۔ میں جب اس پر غور کرتی تھی نا تو مجھے سوائے اپنی ماں کی محبت کے اور کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا لیکن اب اس پر بہت سوچا ہے میں

نے۔۔۔“

”کیا ہے یہ محبت ڈرا مجھے بھی تو پتہ چلے؟“ نسرین نے مذاق کے موڈ میں کہا۔

”اس کے لیے شرط یہ ہے کہ تم عورت بن کر سوچو فقط عورت! اپنے عورت ہونے کا احساس کرو پھر خود کو بنیاد بنا کر اپنے دین کو سوچو اور دُنیا کو

بھگنے کی کوشش کرو۔ سب کچھ واضح ہو جائے گا۔ مادی دُنیا! جسم کی طلب اور ہوس تمہیں بالکل اچھی دکھائی دیں گے۔ یہ محبت ہے نہ بہت بڑی قوت ہے۔“

راحیلہ نے کھوجانے والے انداز میں کہا۔

”تم اُسے یاد کر رہی ہو اُس کے لیے راتوں کو اٹھ اٹھ کر دعا مانگ رہی ہو۔ یہ قوت تمہیں ہی بے چکن کہنے ہوئے ہے اس کا اثر جنید

پر تو نہیں ہوگا۔ اُسے کیا معلوم کہ تم کیا کر رہی ہو؟“ نسرین نے گویا طھوکا۔

دعا نہیں اثر رکھتی ہیں اگر اس پر یقین ہو جس سے دعائیں مانگی جا رہی ہوتی ہیں اور

”میں کون سا اُس کے لیے یہ سب کر رہی ہوں میں تو اپنی محبت کے لیے۔“

یہ لفظ ابھی اس کے منہ ہی میں تھے کہ اُس کا سیل فون بج اٹھا۔ وہ دونوں ہی حیرت زدہ رہ گئیں۔ راحیلہ کے فون کی اسکرین پر جو نمبر درج

تھا وہ جنید کا تھا۔ اب تو رات صبح سے گلے ملنے والی ہے اُس نے فون کیسے کر دیا؟۔۔۔ راحیلہ نے ڈرتے ڈرتے فون اٹھایا اور رسیو کرتے ہوئے

وہ میرے سے بولی۔

”ہیلو۔۔۔“

”ہاں دیکھا۔۔۔ میں نے آج تمہیں سوتے میں جگا دیا۔“ جنید نے تازہ دم لہجے میں کہا۔

”تمہیں میں جاگ رہی تھی۔“ راحیلہ دھیرے سے بولی۔

”او۔۔۔ لیکن کیوں۔۔۔؟“ اُس نے حیرت سے پوچھا۔

”بس یونہی نرسین سے باتیں کر رہی تھی۔“ اس نے اطمینان سے کہا۔

”اچھا خیر۔۔۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ آج اپنے ہسپتال سے چھٹی کر سکتی ہو؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔

”پتہ نہیں۔۔۔ خیریت تو ہے نا۔۔۔؟“ ایک لمبے کورا حیلہ کی آواز لرز گئی۔

”ہاں خیریت ہے۔۔۔ اگر تم آج چھٹی کر سکو تو ٹھیک ورنہ کل ضرور چھٹی کر لینا لیکن آج شام کے وقت مجھے ملنا ہے۔“ جنید نے اُلٹتے

ہوئے کہا۔

”اگر میں آج کی چھٹی کر لوں تو۔۔۔؟“

”تو پھر مجھے فون کرنا۔۔۔ تمہیں عدالت میں آنا ہوگا کچھ دیر کے لیے۔۔۔“ جنید نے حیرت سے کہا۔

”عدالت۔۔۔ مگر کیوں؟“ راحیلہ نے حیرت سے پوچھا۔

”یہ تم وہاں آؤ گی تو متاؤں گا۔۔۔ بہر حال جو بھی صورت حال ہوتی ہے لیکن سورج نکلنے کے بعد آپ کچھ دیر کے لیے میرا فون بند ہوگا۔۔۔“

اچھا اللہ حافظ!

جنید نے کہا اور فون بند کر دیا۔ راحیلہ اس فون کال پر حیرت زدہ رہ گئی تھی۔

وہ دونوں ہی جنید کی فون کال پر حیران تو ہوئی تھیں لیکن ایسی عدالت میں بلانے پر تھوڑا پریشان بھی ہو گئی تھیں۔ ان کے درمیان خاموشی

آن ٹھہری تھی۔ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ سوچ رہی تھیں کہ جنید نے ایسا کیوں کہا پھر اس خاموشی کو نرسین ہی نے توڑا۔

”خیر یہ تو بعد میں ہم بکھنے کی کوشش کریں گی کہ جنید نے یوں اچانک عدالت میں کیوں بلایا ہے لیکن یہ دیکھو کہ میں اس وقت اُس کا فون

آیا ہے جب ہم اس کے بارے میں باتیں کر رہی تھیں۔“

”یہ کوئی آنہوئی تو نہیں ہوگی ایسا تو اکثر ہوتا ہے۔“ راحیلہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بھری مراد ہے کہ تمہاری اور اُن کی محبت کے بارے میں جو ہم باتیں کر رہے تھے۔“ نرسین نے جھینپتے ہوئے کہا۔

”اُس کی محبت کا مجھے نہیں پتہ میں اپنی محبت کی بات کر رہی تھی۔“ یہ کہہ کر راحیلہ چند لمحوں کے لیے جیسے کھوی گئی پھر بولی۔ ”نرسین اب

نارل انسان اپنے معاملات کو وہ اور دو چار کر کے ہی دیکھتا ہے۔ ایسا کرنا بھی چاہئے کہ یہ عقل کا تقاضا ہے مگر جب معاملات دل کے ہوتے ہیں نا تو

وہاں کوئی کلیہ کام نہیں آتا۔“ راحیلہ نے اُس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

”تمہارا کیا مطلب ہے محبت انسان کو نازل نہیں رہنے دیتی؟“ نسرین کے لہجے میں حیرت تھی۔

”انسان نازل رہے یا نہ رہے لیکن کامل بننے کی راہ پر گامزن ضرور ہو جاتا ہے۔“ راحیلہ نے یوں کہا جیسے وہ کہیں اندر ڈوب کر بات کر رہی

—

”خیر چھوڑو یہ سوچو کہ اس نے تمہیں عدالت میں کیوں بلا لیا ہے۔ کہیں وہ تم سے کورٹ میرج تو نہیں کرنا چاہتا؟“ نسرین ہنستے ہوئے

بولی۔

”میرا خیال ہے وہ ایسا ہرگز نہیں کرے گا اور ان حالات میں تو قطعاً نہیں جب میرے امتحان بالکل قریب ہیں اور میری ہاسٹل کی زندگی

شتم ہونے والی ہے۔“

”تو پھر کیا ہو سکتا ہے۔“ نسرین کو بے حد تجسس تھا۔

”یہ تو وہ ہیں جا کر معلوم ہوگا۔۔۔ بہر حال میں جاؤں گی۔“

اس نے مضبوط لہجے میں کہا اور نیکی کے ساتھ سر نکال کر سوچوں میں ڈوب گئی۔ نسرین اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ کئی لمحوں تک وہ اسے غور

سے دیکھتی رہی پھر ویرے سے بولی۔

”راحیلہ تم کتنی بدل گئی ہو۔۔۔ ہر وقت چلنے کڑھتے رہنے والی اپنے آپ میں ڈوب گئی ہے یوں جیسے پوری دنیا سے واسطہ ہی نہ رہا ہو

اور وہ جو تمہاری زندگی کے لیے عذاب جان بنا ہوا تھا ڈاکٹر جمیل وہ بھی اب کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ کتنا سکون سا آ گیا ہے تمہاری زندگی میں۔“

”یہ محبت کی کرامت ہے نیاری محبت انسان کو حوصلہ دے دیتی ہے۔ انسان باہر کی دنیا نہیں بلکہ اپنے اندر دیکھتا ہے کیونکہ ایک سمندر

رواں ہو جاتا ہے من میں۔۔۔“ یہ کہہ کر اس نے نسرین کی جانب دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے بولی۔ ”اب تمہارا کونز تمہیں چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ یہ

حقیقت ہے کہ اس نے تم سے بے وفائی کی تم سے کیے وعدے پورے نہیں کیے لیکن تم اب بھی اسے سوردالز ام نہیں سمجھتی ہو بلکہ اس کی جھجوری

گردانی ہو اور اس کے باوجود تم دکھ محسوس کرتی ہو۔۔۔ آخر کیوں یہ سوچا کبھی تم نے۔۔۔؟“

”تم سمجھاؤ۔۔۔“ وہ ویرے سے بولی۔

”اس میں کوئی اتنی الجھن نہیں ہے صرف سوچ کا فرق ہے۔ تم دونوں کے تعلق میں کہیں کوئی غرض تھی جس کے پورا نہ ہونے کا دکھ تمہیں

ہوتا ہے۔ خالص محبت جس میں کوئی غرض نہیں ہوتی وہاں دکھ نہیں ہوتے بس اپنی محبت میں ڈوبتے جانے کی کوشش میں انسان آگے ہی آگے بڑھتا

چلا جاتا ہے۔“ راحیلہ نے یوں کہا جیسے وہ اپنا حال بتا رہی ہو۔

”میں کبھی نہیں۔۔۔“ نسرین بولی۔

”تمہیں اس وقت سمجھ آئے گی جب کسی غرض کے بغیر تم اس بات کو سوچنے کی کوشش کرو گی۔۔۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ تھوڑی دیر حریہ

سولیں پھر آج باہر بھی جاتا ہے۔“

”لیکن میڈم سے چھٹی۔“ وہ بولی۔

”چھٹی نہیں لیتی اے اپنے باہر جانے کا نقطہ تانا ہے بلکہ۔۔۔“

راحیلہ نے مسکراتے ہوئے کہا تو سرین بات کاٹتے ہوئے بولی۔ ”اب اتنی بھی غصہ کر دی مت کرو۔“

”چلو تمہاری بات مان لیتے ہیں لیکن فی الحال تو سونے دو۔۔۔“

راحیلہ نے چادر اوڑھتے ہوئے کہا تو سرین نے غی بجھا دی۔

☆☆

قلمکار کلب پاکستان

☆..... اگر آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے اور آپ مختلف موضوعات پر لکھ سکتے ہیں؟

☆..... آپ اپنی تحریروں میں ہمیں روانہ کریں ہم ان کی نوک پلک شواروں کے۔

☆..... آپ شاعری کرتے ہیں یا مضمون و کہانیاں لکھتے ہیں؟

☆..... ہم انہیں مختلف رسائل و جرائد میں شائع کرنے کا اہتمام کریں گے۔

☆..... آپ اپنی تحریروں کو کتابی شکل میں شائع کرانے کے خواہشمند ہیں؟

☆..... ہم آپ کی تحریروں کو ویڈیو، ذریعہ و گمشدہ انداز میں کتابی شکل میں شائع کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔

☆..... آپ اپنی کتابوں کی مناسب تصویر کشی کے خواہشمند ہیں؟

☆..... ہم آپ کی کتابوں کی تصویر کشی اور رسائل میں تصویروں اور تصویروں میں شائع کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔

☆..... اگر آپ اپنی تحریروں کے لیے مختلف اخبارات و رسائل تک رسائی چاہتے ہیں؟

☆..... تو..... ہم آپ کی صلاحیتوں کو مزید نکھارنے کے مواقع دینا چاہتے ہیں۔

☆..... مزید معلومات کے لیے رابطہ کریں۔

☆..... ڈاکٹر صابر علی ہاشمی

☆..... قلمکار کلب پاکستان

☆..... 0333 222 1689

☆..... qalamkar_club@yahoo.com

اس وقت دن کا پہلا پھر ختم ہو جانے کو تھا جب راحیلہ عدالت کے باہر رکتے میں سے اتری۔ ٹریفک کے شور میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ جنید سے بات کر کے ہی چلی تھی اس نے ایک نمبر اسے دیا تھا کہ جیسے ہی تم وہاں پہنچو اس نمبر پر کال کر کے وہاں چلی جانا۔ وہ دوسرا نمبر تھا جو اس کے فون میں محفوظ ہوا تھا۔ راحیلہ سڑک سے ہٹ کر احاطہ عدالت کی جانب چل دی پھر ایک جانب جا کر اس نے وہ نمبر ملا دیئے۔ چند لمحوں بعد ہی فون رسبو کر لیا گیا۔

”میں راحیلہ بات۔“ وہ اتنا ہی کہہ پائی تھی۔

”آپ کہاں پر ہیں؟۔۔۔ میں ہمایوں بات کر رہا ہوں۔“

دوسری طرف سے تیزی کے ساتھ کہا گیا تو راحیلہ نے اپنے بارے میں بتاتے ہوئے پوچھا۔

”آپ کہاں پر ہیں؟“

”میں ادھر ہی ہوں۔ آپ وہیں ٹھہریں میں چند منٹ میں آپ تک پہنچ جاتا ہوں۔“

ہمایوں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ راحیلہ وہیں کھڑی رہی اور تقریباً دس منٹ بعد اس نے ایک نوجوان کو دیکھا جو اس کے قریب آ کر عبیدی سے بولا۔

”آپ راحیلہ ہیں۔۔۔؟“

”جی۔۔۔“ اس نے انتہائی اختصار سے کہا۔

”میں ہمایوں ہوں۔۔۔ اگر آپ چاہیں تو جنید سے بات کر لیں تاکہ آپ کو میرے بارے میں پوری تسلی ہو جائے۔“

ہمایوں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو راحیلہ نے جنید کے نمبر پیش کر دیئے۔ چند لمحوں بعد وہ بولا۔

”ہاں تم پہنچ گئی ہو۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔ میرے پاس ہمایوں صاحب کھڑے ہیں۔“

”بات کراؤ۔۔۔“

راحیلہ نے فون ہمایوں کی جانب بڑھا دیا یوں دونوں کے درمیان بات ہو جانے کے بعد راحیلہ کو اطمینان ہو گیا۔ اس نے فون واہس لیا اور اس کے ساتھ چل پڑی۔ دونوں آگے بچھے پلٹے ہوئے ایک کیمبر میں جا پہنچے جو خالی تھا۔ ہمایوں نے اسے وہاں بٹھایا اور باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ واہس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک فائل دبی ہوئی تھی۔ اس کے بچھے ہی ایک ملازم نما شخص چائے کے ساتھ لوازمات لے کر آ گیا اس نے ٹرے رکھی اور وہ ابس چلا گیا۔ ہمایوں نے چائے کپ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

”اب مجھے نہیں معلوم کہ جنید نے آپ کو میرے متعلق بتایا ہے کہ نہیں میں اپنا۔۔۔“

”مجھ میری ان سے فون پر بات ہوئی تھی تب انہوں نے مجھے آپ کے بارے میں تفصیل سے بتا دیا تھا۔“ راحیلہ نے دھیرے

سے کہا۔

”چلیں میرا کام آسان ہوا۔ اب مجھے کسی چوڑی تمبیہ نہیں ہاندھنا پڑے گی۔ لیجئے یہ چائے پیجئے۔“ اس نے کپ اس کے سامنے رکھا اور دوسرا اٹھا کر اپنے سامنے رکھ لیا۔

”لیکن ایک بات مجھے انہوں نے نہیں بتائی کہ مجھے یہاں کیوں بلا یا گیا ہے؟“ وہ پچیس اعزاز میں بولی۔

”ٹھیک۔۔۔! ہمایوں نے مجھے والے اعزاز میں کہا۔ پھر یولا۔ ”وہ منیں آپ کو سمجھا دیتا ہوں۔ دراصل انہوں نے آپ کے لیے ایک گھر بنا دیا ہے۔ اس کی ساری ادائیگی وغیرہ ہو گئی ہے بس قانونی طور پر آپ کے نام کرنے میں چند کاغذات کی تکمیل ہونا باقی ہے اور یہ میری ذمہ داری ہے۔ آپ نے چند کاغذات پر دستخط کرنے ہیں اور۔۔۔“

”لیکن انہوں نے اگر ایسا کیا ہے تو مجھ سے نہیں پوچھا۔ منیں نہیں چاہتی مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

اس نے یوں کہا جیسے یہ سب سن کر اُسے بہت دکھ ہوا اور تب ہمایوں نے اس کی جانب حیرت سے دیکھا اور یولا۔

”یا آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“

راحیلہ نے اُس کی بات نظر انداز کر دی اور فون پر چند کے نمبر پیش کر دیئے۔ چند لمحوں بعد اس کا رابطہ ہو گیا۔

”چند! آپ نے کسی گھر کو میرے نام کرنے کے لیے یہاں مجھے بلوایا ہے؟“

”ہاں۔۔۔ تمہیں ہمایوں نے تفصیل نہیں بتائی؟“

”مجھے تفصیل جاننے کی ضرورت بھی نہیں ہے کیونکہ منیں ایسا نہیں کروں گی۔“ راحیلہ نے صاف لفظوں میں کہا۔

”اوہ!“ اس نے چہ چکتے ہوئے کہا پھر یولا۔ ”جب منیں کہہ رہا ہوں کہ ایسا کرو تو پھر کرو۔“

”کیوں منیں ایسا کیوں کروں؟۔۔۔ یہ کوئی موہا بل فون سیٹ نہیں ہے۔ یہ بہت بڑی بات ہے اور منیں۔۔۔“

”تم ایسا کرو وہیں تمہرے منیں آ رہا ہوں۔“ چند نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”لیکن اس لیے نہیں کہ۔۔۔“

وہ کہتی گئی تو پھر بات کٹ گئی۔ ”۔۔۔ نہ کرنا۔۔۔ منیں تمہیں وہاں سے پک کروں گا ہم کہیں اور جا کر بات کریں گے۔“

چند نے کہا اور فون بند کر دیا۔ تب راحیلہ نے ہمایوں کی جانب دیکھا۔ اُس نے کوئی بات نہیں کی محض کاغذ اُچکا کر چائے پیتا رہا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد راحیلہ حاظر عدالت سے باہر آ گئی جہاں چند ایک گاڑی میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اُس کے ساتھ بیٹھی تو اُس نے گاڑی چڑھا دی۔

”آ خر تمہیں کیا اعتراض ہے۔ منیں جب تمہارے لیے ایک گھر خرید رہا ہوں تو۔۔۔!“ اُس نے پوچھا۔

”یہ ٹھیک ہے کہ آپ میرے حسن ہیں لیکن منیں یہ بھی نہیں چاہوں گی کہ آپ میری غربت کا مذاق اُڑائیں۔ منیں مانتی ہوں کہ منیں

ایک گاؤں کی رہنے والی فریب لڑکی ہوں لیکن مجھ میں ابھی غیرت ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ ایک پختہ گھر جو شہر میں ہو اس کے لیے میری زندگی کے نبھانے کتنے سال خرچ ہوں گے مگر مجھے خود پر بھروسہ ہے۔" راحیلہ نے انتہائی جذباتی انداز میں کہا۔

"تقریر کر چکی ہوتی؟" جنید بڑے ہی اطمینان سے بولا۔

"کیا مطلب ---؟" راحیلہ نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

"کل تم محبت کے دعوے کرتی تھی ہو اور آج اپنے اس دعوے کے بالکل برعکس بات کر رہی ہو۔" وہ دیر سے بولا۔

"کیا کہہ رہے ہیں آپ ---؟" وہ بالکل نہ سمجھتے ہوئے بولی۔

"یہ گھر میں تمہیں نہیں دے رہا بلکہ میں اپنے لیے خرید رہا ہوں۔ تمہیں پتہ ہے میرا کوئی مستقل ٹھکانہ نہیں ہے۔ میں اپنے نام سے کوئی شے خرید نہیں سکتا اور اگر خریدوں گا بھی تو وہ میرے کسی کام نہیں آنے والی بلکہ میرے گلے کا پھندا ابھی بن سکتی ہے۔ میں نے کل جب تمہاری والدہ کو دیکھا تو مجھے ان پر ترس نہیں آیا اور نہ ہی میں بھڑوی کر رہا ہوں بلکہ میں نے اپنا فائدہ سوچا ہے۔ میں تمہاری مختصر سی فیملی کے ساتھ بہت اچھا وقت گزار سکتا ہوں۔ ہاں اگر تم ڈرتی ہو کہ کل کلاں میری وجہ سے تم پر بھی حساب نازل ہو جائے گا تو بالکل انکار کر دو۔"

"کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں؟" راحیلہ نے حیرت سے پوچھا وہ اس تصور سے ہی شاداں و فرماں ہو گئی تھی۔

"ہاں میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ ممکن ہے کہ میں وہاں رہوں چند دن رہوں بہت عرصہ رہوں یا پھر بالکل نہ رہوں لیکن مجھے یہ معلوم ہوگا کہ میرا ایک محفوظ ٹھکانہ ہے اس دنیا میں جہاں میں اطمینان سے رہ سکتا ہوں۔ اگر تم اتنی قربانی دے سکتی ہو تو ٹھیک ورنہ پھر ---" یہ کہہ کر اس نے اپنا گھر اور چھوڑ دیا۔

"نہیں میں ڈرتی نہیں ہوں۔ آپ کے لیے اپنی جان بھی دے سکتی ہوں۔" راحیلہ نے ول سے کہا۔

"مجھے تمہاری جان کی نہیں تمہاری زندگی کی ضرورت ہے۔"

جنید نے کہا تو وہ پوری جان سے سرت آگئیں کیلیت میں کھو گئی چند لمحوں تک وہ اسی میں ڈوبی رہی پھر بولی۔

"جیسا آپ چاہیں۔"

"تم ویسے ہی دہیں اپنے ہاسٹل میں رہو گی لیکن تمہاری والدہ یہاں رہیں گی ان کے ساتھ ایک فیملی رہے گی جو ان کی دیکھ بھال کرے گی۔ چاہو تو ان سے ملتی رہنا اور جب تمہارے امتحان ہو جائیں گے تو پھر فیصلہ ہوگا کہ تم نے کیا کرنا ہے۔ اگر منظور ہے تو واپس عدالت کی جانب چلیں ورنہ تمہیں تمہارے ہاسٹل چھوڑ دیتا ہوں۔" جنید نے حتمی انداز میں کہا۔

"آپ عدالت کی طرف ہی چلیں۔"

راحیلہ نے مضبوط لہجے میں کہا تو جنید نے اگلے پونڈن سے گاڑی موڑ لی۔ پھر فون پر ہٹا دیا کہ راحیلہ واپس آ رہی ہے۔ جس وقت راحیلہ نے عدالت کے باہر اترنا تھا تب جنید نے کہا۔

عشق کا ہے عشق بتا

”جب وہ گھر تمہارے نام ہو جائے گا تو اسے دیکھنے چلیں گے اب چاؤ۔“

راجیلہ نے اس کی طرف بڑی گہری نگاہوں سے دیکھا اور گاڑی سے اتر گئی۔ اس کا رخ احاطہ عدالت کی جانب تھا۔

☆☆

صفیہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی تیار ہو رہی تھی۔ اسے اپنی ایک کھلی کے ساتھ اس کی کلاس فیلو کے ہاں جانا تھا جس نے بڑے اہتمام سے انہیں سالگرہ پارٹی کی دعوت دی تھی۔ جب سے تیور نے اس سے کاغذات پر دستخط کروائے تھے وہ ہواؤں میں اڑنے لگی تھی۔ وہ اپنے انداز و اطوار سے ایک کاروباری خاتون ہونے کا احساس دلا رہی تھی۔ اگرچہ ابھی اس کی عمر نہیں تھی لیکن جیسے کاروباری خواتین جنہیں عرف عام میں ”بزنس ویمن“ کہتے ہیں وہ خود کو سمجھ دیتا کر رکھتی ہیں تاہم اس میں بھی انہوں نے فیشن کا پہلو تلاش کر لیا ہوا ہے اور صفیہ بھی اس وقت اپنے آپ کو ایسے ہی لہاس اور انداز میں دیکھ رہی تھی۔ اٹھنے سے پہلے اس نے خود پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی۔ تھی اس کے من میں خواہش ابھری کہ تھوڑی دیر کے لیے سنی اسے تیور سے ملنا چاہئے۔ شاید یہ کسی عورت کی وہ لاشعوری خواہش تھی کہ وہ بین ستور کر کسی کو اپنا سراپا دکھانا چاہتی ہے۔ اس نے سامنے ٹیبل پر پڑا فون اٹھایا اور اس کے نمبر پیش کر دیئے۔ چند لمحوں بعد دوسری جانب سے فون اٹھایا گیا۔

”ہاں یوں صفیہ اس وقت میری کیسے یاد آگئی؟“

”پرانا ڈائلاگ ہے تیور! لیکن اس وقت چلے گا اور وہ یہ ہے کہ آپ کو بھولے ہی کب تھے آپ تو ہمیشہ میرے ساتھ رہتے ہو۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

”چلو مان لیتے ہیں لیکن پھر بھی۔۔۔؟“ تیور نے جلدی سے کہا۔

”تیور! تمہارے کیوں سہرا دل چاہ رہا ہے کہ میں آپ سے ملوں حالانکہ میں آج اپنی ایک کلاس فیلو کی سالگرہ پارٹی میں جا رہی ہوں۔“ اس نے بڑے مان سے کہا جس میں لہاس لینے والا انداز تھا۔

”اوہ۔۔۔ تو ایسی کون سی راہ میں رکاوٹ ہے۔ تم جب وہاں سے لکھنا تو مجھے فون کر دینا پھر ہم کسی بھی جگہ مل لیں گے۔“ اس نے عام سے لہجے میں کہا۔

”ٹھیک ہے لیکن اگر دیر ہوگی تو پھر نہیں میری ماما پہلے ہی مجھ پر پابندیاں لگانے کی گھر میں ہے۔“ اس نے پھر ایسے ہی لہجے میں کہا جیسے وہ اسے بھاری ہو۔

”آپ تو نہیں بھی کہہ سکتا ہوں کہ جیسا تم چاہو۔۔۔“ اس نے وچیرے سے کہا۔

”اوکے سنی فون کروں گی۔۔۔“

صفیہ نے کہا اور پھر فون بند کر دیا اسی لمحے ہارن کی آواز سنائی دی۔ صفیہ جب ڈرائنگ روم میں آئی تو اسکی کھلی زینچون بی بی کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ صفیہ ایک دم سے چونکا ہو گئی تمہارے اس کی ماما کیا کہہ دے؟ اس نے چورنگا ہوں سے اپنی ماں کو دیکھا اور پھر کھلی کی جانب دیکھ کر بولی۔

عشق فنا ہے عشق بتا

”تم بڑے وقت پر آئی ہو میں تو کبھی تمہی کہہ دیر لگا دو گی۔“

”وقت پر آنے کا مطلب ہے کہ وقت پر واپس بھی آیا جائے۔“ اس کی سہیلی نے کہا۔

”تو پھر میرا خیال ہے ہمیں جلدی جانا چاہئے۔“ یہ کہہ کر وہ ڈرائنگ روم سے نکل چلی گئی زینتوں بی بی اے سے جاتے ہوئے دیکھتی رہی لیکن ایک لفظ بھی نہیں کہا۔

مغرب سے پہلے پارٹی ختم ہو گئی تو صفیہ نے وہاں سے نکلتا چاہا اس کی سہیلی کا ابھی واپس آنے کو ہی نہیں چاہ رہا تھا بہت مشکل سے وہ اسے لے کر باہر نکلی مگر جب گاڑی میں بیٹھ چکی تو صفیہ نے دبے دبے غصے میں کہا۔

”وہاں میرے گھر تو بہت کہہ رہی تھیں کہ جلدی واپس آنا ہے اور یہاں سے تمہارا نکلنے کو ہی نہیں چاہ رہا تھا۔“

”یار ایسے ہنگامے ہم لڑکیوں کو دیکھنے کے کہاں مواقع ملتے ہیں۔ ویسے میں نے عشاء تک واپس جانے کا کہا تھا لیکن تم نے جلدی کی۔۔۔“

”خیر میں تمہیں ڈراپ کر کے باہر ہی سے چلی جاؤں گی۔“

صفیہ نے اپنے ذہن میں جان بٹالیا تھا کہ اس نے کیا کرنا ہے۔ یونہی عام سی باتوں میں سفر کرتا گیا اور صفیہ نے اپنی سہیلی کو ڈراپ کر دیا۔ پھر تیمور کا نمبر ملایا اور اس سے جگہ کا تعین کر کے چل دی اس کی منزل ایک چائینیز ریسٹوران تھا۔

”آج تم بہت خوب لگ رہی ہو لگتا ہے کوئی گہری سہیلی تمہی جس کے لیے اتنا جہاں کیا گیا تھا۔“

تیمور نے ریسٹوران کے ایک گوشے میں بیٹھتے ہی پہلی بات کی تو صفیہ دل ہی دل میں اپنی تعریف پر نہال ہی ہو گئی۔

”ایسا تو نہیں۔۔۔ میں نے دراصل آپ سے ملنے کے لیے اس بہانے کا سہارا لیا تھا۔“ صفیہ نے شمارہ آلود آواز میں کہا۔

”اوه تو ہماری قربت اب اس قدر اچھی لگتی ہے آپ کو۔۔۔؟“ تیمور خوش ہوتے ہوئے بولا۔

”ظاہر ہے۔۔۔ لڑکی اپنی زندگی میں ایک ہی مرد کو چاہتی ہے اور پھر ساری زندگی اس کے ساتھ گزارنے کی خواہش کرتی ہے۔“

صفیہ نے صاف لفظوں میں اپنی بے تابی اس پر ظاہر کر دی جس پر تیمور نے بڑے عطا انداز میں کہا۔

”میں نے کچھ اور بھی سوچا ہے اگر میرے والدین نہ مانے تو میرے پاس برطانوی شہریت ہے میں اور تم ہمیشہ کے لیے یہ وطن چھوڑ کر چلے جائیں گے وہاں ہم بہت سکون سے رہیں گے۔“

”کیا آپ اس حد تک سوچ رہے ہو؟“ صفیہ نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں تو اور کیا۔۔۔ اب تمہارے بغیر زندگی گزارنا بہت مشکل ہو رہا ہے یہ تو میں ہی جانتا ہوں کہ ایک ایک دن کس طرح گزار رہا ہوں۔“

”ہاں۔۔۔ یہ میرے قائل استحقاق درمیان میں نہ ہوتے تا تو نہیں۔“ صفیہ کہتے کہتے رک گئی۔

”خیر ہم جب اس قدر قریب آئی تھیں تو اب ہمیں زیادہ دور نہیں رہنا چاہئے۔ کم از کم بیٹے میں ایک ہارتو میں سارا دن ایک ساتھ گزارنا چاہئے۔“ تیمور بڑے محتاط انداز میں صنفیہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

”ول تو میرا بھی چاہتا ہے لیکن۔۔۔ فائل امتحان تک بہت مشکل ہے۔“ صنفیہ نے تیمور کی بات میں اس خواہش کو کھینچے ہوئے کہا جو نجانے کتنی بار وہ اس کی آنکھوں میں پڑھ چکی تھی اور اس وقت بھی وہ اس کا مطلب بہت اچھی طرح سمجھ چکی تھی۔

”جیسے تمہاری مرضی مننی کیا کہہ سکتا ہوں۔۔۔“ تیمور نے فوراً ہی اس کی ہاں میں ہاں ملا دی لیکن لہجہ بہت زیادہ مایوسی بھرا تھا۔ اس پر صنفیہ نے جب کچھ نہ کہا تو وہ بولا۔ ”لیکن ایسا تو ممکن ہے کہ فائل امتحان سے پہلے ایک بار ہم بھرپور انداز میں انجوائے کریں سارا دن فارم ہاؤس پر گزاریں۔ تم کوئی سا بھی بہانہ نہ کر سکتی ہو۔“

”ہاں ایسا ہو تو سکتا ہے پر۔۔۔“ صنفیہ نے پہلو جھٹی چاہی۔

”بس فائل ہو گیا۔ تین دن بعد تمہارے کالج کی چھٹی ہے اور ہم وہ دن فارم ہاؤس پر گزاریں گے۔ خوب باتیں کریں گے انجوائے کریں گے اور مستقبل کا پلان بنا لیں گے۔“

تیمور نے حتیٰ انداز میں کہا تو صنفیہ نے دھیرے سے اپنی گردن ہلا دی۔۔۔ دونوں کافی دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ اس دوران کھانا بھی آ گیا۔ کھانے کے دوران تیمور نے صنفیہ کو فارم ہاؤس پر جانے اور وہاں دن گزارنے کے پلان سے پوری طرح آگاہ کر دیا تھا۔

صنفیہ جس وقت گھر واپس آئی تو اس وقت تیمور کی باتوں کا روبرو اور برطانیہ کے شہر چٹول کے بارے میں ہونے والی گفتگو کا شمار اس پر حاوی تھا۔ اس کے ذہن میں فارم ہاؤس پر گزارنے والا وہ دن بھی تھا جس نے دو دن بعد آ جانا تھا۔ اس نے گاڑی کھڑی کی اور ڈرائنگ روم میں چلی گئی جہاں اس کی توقع کے عین مطابق اس کی ماں زینون بی بی اس کا انتظار کر رہی تھی اسے دیکھتے ہی وہ سسلی سے بولی۔

”اس سے پوچھو سسلی! یہ اتنی دیر کہاں رہی ہے؟“

”منیں کہیں بھی جاؤ کچھ بھی کروں اس سے آپ کو ذرا بھی مطلب نہیں ہونا چاہئے۔ یہ اتنی منیں آپ لوگوں کو کیسے سمجھاؤں؟“ صنفیہ نے پرس صوفے پر پھینکتے ہوئے کہا۔

”بیٹیوں کے یہ لہجے نہیں ہوتے۔۔۔ اتنی بد اخلاق بنی یا اللہ! اسے موت دے دے یا پھر مجھے اٹھالے۔“ زینون بی بی نے ڈکھے ہوئے دل سے کہا اور اٹھ کراپے کرے میں چلی گئی۔

”تم امی کے ساتھ اس قدر بد تیزی سے کیوں پیش آتی ہو؟“ سسلی نے غصے میں پوچھا۔

”یہ تم ماں بیٹی نے میرے ہارے میں ہی تعیش کا خسیک کیوں لیا ہوا ہے منیں نے کبھی یہ پوچھا ہے کہ تم دونوں کیا کرتی ہو؟۔۔۔ میری اپنی زندگی ہے خدا کے لیے مجھے گزارنے دو۔۔۔“

لفظ ابھی اس کے منہ ہی میں تھے کہ اس کے پاؤں ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ انہوں نے یہ بات سن لی تھی اس لیے آتے ہی بولے۔

”کیا بات ہوگئی صنفیہ کیوں اس طرح بات کر رہی ہو؟“

”پاپا! میں تنگ آ گئی ہوں اپنے ہی گھر میں ذرا ذرا سی بات پر پابندیوں سے۔ یہ نہ کرو ذرا نہ کرو۔ اس وقت اٹھو وہاں نہ جاؤ۔“

کیا کروں پاپا؟“ اس نے روہانسوہوتے ہوئے کہا۔

”ہوا کیا ہے؟“ اس کے باپ نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

”میری کلاس فیلو کی سالگرہ پارٹی تھی وہاں گئی تھی۔ اب انہیں یہ یاد ہے کہ میں ذرا دیر سے کیوں آئی ہوں۔ ان سے پوچھیں کیا رات ختم ہوگئی ہے؟ انہیں کیا پوچھو شل لائف کیا ہوتی ہے۔ انہوں نے تو گھر میں بند رہنا ہوتا ہے۔ کسی سے ملنا نہیں مرضی سے بات کرنی ہے۔“

وہ صفحے میں بولتی چلی گئی۔ پاپا نے سلمیٰ کی جانب دیکھا تو وہ ہونٹوں کی طرح ان دونوں کو دیکھے چلی جا رہی تھی۔

”پاپا! میں نے نہیں امی نے اس سے پوچھا تھا لیکن یہ انتہائی بد تمیزی سے جوش آئی ہے، کم از کم اسے یہ تمیز تو ہونی چاہئے کہ اس سے بات کس طرح کی جاتی ہے۔“ سلمیٰ نے دھیرے سے کہا۔

”ہاں! میں تو سراپا نہی ہوں ان کی نگاہوں میں اور جب میری ہر بات میں نمائی ہے تو پھر کوئی بات کیسے ٹھیک ہوگی۔“ صنفیہ نے باقاعدہ روتے ہوئے کہا۔

”تم جاؤ سلمیٰ۔“ پاپا نے ذرا سختی سے کہا۔ وہ چلی گئی تو پھر صنفیہ کی طرف دیکھ کر بولے۔ ”اچھا خاموش ہو جاؤ۔ وہ ایک طرح سے ٹھیک ہی کہہ رہی ہیں۔ لڑکیاں شادی سے پہلے یوں زیادہ وقت باہر نہیں گزارتیں۔“

ہاں جب تمہاری منگنی وغیرہ ہو جائے تو پھر بات دوسری ہے۔ زندگی پڑی ہے سوشل لائف کے لیے اور پھر جب تم میرے ساتھ بزنس میں آ جاؤ گی تو اپنے شوق پورے کر لینا۔“

اس کے پاپا نے کہا تو وہ خاموش ہوگئی۔ جب اچانک اس کے ذہن میں یہ بات کہ سب وہ موقع ہے جب وہ اپنی غیر معمولی اہمیت کے بارے میں اپنے پاپا کو آگاہ کرے، تاکہ ماہر اسلی کو معلوم ہو کہ اس نے اتنی کامیابی حاصل کر لی ہے۔ اس نے بسے بھر میں سوچا پھر دھیرے سے بولی۔

”پاپا! میں آپ سے ایک بات کہوں۔“

”ہاں کہو۔“ انہوں نے تجسس سے پوچھا۔

”میں نے آپ کو تیمور کے بارے میں بتایا تھا؟“ وہ دھیرے سے بولی۔

”ہاں۔“ کیا ہوا اسے؟“ پاپا نے پوچھا۔

”اُس نے اپنے کاروبار میں مجھے شراکت دار بنا دیا ہے۔“ وہ دبے دبے جوش اور قدرے خوف سے بولی۔

”کیا۔“ کیا کہہ رہی ہو تم؟“ وہ حیرت سے بولے۔

”ہاں پاپا! میرے پاس اُن کا خدات کی نقول پڑی ہوئی ہیں وہ میں آپ کو دکھا سکتی ہوں۔“ صنفیہ نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”لیکن یہ کیوں کیا اُس نے۔“

”صرف گارٹی کے طور پر۔۔۔ اس نے کہا ہے کہ اگر اس کے والدین شمانے تو مجھ سے شادی کرے گا اس کے کاروبار میں شراکت دار تو میں ہوں گی۔ اگر ادھر رہے تو وہ ایک گھر میرے نام کرے گا یا پھر چنڈل ملے جائیں گے۔“ صفیہ نے اطمینان سے کہا۔

”کیا تم مجھے وہ کاغذات دکھا سکتی ہو؟“ پایا نے پوچھا۔

”کیوں نہیں۔۔۔ اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔“ میں ابھی آپ کو لادتی ہوں لیکن۔۔۔ لیکن جب میں گھر آتی ہوں تو مجھے ذرا بھی سکون نہیں ملتا میرا دل کرتا ہے کہ یہ پڑھائی وغیرہ چھوڑ دوں اور آپ کے ساتھ ابھی سے بزنس میں آ جاؤں۔“

”نہیں تم یہ امتحان دو وقت ہی کتنا ہے۔۔۔ میں تمہاری ماں کو سمجھا دوں گا۔“ پایا نے سوچتے ہوئے کہا۔

”آپ بیٹھیں میں ابھی آپ کو وہ کاغذات لادتی ہوں آپ دیکھیں انہیں۔۔۔“

صفیہ یہ کہتے ہوئے اٹھ گئی اور اس کے پایا گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

☆ ☆

ہاہیوں سڑک کے کنارے کھڑا اس جانب دیکھ رہا تھا جس طرف سے راحیلہ آئے والی تھی۔ سورج غروب ہونے میں ابھی کافی وقت تھا۔

ہاہیوں کو یہ نہیں معلوم تھا کہ جنید کی راحیلہ کے ساتھ کیا بات ہوئی ہے لیکن وہ وہی کچھ کر رہا تھا جس کے بارے میں جنید نے اُسے بتایا تھا۔ اُس کی راحیلہ سے بات ہو چکی تھی جس نے تھوڑی دیر بعد آنے کا کہا تھا۔ اُسے وہاں کھڑے ہوئے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ اُسے راحیلہ آتی ہوئی دکھائی دی جس نے ایک بڑی ساری چادر اوڑھ رکھی تھی وہ اسے دور ہی سے پہچان چکا تھا۔

”آئیے۔۔۔“

جیسے ہی وہ قریب آئی تو ہاہیوں نے چند قدم کے فاصلے پر کھڑی ٹیکسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

راحیلہ اس جانب بڑھ گئی پھر پچھلا دروازہ کھول کر اندر جا بیٹھی تب تک ہاہیوں بھی اس کے ساتھ آ کر بیٹھ گیا اور اُس نے ٹیکسی والے کو پلنے کے لیے کہا جو شاید اسی انتظار میں تھا۔ ٹیکسی تیزی سے اپنا سفر مکنتی رہی اور وہ دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش رہے۔ اس علاقے کو نہ تو پوٹس کہا جاسکتا تھا اور نہ ہی وہ کوئی فریجوں کا علاقہ تھا لیکن متوسط طبقے کے لوگوں کے لیے وہ بہت ہی اچھا ناؤن بن چکا تھا جس میں جا بجا بہت ساری کولھیاں تعمیر ہو رہی تھیں۔ ان لوگوں کو یہ یقین تھا کہ آئندہ آنے والے چند برسوں میں یہ علاقہ معروف ترین ہو جائے والا تھا۔ ان کی ٹیکسی ایسی ہی ایک نو تعمیر شدہ کوٹھی کے سامنے جا کر رُک گئی۔ ہاہیوں نے کرایہ ادا کیا۔ اپنی جیب سے چاہیوں کا ایک گچھا نکال کر اس میں سے ایک چابی تھخب کی اور گیٹ کھولنے لگا تب تک ٹیکسی والا واپس چا چکا تھا۔

”یہ ہے آپ کا گھر۔“

ہاہیوں نے گیٹ کھولتے ہوئے کہا اور پھر اندر داخل ہو گیا۔ راحیلہ ایک انجمانی کیفیت میں گھر گئی تھی۔ اس کے اندر جیسے ہی یہ احساس ڈر آیا کہ یہ اس کا اپنا گھر ہے تو خوشی کی ایک لہر نے اسے ادھ مواسا کر دیا لیکن اس کے ساتھ ہی جب یہ خیال آیا کہ یہ اس کے نام کیوں ہوا ہے تو ساری

عشق تو ہے عشق بتا

خوشی ہوا ہوگی یہ خیال اس کے لیے بہت ہی تکلیف دہ تھا۔ مگر جو سکون، تحفظ اور خوشی کا مسکن ہوا کرتا ہے، ممکن ہے کہ یہی گمراہی کا قتل بن جائے۔ اس نے یہ گمراہی لیے اپنے نام کرایا تھا کہ اس میں جنیہ کی اپنی مرضی تھی اور وہ اس کے لیے اپنی جان بھی دے دینے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

”کہاں گم ہیں آپ؟“

ہمایوں نے پوچھا تو وہ چوکی۔

”کہیں نہیں۔“ اس نے اپنے ذہن سے سارے خیالات ہٹاتے ہوئے کہا۔

”راہیلہ! ہوتا ہے ایسا زندگی میں بہت سارے فیصلے اپنی مرضی سے نہیں کرنے پڑتے اور جو من چاہ رہا ہوتا ہے وہ اپنی دسترس سے بہت دور ہوتا ہے۔ اسی کا نام زندگی ہے۔“ خیر آؤ۔ دیکھو مہری پسند کیسی ہے؟“ ہمایوں نے عجیب سے لہجے میں کہا اور اندر کے دروازے کھولنا چلا گیا۔

”یہ تو بالکل ایسا ہے جیسے ابھی اس میں رہائش کرنی جائے۔ سارا سامان موجود ہے، سجایا بھی بہت خوب گیا ہے۔“ راہیلہ نے حیرت زدہ ہوتے ہوئے کہا۔

”جی ہاں ایسا ہی ہے۔ پورا ایک ہفتہ ہو گیا ہے مجھے خریداری کرتے ہوئے۔ اس میں بیشتر چیزیں جنیہ کی پسند کی ہیں۔ مثلاً یہ سارا فرنیچر۔ وہ لیکن کا سارا سامان۔“

ہمایوں تحصیل بتاتے ہوئے بولا اور راہیلہ اُسے دیکھتی رہ گئی۔ ایک گھر کا تصور کس قدر خوش کن ہوتا ہے۔

”اچھا ہے بہت ہی اچھا ہے۔“ راہیلہ نے ہمایوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”لیکن یہ خالی کیوں چھوڑا ہوا ہے کوئی بھی۔“

”نہیں، یہاں رات کے وقت چوکیدار ہوتا ہے۔ کل سے ایک فیملی یہاں آ جائے گی وہ دونوں میاں بیوی ہیں اور ایک بچہ ہے اُن کے ساتھ۔ وہ اوپر والے پورشن میں رہیں گے اور آپ کی امی یہاں نیچے والے پورشن میں۔“ اس نے تصیلا بتایا تو راہیلہ اُس کی طرف دیکھتی رہی لیکن جواباً کوئی بات نہیں کہی تب وہی بولا۔ ”دیکھو میں نے فرق بھی سارا بھر دیا ہے۔“

”بہت اچھا کیا۔“ راہیلہ جب تک اپنے آپ میں آ چکی تھی۔

”تو پھر اس لیکن کا آواز کریں۔ کم از کم جائے تو بتانا آتی ہوگی آپ کو وہی بتائیں۔“

ہمایوں نے خوشگواریت سے کہا تو راہیلہ مسکرا دی اور لیکن کی جانب چل پڑی۔ ابھی شاید اس نے چولہا بھی نہیں ہلایا ہوگا کہ ہمایوں کے سیل فون پر مس بٹل ہوئی اور ساتھ ہی ہارن کی آواز آئی۔ وہ اٹھ کر باہر چلا گیا اور گیٹ کھول دیا۔ جنیہ گاڑی سمیت اُعدا آ گیا، ہمایوں اس سے پہلے ہی ڈرائنگ روم میں آ چکا تھا۔

”راہیلہ! تم نے بالی بتانا، جنیہ آ گیا ہے۔“ اس نے ہانک لگائی۔

”بڑے بے تکلف ہو رہے ہو راہیلہ سے۔“ جنیہ نے بیٹھے ہوئے کہا۔

”آپ یہ حسد سے کہہ رہے ہو یا مذاق کا موڈ ہے؟“

ہمایوں نے ہنستے ہوئے کہا تو جنید مسکرا دیا۔ پھر پوچھا۔

”کیا یہ سب پسند آیا ہے؟“

”خود ہی پوچھ لیتا۔“

ہمایوں نے کہا اور پھر وہ انہی باتوں میں کھو گئے کہ اب کیا حج ضروری ہے کیا نہیں۔ اتنے میں راحیلہ چائے لے کر آگئی ساتھ میں ایک بھی تھا جو اس نے فرنگ میں سے لیا تھا۔ اُس کے آنے پر بھی وہی باتیں چلتی رہیں یہاں تک کہ چائے پی لی گئی۔ تب جنید نے راحیلہ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

”چلیں گاؤں تمہاری امی کو لے آئیں۔“

یوں پوچھنے پر راحیلہ چند لمبے خاموش رہی اور جنید کے چہرے کی جانب دیکھتی رہی۔ پھر دھیرے سے بولی۔

”چلیں۔“

تھوڑی دیر بعد انہوں نے گھر کو لاک کیا اور گاڑی میں بیٹھ کر چل پڑے۔

ہنہ ہنہ

اس وقت رات گہری ہو چکی تھی جب وہ گاؤں پہنچے۔ ہر جانب گہرا سناٹا طاری تھا۔ اتنی رات گئے جب وہ گھر پہنچے تو راحیلہ کی ماں ان دونوں کو یوں سامنے پا کر حیرت اور گھبراہٹ کے ساتھ انہیں دیکھتی ہی رہ گئی سلام ڈھا سے پہلے اُس نے پوچھا۔

”خیریت تو ہے؟“

”ہاں امی! خیریت ہے۔“

یہ کہہ کر راحیلہ اندر چلی گئی۔ اس کے پیچھے جنید بھی اندر چلا گیا۔ دونوں جب سہولت سے بیٹھ گئے تو اس کی ماں نے پھر تشویش زدہ لہجے میں دوبارہ آنے کا سبب پوچھا۔

”امی! میں آپ کو لینے کے لیے آئی ہوں۔ اب ہم شہر میں رہیں گے۔“

راحیلہ نے کہا تو اس کی ماں نے اجماعی حیرت اور پریشانی سے راحیلہ کی جانب دیکھا پھر جنید کے چہرے پر نگاہ ڈالی اور چند لمبے خاموش رہنے کے بعد بولی۔

”میں سمجھی نہیں بیٹی! تم کیا کہنا چاہ رہی ہو؟“ اس کے لہجے میں حیرت ملی تشویش اب بھی تھی۔

”میں نے کوئی ایسی بات نہیں کی ہے جو آپ سمجھ نہ سکیں۔ میں نے شہر میں گھر لے لیا ہے اور۔“

راحیلہ نے کہا جاپا تو اس کی ماں نے ٹوک دیا۔ ”یہی بات تو میں سمجھتا چاہ رہی ہوں۔۔۔ بیٹی لوگ ساری زندگی لگا دیتے ہیں پانی پانی جوڑتے ہیں تو کہیں جا کر چھت لھیب ہوتی ہے۔ تم نے ابھی اپنا کورس بھی مکمل نہیں کیا اور ایک گھر لے لیا ہے۔ اتنی عقل تو ہے مجھ میں! بیٹی! کہ یہ سمجھ

عشق کا ہے عشق بتا

سکوں ایسا صحت کی حلال کمانی سے تو نہیں ہو سکتا۔ تم نے نہیں میری۔۔۔؟“ ماں نے دے دے ٹھسے میں انتہائی ناہوسانہ لہجے میں پوچھا۔

”نہیں ماں! میں اپنی جان تو دے سکتی ہوں لیکن اپنی عزت پر حرف نہیں آنے دوں گی۔ مجھے معلوم ہے کہ میری ماں میری جدائی کا صدمہ برداشت کر لے گی مگر میری عزت چلی جائے یہ اس سے برداشت نہیں ہوگا۔“ راحیلہ نے دھیرے سے کہا۔

”تو پھر اسے میں کیا سمجھوں۔۔۔؟“

ماں نے پوچھا تو جنید نے دھیرے سے کہا۔

”میں سمجھتا ہوں آپ کو۔۔۔ میرا اور راحیلہ کا ایک خاموش معاہدہ ہوا ہے۔ یہ میرے کام آ رہی ہے اور میں اس کے۔۔۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس میں کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ آپ کی بیٹی کی عزت پر حرف آئے۔ یہ مگر میں نے اسے لے کر دیا ہے ایسا میں نے اس لیے کیا ہے کہ اپنی حفاظت کر سکوں۔“

”یہ کیسا معاہدہ ہے؟“ ہنر۔۔۔؟“ ماں نے پوچھا۔

”آپ یہ ساری باتیں پوری تفصیل سے سمجھ جائیں گی۔ آپ نے اپنی زندگی کے کٹھن اور مشکل دن دیکھ لیے آپ اچھے دن بھی دیکھیں۔ آپ یقین کریں مجھ پر۔۔۔“ جنید نے کہا۔

”آپ کچھ بھی مت سوچنا ہی! میں جو آپ کو لینے آئی ہوں۔۔۔“

راحیلہ نے کہا تو ماں نے اپنا سر جھکا لیا پھر پوچھا۔

”کب جاتا ہے۔۔۔؟“

”جا ہیں تو آپ ابھی چلیں۔“ جنید نے کہا۔

”نہیں میں یوں چروں کی طرح رات کے اندھیرے میں یہ گاؤں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ دن نکلے گا تو میں یہ گھر کسی کے سپرد کر کے جاؤں گی باقی اللہ مالک ہے۔“ اس نے یوں کہا جیسے یہ سب کہے ہوئے اسے بہت صدمہ ہو رہا ہو۔

”ٹھیک ہے جیسا آپ چاہیں۔۔۔“

جنید نے حتیٰ انداز میں کہا اور جس چار پائی پر بیٹھا تھا۔ اسی پر لیٹ گیا۔ جب راحیلہ اور اس کی ماں دونوں اٹھ گئیں۔

☆☆

جنید صبح میں کھلے آسمان کے نیچے چمچی ہوئی چار پائی پر لیٹا ہوا تھا۔ چاندنی برسوں پہلی ہوئی تھی رات تھی کہ سنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ رات گئے مشرق سے ابھرنے والا چاند اب سر کے اوپر آ چکا تھا۔ راحیلہ اور اس کی امی کچے کمرے کے اندر تھیں۔ اسے پوری امید تھی کہ وہ بھی نہیں سوئی ہوں گی۔ لہو لہو گزرتی رات کے ساتھ جنید کی سوچیں بھی اسے گھیرے ہوئے تھیں۔ وہاں لیٹے ہوئے ایک ہی سوال اس کے ذہن میں گردش کر رہا تھا کہ آیا اس نے جو کچھ راحیلہ اور اس کی ماں سے کہا ہے وہی سچ ہے یا پھر وہ جھوٹ بول کر نہیں مطمئن کر رہا ہے اور اگر جھوٹ بول رہا ہے تو

کیوں؟ — اُسے اپنے سوال کا جواب بھی معلوم تھا لیکن وہ خود اس سے بچ کر نکل جانا چاہتا تھا۔ وہ اس راہ پر جا کر کسی بندگی میں راستہ نہیں کھونا چاہتا تھا۔ اُس کی ان ساری سرگرمیوں کے پیچھے فقط ایک ہی احساس تھا اور وہی راحیلہ سے محبت! وہ اس اعتراف سے بچ کر نکلنا چاہتا تھا۔ اُسے یہ احساس بھی تھا کہ کبھی نہ کبھی ایسا ہوگا کہ اُسے راحیلہ کے سامنے اپنی محبت کا اقرار کرنے پڑے گا لیکن ایسا کر کے وہ اس بندھن میں نہیں بندھنا چاہتا تھا کہ جس سے پھر وہ ٹرانڈ لے سکے۔

یہ انسانی شعور اور لاشعور کی کہانی بھی بڑی عجیب ہے۔ قدرت نے انسان کے اندر ایسا خود کار نظام رکھ دیا ہے کہ جس سے انسان کی زندگی کے بیشتر مسائل خود بخود حل ہو جاتے ہیں۔ وہ شعور کی آنکھ سے جب ہر شے اور معاملے کو دیکھتا ہے تو ان سے انسان کو آگہی مل جاتی ہے کہ وہ کیا کر رہا ہے لیکن لاشعور کے معاملے ایسے ہیں جن سے انسان کو معلوم بھی نہیں ہوتا اور وہ کسی انجانے فیصلے کے تحت بہت کچھ کرتا چلا جاتا ہے۔ سارے اُلجھے ہوئے مسئلے اسی لاشعور میں جا کر سلجھتے ہیں۔ یہ ہمارے خیالات ہی ہیں جن کی بنیاد پر ہمارے اعمال سرزد ہوتے ہیں اور خیال ایک بیج کی مانند ہے۔ یہ لاشعور کی دھرتی میں جب اُگتا ہے پودے سے تیار درخت بنتا ہے تو اعمال کے پھل پھول اس پر ضرور آتے ہیں۔ جنید جس طرح کی بھی زندگی گزار رہا تھا وہ اپنی جگہ لیکن وہ ایک نوجوان حقیقت پسند اور دل رکھنے والا انسان بھی تھا۔ لاشعور کی کہانیوں میں کہیں کوئی تصویر پڑی ہوئی تھی جو راحیلہ کی صورت میں اُس کے سامنے آگئی تھی یا پھر راحیلہ میں اُس نے وہ کچھ دیکھ لیا تھا جس کی خواہش لاشعور میں تھی۔ بہر حال جو بھی تھا۔ ایک کشش تھی جو اس کی جانب متوجہ کیے ہوئے تھی۔ اُس نے پوری زندگی کسی کے لیے کچھ نہیں کیا تھا بس نظروں سے بنے ایک نصب العین کی خاطر اپنی زندگی داؤ پر لگائے ہوئے تھا۔ اُسے یہ غرض نہیں تھی کہ لوگ کیا کرتے ہیں اُسے اگر کوئی مطلب تھا تو یہ کہ اُس کے نصب العین کے مطابق کیا ٹھیک ہے۔ زندگی میں پہلی بار اُس نے کسی کے لیے دل کے کپے پر کچھ کرنے کا سوچا تھا۔ ایسا کرتے ہوئے اُسے اتنا سرور و اطمینان اور خوشی ملی تھی کہ جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

بعض اوقات انسان کسی شے کے حصول کے لیے ساری زندگی تڑپتا رہتا ہے اس کی خواہش میں ترسنا رہتا ہے لیکن وہ شے اس کی دسترس میں نہیں آتی مگر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ شے نہ صرف وافر مقدار میں مل جاتی ہے بلکہ اس کے مصرف کے بارے میں کچھ بھی بھائی نہیں دیتا۔ جنید کے لیے دولت کا حصول کبھی بھی مشکل نہیں رہا تھا۔ جس قدر خواہش ہوتی اُسے مل جاتی تھی۔ زیادہ کی خواہش اُسے اس لیے بھی نہیں ہوتی تھی کہ اتنی دولت وہ کہاں رکھے؟ بینک بٹلیں کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا وہاں پڑی ہوئی دولت کس کام کی؟ اب اگر اُسے راحیلہ کی صورت میں دولت کا مصرف ملتا تو اُس نے بے دریغ خرچ کرنا شروع کر دیا۔ پھر وہ جو دولت کماتے ہیں احساسِ توجہ ہوتا ہے جب وہ اسے خرچ کرتے ہیں۔ جنید کے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اُس کی صرف ایک خواہش تھی جو کبھی کبھی اُسے بھی بہت عجیب لگتی تھی۔ اُس کا دل چاہتا تھا کہ راحیلہ کبھی پورے دل سے اُس کے ساتھ خوشی کے ساتھ قبضہ لگا دے۔ ایسا قبضہ جس میں کوئی خوف پریشانی یا بے یقینی شامل نہ ہو۔ اس میں فقط خوشی ہو خالص خوشی اس خواہش کے لیے اُسے جو بھی کرنا پڑے وہ کرنے کے لیے تیار تھا۔ وہ حزن جو راحیلہ کے چہرے پر ہمہ وقت رہتا تھا جنید نے اسے ختم کرنے کا پورا ارادہ کر لیا تھا اُس نے یہ راہی خواہش کر توی تھی مگر اُسے معلوم تھا کہ اسے پورا کرنے میں کس قدر مشکل ہے لیکن مشکلات سے ڈرنے کے لیے تو وہ

بھائی نہیں تھا۔ راحیلہ اس کی زندگی میں یوں آگئی تھی جیسے کوئی دبے پاؤں بنا اجازت کرے میں آ کر وہاں کی ہر شے پر تسلط جما لیتا ہے۔ اس وقت وہ خوف زدہ ہو گیا تھا جب راحیلہ نے پورے جذب سے اعتراف محبت کیا تھا شاید اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ جو مشق ہونے جا رہی ہے وہ تو فاتح ہے۔ شاید محبت میں وقتی فاتح قرار پاتا ہے جو اپنا آپ محبت میں دوسرے پر واردے۔ جنیڈ نے راحیلہ کے سامنے اپنی محبت کا اقرار نہیں کیا تھا لیکن وہ دبے قدموں وادی عشق میں قدم رکھ چکا تھا۔ شروع شروع میں تو اسے پتہ ہی نہیں چلا تھا کہ عشق ہوتا کیا ہے لیکن دھیرے دھیرے اسے احساس ہوا کہ وہ عشق کی وادی میں آ چکا ہے تو اس کی سحر انگیزی میں ڈوب کر رہ گیا۔

عشق ہے کیا چیز؟ یہی وہ مقام ہے جہاں انسان و رطلہ حیرت میں ڈوب جاتا ہے۔ جس کسی نے بھی اس کے بارے میں سوچا ہے اس نے اپنا ہی مطلب اخذ کیا ہے۔ ہر سوچ و لکروالے بندے نے عشق کو جیسا پایا اس نے بیان کر دیا۔ یہاں تک کہ صوفیاء نے کہہ دیا کہ عشق کی سمجھ عشق عطا کرتا ہے۔ عشق وحدت کی علامت ہے۔ اس باطنی کشش کا اثر ہے کہ جس میں نگاہ و جمال محبوب ہی پر لگی رہتی ہے۔ عاشق کا سارا دھیان گیان اور وجدان فقط ایک ذات کے لیے مختص ہو کر رہ جاتا ہے یہاں تک کہ عاشق کی اپنی ذات بھی معشوق کے تابع ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہ دل کی زرخیز زمین پر آشیانی کے بیج سے انیسیت کا رُوب لے کر پھوٹتا ہے۔ موانع ماحول میرا آ جانے سے یہ پودا محبت کے تناور درخت کا رُوب اختیار کرتا ہے جس کا پھل عشق ہے۔ شدت طلب کے باعث اس پھل کو کھکنے والا اس کی لذت کا ہو کر رہ جاتا ہے پھر کوئی اور ذائقہ اس کا خم اہل نہیں ہو سکتا۔ سارے ہی ذائقے حواس سے محو ہو جاتے ہیں۔۔۔ لفظ عشق کو اہل لغت "عشقہ" سے تعبیر کرتے ہیں جو ایک نخل کا نام ہے اور وہ شاداب درختوں پر پیرا کر کے دن بدن پھلتی پھولتی اور پرورش پاتی ہے یہاں تک کہ سرسبز درخت کی ہستی فنا ہو جاتی ہے۔ یہ اہل لغت کی شرح ہے جو انہوں نے معنی بتائے۔ یہ ہمیشہ لفظی معنی ہوا کرتے ہیں جو لغت میں بیان کیے جاتے ہیں۔ اصطلاحی معنی ہی وہ سمجھ لو جو عطا کرتے ہیں جو کسی شے کے بارے میں جاننے کی ضرورت کے مطابق ہوتے ہیں۔ جس طرح "سستی" کے لفظی معنی تو کوشش کے ہیں لیکن جب ہم دورانِ حج میں سستی کا ذکر کریں گے تو یہ ایک خاص عمل ہوگا۔ ہر مضمون کے حامل فرونے اپنے نکتہ نگاہ سے عشق کی تشریح کر دی لیکن صوفیاء کا کہنا ہے کہ عشق زہد کائنات کے رموز میں سے ایک راز ہے جو خاص اور اعلیٰ ہے جسے وہی جانتا ہے جس پر عشق کا نزول ہوتا ہے اور عشق انہی پر اثر کرتا ہے جو عشق کے اہل ہوتے ہیں۔ تاہم یہ سوال اب بھی اپنی جگہ موجود ہے کہ عشق ہے کیا؟

جنیڈ بھی ایسے ہی احساس میں گمراہ ہوا تھا اسے یہ احساس تو ہو گیا تھا کہ وہ عشق کی وادی میں آ چکا ہے۔ ذرا غور کرنے پر اسے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وہ اس وادی تک کیسے آن پہنچا لیکن یہ ہے کیا؟ اس بارے میں اک ذرا بھی اسے سمجھ نہیں آئی تھی مگر اس کی سحر انگیزی میں جو خوشی اطمینان اور سرور تھا وہ اس میں ڈوب کر رہ گیا تھا۔ اس رات بھی کھلے آسمان تلخ چاندنی میں اس نے عشق کے بارے میں بہت سوچا تھا لیکن اس کی سوچیں ایوانِ ذہن سے نامراد لوٹیں تھیں گو ہر تصور ہاتھ نہیں لگا تھا سو اس نے عشق پر نہ سوچنے کا فیصلہ کر لیا، عشق اگر اپنی سمجھ خود عطا کرتا ہے تو پھر یونہی کسی کبھی نہ کبھی تو یہ راز اس پر کھلے گا یہ اسی وقت ممکن ہے جب فطرت چاہے گی۔ یہ فیصلہ کرتے وقت وہ ہنس مٹا ہوا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کیں تو نیند کے ٹکڑے ساتھی آنکھوں میں محسوس کیے دھیرے دھیرے وہ نیند کی بانہوں میں بگڑے لینے لگا۔

دن اچھا خاصا چڑھ آیا تھا۔ راحیلہ کی ماں نے جو تھوڑا بہت سامان بکھرا ہوا تھا اندر کمرے میں رکھ کر تالا لگا دیا تھا، صحن میں ہمسایوں کی چند گورتیں موجود تھیں جو حیرت سے ان دونوں کے ساتھ ساتھ جنید کو کبھی دیکھ رہی تھیں۔ راحیلہ انہیں بتا چکی تھی کہ اس کی نوکری شہر میں ہو گئی ہے اس لیے وہ اپنی ماں کو لے کر وہاں جا رہی ہے۔ راحیلہ کی ماں نے تالا لگا دیا اور اس کی چابی ایک اوجیز عمر خاتون کو دیتے ہوئے بولی۔

”لو بہن! اب یہ گھر تمہارے اور اللہ کے آسرے پر ہے۔ تم ہی اس کی دیکھ بھال کرنا۔ میں اگر کبھی آسکی تو آ جاؤں گی ورنہ یہ تم اپنی بیٹی کو دے دینا۔“

یہ کہتے ہوئے اُس کی آواز بھرا گئی تھی۔ وہ ان خواتین سے ملنے لگی تو جنید گاڑی میں جا بیٹھا۔ سامان کے نام پر انہوں نے کچھ بھی نہیں لینے دیا تھا، وہ دونوں ماں بیٹی گاڑی میں آ بیٹھیں تو جنید نے گاڑی بڑھا دی اُس کے من میں ایک اطمینان سا اثر کیا تھا۔

☆ ☆

چنئی رات گہری ہو چکی تھی، ہمایوں بھی اتنی گہرائی میں سوچ رہا تھا۔ اُسے اچانک ایک شارٹ کٹ مل گیا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اُسے اپنی منزل اس قدر آسانی سے مل جائے گی۔ وہ جنید کے کہنے پر شہر کی اس سٹی سے جا کر ملاقات سے عام آدمی تو نقطہ صنعت کاری کی حیثیت سے جانتے تھے، تاہم خواہش کو یہ مصدم تھا کہ وہ بادشاہ گر ہے۔ میدان سیاست میں ضروری نہیں ہوتا کہ کھلاڑی مہلکار پر آئیں۔ وہ جو بساط سیاست بچھانے والے لکھلاڑی ہوتے ہیں انہیں ہمیشہ نئے نئے سے مہروں کی ضرورت ہوتی۔ پٹ جانے والے مہرے اُن کے کسی کام کے نہیں ہوتے۔ انہی مہروں کے سہارے وہ نہ صرف ایوانوں پر قابض ہوتے ہیں بلکہ حقیقی معنوں میں حکمرانی بھی انہی کی ہوتی ہے۔

یہ حقیقت اپنی جگہ ایک المیہ کی حیثیت رکھتی ہے کہ پاکستان میں مجموعی طور پر جاگیرداری کا تسلط ہے۔ وہ نہ صرف سیاست کے میدان میں متحرک رہتے ہیں بلکہ اب تو وہ دور و دور کیسی میں بھی اپنی جزیں مضبوط کر چکے ہیں۔ ممکن ہے کہ مکمل اندھیرا ہو جاتا اور جاگیردار طبقہ پورے نظام پر قابض ہو جاتا لیکن اس کا رد عمل بھی پوری طرح متحرک ہو گیا جس سے اُس کے عشرے میں ایک کشش نے جنم لیا۔ اس کشش میں جہاں جاگیردار طبقے نے خود کو فعال مضبوط اور متحد کرنے کی کوشش کی وہاں اس کے رد عمل کے طور پر مخالف طبقہ بھی فعال مضبوط اور متحد ہونا چلا گیا۔ اس میں وہ طبقہ جو نو دولتوں کا ہے اس کی اہمیت بڑھ گئی۔ دونوں طرف کے طبقات نے اسے اپنے قریب کرنا چاہا، اقتدار کے علاوہ حکمرانی میں بھی تھوڑا بہت حصہ دے کر اسے اپنے ساتھ ملانے کی سر توڑ کوشش کی جس سے تیسرا ایک نیا طبقہ وجود میں آ کر اہمیت اختیار کر گیا۔ وہ جو اپنی طاقت کے لیے جنگ لڑ رہے تھے اب شریک سیاست ہیں۔ آمریت کے دور میں تو ان کی اہمیت فزوں تر ہو گئی۔ چونکہ ان تینوں طبقات نے عوام کے پاس جانا ہوتا ہے اس لیے بہت ساری جگہیں ایسی ہیں جہاں وکھادے کے لیے اس طبقے سے بھی لوگ لینے کا رشتہ قائم بن گیا ہے۔ یہ کوئی ماورائی بات نہیں بلکہ ہمارے وطن کی تاریخ ہے۔ عوام کے ذریعے عوام کی حکومت عوام پر والا تصور اب بھی واضح بھی نہیں ہو سکا۔ عوام تو ابھی روٹی کے چکر سے نکلنے کی تو سوچے گی حالانکہ اس وقت سب سے اہم مسئلہ یہ ہے جس پر سوچنا ہوگا کہ عوام کو کیا کرنا چاہئے۔ جس دن انہیں شعور آ گیا۔ روٹی تو کیا وہ اس ملک کا اقتدار بھی حاصل کر لیں گے۔ سیٹھ حفیظ دین بھی انہی لوگوں میں سے ایک تھا جو میدان سیاست میں اپنی بساط بچھاتے ہیں۔ کبھی اس کی نگاہ جنید پر ٹھہری تھی لیکن اس

نے اپنے نظریات کو چھوڑنا قبول نہیں کیا تھا اور یوں وہ مبرہ نہیں بن پایا تھا۔ جنید کو ہمایوں کے بارے میں یہی حل دکھائی دیا کہ وہ اسے سیٹھ حفیظ سے ملوانے اس لیے ہمایوں اس شام اس کے پاس چلا گیا تھا۔ کافی دیر تک ان کے درمیان گپ شپ چلتی رہی۔ ملکی معاملات سے لے کر مقامی سیاست کی آگے تک مختلف لوگوں کے بارے میں تاثرات سے لے کر اداروں کی کارکردگی تک۔ دونوں ہی بڑے محتاط انداز میں ایک دوسرے کو جانچ اور پرکھ رہے تھے یہاں تک کہ سیٹھ حفیظ نے کہا۔

”دیکھو ہمایوں! ہمارے حصے کی جو صورت حال ہے اس میں اوپر والی سیٹھ پر تو ہمیشہ جاگیرداروں ہی کا قبضہ رہا ہے۔ بہت سارے لوگوں نے یہ قبضہ توڑنے کی کوشش کی۔ ان میں نظر پاتی لوگ بھی تھے اور ذات برادری والے بھی لیکن سبھی کومات ہوئی۔ میرے خیال میں ان کا قبضہ اس وقت تک نہیں ٹوٹ سکتا جب تک سیاسی پارٹیوں میں خود جمہوریت نہیں آجاتی اور سیاسی پارٹیوں پر بھی تو وہی جاگیردار ہی مسلط ہیں جن کی اپنی ذات، زمینگی اور پوزیشن تو بن رہی ہے لیکن عوام اسی طرح بے حال ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ چند لمبے خاموش رہا پھر بولا۔ ”جہاں تک چھوٹی سیٹھ کا سوال ہے وہ ہمیشہ حادثاتی رہی ہے۔ بظاہر وہ حادثاتی ہی دکھائی دیتی ہے لیکن اس کے پیچھے بھی پوری ایک پلاننگ ہوتی ہے کہ وہ بندہ لایا جائے جو انہی کے رحم و کرم پر ہو اور متوسط طبقے کی نمائندگی بھی ہو جائے حالانکہ ایسا ہونا نہیں ہے۔ میری بات کا مطلب یہ ہے کہ یہ جو چھوٹی سیٹھ ہے اس پر ہی ساری ٹیم ہوتی ہے۔ جو بھی خود کو اس کا اہل ثابت کرنے اُبل جاتی ہے۔“

”مطلب اس میں سرمایہ صلاحیت یا نظریات کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ٹیم نہیں اور کھیلی جاتی ہے؟“ ہمایوں نے اپنی طرف سے تجزیہ کرتے ہوئے سوال کیا۔

”ہاں ایسا ہی ہے۔ ظاہر ہے کہ جس نے سرمایہ لگانا ہے اُس نے کسی نہ کسی طرح اسے پورا تو کرنا ہی ہوتا ہے تا وہ بہر حال پورا ہو جاتا ہے۔“

”تو اس سارے مظر میں میرا کیا کردار ہو سکتا ہے اگر میں خود کو اس کا اہل ثابت کرنے کی کوشش کروں تو۔“ ہمایوں سیدھے اپنے مطلب پر اتر آیا تھا۔

”وہی کچھ جو کہا جائے گا۔ ایک نارگٹ دے دیا جائے گا! اسے پورا کرتے رہنا۔ فی الحال تم ہمارے قانونی مشیر ہو گے۔ ایک بہت اچھا دفتر اور رہائش دے دی جائے گی وہاں لوگوں سے ملنا ان کے مسائل حل کرنے کی کوشش کرنا۔ جہاں رسائی نہ ہو وہ ہم دیکھ لیں گے۔ گاڑی بھی مل جائے گی یوں پورے حصے میں لوگوں سے ملوانے سے تعلقات بناؤ۔ یہی کچھ اور کیا۔“ سیٹھ حفیظ نے بڑے آرام سے اس پر واضح کر دیا۔

”ٹھیک ہے میں تیار ہوں۔“ اس نے ایک عزم سے کہا۔

”ہاں ایک بات اور۔۔۔ اگر کسی کو فائدہ دینا ہے یا اس کا نقصان کرنا ہے اس میں ہمیشہ یہ دیکھنا ہے کہ تمہیں کیا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ محض جذباتی انداز میں فیصلے نہیں کرنے۔ تم کل آؤ۔ ہمارا جنرل نمبر سارے انتظامات کر دے گا کھجاندے گا کہ ڈیرے داری کیسے چلائی ہے۔

میرے خیال میں تم خود بھی سمجھداری سے کام لو گے۔“ اس نے کہا اور گویا اپنی طرف سے بات ختم کر دی۔

”ٹھیک ہے اب مجھے اجازت۔“ اس نے اٹھتے ہوئے کہا تو دوسری طرف سے ہاتھ ملایا گیا ’یوں ہا یوں کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہو گیا۔

اس وقت وہ بیٹھا یہی سوچ رہا تھا کہ اس کا یہ فیصلہ کیسا ہے۔ کہیں اس نے غلط تو نہیں کیا یا بالکل درست کیا ہے؟۔۔۔ وہ اپنے آپ کو دلیلیں دے رہا تھا۔ یہ بہر حال غلط تھا کہ اتنی جلدی شارٹ کٹ مل جانا آسان نہیں ہوا کرتا یہ قسمت والوں ہی کو ملتا ہے۔

”تو پھر کیا غلط کیا ہے تم۔۔۔؟“ اس کے اندر سے آواز ابھری

”یہی کہ میں نے وہی کرتا ہے جو ان سے ڈن کر آیا ہوں۔“

”دیکھو تمہاری زیادہ وہ نہیں ہے۔ تم ایک غریب باپ کے بیٹے ہو۔ اب تمہارا بھائی بھی پڑھ لکھ گیا ہے اُسے انجینئر کی جاب ملنے والی ہے۔ تم لوگوں کے دن بدل جائیں گے تو پھر ادا کھلی میں سر دینے کا فائدہ۔۔۔ ظاہر ہے وہاں موصلیاں بھی پڑیں گی؟“

”پہلے کون سا میرا شمار زندوں میں ہو رہا ہے مردوں جیسی زندگی گزار رہا ہوں۔ ایک کپڑے جیسی اوقات ہے میری ایک معمولی سے پولیس اہلکار نے میری ذہنی کر کے رکھ دی تھی میں جو قانون کا طالب علم تھا یہ عزت ہے قانون دانوں کی اور اس کے علاوہ میرے پاس کیا ہے؟ کل بھائی تو کڑی لگ جائے گا کمانے لگے گا تو کب تک مجھے انورہ کرے گا وکالت بھی تو تعلقات پر چلتی ہے۔ اس سے کم از کم یہ فائدہ تو ہوگا کہ ایک حلقے میں میری پہچان تو بنے گی۔ میں سیاست میں کامیاب نہ بھی ہوا تو کیا ہو میری وکالت تو چلے گی۔“

”لیکن یہ درست راستہ نہیں ہے۔۔۔؟“

”نہ ہو۔۔۔ میری پہلی ضرورت مدنی نہیں ہے بلکہ میری اُنا ہے جسے قدم قدم پر چلا گیا ہے۔ محبت کی بات کی تو میری رُوح تک کو مزہ سدی ملے گی قانون کی بات کی تو سچ چوراہے پر چکا کدیا گیا۔ کیا میں نے درست راستہ اختیار نہیں کیا تھا۔ کیا درست راستہ یہی ہے کہ خاموش رہو اور ظلم سہتے چلے جاؤ؟۔۔۔ میری ضد ہے کہ میں نے اسے حاصل کرنا ہے جس نے میری زندگی برباد کر دی ہے۔“

”اس پر الزام مت دھرو تم خود ذمیل ہو رہے ہو۔ کیوں خواہش کرتے ہو اس کی ذول سے اُتار کر پھینک دو۔ اس کے لیے فقط ایک لمحہ درکار ہے۔“

”غلط کہتے ہو۔ ایک لمحہ نہیں۔ ان لمحات کا حساب کون دے گا جن میں میری رُوح تک سگ اُٹھی تھی اس تپش کی صدا میں کیسے بھلا پاؤں گا جو سچ ہزار میرے منہ پر پڑا تھا۔ میں تو محبت کے پھول لے کر گیا تھا میری سوچوں میں اٹکارے کیوں بھر دیئے گئے؟“

”پھر بھی یہ غلط راستہ ہے جس پر تم جانا چاہتے ہو۔ اس میں ایسے مقام بھی ہیں کہ بندہ ساری زندگی اپنے ذمہ سہلانا ہوا مرنے کی دعا نہیں کرتا ہے لیکن موت نہیں آتی۔“

”مجھے کوئی پروا نہیں ہے۔ میں مانتا ہوں کہ یہ غلط راستہ ہے لیکن تم مجھے یہ بتاؤ میرے سامنے درست راستے کا بھی تو کوئی آپشن نہیں

ہے۔ تاؤ مجھے دُست راستہ کون سا ہے جس پر چلتے ہوئے میں اپنے آپ کو مطمئن کروں۔ اپنا وہ مقصد پا لوں جس سے میں عشق کی حد تک لگاؤ رکھتا ہوں۔ اگر ایسا ہے تو میں وہی کروں گا جو تم چاہو گے ورنہ خاموش ہو جاؤ سو جاؤ۔ اس طرح سو جاؤ کہ میری ذلیل سے ذلیل حرکت پر بھی تم نہ جاگ سکو۔“

”نہیں میں اپنا فرض نبھاتا رہوں گا۔“

”تم اگر اپنے مقصد سے باز نہیں رہ سکتے تو میں کیوں رہوں۔ تم اپنا کام کرتے رہو میں اپنا۔ آج کے بعد تمہاری کسی آواز پر کان نہیں دھروں گا۔“

”میں پھر۔۔۔“

”خاموش۔۔۔“

اس لفظ کی دیر تک اس کے ذہن میں بازگشت رہی۔ پھر اس نے سر جھٹکا تو رات کے دوسرے پہرہ کا احساس ہوا۔ اس نے سوچا نامی

مناسب سمجھا! نئی لمحات میں اس کا سائل فون بج اٹھا۔

”جی! چنید۔۔۔ ا“ اس کا لبہ جھجکا ہوا سا تھا۔

”جاگ رہے ہو تم؟“ اُس نے پوچھا۔

”ہاں۔۔۔“ وہ دھیرے سے بولا۔

”کیا رہا پھر۔۔۔؟“ اُس نے پوچھا۔

”ڈن کرا یا ہوں۔۔۔ صبح اُن کے جنرل نمبر سے ملنا ہے۔“ اس نے اپنے لہجے میں خوشی کا تاثر بھرتے ہوئے بتایا۔

”ٹھیک۔۔۔ اُس سے مل کر آؤ تو پھر مجھے ملنا۔“

چنید نے خوشگوار انداز میں کہا پھر فون بند کر دیا۔ وہاں نے فون مرمانے رکھا اور پھر سونے کے لیے آنکھیں موند لیں۔

☆☆

سورج طلوع ہونے کے بعد چند گھنٹوں کا سٹر کرچ کا تھا۔ صبیحہ تیار ہو چکی تھی! اسے تیمور سے ملنے کے لیے جانا تھا۔۔۔ رات بہت دیر تک

وہ فون پر باتیں کرتے رہے تھے صبح اُنہوں نے ملنے کا تعین کیا اور اب وہ جانے کے لیے تیار تھی۔ اس کے لیے مشکل ترین مرحلہ یہی تھا کہ جب وہ

گھر سے نکلے تب اس کا ماں سے سامنا نہ ہو جائے۔ اگر اس کے سامنے گھر سے نکلتی ہے تو پھر جب تک وہ وہاں نہیں آ جاتی تب تک نہ صرف اس

کی ماں پریشان رہتی بلکہ وہ بھی ڈسٹرب ہی رہتی۔ اسی لیے اس نے کوئی خاص اہتمام نہیں کیا تھا۔ وہی عام سالہاں! بغیر میک آپ اور کسی جیولری

و غیرہ کے بنا وہ ڈرائنگ روم میں آئی جہاں کوئی نہیں تھا! اس نے سکون کا سانس لیا اور کچن کی جانب بڑھ گئی جہاں ملازمہ صفائی وغیرہ کر رہی تھی۔

اسے دیکھتے ہی وہ ملازمہ بولی۔

”آئیے چھوٹی بی بی! بس آپ ہی نے ناشتہ نہیں کیا ہاتی سب کر چکے ہیں۔“

”اچھا چلو چلو۔“

اس نے لاہروای سے کہا اور ڈرائنگ روم میں آگئی۔ وہاں صوفے پر بیٹھ کر اس نے ٹی وی آن کر لیا۔ تھوڑی دیر بعد ملازمہ اس کے لیے ناشتہ لے آئی۔ ابھی وہ ناشتہ کر رہی تھی کہ اس کے پاپا وہیں آ گئے۔

”گلتا ہے آج تم کالج نہیں جا رہی ہو۔“ اس کے پاپا نے قریب ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”جی۔۔۔ پڑھائی تو ہوتی نہیں، کلاسز بھی تقریباً فری ہیں امتحانوں کی وجہ سے۔ بس سمجھیں آنا جانا ہی ہے، کوئی ضروری کلاس تو ہوتی

نہیں۔“ اس نے دھیرے سے کہا۔

”امتحانوں کی تیاری کیسی ہے؟“ اس کے پاپا نے حتم سے پوچھا۔

”ٹھیک ہے پاس تو ہو جاؤں گی۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا، مگر برتن ایک طرف رکھتے ہوئے چائے گنگ اٹھا لیا۔

”بس صرف پاس ہی کرو گی؟۔۔۔ تم اگر چاہو تو بہت بہترین مارکس لے کر کوئی پوزیشن بھی لے سکتی ہو۔“ پاپا نے اس کے چہرے پر

دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ تو تب ہوتا تھا کہ میں کتابی کیزے کی مانند ہر وقت کتابوں میں مردے پڑھتی۔ مجھ سے نہیں ہوتا یہ سب کچھ۔ بس پاس ہو جاؤں تو ہی

بڑی بات ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔ ”وہی ہے آج آپ کو آفس جانے میں اتنی دیر کیوں ہو گئی ہے؟“

”وہ اس لیے کہ میں نے تم سے انتہائی ضروری بات کرنی تھی۔“ پاپا نے مصمبیر لہجے میں کہا۔

”مجھ سے انتہائی ضروری بات۔۔۔؟“ وہ حیرت سے بولی۔

”ہاں۔۔۔ میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تم ایک بہت بڑے فراڈ سے دوچار ہونے والی ہو۔“ انہوں نے یوں کہا جیسے وہ بڑے حتم سے

بات کرنے میں مشکل محسوس کر رہے ہوں۔

”بہت بڑا فراڈ۔۔۔ میں کبھی نہیں پاپا؟“ وہ تیزی سے بولی۔

”تمہارے بارے میں کہہ رہا ہوں۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ ایک صنعت کار کا بیٹا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ بہت دولت مند لوگ ہیں

اس کا اپنا بھی کاروبار ہے اس شہر میں لیکن اس نے جو تمہیں کاغذات دینے ہیں ان کی کوئی قانونی یا کسی بھی قسم کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ وہ کاغذ

جھوٹ کا پلندہ ہیں۔“ پاپا نے یوں کہا جیسے ان کا بس نہ چل رہا ہوں کہ پھٹ پڑیں۔

”یہ۔۔۔ کیسے ممکن ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔“ صفیہ نے ہڈیائی انداز میں کہا۔ اس کے اندر خراب ٹوٹنے کا چھٹا کا اس قدر زیادہ ہوا تھا

کہ چند لمحوں تک اسے اپنی سادہ بدھی نہیں رہی تھی۔

”ایسا ہی ہے۔۔۔ میں نے ان کاغذات کے بارے میں پوری چھان بین کی ہے۔ اس میں سوائے دھوکہ دینے کے اور کچھ بھی نہیں

ہے۔" پاپا نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن وہ ایسا کیوں کرے گا۔۔۔ اس نے کیوں کیا ایسا۔۔۔؟" وہ اب بھی صدمے سے دوچار تھی اس لیے دیکھے ہوئے لہجے سے

بولی۔

"دیکھو بیٹی! میں نے تمہیں ہر طرح کی آزادی دی۔ تم نے جو چاہا میں نے اسے مانا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں تمہارے معاملات سے غافل رہا ہوں۔ ہاں کسی ٹھوس ثبوت کے اگر میں تم پر روک ٹوک لگا تا تو تم میرے ساتھ بھی ویسا ہی رویہ رکھتیں جیسا کہ تم نے اپنی ماں کے ساتھ کیا۔ میں نے تم سے یہ بھی نہیں کہا کہ تم نے غلط کیا ہے یا صحیح، ہمیشہ تمہاری بات کو اہمیت دی ہے لیکن اگر اب میں تمہیں تمہارے ہی فائدے کے لیے اس دھوکہ دہی کے بارے میں بتا رہا ہوں تو یہ بھی غلط نہیں ہے۔"

پاپا نے بہت مشکل سے دھیرے دھیرے کہا۔ اس نے ایک ایک لفظ سنا اور اس پر غور کرتی رہی۔ اچانک ہی اسے تیور کا وجود نہ اگلنے لگا۔ چند لمبے وہ اسی شاک میں رہی پھر دھیرے سے بولی۔

"اس سے یہ توقع نہیں تھی۔" اس کے لہجے میں حسرت شامل تھی۔

"کیوں نہیں توقع کی جا سکتی۔۔۔ اس دنیا میں جہاں بہت سارے اچھے بھروسہ دار اور بڑے غلام لوگ ہیں وہیں اسی قدر بڑے منافق اور دھوکے باز بھی ہیں۔ میں ان غمنے بد معاشوں کو بہر حال ان لوگوں سے اچھا خیال کرتا ہوں جو چہرے پر شرافت کا نقاب اوڑھے دوسرے لوگوں پر ظلم کرتے ہیں۔ غمنے بد معاش اس لیے بھی اچھے ہیں کہ وہ کھل کر سامنے تو آ جاتے ہیں۔ میرا مشورہ یہی ہے کہ آج کے بعد تم تیور کو بھول جاؤ۔ یہی تمہارے حق میں اچھا ہے ورنہ تم بہت بڑے دھوکے کا شکار ہو سکتی ہو۔" پاپا نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"پاپا! آپ نے جو کچھ کہا میں اسے مانق ہوں لیکن مجھے تیور پر حسرت آ رہا ہے۔ اس نے۔۔۔ اس نے میرے ساتھ فراڈ کرنے کی جرأت کیسے کی؟" سفید نے دانت پیتے ہوئے کہا۔

"اس لیے میری بیٹی اگر تم نے خود کو شکار ہونے کے لیے اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔ یہ تو اچھی بات ہے کہ تم نے مجھ پر اعتماد کیا اور نہ۔۔۔" یہ کہتے ہوئے ان کا اپنا لہجہ بھرا گیا تھا۔

"پاپا! میں آج کے بعد اس کا نام بھی نہیں لوں گی لیکن میرے دل میں اس سے انتقام کا جذبہ ضرور رہے گا میں اسے یونہی معاف نہیں کر سکتی۔" اس نے اندر ہی اندر کھولتے ہوئے کہا۔

"ہر کام وقت پر اچھا لگتا ہے۔ اس وقت تم ایسی پوزیشن میں نہیں ہو لہذا خاموشی سے اپنا امتحان دو بعد میں دیکھا جائے گا کہ اس کے ساتھ کیا ہو سکتا ہے؟" پاپا نے اسے گلے سے سمجھایا۔

"ٹھیک ہے پاپا! جیسا آپ چاہیں۔ میں اب اس کا نام بھی نہیں لوں گی۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"مجھے تم سے یہی امید تھی بیٹا! اسی میں تمہاری بہتری ہے۔"

پاپا نے کہا اور پھر اٹھ گئے وہ نوٹھی بیٹھی رہی۔ اسے زبردست شاک لگا تھا۔ کہاں وہ اپنے ہی خوابوں کے سہارے ہواؤں میں اُڑ رہی تھی اور کہاں اچانک وہ زمین پر منہ کے مل آ گری تھی۔ چوٹ لگنے سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کی حیثیت کیا ہے۔ اس کے اندر خُصاً غلے لگا اس کا جی چاہ رہا تھا کہ ابھی اٹھے اور جا کر اس کا منہ لوج لے لیکن ایسا کرنے سے بھی کیا ہوگا؟ وہ مردِ ذات ہے نقصان اگر ہوگا بھی تو اس کا اس کی تشہیر ہو جائے گی۔۔۔ سوچوں کا ایک سلسلہ تھا جو اسے اپنے گھبرے میں لپے ہوئے تھا۔ ملازمہ کب سے آ کر برتن لے جا چکی تھی، تبھی اس کے سیل فون کی گھنٹی بجی تو وہ چونک گئی۔ سکرین پر تیور کا نام جگمگا رہا تھا۔ اس نے ایک گہری اور طویل سانس لی پھر فون اٹھا لیا اور خود پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

”ہیلو۔۔۔؟“

”بھئی کہاں ہو تم صبح تمہارے فون کا انتظار کر رہا ہوں۔۔۔؟“ تیمور نے بھنجھلاتے ہوئے کہا۔

”تیور ایک گڑبڑ ہو گئی ہے شاید میں آپ سے آج نزل سکوں۔“ اس نے اپنا آپ سنبھالتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

”کیا ہوا امی نے کوئی بات کہہ دی۔۔۔؟“ اس نے ظہیر کے انداز میں پوچھا۔

”نہیں۔۔۔ بس ایسا پرالیم آن پڑا ہے کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتی۔“ اس نے ویسے ہی جیسے سے لہجے میں خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”پھر بھی کیا ہوا۔ کون سا ہپاڈ ٹوٹ پڑا ہے؟“ وہ اپنی ہی ذہن میں کہے جا رہا تھا۔

”اس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے اس لیے تمہیں بتانے کا قاعدہ۔۔۔؟“ اس نے اپنی ہی جھونک میں یوں کہا جیسے خود پر قابو بہت مشکل

ہو رہا ہو۔

”صنو! کیا ہو گیا ہے تمہیں یہ کیا کہہ رہی ہو تم نے غور کیا ہے اپنے لفظوں پر۔۔۔ ہمیشہ آپ کہنے والی اب تم کہہ کر مخاطب کر رہی ہو۔“ وہ

گڑبڑاتے ہوئے حیرت سے بولا۔

”سوری تیمور! پریشانی ہی اس قدر ہے کہ میں اپنے آپ ہی میں نہیں رہی ہوں۔“ وہ بولی۔

”اچھا تم آؤنا پھر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔ میں اگر تمہارے کسی کام آسکا تو۔۔۔“ وہ پیا پھرے لہجے میں بولا۔

”میں فارم ہاؤس تک نہیں آ پاؤں گی آج۔“ اس نے ظہیر سے ہوئے انداز میں کہا۔

”کیا واقعی بہت سیریس معاملہ ہے؟“ کھلی ہار اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”ہاں امی لیے کہہ رہی ہوں۔۔۔ سبھیوں ایک طوفان آ گیا ہے۔“ اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”وہ تو ٹھیک ہے مگر معاملہ ہے کیا۔۔۔؟“ اس نے پھر اصرار کیا۔

”آپ ایسا کریں اپنے آفس آئیں۔ میں بھی وہیں آ رہی ہوں وہیں آپ کو بتاتی ہوں۔“ وہ تیزی سے بولی۔

”ٹھیک ہے میں وہیں جا رہا ہوں۔ تم آ جاؤ۔۔۔“

اس نے کہا پھر فون بند کر دیا۔ صفیہ نے بھی اپنا فون بند کرتے ہوئے زہر ملی مسکراہٹ سے فون کی طرف دیکھا۔

دو پہر ہونے کو تھی جب صفیہ اپنی گاڑی میں تیمور کے آفس پہنچ گئی۔ اس وقت بھی وہ عام سے لباس انفرمیک آپ اور کسی جیلری وغیرہ کے بغیر تھی۔ وہ سیدھی اُس کے کمرے کی جانب بڑھ گئی اور بنا دستک دیئے اُس کے کمرے میں چلی گئی۔ وہ تنہا تھا۔

”اوہ آؤ صفو! میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔“

”سوری! تیمور! میں آج فارم ہاؤس تک نہیں جا پائی۔“ اس نے بیٹھنے ہی بڑی عداوت بھرے انداز میں کہا۔

”کوئی بات نہیں۔۔۔ تم سہولت سے بیٹھو اور بتاؤ بات کیا ہے۔ فارم ہاؤس تو کبھی بھی جایا جاسکتا ہے۔“ تیمور نے ہمدردی سے کہا۔

”بات دراصل یہ ہے کہ پاپا کو اچانک دس لاکھ کی ضرورت آن پڑی ہے۔ انہوں نے۔۔۔“ صفیہ نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”اتنی تھوڑی سی رقم کے لیے تم پریشان ہو رہی ہو۔۔۔ وہ اتنے بڑے آفیسر ہیں تمہارا بھائی کا رو بار کر رہا ہے۔ اتنی رقم تو ویسے ہی پڑی ہوتی ہے۔“

”اصل میں انہیں کہیں ادا نیگی کرنی ہے۔ رقم تو بہت زیادہ چاہئے دس لاکھ کم پڑ رہے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے میرے عزیز اور وغیرہ مانگے ہیں تاکہ میں انہیں دوں تو وہ سچ کر رقم پوری کریں۔ فوری طور پر یہی ممکن ہے ورنہ پراپرٹی بھی ہے۔ میں اپنا ذریعہ نہیں دینا چاہتی۔“ اس نے یوں کہا جیسے کسی بچے سے اُس کا کھلونا مانگا جا رہا ہو اور وہ دینے سے انکار کر رہا ہو۔

”بس اتنی سی بات پر پریشان ہو گئی ہو؟“ تیمور نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کیا یہ پریشانی والی بات نہیں ہے؟“ وہ حیرت سے بولی۔

”نہیں۔۔۔ حقیقت یہ ہے، صفو! تمہاری یہ پریشانی ہے ہی نہیں تمہیں جھوٹ بولنا آیا ہی نہیں ہے۔ تم وہ بات کرو جو اصل میں ہے۔“ تیمور نے اچانک بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔

”یہ کیا کہہ رہے ہو تم۔۔۔؟“ صفیہ جو پہلے ہی غصے میں تھی اچانک غصے سے اُکڑ گئی۔

”صفو! میری جان! تم کیا سمجھتی ہو کہ میں کوئی بہت بڑا امیر ہوں جو تمہارے بڑا سے جھوٹ پر فوراً چیک بک نکالوں گا! اس میں رقم بھردوں گا اور دستخط کر کے تمہارے حضور پیش کروں گا؟“ وہ مسکراتے ہوئے لفظ چپا کر بولا۔

”تمہارا مطلب ہے کہ میں نے یہ اس لیے کیا ہے کہ تم مجھے رقم دو۔۔۔؟“ وہ بولی تو اس کی آواز میں لرزش تھی۔

”ہاں ایسا ہی ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”تم یوں کیسے کہہ سکتے ہو۔۔۔؟“ اس نے غصے میں کہا۔

”اس لیے میری جان! کہ ایسا کچھ نہیں ہے تمہارے گھر میں ہانگل سکون ہے۔ تمہارے باپ نے رقم مانگی ہے اور نہ ہی انہیں کسی ادا نیگی کے لیے ضرورت ہے۔ اصل میں تمہارے باپ نے میرے دیئے ہوئے کاغذات کے بارے میں تمہیں بتا دیا ہے کہ وہ فراڈ تھے۔“

یہ کہہ کر تیمور نے گہری لٹکاہوں سے صفیہ کی جانب دیکھا جس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا لیکن ساتھ میں حیرت بھی پھیل گئی تھی۔

ہے۔ قادم ہاؤس پر بھی کبیرے ہیں وہاں تمہاری اور میری تجمائی کی ملاقاتیں ریکارڈ ہو چکی ہیں۔ تم کہیں بھی بھاگ کر نہیں جا سکتی ہو جب تک میں نہ چاہوں۔ جاؤ اور بہت غور کرو۔ میرا ساتھ قبول ہے تو نہال کروں گا اور اگر نہیں تو سوچنا میں تمہارے ساتھ کیا کر سکتا ہوں۔ اب دفع ہو جاؤ میرے آفس سے۔ میں جب چاہوں گا تم سے بات کروں گا مگر خود فون کرنے کی کوشش نہ کرنا۔۔۔ جاؤ۔“

اُس نے انتہائی عقارت سے کہا تو صفیہ ہونٹوں کی طرح وہاں سے اٹھ گئی۔ پھر اسے ہوش ہی نہیں رہا کہ وہ وہاں سے کب اٹلی کب اپنی گاڑی تک پہنچی۔ وہ پوری جان سے سلگ رہی تھی پوری دنیا میں آگ لگا دینا چاہتی تھی۔ اتنی عقارت اتنی بے عزتی اور اس قدر رُسوا سلوک۔۔۔ وہ بہت مشکل سے اپنے گھر تک پہنچی۔ اس نے گاڑی کھڑی کی اور گرتی پڑتی اپنے کمرے تک آ کر اپنے بستر پر گر گئی۔ وہ رونا چاہتی تھی لیکن اس کی آنکھ سے ایک بھی آنسو نہیں پٹکا۔ اس کا جی چاہا رہا تھا کہ یہ دنیا ہی چھوڑ دے۔ وہ اپنے آپ کو قتم کرنے کا سوچ رہی تھی مگر پھر اسے ہوش نہیں رہا وہ اٹھ ہی نہ سکی۔ ہر طرف اندھیرا چھا گیا تھا۔

☆ ☆

راحیلہ اس وقت ایمر جنسی میں ڈیوٹی کر رہی تھی۔ وہ دیگر شاف کے ساتھ مصروف تھی۔ ان کی ڈیوٹی ختم ہونے میں ابھی کچھ وقت پڑا تھا۔ ایک خاتون ڈاکٹر اپنے کمرے میں موجود تھی باقی سب چلے گئے تھے۔ جب سے میڈم کو یہ معلوم ہوا تھا کہ راحیلہ ایک خاموش گائے کی مانند نہیں شیر کے جیسا حوصلہ بھی رکھتی ہے اس کے بعد سے وہ اپنی مرضی سے ڈیوٹی لگواتی اور زیادہ تر اس کے ساتھ نسرین ہوتی تھی جس کے ساتھ اس کا وقت بہت اچھا کٹ جاتا تھا۔ اب اکثر وہ دن کی ڈیوٹی کے بعد رات اپنی ماں کے ساتھ گزارتی تھی۔ اس کی ماں جب سے شہر میں آئی تھی ایک خاموشی سی اسے لگ گئی تھی۔ اُس نے کبھی کوئی سوال راحیلہ سے نہیں کیا تھا بس چپ چاپ سارا دن گزارتی۔ اب اسے کھانا بھی نہیں بنانا پڑتا تھا اور نہ ہی کوئی گھر کا کام کرنا پڑتا سارے کام وہی نوجوان لڑکی رضیہ کر دیتی جو ان کے ساتھ رہ رہی تھی اور اس کا خاندان شام ڈھلے گھر آتا تھا۔ راحیلہ کی ماں سارا دن یا تو ان کے بچوں میں مصروف رہتی جو اُس سے خاصے مانوس ہو گئے تھے یا پھر نماز تسبیح میں دن گزارتی۔ دوسرے سے دوسرے دن جب وہ تھکی ماندی گھر جاتی تو اس کے باوجود کہ وہ بہت تھکان محسوس کرتی اپنی ماں سے باتیں کرنے کو اس کا دل بہت چھٹا لیکن وہ ہوں ہاں کر کے ہی رہ جاتی تھی۔ اس نے سوچا کہ یہ ماحول کی تبدیلی اثر ہے۔ کچھ عرصہ ایسے ہی رہے گا پھر ٹھیک ہو جائے گا۔ ظاہر ہے یہاں اُس کا کوئی جاننے والا نہیں تھا جبکہ گاؤں میں اُس نے اتنی ذمہ داری تھی فرق تو پڑنا ہی تھا۔ وہ خود بھی اتنا وقت کہاں دے پاتی تھی۔ بس یہی سوچ کر اپنے آپ کو ڈھارس دے لیتی کہ یہ امتحان ختم ہو جائیں گے تو پھر وہ سارا دن اپنی ماں کے پاس رہا کرے گی اور خوب جی بھر کے ان کی خدمت کرے گی۔۔۔ انہی سوچوں کے دوران وہ تیزی سے کاغذوں میں اُلجھی ہوئی اپنا کام بھی ختم کر رہی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ ڈیوٹی آف کرنے کے بعد وہ آج اپنی ماں کی طرف جائے گی۔ وہ اپنے کام میں مصروف تھی کہ کارڈر میں الجھل ہوئی۔ ان کے لیے یہ معمول کی بات تھی مریض آتے ہی رہتے تھے۔ ایمر جنسی میں تو لوگ بہت تیزی سے آتے ہیں۔ پھر چند لمحوں بعد مریض کو اندر لایا گیا تو وہ کاغذات چھوڑ کر اس کی طرف لپکی اُٹنے میں ڈاکٹر بھی آ گئی۔ اس نے سامنے پڑی صفیہ کو غور سے دیکھتے ہوئے اُلجھو سکوپ سیدھا کیا۔

”کیا ہوا ہے؟“

ڈاکٹر نے سرسری سے انداز میں پوچھا اور اسے دیکھنے لگی۔ اس کے ساتھ سملی اور زہون بی بی تھی۔ راحیلہ پہچان چکی تھی کہ وہ زہون بی بی ہے جو کچھ عرصہ پہلے یہاں پرائیوٹ تھی اور اس نے دو بار وہ ملنے کا وعدہ کیا تھا جبکہ زہون بی بی نے اسے نہیں دیکھا تھا۔

”پہنچیں، جی یہ اپنے کمرے میں بے ہوش پڑی تھی۔“ سملی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”درمیان میں کہیں ہوش آیا تھا یا یہ مسلسل یونہی بے ہوش ہے؟“ ڈاکٹر نے اس کے دل کی دھڑکن دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”یہاں لاتے لاتے تھوڑا ہوش کیا تھا پھر یونہی۔“ سملی سے کہا نہ گیا۔

”ٹھیک ہے۔۔۔ آپ باہر نہیں ہم دیکھتے ہیں۔“

ڈاکٹر نے المیہ خان سے کہا اور اسے ہوش میں لانے کے لیے کوشش کرنے لگی۔ اس کے ساتھ راحیلہ اور دوسری دو تریس بھی شامل ہو گئیں۔ اتنے میں دو ڈاکٹر مزید آگئے جن کی یہاں ڈیوٹی تھی۔ تقریباً چارہ منٹ کی کوشش کے بعد وہ ہوش میں آگئی۔ صفیہ کارنگ پیلا زرد ہو رہا تھا۔

ڈاکٹر اس سے مختلف سوالات پوچھتے رہے ساتھ میں انجکشن وغیرہ بھی لگے۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ان سب کی رائے تھی کہ مریض کو سخت ذہنی جھٹکا ہوا ہے جس سے نروس بریک ڈاؤن ہو گیا ہے۔ اسے ایمرجنسی وارڈ میں شفٹ کر دیا گیا جہاں سملی اور زہون بی بی اس کے پاس تھیں۔ راحیلہ انجکشن دینے لگی تو زہون بی بی نے اسے پہچان لیا۔ یونہی چند باتوں کے بعد اس نے پوچھا۔

”کیا ہوا ہے صفیہ کو۔۔۔؟“

”پہنچیں یعنی ایس اتنی سمجھا آتی ہے کہ جس طرح میں اس کی وجہ سے یہاں پہنچی تھی اسی طرح یہ اپنی وجہ سے یہاں پر آئی ہے۔ کوئی بہت گہرا صدمہ پہنچا ہے اسے۔“ زہون بی بی نے کہا۔

”خیر اللہ کرم کرے گا۔ آپ حوصلہ رکھیں ٹھیک ہو جائے گی یہ۔“

راحیلہ نے سکون سے کہا اور پلٹ گئی۔ اس کیلئے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی لوگ جب اپنی ہی سوچوں سے بے بس ہو جاتے ہیں تو اسی طرح خود سے بیکار ہو جاتے ہیں ایسا فطرت انہی کے ساتھ ہوتا ہے جو حوصلہ نہیں رکھتے بلکہ مایوسیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ قدرت نے انسان کے اندر

ایسی صلاحیتیں رکھی ہیں کہ وہ چاہے تو اپنے آپ کو بہت مضبوط بنالے یا پھر خود کو ایسا بنا لے کہ ذرا سی ہوا اسے آڑا کر رکھ دے۔ چونکہ انسان اپنے ہی خیالات کا عکس ہے۔ وہ جو سوچتا ہے اس کا اظہار اس کے اعمال سے ہو جاتا ہے۔ سوچ سے عمل تک کے دورانے میں فقط ایک شے ہے جو بنیاد ہے

اور وہ ہے یقین۔ اگر انسان کو اپنے آپ پر یقین ہے تو پورا بھی اس کے سامنے رائی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں۔ تاریخ شاید ہے کہ انسان نے ایسا کر کے دکھایا ہے لیکن اگر اسے خود پر یقین نہیں ہے تو اس پر جینکا اٹھانا بھی بھاری ہو جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یقین کس طرح پیدا

ہو؟ یہی وہ راز ہے جس سے انسان غافل رہتا ہے حالانکہ یہ راز اس کے اندر ہی پڑا ہوا ہے جو اس وقت ہی کھلتا ہے جب انسان اپنے آپ پر نگاہ ڈالتا ہے۔ کیا کبھی ہم نے یہ سوچا کہ انسان کا ارادہ کیا شے ہے؟۔۔۔ جو لوگ اس پر سوچتے ہیں وہ یقین کی منزل تک ضرور پہنچتے ہیں۔

راحیلہ کی اپنی زندگی اس قدر سخت دور سے گزری تھی کہ اگر وہ لوگوں کی باتوں میں چبھے ہوئے زہر کو محسوس کرتی تو وہ اپنے حالات کی مشکلوں کو خود پر حاوی کر لیتی اور زندگی کی مسدود راہوں میں حوصلہ ہار کر بیٹھ جاتی تو اب تک وہ مر گئی ہوتی۔ اسے اگر زندہ رکھا تھا تو اس کے یقین نے۔ اسے اپنی ذات پر اعتماد تھا کہ وہ ان سب سے نبرد آزما ہو سکتی ہے۔ ویرے ویرے لوگ ہاتھ کرنا بند کر گئے حالات کی مشکلات ختم ہونا شروع ہو گئیں اور زندگی کی راہیں کھل گئیں۔ راحیلہ لاشعوری طور پر اس سے اپنا مقابلہ کیے جا رہی تھی۔ اسے یہ کچھ نہیں آ رہی تھی کہ جن کی زندگی اپنی سہل ہوتی ہے وہ حوصلہ کیوں ہار بیٹھتے ہیں؟ اگرچہ یہ سوال اپنی جگہ اہمیت رکھتا تھا لیکن اسے نہیں معلوم تھا کہ ان کے اپنے الگ طرز کے مسائل و معاملات ہوتے ہیں۔ اس سے بحث نہیں کہ وہ حتمی ہوتے ہیں یا ثابت ان کی بنیاد میں لالچ و ہوس پائی جاتی ہے یا غلوں؟ یہی سوچتے ہوئے وہ اپنا کام ختم کر چکی تھی۔ اس کی ذیوبی کا وقت بھی ختم ہو گیا۔ ساتھی نرسز ہاسٹل کی جانب جانے کو تیار تھیں۔ اس کا جی چاہا کہ وہ ایک بار زینون بی بی کے پاس ضرور جائے چاہے چند لمحوں کے لیے ہی کسی۔۔۔ وہ اٹھی اور ان کے پاس چلی گئی۔

”آپ کسی طبیعت ہے۔۔۔؟“

اس نے پوچھا تو صفیہ نے غم آلود نگاہیں اٹھا کر اس کی جانب دیکھا پھر لگا ہیں بٹاتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔

”پوری طرح ہوش میں نہیں آ رہی ہے ایسے ہی ہونقوں کی طرح دیکھے چلے جا رہی ہے۔“ زینون بی بی نے بتایا۔

”آپ اسے آرام کرنے دیں اس سے باتیں مت کریں۔“ راحیلہ نے ویرے سے تاکید کی۔

”تمہاری ہمدردی کا بہت شکریہ بیٹی!“ زینون بی بی نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ تو میرا فرض ہے۔۔۔ اس وقت تو میں جا رہی ہوں۔“ اس نے کہا اور واکس مڑ گئی اسے اپنے گھر جانے کی جلدی تھی۔

☆☆

یستی

اس طویل و عریض دنیا میں ابھی بے شمار حقائق ایسے بھی ہیں جن سے انسان پوری طرح ناخبر نہیں ہو سکا ہے لیکن اس کی تجسس پسند فطرت ہر روز کسی نئے چونکا دینے والے انکشاف کے لئے اسے بے قرار رکھتی ہے۔ ایسے ہی چند تحقیق کے میدان کے کھلاڑیوں کی ہم جوائی کا قصہ۔ وہ ایک ان دیکھی مخلوق کے بارے میں جاننے کے لئے بے چین تھے۔ ان کی ہم جو طبیعت انہیں خطرناک راستوں پر لے آئی تھی۔ ایک ہفتی (ہوفانی انسان) کی انہیں تلاش تھی۔ اس کتاب کا قصہ جس کا آخری باب تحریر کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ انگریزی ادب سے یہ انتخاب کتاب گھر کے ایکشن ایڈیٹر جنرل سیکشن میں دستیاب ہے۔

جس وقت راحیلہ نے رکشے سے اتر کر اپنے گھر کی تہل دی اس وقت اسے خیال آیا کہ جنیہ نے تو یہ کہا تھا کہ وہ یہ گھر اپنے ٹھکانے کے طور پر لے کر رہے رہا ہے مگر اتنے دن ہو گئے اس نے ایک بار بھی یہاں آنے کے لیے نہیں کہا۔ اس خیال کے ساتھ ہی اسے احساس ہوا کہ اس نے کئی دن ہوئے فون بھی نہیں کیا۔ اللہ خیر کرے اسکے دل سے یہ دعا نکلی۔ تبھی گیٹ کھل گیا اور وہ اندر چلی گئی۔ اس کی ماں مطرب کی نماز پڑھ چکی تھی لیکن ابھی تک جائے نماز پر چٹھی ہوئی تھی۔ پھر ملنے ملانے کھانا کھانے اور تھوڑی دیر باتوں کے بعد جب وہ اپنے بستر پر لیٹی تو اسے پھر سے جنیہ کا خیال آیا۔ چند لمحوں تک وہ اسے فون کرنے یاد کرنے کے بارے میں سوچتی رہی پھر بے تاب سی ہو کر نمبر ملانے لگی۔ چند لمحوں بعد رابطہ ہو گیا۔

”ہیلو۔۔۔“ وہ وحیرے سے بولی۔

”ہاں راحیلہ! کیسی ہوتی۔۔۔؟“ اس نے خوشگوار لہجے میں پوچھا۔

”میں ٹھیک ہوں مگر لگتا نہیں ہے کہ آپ ٹھیک ہوں گے۔ اتنے دن ہو گئے فون ہی نہیں کیا؟“ اس نے ایک ہی سانس میں سب کہہ دیا جس میں شکوہ بھی تھا اور شکایت بھی۔

”تم ٹھیک کہتی ہو۔ میں ان دنوں کچھ مصروف ہوں اس لیے کوئی رابطہ نہیں کر سکا۔“ اس نے ضمیر سے ہوئے لہجے میں کہا۔

”ابھی بھی کیا مصروفیت حال احوال پر چسنے میں کون سا وقت لگتا ہے؟“ راحیلہ کا لہجہ شکوے بھرا تھا۔

”تمہیں یاد ہے راحیلہ! میں جس مریض کو لے کر ہسپتال آیا تھا اور ایک بار تم نے اس کے بارے میں سوال بھی کیا تھا کہ میں اسے کیوں۔۔۔“

راحیلہ نے بات کا سچے ہوئے کہا۔ ”میں اسے کیسے بھول سکتی ہوں آپ ہی کی گولی سے وہ زخمی ہوا تھا۔“

”وہ گولی میں نے اپنی مدافعت میں ماری تھی وہ ٹھیک بھی ہو رہا تھا لیکن مر گیا۔ اب اس کے دل کا الزام مجھ پر ہے بس اسی کے چکر میں ہوں۔“ وہ بڑے ضمیر سے ہوئے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”کیا پولیس۔۔۔؟“ وہ تشویش سے بولی۔

”نہیں! میرے ہی لوگ ہیں۔ انہیں بس اتنا یقین چاہئے کہ ہسپتال میں اس کے ساتھ کچھ ہوا ہے۔ میرے ساتھ ایک اور بھی لڑکا تھا اسی نے کچھ کیا ہے۔ اب وہ ملک سے فرار ہو چکا ہے اور۔۔۔“

”میں اس بارے میں تصدیق کر لوں گی کہ اس کی موت کس وجہ سے ہوئی تھی۔ ریکارڈ میں تو موجود ہوگا؟“ راحیلہ نے تیزی سے کہا۔

”کیا ایسا ممکن ہے؟“ وہ تیزی سے بولا۔

”ہاں۔۔۔ اس سے کچھ نہ کچھ تو اندازہ ہوگا۔“

”ٹھیک ہے میں کل پھر فون کروں گا۔“

اس نے کہا اور پھر یونہی ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ پھر رات گئے۔ باتیں ختم ہوئیں اور وہ سو گئی۔

اگلے دن جب وہ ڈیوٹی پر گئی تو سب سے پہلے اس کلرک کے پاس گئی جو اسے ریکارڈ دے سکتا تھا۔ اس نے تھوڑی دیر تک حیل و حجت کی لیکن جب ایک بڑا نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے راحیلہ نے کہا۔

”ایسا ہی مزید آپ کو ملے گا اگر آج ہی وہ مطلوبہ فائل کی فوٹو کاپی مجھے مل جائے۔“

”سٹاف اڈیکٹو یہ معاملات اسی وقت سامنے آتے ہیں جب پولیس یا عدالت کو مطلوب ہوں۔ مجھے یہ کچھ میں نہیں آرہا ہے کہ آپ کو اس کی ضرورت کہاں آن پڑی ہے؟“ کلرک نے اپنا اطمینان کرنا چاہا۔

”میں آپ کو پوری تفصیل بتا دوں گی اگر آپ اس فائل کی فوٹو کاپی مجھے دے دیں۔“ اس نے صاف لفظوں میں کہا۔

”ٹھیک ہے میں دے دوں گا۔“ اس نے حتیٰ انداز میں جواب دیا۔

”میں وہ پہرے کے وقت آؤں گی۔“

یہ کہہ کر وہ اٹھ گئی اور سیدھی ایمر جنسی وارڈ میں چلی گئی جہاں اس کی ڈیوٹی تھی۔ وہاں جا کر اسے معلوم ہوا کہ نہ نون بی بی کی مریضہ اب وہاں نہیں ہے انہیں پرائیویٹ وارڈ میں شفٹ کر دیا گیا ہے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ وہاں جائے ان کا حال احوال پر دیکھے لیکن پھر وہیں مصروفیت میں کھو گئی یہاں تک کہ دوپہر کے وقت اسے خیال آیا تو وہ سیدھی کلرک کے پاس چلی گئی جس نے ایک بتدلفائی میں اس فائل کی فوٹو کاپی کر کے اسے دے دی۔ راحیلہ نے کلرک کے کمرے سے نکلنے ہی چند کوفون کر دیا کہ فائل مل گئی ہے اب وہ پوری تفصیلات سے آگاہ ہو کر ہی فون کرے گی۔ راحیلہ وہ فائل لے کر اسی ڈاکٹر کے پاس چلی گئی جس نے اس کا پوسٹ مارٹم کیا تھا۔ اس نے فائل دیکھی اور پھر پوچھا۔

”سٹاف اسٹنڈ آپ کو اس کی تفصیل تو بتا دیتا ہوں لیکن پہلے مجھے مطمئن کرو کہ یہ بی بی کہاں سے اور آپ کی اس میں کیا دلچسپی ہے؟“

”میرے ایک محسن دیکل ہیں انہوں نے دی ہے تاکہ میں آپ سے معلومات لے سکوں۔ ان کے مجھ پر بڑے احسان ہیں۔“ راحیلہ نے فوراً ہی جھوٹ گھڑ لیا۔

”کیا آپ اس دیکل سے مجھے ملوا سکتی ہیں؟“ اس نے راحیلہ کے چہرے پر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کیوں نہیں۔“ وہ حیرتی سے بولی۔

”میں دو گھنٹے تک ادھر ہوں آپ انہیں بلا لیں میں پوری تفصیل ان کے ساتھ شیئر کر لوں گا۔“ اس نے وہ فائل راحیلہ کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

”میں ان سے بات کرتی ہوں اگر وہ آگئے تو۔“ راحیلہ نے بات نہ بننے دیکھ کر بچھے دل سے کہا۔

”اگر انہیں دلچسپی ہوئی تو ضرور آئیں گے۔ آج اگر مصروفیت ہوئی تو کل آ جائیں۔“ ڈاکٹر شاید مطمئن نہیں ہو پارہا تھا۔

”ٹھیک ہے ڈاکٹر! آپ کی بہت مہربانی۔۔۔“

اس نے کہا اور اٹھ گئی۔ کلرک ریکارڈ میں آ کر اس نے چند کوفون کیا۔ اس نے تمام بات سنتے ہی کہا۔

”یہ کون سی بڑی بات ہے میں ابھی ہمایوں کو بھیجتا ہوں۔“

”یہ لٹیک رہے گا۔“ راحیلہ کی جیسے جان میں جان آگئی اس کا جھوٹ سج میں تبدیل ہو جانے والا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹہ بھی نہیں گزرا تھا کہ ہمایوں نے راحیلہ کو فون کر دیا۔ وہ ہسپتال پہنچ چکا تھا اور اس سے پوچھ رہا تھا کہ وہ کہاں ہے؟ دونوں نے ایک جگہ ملنے کی پھر تھوڑے سے وقت کے بعد وہ ڈاکٹر کے پاس تھے۔ تھوڑی دیر تعارف وغیرہ میں گزرنے پھر ڈاکٹر نے کہا۔

”مجھے خود حیرت تھی کہ اس مریض کی موت کیسے واقع ہو گئی ہے۔ اس کا زخم لٹیک ہونے کی طرف جارہا تھا اور پوری امید تھی کہ چند دن تک وہ بالکل لٹیک ہو جاتا۔ کوئی زہر نہیں پھیلا تھا ایسا کوئی ثبوت نہیں ملا یہ میں نے رپورٹ میں بھی لکھا ہے۔ بہت مشکل سے مجھے یہ معلوم ہوا کہ اس کی موت حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے ہوئی تھی۔ بلاش اس کا سانس رکا تھا اور اُلجھن میں پر ہے کیونکہ اس سے اڑتالیس گھنٹے قبل آکسیجن اُتار دی گئی تھی اس وقت مریض کو ضرورت نہیں تھی۔ اب سانس کس طرح رکا ہے۔ یہی اُلجھن ہے اور یہ بات رپورٹ میں درج ہے۔“ ڈاکٹر نے تفصیل سے بتایا۔

”مطلب مریض رو بہ صحت تھا لیکن اس کی سانس رکا جانے کی وجہ سے اس کی موت واقع ہوئی؟“ ہمایوں نے پوری بات سمجھتے ہوئے کہا۔

”جی۔۔۔ اس وقت کسی طرف سے یا اس مریض کے لواحقین نے توجہ نہیں دی تھی ورنہ یہ بات اسی وقت کھل جاتی تھی مگر یہ بات فائلوں میں دفن ہو گئی۔ اب آپ اس کا کیس لڑنا چاہتے ہیں تو مجھے یقین نہیں کہ آپ اس وجہ تک پہنچ پائیں گے۔“ ڈاکٹر نے کہا۔

”آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں؟“ ہمایوں نے کر دیا۔

”اس لیے کہ میں ایک پرو فیشنل بندہ ہوں۔ مجھے بھی اُلجھن ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ اگر اس وقت کرید ہوئی تو بات سامنے آ سکتی تھی لیکن اب بہت دیر ہو چکی ہے۔“ ڈاکٹر نے کہا۔

”میرے پاس اگر ٹھوس دلائل ہوتے تو میں ضرور آپ کو مطمئن کروں گا یہ میرا وعدہ رہا اور نہ ہوتے تو میں خاموش ہو جاؤں گا۔“

ہمایوں نے کہا۔ پھر تھوڑی دیر باتوں کے بعد وہ اٹھ گئے۔ دونوں کارڈور میں چلتے چلے آ رہے تھے۔ ان کے درمیان یہی موضوع چل رہا تھا۔ ہمایوں کا خیال تھا کہ بات صاف ہو گئی ہے، ڈیشان ہی دراصل عالمگیر کا قاتل تھا۔ اب جنیوا پٹی قیادت کو مطمئن کر سکتا ہے۔۔۔ پارکنگ کی جانب بڑھتے ہوئے ہمایوں نے کہا۔

”اچھا اب میں چلتا ہوں۔ میں پوری تفصیل خود ہی اُسے بتا دوں گا۔“

”کم از کم جاننے یا اظہار؟“ آپ یونہی جا رہے ہیں اس طرح اچھا نہیں لگتا۔“ راحیلہ نے کہا۔

”چلو تم پر اُدھار رہا اس کے عوض کسی دن کھانا کھائیں گے وہ بھی تمہارے گھر۔ اس وقت جانا ضروری ہے پھر کسی وقت سہی۔“ ہمایوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی۔“

راحیلہ نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔ ٹھیک انہی لمحات میں پارکنگ میں ایک گاڑی آ کر رُکی اس میں سے زینون بی بی اور سلسلی باہر آ گئیں۔ اُن کی نگاہ دونوں پر پڑی تو اُن کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اُن دونوں کی نگاہوں کا مرکز آب ہا یوں تھا۔

”ہا یوں ایہ آپ کو ایسے کیوں دیکھ رہی ہیں؟“ راحیلہ نے فوراً ہی پوچھتے ہوئے پوچھا۔

”یہ جو اہم عمر خاتون ہے نہ یہ میری چاچھی ہیں اور اُس کے ساتھ میری کزن۔“ یہ کہتے ہوئے اُس نے تشویش سے پوچھا۔ ”مگر یہ

یہاں کیا کر رہے ہیں؟“

”ان کی بیٹی کو نروس بریک ڈاؤن ہو گیا ہے کل سے وہ یہاں ایڈمٹ ہے۔“ راحیلہ نے ویرے سے جواب دیا۔

”صنیا۔۔۔ اے۔۔۔“ ہا یوں اتنا ہی کہہ سکا۔

”ہاں کوئی صدمہ پہنچا ہے اے۔“

وہ بولی تو ہا یوں نے ویرے سے کہا۔

”اچھا۔۔۔ انہیں معلوم نہ ہو کہ ہمارے درمیان کوئی تعلق یا شاساساتی ہے۔ اس کی تفصیل میں بعد میں بتاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔“

راحیلہ نے کہا تو ہا یوں آگے بڑھ گیا۔ زینون بی بی نے اُسے دیکھ کر رُکنا چاہا مگر وہ نہیں رُکا اپنی گاڑی تک گیا اور تیزی سے وہاں سے نکل

گیا۔ وہ دونوں کھڑی اُسے دیکھتی رہیں۔ جب وہ نگاہوں سے اوچھل ہو گیا تو زینون بی بی جھکے قدموں سے راحیلہ کی جانب آگئی۔ راحیلہ نے اُسے

سلام کیا جس کا جواب دیتے ہوئے اُس نے پوچھا۔

”بی بی! یہ لڑکا ہا یوں ہی تھا نا۔۔۔؟“

”ہی۔۔۔ یہی نام بتایا تھا انہوں نے۔“ راحیلہ نے کہا۔

”یہاں کیا کرنے آیا تھا؟“ وہ تشویش سے بولی۔

”کسی کیس کے سلسلے میں یہاں ایک ڈاکٹر سے ملے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے بھی بلوایا تھا کوئی بات پوچھنے کے لیے اب میں انہیں یہاں

تک چھوڑنے آئی تھی۔ کیا آپ جانتی ہیں انہیں؟“

”جانتی ہی نہیں پہچانتی بھی ہوں لیکن۔۔۔ خیر!“

یہ کہتے ہوئے زینون بی بی ایک دم سے اُسے سیٹ ہو گئی پھر کوئی بات کہے بغیر آگے بڑھ گئی۔ اُس کے پیچھے سلسلی تھی۔ تب راحیلہ بھی اپنے

وارڈ کی جانب چلی گئی۔ راحیلہ کو پورا یقین ہو گیا تھا کہ ان کے درمیان کوئی بات ضرور ہے۔ کیا ہے؟ یہ معلوم نہیں تھا۔

☆☆

جنید اپنی قیادت کے تین اہم لوگوں کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اُن کے سامنے اپنی طرف سے پھر پورے دلائل دینے کے بعد لمبی گفتگو کر چکا تھا اور اُن کی طرف سے کسی جواب کا شکر تھا۔ تھوڑی دیر یونہی گزر گئی تو اُن میں سے بولا۔

”جنید! ہمیں اُس دن ہی یہ معلوم ہو گیا تھا کہ تم بے گناہ ہو جس دن ڈیٹا ان کے ہاگ چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ اگرچہ ہم نے تمہیں فقط تین دن دینے تھے لیکن یہ تین دن تمہیں ماہ پر بھیلا ہو گئے ہیں۔ ہم اصل کہانی تک پہنچنا چاہتے تھے اور وہ اصل کہانی یہ ہے کہ ڈیٹا ان نے عالمگیر کو قتل کیا اور بھاگ گیا۔“

”لیکن اُس نے ایسا کیوں کیا؟“ جنید نے پوچھا۔

”اُن دنوں کے درمیان تنازعہ چل رہا تھا۔ دونوں ہی تنظیم چھوڑ دینا چاہتے تھے اور تنازعہ یہ تھا کہ اُن کی رقم جو دونوں ہی اپنے ذرائع سے حاصل کرتے رہے تھے وہ کوئی تیسرا اُن کے درمیان سے لے اُڑا تھا۔ اس میں قصور عالمگیر کا تھا کہ اُس نے اسلٹ خریدنے کے لیے یہ رقم درمیان کے ایک بندے کو دی تھی۔ اُن ڈیٹا ان اُس تک پہنچ گیا ہے اور بڑے آرام سے زندگی گزار رہا ہے۔ وہ آپ ان ہاتھوں میں ہے جو بین الاقوامی طور پر کام کر رہے ہیں۔“ دوسرے شخص نے تفصیل سے بتایا۔

”میں نے اپنا دامن صاف کرنا تھا وہ کر دیا ہے۔ آپ کو اصل بات معلوم ہو گئی میرے لیے اتنا ہی کافی ہے۔“ جنید نے فوراً ہی اپنی صفائی میں کہہ دیا۔

”لیکن ہم چاہتے ہیں کہ یہ مدداری تم قبول کرو۔ ڈیٹا ان نے جس طرح قیادت کی ہے اُسے معاف نہیں کیا جاسکتا۔ اُس نے یہاں بھی اپنا میٹ ورک بنا رکھا ہے اسے تو ڈٹا ہے ورنہ ہماری تنظیم کزور ہی نہیں ختم ہو کر رہ جائے گی۔“ تیسرے نے دھیرے سے تشویش کے ساتھ کہا۔

”میں اکیلا نہیں کر سکتا کیونکہ میری معلومات کے مطابق ہم میں سے ہی وہ لوگ ہیں جو اُس کے نیٹ ورک کا حصہ بننے چلے جا رہے ہیں۔ میں اعتماد کس پر کروں؟— یا پھر مجھے وقت دیا جائے کہ میں اپنے حساب سے بندے جمع کروں اور پھر کوئی معاملہ دیکھوں۔“ جنید نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”بد قسمتی سے ایسا ہو رہا ہے حکومت کی جانب سے بھی کوئی اچھے اشارے نہیں مل رہے ہیں۔ تم جو چاہو کرو لیکن ڈیٹا ان کا میٹ ورک ختم کرو۔ اس کے لیے تم جو چاہو گئے تمہیں ملے گا۔“ پہلے نے دہرے ہوئے لہجے میں کہا جیسے اُس کے نزدیک یہی سب سے اہم بات ہے۔

”اگر یہ سارے مدداری بھروسے جاری ہے تو میں قبول کرتا ہوں۔“ جنید نے پوری سنجیدگی سے اس ناکت کو اپنے ذمے لے لیا۔

”جو ضروری معلومات ہوں گی وہ تمہیں دے دی جائیں گی اور بہت ساری باتوں کا تمہیں خود بھی علم ہوگا۔ اس بابت اگر تم کوئی بات کرنا چاہو تو کر سکتے ہو۔“ تیسرے نے سرد سے لہجے میں کہا۔

”اسی کوئی بات نہیں لیکن جس طرح آپ نے کہا ہے کہ حکومت کی طرف سے کوئی اچھے اشارے نہیں مل رہے ہیں۔ اگر اپنے لوگوں کے تحفظ کے لیے میں کچھ کروں تو تنظیم کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے کیونکہ میں ایسا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ جنید نے اُن پر واضح کر دیا۔

”تم جو چاہو کرو۔ ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں، ہمیں بس نتیجہ چاہئے۔“ تیسرے نے ہی کہا۔

"تو پھر ملے ہو گیا۔" جنید نے آخری بات کہہ دی اور اٹھ گیا۔

اُس کی یہ خفیہ ملاقات جہاں ہو رہی تھی جب وہ وہاں سے نکلا تو ذہن پر سے یوجھ اتار چکا تھا۔ اُسے جو نیا مشن دیا گیا تھا اس سے نہ صرف عظیم میں اُس کی اہمیت واضح ہو رہی تھی بلکہ اُس کی اپنی خواہش بھی اس میں شامل تھی۔ ایک طرح سے وہ آزاد ہو گیا تھا۔ اُس نے اپنے طور پر کام کرتے ہوئے اپنے فیصلے کرنے تھے۔ اس میں جس قدر کامیابی کے امکانات تھے اس سے دو سو فیصد تا کامیابی ہو سکتی تھی۔ وہ اپنی زندگی کو تو پہلے ہی ہتھیلی پر رکھے ہوئے تھا اس لیے کوئی پروا نہیں تھی۔ اُسے راجیلہ پر بہت چار آ رہا تھا ایک معمولی سی بات جو اُس کی نگاہوں سے اوجھل تھی اُس کے اشارہ کرنے پر اور پھر اس کو واضح کر دینے کے بعد وہ کس قدر رُک سون ہو گیا تھا اُسے اپنی عظیم کی جانب سے تو کوئی خطرہ نہیں تھا پہلے وہ خود کو پہلی کے دو پانوں میں محسوس کر رہا تھا۔ راجیلہ نے اُسے یہ سکون دیا تھا وہ جس قدر خطرے، تشویش اور بے سکونی میں مبتلا تھا اس کے ختم ہوتے ہی وہ سب کچھ اسے غیر اہم سا لگا جو وہ راجیلہ کے لیے کر چکا تھا۔ اگر اسی بے یقینی کی فضا میں اُسے کوئی سنسناتی ہوئی گولی لگ جاتی اُسے موت آ بھی جاتی تو اُسے یقین تھا کہ اسے جاننے والے لوگ اُسے غدار نہیں کہہ سکیں گے۔ انہی خیالات میں گھرا وہ گاڑی دوڑائے شہر کی جانب آ رہا تھا۔ وہ آج ہر حالت میں راجیلہ سے ملنا چاہتا تھا چاہے چند گھنٹی ہی سہی یا پھر کسی ریستوران میں کھانا۔ وہ اس کے گھر نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہ اس کی ماں کے سامنے جانے کا حوصلہ نہیں رکھتا تھا وہ اس قدر حسرت بھری نگاہوں سے اُسے دیکھتی تھی جیسے کوئی قیدی اپنے سیاد کی طرف دیکھتا ہے۔ بلاشبہ اُس کے ذہن میں یہی تھا کہ اس کی ساری نوازشیں اہم روئی اور غلوں میں صرف اور نظر راجیلہ کی وجہ سے ہیں اور حقیقت میں ایسا تھا بھی لیکن وہ شک جو اُس کی نگاہوں سے عیاں تھا زبان پر نہیں آتا تھا وہ جنید کو مارے ڈال رہا تھا۔ اُس نے اپنا سیل فون نکالا اور راجیلہ کے نمبر پر کال کر دی۔ چند لمحوں بعد ان کا رابطہ ہو گیا۔

"آج کہیں کھانا کھانے کا خیال ہے۔" اُس نے کہا۔

"جیسا آپ کہیں۔" تاجیے؟" راجیلہ نے فوراً کہا۔

"تم بتاؤ کہاں کھائیں؟" جنید نے تڑنگ میں پوچھا۔

"ادھر گھر ہی آ جائیں میں خود بنا لیتی ہوں۔" اس نے بڑے مان سے کہا۔

"ٹھیک ہے میں آ رہا ہوں۔ تموڑی دیر تک پہنچ جاؤں گا۔" اُس نے چند لمحوں سوچنے کے بعد کہا اور فون بند کر دیا۔

وہ شہر کی جانب گاڑی دوڑائے چلا جا رہا تھا۔ ایک موڑ کے بعد اُسے نہر کا پل تھا جہاں اُسے گاڑی آہستہ کرنا پڑی اس کے ساتھ ہی کچے میں سڑک اترتی تھی۔ تبھی اُس کی نگاہ تیمور کی گاڑی پر پڑی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر تیمور ہی تھا جو گاڑی موڑ لینے کے لیے انتظار میں تھا۔ لمبے کے بزار دیں حصے میں جنید نے ایک فیصلہ کر لیا۔ اُس نے گاڑی تیمور کی گاڑی کے سامنے روک دی پھر بھینجریٹ پر کپڑے کے نیچے پزار بیاورا اٹھایا اور اُس کے چہرے پر نگاہیں جمائے تیزی سے باہر نکلا۔ تیمور کے چہرے پر شدید قسم کی حیرت جم کر رہ گئی تھی۔

تیمور اُس کی جانب دیکھ رہا تھا جبکہ جنید بلا خوف اس کی نگاہوں میں نگاہیں ڈالے آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا یہاں تک کہ وہ اس کے قریب

کھینچ گیا۔ تیمور اُسی جانب یوں دیکھ رہا تھا جیسے تیز روشنی میں خرگوش ساکت ہو جاۓ۔ جنید نے اُسی طرف کا دروازہ کھولا اور سرد سے لہجے میں کہا۔
 ”باہر آؤ۔۔۔“

”کگ کیا بات ہے۔۔۔ کون ہو تم؟“ تیمور نے لرزاتے ہوئے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔ اس نے ریوالبودہ کی طرف اشارہ کیا تھا۔

”میں اپنی بات ڈہرانے کا عادی نہیں ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے اُس نے تیمور کو کالر سے پکڑ لیا۔

”دیکھو تم ایسا۔۔۔ نہیں کر سکتے تم جانتے نہیں ہو کہ میں۔۔۔“

لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ جنید نے اسے باہر گھسیٹ لیا۔ جیڑ کی ٹھوک سے دروازہ بند کیا اور پھر اسے لیتا ہوا اپنی گاڑی کی طرف آیا۔ ڈرائیونگ سیٹ والا دروازہ کھولا اور پھر اسے اندر دکھیل دیا۔ خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی چلا دی۔ وہ ابھی تو گاڑی دور گئے تھے کہ تیمور نے پوچھا۔

”کون ہو تم اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“

”سنا ہے تیرے باپ کے پاس بہت دولت ہے۔ اس میں سے تو بڑا سا حصہ ہمیں بھی چاہئے، بس اتنی ہی بات ہے۔“

یہ کہہ کر اُس نے ریوالبودہ کی گود میں رکھا اور اپنا فون سیدھا کر کے نمبر ملائے۔ چند لمحوں بعد رابطہ ہو جانے پر اُس نے کہا۔

”ایک نیا پرندہ ہے تو بڑا نازک مزاج بھی ہے۔ ممکن ہے اُسے سدھارنے میں دو چار دن لگیں۔ اس لیے فوراً شیجرے کا بندوبست کرو۔ پانچ منٹ بعد مجھے بتاؤ کہ اسے کس شیجرے میں بند کرنا ہے۔ میں اس وقت شیجرے سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر ہوں۔“

پھر دوسری طرف سے سن کر اُس نے فون بند کر دیا۔

”تم کیا کرنا چاہتے ہو میرے ساتھ۔۔۔؟“ تیمور اس وقت تک تو بڑا حوصلہ پکڑ چکا تھا۔

”انوار برائے تاوان کا نام یاد کرو تو کبھی سنا ہوگا یا پھر اخبار میں کبھی پڑھا ہوگا، بس یہی کچھ ہونا ہے تمہارے ساتھ۔ تعاون کرو گے تو زندہ اپنے والدین کے پاس پہنچ جاؤ گے ورنہ اسے تو کھنڈ کر کے جان سکوتہارے ساتھ کیا کیا جاسکتا ہے۔“ اُس نے سرد سے لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

”کیا چاہتے ہو تم۔۔۔؟“ تیمور نے دھیرے سے پوچھا۔

”بکواس بند کرو اور چپ کر کے بیٹھ جاؤ بعد میں بات کرتے ہیں۔“

جنید نے اسے جھڑکتے ہوئے کہا اور پوری توجہ ڈرائیونگ پر لگا دی۔ تو گاڑی دیر بعد اُس کا سیل فون بج اُٹھا۔ اُس نے فہرہ دیکھ کر فون سنا پھر چند لمحوں سننے رہنے کے بعد بولا۔

”ٹھیک ہے۔۔۔ شیجرے دو یا تین کلومیٹر پر ہے۔“

یہ کہہ کر اُس نے فون بند کر دیا اور پھر گاڑی کی رفتار مزید تیز کر دی۔ تقریباً دو کلومیٹر فاصلے طے کرنے کے بعد اُسے ایک دین دکھائی دی جو سڑک کے کنارے کھڑی تھی اور دو بندے اس کے قریب کھڑے تھے۔ جنید نے اپنی گاڑی ان کے قریب روک دی۔ وہ لوگ جیزی سے اُس کی

جانب آئے اور پھر سٹیٹ کا دروازہ کھول کر اندر جھانکا پھر کوئی بات کہنے بغیر ایک واٹس پلٹ گیا۔ اس نے دین کا دروازہ کھولا۔ دوسرے نے ریوالور نکال کر تھور کے ساتھ لگا دیا۔ تب جنید نے کہا۔

”جاؤ ان کے ساتھ جاؤ۔ تھوڑی دیر بعد ملاقات ہوتی ہے۔“

تھور کا رنگ زرد پڑ چکا تھا یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ ابھی بے ہوش ہو جائے گا۔ باہر والے بندے نے اسے کھینچا تو وہ بے جان سا اس کے ساتھ چل دیا۔ اگلے ہی لمحے وہ دین میں تھا۔ گاڑی کا دروازہ بند ہوا تو وہ دین کے پیچھے چلے لگا۔ اسے بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں جائیں گے؟ پورا شہر گزر گیا۔ وہ باہر والی بائی پاس سڑک پر تھے۔ پھر اچانک وہ ایک سائینڈ میں جانے والی چھوٹی سڑک پر اتر گئے۔ مکانات گزرے نہ گھمٹے آئے اور پھر انہی کھیتوں کے درمیان بڑی ساری حویلی میں گاڑی سمیت اندر چلے گئے۔ تھور کو جب دین سے باہر نکالا تو اس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی وہ اسے فوراً ہی اندر لے گئے۔ وہ ایک بڑا سا کمرہ تھا جس میں بیڈ لگا ہوا تھا صاف ستھرے کمرے میں خوشگوار مہک تھی۔ تھور کو ایک کرسی پر بٹھا دیا گیا اور اس کی آنکھوں پر سے پٹی اتار دی گئی۔ چند لمحے اس نے یوں دیکھا جیسے کچھ بھی دکھائی نہ دے رہا ہو پھر اس کی نگاہیں ان دونوں کے علاوہ جنید پر جم گئیں۔

”ہاں تو پیارے ابھی فون کر کے اپنے باپ کو یا پھر تھوڑی دیر آرام کے بعد۔۔۔؟“ جنید نے صغیر انداز میں پوچھا۔

”میں اب تمہارے رجم و کرم پر ہوں۔ جو چاہو کرو۔“ تھور نے قدرے نفرت سے کہا۔ اسے مزاحمت کی کوشش کرنا فضول لگا۔

”ہاں، ٹھکنے ہو۔۔۔ لگاؤ اپنا فون یا پھر مجھے فون کرنا پڑے گا؟“ اس نے سرد لہجے میں کہا تو اس پر تھور نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ اپنا فون

نکال کر نمبر پیش کر دیئے تب جنید بولا۔ ”ہیکر آن کرو پیارے! میں بھی تو سنوں تمہارے باپ کو تم سے کتنا پیار ہے؟“

اس پر تھور نے ہیکر آن کر دیا۔

”ہیلو۔۔۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔

”پاپا! میں تھور ہوں مجھے انہی نموا کر لیا ہے کچھ لوگوں نے۔“

”انہی۔۔۔ کیسے؟“ دوسری طرف سے چیختے ہوئے پوچھا گیا۔

”ابھی تھوڑی دیر پہلے فارم ہاؤس کے قریب سے۔“ اس نے دھیرے سے کہا۔

”اس وقت کہاں ہو۔۔۔؟“

دوسری طرف سے پوچھا گیا تو جنید نے فون پکڑ لیا اور غراتے ہوئے کہا۔

”تم اس طرح پوچھ رہے ہو جیسے ہمیں یہاں آنے میں کوئی دشواری نہ ہوگی۔“

”کون ہو تم۔۔۔؟“ دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

”کام کی بات کرو مجھے نہیں لگتا کہ تم اتنے احمق ہو۔“ وہ اسی لہجے میں بولا۔

”کیا چاہتے ہو۔۔۔؟“

”صرف دو کروڑ روپیہ اور وہ بھی چھٹیس گھنٹوں میں۔۔۔ اس کال کے بعد کاؤنٹ ڈاؤن شروع ہو جائے گا اور میرا یہ بھی خیال ہے کہ پولیس وغیرہ کو تم زحمت نہیں دو گے ورنہ ہم ناراض ہو کر تمہارے بیٹے کی لاش بھی تمہیں بھجوا سکتے ہیں یا پھر کہیں سڑک پر پھینک دیں گے۔“

”تیور سے میری بات کراؤ۔۔۔“

”وہ سن رہا ہے۔۔۔“ جنید نے کہا۔

”تیور بیٹے اتم گھبرانا نہیں۔ مجھے تمہاری زندگی عزیز ہے میں فوراً بندوبست کرتا ہوں۔۔۔ اور تم جو کوئی بھی ہو میرے بیٹے کو کچھ مت کہنا میں رقم دے دوں گا۔“ دوسری طرف سے انتہائی گھبراہٹ میں کہا گیا۔

”ٹھیک۔۔۔ میں رقم کسی طرح لوں گا بعد میں فون کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ چند لمبے وہ تیور کو دیکھتا رہا پھر بولا۔

”آرام کرو گے۔۔۔؟“

”میں ایک بات کہوں۔۔۔؟“ تیور بولا۔

”ہلو۔۔۔“ وہ ہنٹارا۔

”مجھے چھوڑ دو۔ پاپا کی رسائی بہت زیادہ ہے وہ۔۔۔“

اس نے کہنا چاہا تو جنید نے آگے بڑھ کر زوردار تپش اس کے منہ پر دے مارا۔ وہ الٹ کر کرسی سے نیچے گر گیا۔ پھر اسے کالر سے پکڑا اور اٹھاتے ہوئے بولا۔

”ڈمکلی دیتا ہے۔۔۔ جب تک تیرا پاپا رسائی کرے گا اس وقت تک میں تجھے اوپر نہ پھانڈوں گا۔ سمجھا؟“

یہ کہہ کر اس نے تیور کو بیڈ پر پھینکا اور باہر نکل گیا۔ شاید تیور نے اس کی باتوں کا کوئی تعلق نہ لایا تھا اس لیے ڈمکلی پر اتر آیا تھا۔

جنید کی سوچتا ہوا وہاں سے آ گیا۔ تیور کا فون اس کے پاس ہی تھا جو اس نے بند کر کے ایک طرف رکھ دیا۔ اب اس چوٹیں گھٹنے اسی حویلی میں گزارنے تھے۔

☆☆

شام ڈھل چکی تھی۔ شہر میں روشنیاں بجھ چکی تھیں۔ راحیلہ اس وقت بھی لیجن میں مصروف تھی۔ اسے جو تین چار ڈشیں بنانا آتی تھیں وہ

بنا چکی تھی۔ اس کی ماں اپنے کمرے میں تھی اور رضیہ اس کے ساتھ کام میں مصروف تھی۔ اس کے بچے ڈرائنگ روم میں اپنے باپ کے ساتھ کیل رہے تھے۔ وقت و میرے و میرے زیادہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ وہ کھانا بنا چکی تھی اس لیے فون کر کے جنید سے اتنی دیر ہو جانے کی بابت پوچھتا چاہا۔ اس نے اپنا فون لیا اور اس کے نمبر پیش کر دینے دوسری طرف سے وہ بولا۔

”سوری اور ی سوری راحیلہ میں تمہاری طرف آ رہا تھا کہ اچانک کام پڑ گیا اور مجھے اس جانب نکلتا پڑا۔ میں اب نہیں آسکوں گا۔“ اس

کے لہجے میں انتہائی معذرت سہلی ہوئی تھی۔

”— اور یہ جو میں نے اتنا کھانا بنایا؟“ اُس نے دھیرے سے کہا۔

”میں نے کہا نا، سوری— کام ہی اتنا ضروری—“

”کوئی بات نہیں آپ اطمینان سے اپنا کام کر کے آ جائیں میں آپ کا انتظار کروں گی۔“

”ارے نہیں میں نہیں آ پاؤں گا۔ میں کل کسی وقت آؤں گا۔ تم پریشان نہیں ہونا میں پھر معذرت خواہ ہوں۔“ اس نے شمار آلود سے

لہجے میں کہا۔

”ٹھیک ہے—“ وہ مایوسی سے بولی۔

”تم ایسا کرو ہاویوں کو بلا لو۔ اُس کے ساتھ کھانا کھاؤ۔“

”وہ کیوں؟“ وہ حیرت سے بولی۔

”میں نہیں ہونا تا تو وہ تمہاری کیئر کرتا ہے تمہارا اُس کے ساتھ بہت اچھا تعلق ہونا ضروری ہے۔ میں اُسے کہہ دیتا ہوں— پلیز!“

جنید نے تیزی سے کہا۔

”آپ کہتے ہیں تو—“ وہ دھیرے سے بولی۔

”میں کہہ دیتا ہوں وہ کچھ دیر بعد آ جائے گا۔“

جنید نے کہا اور پھر فون بند کر دیا۔ راحیلہ نے چمکتی ہوئی سکرین کو ایک بار دیکھا اور پھر مایوسی کے ساتھ ایک طرف رکھ دیا۔ اُسے یوں لگ

رہا تھا جیسے اندر ہی اندر کوئی شے ٹوٹ گئی ہو۔ اُس نے قریب کھڑی رضیہ سے کہا۔

”مہمان تو شاید دیر سے آئے، تم لوگ تو کھانا کھا ڈالو کوئی کو بھی دے دو۔“

”ٹھیک ہے—“

اس نے سعادت مندی سے کہا اور پھر کھانے کی جانب متوجہ ہو گئی۔ راحیلہ وہاں سے اپنے کمرے کی جانب چلی گئی اُسے جنید کے نہ آنے

کا بہت دکھ ہو رہا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد ہاویوں آ گیا۔ اس وقت ڈرائنگ روم میں کوئی نہیں تھا۔ رضیہ اسی انتظار میں تھی وہ کھانا لگانے کے لیے بڑھ گئی۔

راحیلہ نے ڈرائنگ روم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”آئیے ہاویوں—!“

”اے کہتے ہیں قسمت، کھانا کسی کے لیے بنا اور کھانے میں آ گیا— ویسے کیا بنایا ہے؟“ اُس نے خوشگوار انداز میں کہا۔

”جو بھی بنا ہے! اے قسمت کا کھانا کچھ کربھی کھائیں۔“ راحیلہ نے ایک طرف پٹختے ہوئے کہا۔

”ویسے راحیلہ! یقین جانو میں خود تم سے ملنا چاہ رہا تھا۔ جنید کے فون آنے سے پہلے ہی سوچ رہا تھا کہ تمہیں فون کر کے کوئی وقت ملے کر دوں۔ یہ تو اللہ نے میری سن لی۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

”کیا کوئی خاص بات تھی۔۔۔؟“ راحیلہ نے پوچھا۔

”ہاں۔۔۔ وہی میرے رشتے دار ہسپتال میں اسی بارے میں بات کرنا چاہ رہا تھا۔“

”ہاں۔۔۔“ اسے جیسے یاد آیا کھمرو کھمکی سے بولی۔ ”ویسے بات کیا ہے آپ کے اور اُن کے درمیان کوئی گزب ہے؟“

”کوئی تھوڑی بہت۔۔۔“ ہالیوں نے کہا کھمچند لمبے توقف کے بعد بولا۔ ”اگرچہ یہ ایک لمبی داستان ہے لیکن انتہائی اختصار سے تمہیں

سنانا پڑے گی۔“

کھم اس نے انتہائی اختصار سے پوری بات بیان کرنا شروع کر دی۔ اس دوران وہ کھانا بھی کھاتے رہے۔ راحیلہ اس کی بات پوری توجہ سے سنتی رہی یہاں تک کہ کہانے کے ساتھ اس کی بات بھی مکمل ہو گئی تو اس نے نتیجہ نکالتے ہوئے کہا۔

”تو آپ صاف سے عشق کرتے ہیں اور وہ ہے کہ آپ کو اس لائق ہی نہیں سمجھتی اس کی وجہ صرف اور صرف آپ کی فریٹ ہے۔“

”ہاں۔۔۔“ ہالیوں نے اعتراف کیا۔

”چائے پیئیں گے آپ۔۔۔؟“ راحیلہ نے اچانک پوچھا۔

”اتنی اچھی بات چل رہی ہے اور تم چائے۔۔۔؟“ ہالیوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اصل میں کام کی بات اب ہو گئی نا! میں چاہتی ہوں کہ سکون سے وہ بات سنوں۔ آپ ادھر صوفے پر آئیں میں چائے کا کپہ کر آتی

ہوں۔“

اس نے کہا اور وہاں سے اٹھ گئی۔ ہالیوں بھی اٹھ کر صوفے کی جانب چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد راحیلہ اس کے پاس دوسرے صوفے پر بیٹھ

گئی۔

”ہوں تو عشق ہے۔“

”نہیں۔۔۔ مجھے اس سے عشق تھا، کشش تھی اس میں لیکن اب نہیں ہے۔ اب تو میں اُسے حاصل کرنا چاہتا ہوں، جیسے بھی ممکن ہو۔“

یہ کہہ کر وہ یوں ہو گیا جیسے ماضی کے کسی کرب ناک لمبے میں کود گیا ہو پھر اس کیفیت سے چونک کر نکلتے ہوئے بولا۔ ”میں پوچھنا یہ چاہ رہا ہوں کہ

اُسے کیا ہو گیا ہے جو وہ ہسپتال میں ہے؟“

”اُسے کوئی گہرا صدمہ آیا ہے جس کی وجہ سے اُس کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا ہے لیکن اب اُس کی حالت بہتر ہے۔ اُسے اس وقت شدید

جذباتی تعلق کی ضرورت ہے اور مجھے حیرت ہے کہ اُس کی ماں بھی اُسے کوئی حوصلہ نہیں دے پا رہی ہے۔“ راحیلہ نے سمجھ میں نہ آنے والے انداز میں

کہا۔

”اصل میں اُس نے اپنی ماں کی بھی تو کبھی نہیں سنی ہے نا دونوں کے درمیان بہت خلا ہے۔ تم نے دیکھا نہیں کہ ریحون بی بی کچھ پرانے خیال کی ہیں اور وہ بہت مالا ہے۔“ ہمایوں دھیرے سے بولا۔

”— ویسے اتنی ہی عمر میں اُس کا یوں بہت اونچا سوچنا معنی خیز ہے۔ لگتا ہے بڑی شے ہے۔“ راحیلہ نے اپنے انداز میں ہمایوں کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

”شے تو وہ ہے؟“ ہمایوں نے بھی جواہا مسکراتے ہوئے کہا۔

”ویسے میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ ایک بار اُس کی عیادت کر آئیں۔ ممکن ہے۔“ وہ کہتے کہتے رُک گئی۔

”نہیں یوں نہیں۔۔۔۔“ ہمایوں نے خود گکائی کے سے انداز میں کہا۔

”پھر کیسے۔۔۔؟“ راحیلہ نے سوال کیا۔

”اس وقت تک نہیں جب تک وہ خود میری جانب نہ لپکے۔“ اُس کے لہجہ اور انداز میں عدوی کی اہل ہو ”اس وقت ہی میں اُس کی جانب متوجہ ہوں گا۔“ ہمایوں نے دانت پیٹتے ہوئے کہا۔

”اور۔۔۔۔ مطلب اُس سے نفرت ہے؟“

”ہاں یہی سمجھ لو۔۔۔۔“ یہ کہہ کر وہ چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔ ”میں یہ چاہ رہا تھا کہ کسی طرح تم یہ معلوم کر سکتی کہ اُس سے صدمہ کیا ہے؟“

”مشکل تو ہے لیکن ناممکن نہیں۔ میں کوشش کروں گی اور پھر پورے کوشش کروں گی کہ ایک دو دن ہی میں معلوم ہو جائے۔“

راحیلہ نے سجدہ کی سے کہا۔ اتنے میں رضیہ چائے بنا کر لے آئی۔ وہ اپنا کپ بھی ساتھ میں لائی تھی یوں ان کے درمیان موضوع ہی بدل گیا۔ کچھ دیر بعد ہمایوں چلا گیا تو وہ بھی سونے کے لیے اپنے کمرے کی جانب چل دی۔ جب اسے احساس ہو رہا تھا کہ جنید نے ہمایوں کو یونہی نہیں بھیجا۔ اس میں بھی کوئی خاص مقصد تھا۔

☆☆

رشتوں کے ریشم

رہلت سراج کے بہترین اور خوبصورت افسانوں کا مجموعہ۔۔۔۔۔ رشتوں کے ریشم۔۔۔۔۔ جس کی سطر سطر محبت خلوص پاکت، اور بھائی چارہ کا درس دیتی ہے۔ انسانی زندگی میں سب رشتے خوبصورت ہیں، ہر رشتہ ریشم سے زیادہ خوبصورت اور مضبوط ہے۔ افسانوں کا یہ مجموعہ کتاب گھر دستیاب ہے، جسے افسانے سیکشن میں پڑھا جاسکتا ہے۔

اس وقت سورج طلوع ہونے کو تھا جب جنید نے تیسور کا فون آن کیا اس کے ساتھ اس میں آنے والے ایس ایم ایس کی بھرمار ہوئی۔ اس نے ایک ایک کر کے پڑھے۔ وہ سب مختلف نمبر سے تھے ایک نمبر زیادہ تھا جو اس کی جانب سے کال کرنے کے لیے تھا۔ وہ چند لمبے سوچتا رہا پھر تیسور کی طرف چلا گیا۔ ایک ہی رات میں اس کی حالت خست ہو گئی تھی شاید وہ رویا بھی تھا یا پھر ساری رات اسے نیند نہیں آئی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ جنید اس کے قریب جا کر کرسی پر بیٹھ گیا وہ اتنی دیر میں بیڈ پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔

”کیوں جان من ارات کیسے گزری۔۔۔ لگتا ہے آرام نہیں کیا تم نے۔۔۔؟“ جنید نے مسکراتے ہوئے سرد سے لہجے میں کہا مگر تیسور اس کی طرف دیکھتا رہ گیا بولا کچھ بھی نہیں تو جنید نے کہا۔ ”دیکھو ایک معمولی سے تھپڑ کے علاوہ میں نے تمہیں کچھ نہیں کہا۔ وہ بھی تم نے اپنی غلطی کی وجہ سے کہا یا۔ تم نے مجھے اور کیلکولٹ کر لیا تھا۔ میری تم سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے۔ میرا مطالبہ تھا باپ بنا کسی جھجک کے پورا کروتا ہے تو میں تمہیں زندہ سلامت تمہارے گھر تک پہنچا دوں گا ورنہ پھر ظاہر ہے میں تمہیں اوپر پہنچانے کے علاوہ اور کیا کر سکتا ہوں؟“

”دیکھو مجھے ڈرانا بند کرو اور میری بات پاپا سے کراؤ۔“

تیسور نے اپنے فیسے کو دباتے ہوئی کہا تو جنید اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

”جب بیٹی گھر سے آتی ہے تو وہ نہ صرف غرائی ہے بلکہ بچہ مارنے کی کوشش بھی کرتی ہے۔“

اس نے یوں کہا جیسے اسے تیسور پر بہت ترس آ رہا ہو۔ پھر فون کے نمبر پیش کر دیے اور دیکھ کر آن کر دیا فوراً ہی فون ریسٹ کر لیا گیا۔

”تیسور بیٹے! تم ٹھیک تو ہو؟“ دوسری جانب سے انتہائی تشویش کے ساتھ پوچھا گیا۔

”میں ٹھیک ہوں پاپا۔!“ اس نے دھیرے سے کہا۔

”تم پر کوئی ظلم۔۔۔“

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔“

”میں نے رقم کا بندوبست کر لیا ہے۔ تم صبری اس سے بات کراؤ۔“

”ہاں بولو۔۔۔“ جنید نے کہا۔

”میں نے۔۔۔ میں نے رقم پوری کر دی ہے تاکہ وہاں پہنچانی ہے؟“

”تم یوں کرو، اکیلا اپنی گاڑی میں شہر کے جنوب کی طرف آؤ۔ میں بتاتا ہوں رقم کہاں لی جائے گی۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔“ دوسری طرف سے کہا گیا تو اس نے فون بند کر دیا پھر اپنا فون نکالتے ہوئے بولا۔ ”اب تمہاری زندگی کا فیصلہ

تمہارے باپ کے ہاتھ میں ہے۔ مگر اس کی نیت میں ڈرنا سا بھی کھوت دکھائی دیا تو سمجھو اس نے تمہیں مارنے کا فیصلہ کر دیا ہے۔“

”نہیں تمہیں رقم مل جائے گی لیکن میں یہ بتا دوں تمہیں یہ رقم ہضم نہیں ہوگی۔“ تیسور نے کہا۔

”تم جو بھی کہو میں سن لوں گا۔ آخر قرانی کے بکرے کو بولنے کا حق تو ہونا چاہئے نا۔۔۔!“ یہ کہہ کر اس نے اپنا فون کان سے لگا لیا۔ ڈرنا

کی درمیں رابطہ ہو گیا تو وہ بولا۔ "ہاں وہ کہہ رہا ہے کہ تم نے کمرہ سے نکل آنے کو ہے۔ ذرا دھیان دو کہ واقعہ اکیلا ہے یا کوئی لاؤ لنگر بھی اُس کے ساتھ ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ کسی کے ساتھ جا کر طے فون پر بھی ہمارے لیے مہمان نوازی کا بندوبست ہو سکتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ دوسری جانب سے ستار باچھر فون بند کر دیا۔ جنید چند لمے تیور کو گھورتا رہا اور پھر پوچھا کہ ناشتہ کرو گے؟

"نہیں۔" تیور نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"کر لیا رہا پھر کہو گے ہم نے کوئی مہمانداری ہی نہیں کی اور اگر تمہیں مرنا پڑتا ہے تو کم از کم بھوکے تو نہ مرو۔"

"تم جو کوئی بھی ہو جاوے مجھے مار دو لیکن تم کیا سمجھتے ہو کہ تم یوں چھپ جاؤ گے؟"

"نہیں، میری جان امنیں چھپ نہیں جاؤں گا بلکہ تمہاری بہت قریب رہوں گا اتنا قریب کہ تم سانس بھی لو تو مجھے سنا لی وے اور تم کیا سمجھتے ہو کہ میں نے یو پی راہ چلنے تمہیں پکڑ لیا ہے؟" نہیں، میری جان امنیں نے تم پر محنت کی ہے۔" جنید نے اس کی جانب دیکھ کر جمیدگی سے کہا۔

"مجھ پر محنت؟" تیور حیرت سے بولا۔

"ہاں تم پر۔ تم نے جو یہاں آتے ہی لڑکیوں کو گھیرنے کا مشغلہ اپنایا تھا، اسی نے مجھے تمہاری جانب متوجہ کیا ہے۔ میرا ٹک اور میرا یہ شہر برطانیہ کا رچرٹل نہیں ہے۔ ممکن ہے کچھ تمہارے جال میں پھنس چکی ہوں اور بعض کو تم شکار بھی کر چکے ہو لیکن میں تمہیں سچ بھی سمجھانا چاہتا ہوں۔ یہاں وہ ہتا ہے تو بندے کے بچے بنو یا پھر واپس رچرٹل لوٹ جاؤ ورنہ۔" جنید کے لہجے میں لہرت عود کر آئی تھی۔

"تم مجھے اس قدر قریب سے جانتے ہو؟" وہ حیرت سے بولا۔

"میں نے کہا تھا، امنیں تمہارے اس قدر قریب ہو چکا ہوں کہ تمہاری سانس تک گن لوں۔ اگر تم زندہ بچ کر چلے بھی گئے اور وہ بارہ انہی مصروفیات کو اپنانے کی کوشش کی تو میں بلا تامل تمہیں مار دوں گا۔" اس نے فراتے ہوئے کہا۔

"میں واپس چلا جاؤں گا مجھے یہاں رہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔" وہ تیزی سے بولا۔

"اس کا فیصلہ تو آج تمہارا ہاپ کرے گا کہ تم کچھ کر بھی سکتے ہو یا نہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ تمہارے باپ نے یہ تک نہیں پوچھا کہ تمہیں کس نے کب اور کیسے اغوا کیا ہے؟" جنید نے لا پرواہی کے سے انداز میں کہا۔

"ہمارے سوڈٹمن ہیں۔ انہوں نے بس اس پر توجہ دی ہوگی کہ مجھے اغوا کر لیا گیا ہے اور۔" وہ یہ کہتے ہوئے خود بھی ہلکا گیا تھا۔

"نہی بات مجھے سوچنے پر مجبور کر رہی ہے کہ تمہارے باپ کے ساتھ لاؤ لنگر ضرور ہوگا اسی لیے میں پوری تیاری کے ساتھ جاؤں گا۔" جنید نے یوں کہا جیسے وہ ان کی منافقت پر غصے میں آ گیا ہو۔

"پلیز مجھے فون دو۔ میں پاپا سے بات کرتا ہوں۔"

"نہیں۔ ابھی نہیں، میری جان امیری ذرا تلخ زیادہ مستحرب ہیں، چوہے ملی کا تکمیل تو ابھی شروع ہوگا۔"

جنید نے سر دھکے میں کہا اور پھر کسی بندے کو آواز دی۔ چند لمحوں بعد وہ آ گیا تو اُس نے ناشتہ لانے کو کہا۔ تب ان دونوں میں خاموشی ڈر

آئی۔ ابھی وہ بندہ ناشتہ لے کر نہیں پلٹا تھا کہ جنید کا فون بج اٹھا اس نے پتھر آن کر دیا۔

”ہاں بولو۔۔۔؟“ جنید بولا۔

”وہ گھر سے تو اکیلا ہی نکلا ہے لیکن بڑی شاہراہ پر آتے ہی اس کے ساتھ دو کاریں مسلسل سفر کر رہی ہیں خطرہ ہے۔“ دوسری جانب سے

انجائی تشویش کے ساتھ کہا گیا۔

”اس پر لگا رہ رکھو۔ ذرا سی بھی کوئی بات محسوس کرو تو مجھے بتانا۔“

یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ پھر فون ایک جانب رکھتے ہوئے تیمور کی طرف دیکھا اور لگا ہوں میں ہی اسے کہا کہ اب بتاؤ؟

”فون مجھے دو منٹیں بات کرنا ہوں۔۔۔۔“

”جنید نے فون اس کی جانب بڑھا دیا۔ تیمور نے جلدی سے نمبر پیش کیے فوراً ہی رابطہ ہو گیا۔

”تیمور۔۔۔ تم تیمور ہی بات کر رہے ہو نا؟“

”پاپا! کیا آپ کو میری زندگی نہیں چاہئے؟“

”یہ تم کسی باتیں کر رہے ہو؟“

”وہ لوگ بہت تیز اور چالاک ہیں وہ آپ کی ہر حرکت پر لگا دکھے ہوئے ہیں۔ آپ کے ساتھ دو کاریں کیا کر رہی ہیں؟ یہ بات انہیں

معلوم ہو گئی ہے۔“

”نہ نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے انہیں غلط فہمی ہو گئی ہے۔“

تجسبی جنید نے فون پھرایا اور فرماتے ہوئے بولا۔

”غلط فہمی جمیں ہوئی ہے بڑھے ام کیا سمجھتے ہو کہ ہمیں چانس لوگے؟۔ اس وقت تم ہمارے جال میں ہو تمہارا بیٹا تو جائے گا ہی تم

بھی خود کو گئے سمجھو۔“

”نہیں تم کچھ نہیں کرو گے۔“

”ہاں سنیں اپنے وعدے کا پاس کروں گا۔ صرف ایک گھنٹہ ہے تمہارے پاس انہی میں تم نے اپنے بیٹے کی زندگی کا فیصلہ کرنا ہے۔“

”سنیں مجبور ہو گیا ہوں۔ پلیز تم کچھ مت کرنا سنیں کوئی راستہ نکالنا ہوں۔“

”صرف ایک گھنٹہ ہے تمہارے پاس۔“ جنید نے کہا اور پھر فون بند کر دیا۔

”سنیں نے تمہارے ہارے میں غلط اندازہ لگایا تھا اور میرے باپ نے بھی۔“

تیمور نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے انہماکی حسرت کے ساتھ جنید کی طرف دیکھا جو بالکل خاموش تھا۔۔۔ جنید اس

وقت ناشتہ کر چکا تھا جب دوبارہ فون آیا۔ تیمور نے ایک لقمہ بھی نہیں لیا تھا وہ بس اس کی جانب دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ جنید نے فون کان سے لگا دیا اور

عشق کا ہے عشق بتا

پوچھا۔

”ہاں بولو۔۔۔؟“

”وہ سب ایک سڑک کنارے بنے ہوئے بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں ان سے کچھ قاصطے پر ہوں۔ ان میں تیز تیز ہاتھ چل رہی ہیں۔ لگتا ہے وہ کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔ وہ بارور رابطہ کرنا۔“

یہ کہہ کر جنید نے فون بند کر دیا اور اٹھ کر باہر چلا گیا وہ آب خود میدان میں آ جانا چاہتا تھا۔

☆ ☆

را حیلہ ایچر منگی وارڈ سے اُس طرف جاری تھی جہاں پرائیویٹ کمرے میں صفیہ تھی۔ اس کے ذہن میں یہ قطعاً نہیں تھا کہ وہ اس سے کس طرح بات کرے گی لیکن اُسے یقین تھا کہ وہ ہمایوں کا ذکر ضرور پھیرے گی اور صفیہ کا تاثر لینے کی کوشش کرے گی۔ اسی تاثر سے معلوم ہو جائے گا کہ وہ اس قدر ٹوٹ جانے کے باوجود بھی اُس سے نفرت کرتی ہے یا پھر اب بھی اس کے دماغ میں دولت کا شمار باقی ہے؟

وہ ہر جانب سے بے نیاز مکی سوجھی ہوئی اس طرف مٹی جاری تھی۔ رات جب ہمایوں نے اُسے صفیہ سے تعلق میں شدت اور خاندانی پس منظر کا احوال سنایا تھا تو اُسے صفیہ کا وہ یہ عجیب معلوم نہیں ہوا تھا۔ اُس کے خیال میں ہر انسان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے بارے میں خود فیصلہ کرے اُسے محبت یا کسی بھی جذبے کے تحت مجبور نہ کیا جائے۔ اصل میں جب انسان کسی روایت یا اصول کی خلاف ورزی کرتا ہے تب یا تو وہ اصول یا روایت اس قدر کمزور ہوتی ہیں کہ ان کی اہمیت باقی نہیں رہ جاتی یا پھر ان کی روایت اس قدر تبدیل ہو جاتی ہے۔ وہ روایت یا اصول جو کبھی انسان نے اپنے مفاد میں بنائے ہوتے ہیں اُس کے گلے کا پھندہ بن جاتے ہیں۔ پھر وقت اور ماحول بھی ان اصولوں اور روایات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ جس طرح انسان کے بنائے ہوئے قانون ایک خاص وقت کے بعد غیر موثر ہو جاتے ہیں اور ان کی تجدید کی ضرورت محسوس ہوتی ہے بالکل اسی طرح کا معاملہ سماجی اصولوں اور روایات کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ کئی سماجی معاملات کو بھی وقت کے تقاضوں کے مطابق پرکھنے کی کوشش کی جاتی ہے البتہ جن کی اپنی مستقل حیثیت ہوتی ہے وہ تبدیل نہیں ہو سکتے۔ دراصل انسانی معاشرہ میں انجیلا پسندی ضرور آ جاتی ہے جن میں یا تو وہ ظلم کی جانب چل نکلتے ہیں یا پھر اس روایت اصول اور قانون کی تجدید ہو جاتی ہے۔ جب بھی معاشرے میں ظلم بڑھتا ہے تو اس کے جواب میں بغاوت ضرور پیدا ہوتی ہے بلکہ یوں کہہ دینا زیادہ مناسب ہے کہ ظلم کا رد عمل بغاوت ہے اور جو باقی ہوتا ہے اس کے نزدیک قانون روایت اور اصول کی کوئی اہمیت اس لیے نہیں ہوتی کہ انہی کی بدولت وہ اپنا رد عمل ظاہر کر رہا ہوتا ہے۔ را حیلہ یہ سمجھتی تھی کہ صفیہ اپنی خواہشات میں ڈوبی ہوئی ہے وہ اپنی من پسند زندگی چاہتی ہے۔ قصور اس کا نہیں کہ اس نے ایسا کیوں چاہا بلکہ فوراً طلب بات یہ ہے کہ وہ کون سے عوامل ہیں جو اسے اس طرح کا بنا گئے ہیں۔ کوئی بھی انسان اس طرح کی زندگی کی خواہش نہیں کر سکتا جس کے بارے میں اسے معلوم نہ ہو۔ کسی خیال یا تصور کے بغیر عمل کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ ناممکن ہی بات ہے اور پھر کسی بھی انسان کو کیسے مجبور کیا جا سکتا ہے کہ وہ تقاضا شخص کو چھوڑ کر تقاضا شخص سے محبت کرے؟ یہ بھی تو ناممکن باتوں میں سے

عشق تو ہے عشق بتا

ایک بات ہے۔ اس نے سب سے پہلے اپنی ذات ہی کا تجربہ کیا تھا۔ وہ جنید کو شدت سے چاہتی تھی اس کے لیے اس نے ایک خطرناک زندگی کا چناؤ بھی کر لیا تھا۔ اس نے اپنی ذات ہی کو نہیں بلکہ اپنی ماں کو بھی اس میں جھونک دیا تھا یہاں تک کہ اسے جنید کے ساتھ مر جانا بھی قبول تھا۔ ایسے میں کوئی اسے یہ کہے کہ تم جنید کا خیال چھوڑ کر کسی دوسرے سے اتنی ہی شدت سے محبت کرو تو ایسا ممکن نہیں تھا۔ یہ تو ان معاملات میں سے ایک معاملہ ہے جن پر انسان کو اپنا اختیار بھی نہیں ہوتا۔ یہی سوچتی ہوئی وہ اس کمرے کے سامنے جا پہنچی جس میں صفیہ تھی۔ وہ بلا جھجک اندر چلی گئی اس نے بیڈ پر صفیہ لیٹی ہوئی تھی اور اس کے پاس زینون بی بی تھی۔ سلام و دعا کے بعد وہ ان کے قریب بیٹھ گئی۔

”آپ کبھی طبیعت ہے؟“ راحیلہ نے دھیرے سے پوچھا۔

”ٹھیک ہوں۔۔۔“ اس نے اجماعی انحصار سے جواب دیا۔

”میرے خیال میں آپ دو انٹیاں اتنا اثر نہ دکھائیں گی جتنا تم خود اپنے آپ کو تندرست کر سکتی ہو۔“

راحیلہ نے دھیرے سے کہا تو صفیہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ذرا سی خاموشی کے بعد زینون بی بی نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

”تم ٹھیک کتنی ہو بیٹی! جب بندہ اپنی خواہشوں میں جنون کی حد تک جا پہنچتا ہے تو ایسا ہوسا جاتا ہے۔ کسی دوسرے کو کیا خبر کہ صدمہ کس قدر ہوتا ہے یہ تو وہی جانتا ہے جس پر گزری ہو۔ ایسے میں دوبارہ سے ہونے میں وقت لگتا ہے اور خود ہی حوصلہ کرنا پڑتا ہے۔“

”وہی ہے تو یہ آپ کا ذاتی معاملہ لیکن میں ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں؟“ راحیلہ نے زینون بی بی کی طرف دیکھتے ہوئی کہا۔

”کل میرے ساتھ جو ایک وکیل صاحب تھے وہ ڈاکٹر صاحب سے ملنے آئے تھے اور میں انہیں پارکنگ تک چھوڑنے لگی تھی تو وہ آپ کو دیکھتے ہی اچانک گڑبوا گئے تھے پھر تجزی سے چلے گئے۔۔۔ ایسا کیوں ہوا تھا؟“ راحیلہ نے بڑی مشکل سے اپنی بات کہی تھی۔

”اس لیے بیٹی کہ وہ میرا بھتیجا تھا۔ ہمارے خاندان میں کچھ اختلافات ہیں بس اس وجہ سے۔۔۔ آپ نہیں یہ تو نہیں بتا سکتی ہوں کہ اس کے ذہن میں کیا تھا؟“ زینون بی بی نے دھیرے سے کہا۔

”وہ آیا ہوگا تماشہ دیکھئے۔۔۔ وہ تو خوشیاں منا رہا ہوگا بلکہ اس کے سارے خاندان والے۔۔۔“

صفیہ نے اجماعی نفرت سے کہا تو راحیلہ اس کی جانب دیکھتے ہوئے بولی۔

”یہ تمہاری بدگمانی ہے صفیہ! وہ کوئی قتل کا معاملہ تھا جس پر اس نے معلومات لی تھیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی والدہ کو دیکھنے سے پہلے تک اسے معلوم بھی نہیں ہوگا کہ یہاں کون ہے جس کے لیے یہ یہاں پر ہیں۔“ اس نے زینون بی بی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”بس بیٹی بدگمانی نے ایک خاندان کو دوسرے سے جدا کر دیا ہے۔“ زینون بی بی نے سر دآہ بھرتے ہوئے کہا۔

”ہماری ان سے کیا بدگمانی ہو سکتی ہے ہمارا ان کا مقابلہ ہی کیا؟“ صفیہ نے اپنی ماں کی طرف دیکھتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

”ممکن ہے وہ کل امیر ہو جائے تو۔۔۔؟“ زینون بی بی نے کہا۔

”وہ سات جہنم میں بھی ایسا نہیں ہو سکتا۔“ صفیہ نے نفرت سے کہا۔

”صفیہ! انسان کو جنم ایک بار ہی ملتا ہے اور وہ اسی میں بہت کچھ کر سکتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اُن کی مالی پوزیشن پہلے کیا ہوگی لیکن اس وقت وہ شہر کی ایک بڑی صنعتی کمپنی میں قانونی مشیر ہیں، شہر کے بہترین علاقے میں بڑے سے گھر میں رہتے ہیں اور وہ اپنی گاڑی میں یہاں تک آئے تھے۔ یہ ساری معلومات مجھے ڈاکٹر صاحب نے دی تھیں۔“

”کیا— یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“ صفیہ نے حیرت سے پوچھا۔

”وہی جو تم نے سنا ہے— عام حالات میں شاید ڈاکٹر صاحب اُنہیں نئے کی بھی اجازت نہ دیتے لیکن کوئی بات ضرورت ہے جس کے باعث نہ صرف وہ ملے ہیں بلکہ معلومات بھی دیں۔ یہاں تک کہ پروٹوکول دینے کے لئے مجھے بھی کہا کہ میں اسے دروازے تک چھوڑ آؤں۔ میں نے بھی ڈاکٹر صاحب سے اُن کے اس معمول سے ہٹ کر رویے کے بارے میں پوچھا تھا تب مجھے اُس وکیل کی اہمیت کے بارے میں معلوم ہوا تھا۔“ راحیلہ نے بات بتاتے ہوئے کہہ دیا۔

”تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اب وہ اہم لوگوں میں شمار ہونے کی کوشش کر رہا ہے؟“ صفیہ نے قدرے خطرناک انداز میں کہا۔

”میرے خیال میں شمار ہے ورنہ—“

راحیلہ نے جان بوجھ کر فقرہ ادا اور اچھوڑ دیا تو صفیہ کو چپ لگ گئی۔ وہ یہ کہہ بھی نہ بولی تو زینون بی بی نے کہا۔

”بات اصل میں یہ ہے بیٹی! کہ میرے شوہر نے خوب محنت کی۔ وہ اعلیٰ عہدے پر ہیں ساتھ میں ایک کاروبار بھی چل رہا ہے جسے میرا بیٹا دیکھتا ہے لیکن اس کے مقابلے میں وہ دولت کمانے کے معاملے میں بہت پیچھے رہ گئے۔ بس یہی اصل میں دوری کی وجہ ہے۔“

”صفیہ کے بات کرنے سے تو یہی لگتا ہے کہ یہ دوری جیسے نفرت میں تبدیل ہو گئی ہے۔“ راحیلہ نے جان بوجھ کر ذرا سی تلخ بات کہی۔

”دو الگ الگ معیار زندگی میں رہنے والے لوگ کیا کہے ہو سکتے ہیں؟“ صفیہ نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”— ہو سکتے ہیں اگر اول میں وسعت ہو۔ اب یہی دیکھو کہ وہ لوگ اگر آپ کے معیار زندگی میں آ جائیں تو پھر تعلق کا سلسلہ تو چل سکتا ہے پھر نفرت کہاں جائے گی؟ اُس نے جواب دیتے ہوئے سوال کروا دیا۔ جس پر صفیہ خاموش رہی۔ راحیلہ کا بھی یہی مقصد تھا کہ وہ جھلے جواب نہ دے لیکن اس بات پر سوچے کی ضرورت— ماحول میں تاؤ سا آ گیا تھا اس لیے راحیلہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”اب میں چلتی ہوں۔“

”ٹھیک ہے بیٹی!“

زینون بی بی نے کہا تو صفیہ اُس کی طرف دیکھتی رہی۔ راحیلہ نے اس کی جانب دیکھنا ہی گوارا نہیں کیا اور وہاں سے آگئی۔ راحیلہ وہ پیغام پہنچا چکی تھی جو مایوں کے ذہن میں تھا۔ اُسے پورا یقین تھا کہ صفیہ اپنے طور پر مایوں کے بارے میں ضرور معلومات لے گی۔

☆☆

جنید اسی کمرے میں موجود تھا جہاں تیمور کو رکھا گیا تھا۔ اس کے ساتھ دو آدمی حریہ تھے جو کسی بھی وقت کسی بھی حکم کے لیے تیار تھے۔ کمرے کے ماحول میں تاؤ تھا، گہری خاموشی میں سب کی نگاہ گھڑی پر تھی۔ جنید کا دیا ہوا وقت ختم ہونے کو تھا۔ تیمور کی حالت بہت خراب ہو چکی تھی۔

اس کا رنگ زرد تھا اور جسم یوں ڈھیلے تھا کہ جیسے ابھی بے جان ہو جائے گا۔

”پلیز مجھے ایک ہار فون کر لینے دو۔ میں ساری ہمت سنبھال لیتا ہوں۔“ تیمور نے مرلی سی آواز میں گڑ گڑاتے ہوئے کہا۔

”اتفاقاً گزر جانے کے باوجود بھی تمہارے باپ نے پولیس والوں سے اپنی جان نہیں چھڑائی۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ انہیں تمہاری زندگی سے کوئی غرض نہیں، وہ صرف اپنا پیسہ بچانا چاہتے ہیں۔۔۔ جب انہیں روکا گیا تھا کہ پولیس والوں کو نہ بتائیں تو اب اس کی سزا تو ملنی چاہئے نا۔۔۔؟“ جنید نے یوں کہا جیسے وہ بمشکل اپنا فخر ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

”مجھے فقط آخری بار بات کر لینے دو تمہارا چاہے مجھے کوئی مار دینا۔“

تیمور نے انتہائی مایوسی سے کہا جس پر جنید اس کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔

”چلو ٹھیک ہے، کرو بات۔“

یہ کہہ کر اس نے فون سے نمبر پیش کیے اور دوسری طرف رابطہ ہو جانے کا انتظار کرتا رہا۔ دوسری نکل پر فون اٹھا لیا گیا۔

”پاپا! آپ نے ابھی تک رقم کا بندہ بست نہیں کیا؟“

”میں کر کے بیٹھا ہوں لیکن۔۔۔“ وہ روہان سوا اعزاز میں بولا۔

”اب شاید آپ کی یہ رقم بھی کام نہ آئے۔ یہ لوگ کسی طرح بھی پولیس کی نگاہوں میں آنا پسند نہیں کریں گے۔ آپ نے میری زندگی خود داؤ پر لگائی ہے۔ اب ان کے پاس سوائے میرے قتل کے اور کوئی آپشن ہی نہیں ہے۔ میرے قاتل آپ ہیں۔“ تیمور نے انتہائی جذباتی انداز میں کہا۔

”بیٹا! وہ اس بات کی کیسے گارنٹی دیتے ہیں؟“

”تمہیں گارنٹی چاہئے۔۔۔“ جنید نے پھنکارتے ہوئے کہا۔ ”تو سنو کوئی گارنٹی نہیں ہے لیکن اب تمہارا بیٹا قتل ہو گا ہی، تم بھی نہیں بچ پاؤ گے یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔ اب جاؤ آرام سے گھر چلے جاؤ اور اس وقت کا انتظار کرو جب تمہارے بیٹے کی لاش تمہارے سامنے آئے گی۔“

”سوری پاپا! میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ آپ ہی میرے قاتل ہیں۔“

تیمور نے مری ہوئی آواز میں کہا تو جنید نے فون بند کر دیا اور تیمور کی جانب دیکھا جو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا۔

”دولت بھی کیا چیز ہے یا رانی! نئی نسل کو بھی قربان کر دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ خیر تم حوصلہ کرو۔“

”مجھے چھوڑ دو میں تمہارے ہر بات ماننے کو تیار ہوں۔ میرے پاس جو کچھ ہے وہ میں لکھ کر دینے کو تیار ہوں۔“

تیمور نے کہا تو جنید ہنس دیا اور کوئی بات کہنے لاشیر باہر آ گیا۔ باہر آتے ہی اس نے فون پر نمبر ملائے اور دوسری طرف رابطہ ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

”ہاں اب کہاں ہیں وہ۔۔۔؟“

وہ اسی شاہراہ پر ہیں۔۔۔ سادہ کپڑوں میں بہت ساری پولیس ہے۔ وہ منہ بکار گاڑی میں ہے اور اکیلے ہے۔“

”تم لوگ اُسے نظر انداز کر کے واپس چلے جاؤ۔ میں دوبارہ رابطہ کرتا ہوں۔“

جنید نے کہا اور فون بند کر دیا پھر اندر تیمور کے پاس چلا گیا جو اُس کی طرف دیکھتے ہی زرد ہو گیا تھا۔ تب جنید نے اپنے آدمیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”چلو گلو۔ اسے بھی لے لو وقت ختم ہو گیا ہے۔“

”خدا کے لیے۔۔۔ خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔“

تیمور اُدھچی آواز میں گڑ گڑانے لگا۔ جنید نے اس کی طرف دیکھا تک نہیں اور باہر آ گیا۔۔۔

اس وقت شام کے سائے پھیل چکے تھے جب وہ اس حویلی سے نکلے تیمور ایک دین میں تھا جبکہ جنید ایک گاڑی میں۔ اُن کے پیچھے ایک اور گاڑی میں چند لوگ تھے۔ یوں یہ قافلہ بڑی سڑک کی جانب چل پڑا۔ وہ اس شہری سے نکل جانا چاہتا تھا۔ رات گئے وہ دوسرے شہر میں پہنچ چکے تھے جہاں اُنہیں محفوظ ٹھکانہ مل گیا تھا۔ ابھی اُنہیں سکون سے بیٹھے ہوئے تھوڑا وقت گزرا تھا کہ جنید کا فون بج اٹھا یہ کال وہیں سے تھی جہاں سے وہ آئے تھے۔

”اس پورے علاقے میں پولیس پھیل ہوئی ہے۔ اچھا ہوا آپ یہاں سے چلے گئے ہیں۔“

”مجھے یقین تھا کہ وہ تیمور کے فون سے مدد لے کر یہاں پہنچیں گے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ تم لوگوں کے لیے کوئی خطرہ نہیں مگر وہاں کوئی بھی نشان باقی نہ رہے۔ اگر پولیس وہاں آ بھی گئی تو فوراً سا بھی شک نہ ہو۔“

جنید نے کہا اور دھیرے سے مسکرایا اُس کا شک یقین میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اُس نے تیمور کے فون کی طرف دیکھا! اسے کھول کر سم نکالی اور دوبارہ بند کر دیا۔ پھر ڈرامی دیر بعد وہ اس شہر سے نکل کر واپس لوٹ آیا۔ صبح ہو رہی تھی جب وہ واپس اپنے اس ٹھکانے پر پہنچا جہاں وہ ان دنوں مستقل رہ رہا تھا۔ تیمور کا فون اُس نے رات سے میں آنے والی نہیں بیٹھک دیا تھا۔ بھر پور شہد کے بعد وہ اٹھا اُس نے سلطان سے ناشتہ بنانے کو کہا اور پھر تیار ہو کر ناشتہ کیا۔ جب وہ اپنی گاڑی میں باہر نکلا تو دن کا پہلا چہر ختم ہو جانے کو تھا۔ وہ اسی شاہراہ پر چلا گیا جہاں پر گزشتہ دن تیمور کا باپ ٹھہرا ہوا تھا۔ اُس نے وہاں جا کر اپنے فون میں تیمور کی ہم ڈالی اور اس کے باپ کو فون کیا۔

”کیا تمہیں اپنے بیٹے کی لاش مل گئی ہے؟“

”کیا۔ کیا کہہ رہے ہو تم۔؟“ دوسری طرف سے ہندیانی انداز میں کہا گیا۔

”وہی جو تم نے سنا ہے۔۔۔ بہت افسوس ہے مجھے بچا رہ آخری وقت میں اپنے باپ ہی کو قاتل ٹھہرا تا رہا۔“

”یہ کیا بکواس کر رہے ہو تم۔؟“

”بکومت۔۔۔ اب ہمیں تلاش کرنے کی بجائے اپنے بیٹے کی تلاش کرو۔ کل شام تمہاری پھیلائی ہوئی پولیس کے درمیان سے تمہارے بیٹے کو لے جا کر قتل کر دیا ہے۔“

”بہت — نہ اہوا۔“

یہ کہتے ہوئے وہ رونے لگا۔ جنید چند لمبے سنتار ہا اور پھر فون بند کر کے سم نکال کر اپنا فون آن کر لیا۔ وہاں سے وہ سیدھا ہمایوں کے پاس چلا گیا جوا بھی تک اپنے دفتر میں موجود تھا۔

”بہت مصروف ہو گئے ہو آپ؟“ ہمایوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں میں کچھ دنوں کے لیے شہر سے باہر تھا۔ رات ہی آیا ہوں۔۔۔ سناؤ کیسا چل رہا ہے؟“

جنید نے پوچھا۔ پھر ان کے درمیان گپ شپ چل پڑی۔ دوپہر کے بعد تک وہ وہیں رہا۔ سینیں پر اُسے فون کال کے ذریعے حالات سے آگاہ کیا جاتا رہا تھا، یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ جنید بہت بے چین دکھائی دے رہا تھا، اُسے جس فون کال کا انتظار تھا وہ ابھی تک موصول نہیں ہوئی تھی۔ پھر وہ اسی بے چینی میں ہمایوں کو لے کر باہر نکلا اور ایک پارک کی کھلی فضا میں چلا گیا اس وقت وہ دونوں پارک میں چہل قدمی کرتے ہوئے باتیں کر رہے تھے کہ ہمایوں کو فون ملا۔ وہ اس کے بڑے بھائی کا تھا، فون سن کر اس نے جنید سے کہا۔

”چاچا صنعتی کو پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔“

”کیوں؟“ اُس نے دھیرے سے پوچھا۔

”ٹھیک طرح سے معلوم نہیں ہو سکا۔“ وہ تشویش سے بولا۔

”انہیں کیسے پتہ چلا؟“ جنید نے پوچھا۔

”زینون بی بی جو میری چاچی ہیں انہوں نے گھر فون کر کے مجھ سے بات کرنا چاہی تھی۔“ وہ بولا۔

”تو؟“ اُس نے ہمایوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”موتہ تو بہت اچھا ہے لیکن میں نکس جاؤں گا جب تک کہ مجھے صافہ خود نہیں کہتی۔“ اس نے سخت لہجے میں کہا۔

”جاؤ، معلوم تو کرو۔۔۔ احسان بعد میں کر لیتا۔“

جنید نے کہا تو وہ چونک گیا پھر تیزی سے بولا۔

”ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔“

”تو جاؤ۔۔۔ مجھے فون پر ہی تفصیل سے بتا دینا، وقت ضائع مت کرو۔“

جنید نے کہا اور پھر دونوں ہی تیزی کے ساتھ پارک سے نکلنے چلے گئے۔ جنید نے وہ کام کر دیا تھا جس کے لیے ہمایوں نے ایک لمبے عرصے کی پلاننگ کی ہوئی تھی۔ تنہا ہوتے ہی اُس نے تیمور کے ہاٹ کو وہ پارہ فون کیا۔

”ابھی تک تمہیں اپنے بیٹے کی لاش نہیں ملی۔۔۔؟“

”خدا کے لیے بتا دو۔ کہاں ہے وہ۔۔۔؟“

”پہ نہیں۔ میں نے تو سڑک کنارے پھنکوا دیا تھا۔ ممکن ہے جانور کھا گئے ہوں۔۔۔ ویسے افسوس ہے تم اتنے بڑے معصکڑا متے نامور کہ تمہاری کٹی ایوانوں تک ہے اور اپنے بیٹے کی لاش تک نہیں تلاش کر پائے ہو؟“

”خدا کے لیے میری غلطی کی اتنی بڑی سزا مت دو۔۔۔“ اس نے روتے ہوئے کہا۔

”آب بھگتو۔۔۔ میں دیکھتا ہوں تمہارے دو کروڑ کس حد تک کام آتے ہیں؟“

”مجھ سے لے لو پلیز میرا بیٹا مجھے واپس کر دو۔۔۔“ وہ ہڈیانی انداز میں چیخ اٹھا۔

”جو مر جاتے ہیں وہ دوبارہ زندہ نہیں ہوتے۔“

یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا پھر وہی مل دہرا کر ہم جیب میں ڈال لی۔۔۔

حینہ اپنے کمرے میں پڑا ہوا میگزین دیکھ رہا تھا لیکن اس کا سارا دھیان باہر کی سمت تھا، توڑی دیر پہلے اس نے تیمور کا حال پوچھا تھا۔ اسے اب فقط ہالیوں کے فون کا انتظار تھا جسے ضرورت سے زیادہ وقت ہو گیا تھا۔

ہا۔۔۔

ہالیوں متعلقہ تھانے میں پہنچا تو سامنے ہی اس کا چچا اصغر علی بیٹھا ہوا تھا اس کے ساتھ چند لوگ اور بھی تھے اور درمیان والی کرسی پر انسپلر بیٹھا ہوا تھا۔

”آئیے۔۔۔“ انسپلر نے ڈراما اٹھتے ہوئے ایک کرسی کی جانب اشارہ کیا۔ ہالیوں جب بیٹھ چکا تھا تو انسپلر بولا۔

”آپ کو اس معاملے میں کیا دلچسپی ہو گئی ہے؟“

اس کے یوں پوچھنے پر لمبے کے ہزاروں حصے میں اُسے وہ رات یاد آ گئی جب اس طرح ہی کے ایک تھانے میں اُس پر تشدد کیا گیا تھا اور اس کی وجہ صرف یہی تھی کہ اس نے انسپلر کو ظلم کرنے سے باز آنے کو کہا تھا۔

”اس لیے انسپلر! کہ ان دونوں کاروباری کمپنیوں سے ہماری کمپنی کا کاروبار ہے۔“

”یہ اصغر علی تو سرکاری آفیسر ہیں۔؟“

”لیکن ان کا کاروبار بھی چل رہا ہے۔“

ہالیوں نے کہا اور اپنے چاچا کی طرف دیکھا جو اٹھائی شرمندگی کے ساتھ ٹائیں جھکائے بیٹھا تھا۔ سبھی وہاں بیٹھے ہوئے شخص نے بولنا شروع کر دیا۔ جیسے وہ وہیں سے بات کا آغاز کر رہا ہو جہاں سلسلہ رکھا تھا۔

”میرا ہاں تو ذمہ خور وہ ہے اُسے ہر بندے پر شک ہے۔ یہ بس اتنا جواز فراہم کر دیں کہ یہ تیمور کے ہارے میں مطلوبات کیوں لے رہے

تھے۔ میں ان بندوں کو پیش کر سکتا ہوں جن سے انہوں نے تفتیش یا تحقیق جو بھی ہے انہوں نے کی۔“

”آپ کے پاس اس کا کوئی جواز ہے تو دیں۔“ انسپلر نے اصغر علی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✦ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✦ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

”دیکھیں وہ ایسا معاملہ ہے جس کے بارے میں کلمے عام کچھ نہیں کہا جاسکتا میں ڈی ایس پی صاحب سے مل لیتا ہوں انہیں مطمئن کر دیتا ہوں۔“ امصغریٰ نے دجھ سے کہا۔

”کیسی بات کر رہے ہیں آپ؟— ہاس کا پشاکل ہو گیا ہے اس سے پہلے وہ انخوا ہوا۔ آپ جس قدر اس بات کو چھپانا چاہیں گے آپ پر اس قدر تک بڑھے گا۔ میرے خیال میں آپ کو ساری بات سبھی صاف کر دینی چاہئے۔“

وہ شخص بولا۔ ہمایوں نے اپنے چاچا کی طرف دیکھا جس نے بے چارگی سے پہلو بدلا شاید اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ تب ہمایوں نے کہا۔

”اگر یہ کہہ رہے ہیں کہ وہ ڈی ایس پی صاحب کو مطمئن کر دیتے ہیں تو ممکن ہے کوئی ایسی بات ہو۔“

اُس کے یوں کہنے پر امصغریٰ نے چونک کر ہمایوں کی جانب دیکھا۔ شاید اسے اُمید نہیں تھی کہ ہمایوں اس کے حق میں بولنے کا یاس کی مدد بھی کر سکتا ہے۔ وہ قدرے حوصلے سے بولا۔

”اور جس وجہ سے میں نے تیمور کے بارے میں معلومات ایس تھیں۔ وہ اس وقت میرے پاس نہیں ہے۔ میں کہیں ہوا کا نہیں جا رہا۔ مجھے اگر تھوڑا وقت دیا جائے یہاں سچ میری ملاقات اُن کے درمیان طے ہو جائے تو میں انہیں مطمئن کر دوں گا۔“ امصغریٰ نے اس بار حوصلے سے کہا تھا۔

”کیوں کیا کہتے ہیں آپ؟—“ انسپکٹر نے اس شخص سے پوچھا۔

”لیکن کیا گارنٹی ہے کہ یہ دوبارہ آپ کے ہاتھ آئیں گے؟“

اس نے کہا تو امصغریٰ نے پھر ہمایوں کی جانب مدد طلب نگاہوں سے دیکھا۔

”میں دیتا ہوں گارنٹی۔“ ہمایوں نے دجھ سے کہا۔

”آپ۔۔۔ وہ کیوں؟“ وہ شخص تیزی سے بولا۔

”کاروباری دنیا میں ایک ساکھی تو ہوتی ہے۔ میں اس کشتی کی ساکھ کو بچا لینا چاہتا ہوں ایسی جذبات میرے آپ کے لیے بھی ہیں۔ اگر تیسرے فریق کے باعث معاملہ صاف ہو جائے تو زیادہ اچھا ہے۔۔۔ بجائے ان پر توجہ دینے کے اصل بھرموں کی جانب توجہ دی جائے۔ کیا خیال ہے آپ کا۔۔۔؟“ ہمایوں نے تیزی سے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ ہم انہیں نہیں بلکہ آپ کو کل دو پہر تک وقت دیتے ہیں۔“

اس شخص نے حقی انداز میں کہا تو امصغریٰ کی جان میں جان آئی۔ پھر کچھ دیر کے بعد وہ تھانے سے اُٹھ آئے۔ ہمایوں کی گاڑی میں امصغریٰ بیٹھا تو قدرے شرمندہ دکھائی دے رہا تھا۔ اُس نے کوئی توجہ نہ دی اور گاڑی بڑھادی۔ راستے میں اُس نے پوچھا۔

”اگر آپ مجھے اس کی تفصیل بتانا پسند کریں تو ممکن ہے میں آپ کی بھرپور مدد کر سکوں؟“

”اس کی ساری تفصیل میں گھر جا کر بتاتا ہوں۔“

اس نے انتہائی دبیسی آواز میں کہا اور پھر ان کے درمیان خاموشی چھا گئی۔ گھر کے گیٹ پر جب ہارن بجایا گیا تو اگلے ہی لمحے گیٹ کھل گیا۔ وہ گاڑی سمیت اندر چلا گیا پورچ میں گاڑی روکی اور پھر اس کے ساتھ ہی اندر ڈرائنگ روم میں چلا گیا جہاں زینون بی بی سلمیٰ اور ان کے بیٹے یعنی پٹی جیٹنگھوں سے دیکھتی ہوئی صفیہ کھڑی تھی۔

”ٹاؤنڈر ہے۔“ صفیہ نے اپنے بیٹے کے بارے میں پوچھا۔

”وہ آ رہا ہے۔ منسٹر صاحب کی طرف گیا تھا۔“

زینون بی بی نے ہمایوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جبکہ اُس نے ایک نگاہ بھی ان پر نہیں ڈالی تھی۔ اُس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ کسی اجنبی کے ہاں آیا ہو۔ صفیہ نے ہاتھ کے اشارے سے ان سب کو جانے کے لیے کہہ دیا۔

ہمایوں سونے پر بیٹھ گیا تو اُس کے قریب ہی سونے پر بیٹھے ہوئے صفیہ نے ساری تفصیل اُسے بتادی۔ سب کچھ کہہ دینے کے بعد وہ

بولی۔

”ان کا تعلق کی فونو کا پی میرے پاس ہے۔ میں نے وہاں صرف اس وجہ سے نام نہیں لیا کہ صفیہ کا نام آئے گا۔“

”ہوں۔“ ہمایوں نے ہنکارہ بھرا پھر بولا۔ ”ٹھیک ہے۔ میں آپ کے ساتھ ہی ڈی ایس پی سے ملوں گا اور انہیں پوری

تفصیلات بتانے کے بعد اسے فراڈ ثابت کریں گے۔ آپ گھبرائیے مت۔“

”بہت شکریہ پیش کرتی ہوں۔“ صفیہ نے اس سے زیادہ ایک لفظ بھی نہ کہہ پایا شایدا پتی شرمندگی میں اس کی زبان گنگ ہو گئی تھی۔

”اوکے میں چلتا ہوں۔“

ہمایوں نے اٹھتے ہوئے اپنا ہاتھ بوجھا دیا صفیہ اٹھا اور اُس سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔

”اپنا نمبر تو دے دو۔ میں صبح۔“

”ٹھیک ہے۔“

یہ کہہ کر ہمایوں نے اپنا کارڈ اُسے تھما دیا اور باہر کی جانب لپکنے لگا تو زینون بی بی کمرے میں آ گئی جیسے وہ کہیں انہیں دیکھ رہی ہو۔

”ٹھہر ڈینا! کچھ کھانی کرتو جاؤ۔ یوں جانا۔“

”شکریہ! میری امی کھانے پر میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔ اللہ حافظ!“

اس نے تیزی سے کہا اور کمرے سے لگتا چلا گیا۔ جس وقت وہ اپنی گاڑی میں گیٹ سے باہر نکلا تو سکون کی بلندیوں پر تھا۔ وہ سرشار سا

اپنے گھر کی جانب چل دیا۔ راستے میں اُسے جینے کو فون کرنے کا خیال آیا تب اس نے ساری تفصیلات اُسے بتادیں۔

”تم ان کی مدد ضرور کرنا کہیں بھی ڈنڈی مارنے یا ان سے انتقام لینے کی کوشش نہ کرنا۔۔۔ اس کا پتہ تمہیں بعد میں چلے گا۔“

”اوکے جیسا تم کہو۔“ یہ کہہ کر اُس نے فون بند کر دیا۔

وہ اپنے گھر پہنچا تو اس کا باپ انور علی اور والدہ زینب بھی اس انتظار میں بیٹھے تھے کہ وہ بات معلوم کریں جس کے باعث اصغر علی کو پولیس پکڑ کر لے گئی تھی۔ ہمایوں نے پوری تفصیل بتادی تو اس کی ماں نے پوچھا۔

”یہ زینحون تو منیہ کے ساتھ ہسپتال میں تھی اُسے وہاں کیسے پتہ چلا ہے اور لگتا نہیں کہ منیہ اتنی بیمار تھی کہ فوراً گھر بھی آگئی؟“

”امی! کون سا اس کے ذمہ آئے ہوئے تھے اور کون سا ہسپتال چل کر آنا تھا۔۔۔ زینحون چاہتی کوفون ملا تو اس نے انجن کو ہی یاد کیا۔“

ہمایوں نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”ہاں یہ صدمہ تو ہوا تھا کہ اس کے باپ کو پولیس پکڑ کر لے گئی ہے اور وہ بھی اسی کی وجہ سے۔۔۔“

زینب نے نفرت بھرے لہجے میں کہا تو انور علی نے بہت سنجیدگی سے پوچھا۔

”لیکن بات یہ ہے ہمایوں کہ زینحون کو تمہارا خیال آیا کیسے۔۔۔ کیا انہیں تمہارے بارے میں معلوم تھا؟“

بلال شہزادہ اس بنیادی بات تک پہنچا تھا جس کے باعث ان دونوں خاندانوں میں پھر سے رابطہ ہوا تھا لیکن ہمایوں یہ بات نہیں بتا سکتا تھا۔

اُسے پورا یقین تھا کہ راحیلہ نے احسن طریقی سے اُس کا تیار پ اُنہیں دکھایا ہوگا۔۔۔ وہ خاموش رہا تو اُس کے باپ نے دوبارہ پوچھا۔ تب اُس نے کہا۔

”ابا جی! میں نہیں جانتا سنیں اس وقت سے یہی سوچ رہا ہوں۔“

”اب یوں بھی تو وہ میرے بیٹے سے حائل نہیں رہ سکتے۔ زینحون کا اللہ بھلا کر نے وہ ہمیشہ ہمارے بارے میں اچھا ہی سوچتی ہے میرے

خیال میں اُس نے اس موقع پر جو کیا ٹھیک کیا۔“ زینب نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

”تو کیا تم اب بھی ان سے تعلق رکھنا چاہتی ہو؟“

انور علی نے حیرت سے پوچھا تو زینب خاموش رہی کوئی جواب نہ دے سکی پھر اس جواب سے بچنے کی خاطر کہا۔

”چلو بیٹا! میں تمہارے لیے کھانا لگا دوں۔“

یہ کہہ کر وہ اٹھ گئی تو ہمایوں بھی اُس کے پیچھے چل دیا جبکہ انور علی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

☆☆

منیہ اپنے کمرے میں موجود گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ دوپہر کے وقت اس نرس راحیلہ نے جس طرح ہمایوں کا ذکر کیا تھا۔ وہ سوچ

بھی نہیں سکتی تھی کہ شام ہوتے ہی اس کا ثبوت مل جائے گا اور یہ خبر جہاں اس کے لیے معنی خیزی کہ تیمور انوار ہونے کے بعد قتل ہو چکا ہے وہاں یہ

بات شرم انگیز تھی کہ اس کے باپ کو تیمور کے قتل کے شبک میں پکڑ لیا گیا ہے۔ ایک ہی دن میں اتنی ساری باتیں اس کے دماغ پر بوجھ بن گئی تھیں۔

کتی دیر تک اسے سمجھ نہیں آ سکتی تھی کہ وہ کس پر سوچے اور کس بات کو نظر انداز کر دے؟ وہ جس قدر تیمور کے بارے میں سوچتی اتنی شدت سے ہمایوں

اس کے سامنے آ کھڑا ہوتا جس نے ایک لگا بھی اسے دیکھنا گوارا نہیں کیا تھا۔ پھر اچانک ہی اس کے ذہن میں سانپ کی مانند ٹل کھاتا ہوا ایک خیال

آ گیا۔ جس پر وہ چمک گئی۔ اگر ہاویوں نے میرے پاپا کی مدد کی اور وہ اس معاملے میں سے صاف نکل گئے تو اس کا احسان کا بدلہ کہیں میرے گھر والوں کو اس طرف نہ لے جائے کہ میری منگنی اور بھرشادی۔ " اتنا سوچتے ہی وہ بے قرار ہو گئی۔ اس نے شدت سے سر مارے ہوئے خودکھائی میں کہا۔

"نہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ میں مرجانا قبول کر لوں گی مگر ہاویوں کے ساتھ۔۔۔"

"۔۔۔ اور اگر موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اُس نے تمہارے تمپیز کا انتقام تمہارے خاندان سے لیا تو پھر تم کیا کرو گی؟ تمہارا باپ جیل چلا جائے گا تب کچھ بکھر جائے گا۔ پھر اگر تم اُن کی سزا پر آ گئیں تو شاید تمہیں ہاویوں بھی قبول نہ کرے۔۔۔" وہ باغ بھی خاموش نہ رہا۔

"اُس میں اتنی جرأت کہ میرے خاندان سے انتقام لے۔۔۔؟" وہ چیخا۔

"آپ بھی تم خرگوش کی مانند آنکھیں بند کر دی ہو اگر وہ تیمور کے ساتھ تمہارے معاملے ہی کو اُچھال دے تو تمہارے دامن میں کیا رہ جائے گا؟"

"یہ کوئی نئی بات تو نہیں بہت سارے لوگ میرے اور تیمور کے تعلق بارے جانتے ہیں۔"

"تم جموئی آنا میں سارے کام خود ہی خراب کر لو گی تمہارے ہسپتال جانے ہی سے کتنے افسانے بن گئے ہیں۔ تمہارا باپ اس کے قتل کے الزام میں دھر لیا گیا ہے۔ کیا تم اب بھی شرمندگی محسوس نہیں کر رہی ہو؟ وہ جو قتل ہو گیا جس نے بہت بڑے انداز میں تمہاری چنگ کی ہے وہی تمہارے باپ کو بھی ذلیل و زسوا کر دینے پر تلے ہوئے ہیں۔ اگر مقدمہ چلا تو کیا تمہیں عدالت میں نہیں لائیں گے۔ پھر تم کیا جواب دو گی۔۔۔؟"

"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔" وہ سر مارنے لگی۔

"تم اپنے خوابوں میں اپنی زندگی تو بسر کر سکتی ہو لیکن حقیقت کی دنیا میں تمہاری کوئی حیثیت نہیں ہے۔ تم نے جو نفرت سے ایک شخص کے جذبات کو ذلیل و زسوا کر دیا تھا آج وہی تمہارے خاندان سمیت تمہیں بچانے کے لیے آ گیا ہے۔ تمہیں اُس کی قدر کرنی چاہئے۔"

"وہ اگر احسان کرے گا تو میرے پاپا پر کچھ نہیں۔ میں اُسے ہرگز قبول نہیں کر سکتی۔ میرے جو رسوائی ہونا تھی ہو چکی۔ مجھے عدالت میں بھی جانا پڑا تو میں جاؤں گی لیکن فقط ہاویوں کی مدد کے عوض میں اُس کی ہو جاؤں گی ایسا قطعاً نہیں ہو سکتا۔"

"لیکن اب تم اُس کے ساتھ نفرت کا اظہار بھی نہیں کر سکتی ہو کیا یہ تمہاری ہکست نہیں ہے؟"

"نہیں نہیں کبھی ہکست نہیں مانوں گی میں اپنے خوابوں کی تعبیر حاصل کر کے رہوں گی کل اگر میرے پاس دولت اور حیثیت ہو گی تو کسی کو بھی میرے ماضی پر انگلی اٹھانے کی جرأت نہیں ہو گی میں ان حالات کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لوں گی۔ ابھی ہاویوں کو میری سزا تک آنے میں بہت وقت لے گا وہ خود دولت مند نہیں بلکہ دولت مندوں کا فلام ہے اُن کی نوکری کر رہا ہے۔ یہ پوزیشن اُس کی نہیں اُس کے پیچھے دولت مندوں کی ہے۔ آج اگر وہ اُس سے ہاتھ ہٹالیں تو اُس کی پوزیشن پھر وہی فٹ پاتھیے والی ہو گی۔"

"لیکن حالات یہ ہیں کہ تم فٹ پاتھ پر آ سکتی ہو۔"

”نہیں! ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ میں یا میرے پاپا اگر محرم نہیں ہیں تو ہم اسے ثابت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں البتہ میں یہ مانتی ہوں کہ میری بے وقوفی کی وجہی سے یہ سب ہو رہا ہے۔ اس بے وقوفی کی قیمت چکانا پڑے گی کوئی بات نہیں لیکن اگر اس کی قیمت ہمایوں کے ساتھ کی صورت چکانا پڑی تو میں خود کو ختم کر لوں گی۔“

”حالات اگر اس نچ پر آ گئے۔۔۔؟“

”خاموش! میں اس پر سوچتا ہی نہیں جانتی۔۔۔“

اس نے چیخ کر کہا اور پھر اسے اپنا کراڈ ولٹا ہوا محسوس ہوا جیسے وہ کسی ہنڈولے میں بیٹھی ہے۔ اس نے بہتر خود پر تہ پونے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکی اور پھر سے بے ہوش ہو گئی۔ ڈوچے ہوئے محترم اس نے اپنی ماں کا چہرہ دیکھا تھا جو اس سے کچھ پوچھ رہی تھی لیکن اس کی آواز نہیں آرہی تھی۔ اس کے بعد ہی اندھیرا چھا گیا تھا۔

☆ ☆

رات اپنا سفر طے کر چکی تھی اور جینہ مسلسل سوچتا چلا جا رہا تھا کہ وہ کس طرح کی زندگی میں آچکا ہے۔ وہ ایک چھوٹا سا وندہ بھی راحیلہ سے نہ بھاسکا! اگر کوئی بڑا وندہ اس سے کر لیں تو کیا وہ بھاسکتا یا پھر آئندہ زندگی میں اگر اسے چاک اس کی ضرورت پڑ گئی تو وہ اس تک پہنچ پائے گا کیا سہولیات دے دینے سے دوسرے انسان کی تمام تر ضروریات پوری ہو جاتی ہیں؟۔۔۔ اس ایک ڈرامی سوچ نے اسے ماضی میں لاپھنگا پھر حال سے گزرتے ہوئے وہ مستقبل کے دھندلکوں میں جا پہنچا جہاں خوف کے سائے زیادہ منڈلا رہے تھے اور ان میں راحیلہ کا وجود ہوا کے دوش پر کسی کئی پننگ کی طرح ہلکولے لکھ رہا تھا۔ یہ ایک ایسا خوفناک منظر تھا کہ جس سے اسے جھرجھری آ گئی اور وہ سوچوں سے کٹ کر حقیقت کی دنیا میں آ گیا۔ وہ چند لمبے یونی بیضار ہا پھر جیسے اسے یاد آ گیا۔ اس نے تیمور والی اسم ٹکالی اور ایک فون میں ڈال کر تیمور کے باپ کا نمبر پیش کر دیا تیسری تیل پر فون رسو کر لیا گیا۔

”خدا کے لیے میرے بچے کی لاش دے دو تم جرم گلو گے میں دوں گا تم دو کروڑ لے لو مگر میرے بچے کی لاش واپس کر دو۔ مردے کی بے حرمتی کوئی بھی نہیں کرتا۔“ اس کا باپ روتے ہوئے بولا۔

”کس قدر بد قسمت باپ ہو زندہ بیٹے کو مار دیا اپنی دولت کے لیے اور اب مردہ بیٹے کی لاش کا سودا! انہی دو کروڑ میں کر رہے ہو؟“

”میں بے وقوف تھا! حق تھا مجھے درم تھا اپنی رسائی پر۔ پوری فورس حرکت کر رہی ہے لیکن میرے بچے کا نام و نشان تک نہیں ملا۔“

”تمہارا کیا خیال ہے یہ فون بھی کہیں شیپ نہیں ہو رہا ہوگا؟“

”۔۔۔ ہوتا رہے لیکن جب میں تمہیں رقم دینا چاہتا ہوں تو کوئی درمیان میں نہیں آئے گا۔ یو لو میں رقم کہاں پہنچاؤں اور۔۔۔“ یہ

کہتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

”تم رقم تیار رکھو میں بتاتا ہوں کہ تمہیں کیا کرنا ہوگا۔“

”ہلیز — خدا کے لیے مجھے بناؤ۔“

”صبر کرو تمنا ہوں۔۔۔“

یہ کہہ کر اُس نے فون بند کر دیا۔ اسی ہم میں گھر کے ایک ملازم کا نمبر بھی تھا جنید نے وہ نمبر دوسرے فون سے ملا یا جو تھوڑی دیر بعد رسد کر لیا

گیا۔

”کون ہے اتنی رات کو تک کر رہا ہے۔؟“ اس نے شمارا لوڈ آواز میں انتہائی حیرت سے کہا۔

”میں تمہارا اچھوتا صاحب ہوں تم ایسا کرو فوراً یہ فون لے کر پاپا کے پاس جاؤ۔“

”اتنی رات گئے میں کیسے۔۔۔ میں سرورٹ کو آرٹ۔“

”میں نے کہا نا جلدی جاؤ۔ وہ تمہارا انتظار کر رہے ہیں فوراً پہنچو۔“

”جی۔۔۔ جی۔۔۔“

یہ کہتے ہوئے وہ فون بند کرنا بھول گیا۔ جنید کو آوازوں سے لگ رہا تھا کہ وہ اٹھا ہے۔ تقریباً پانچ منٹ کے بعد کسی دروازے پر دستک

ہوئی۔

”جی چھوٹے صاحب کا فون ہے۔“

پھر چند لمحوں بعد تیمور کے باپ کی آواز سنائی دی۔

”ہیلو۔“

”میں ہوں۔۔۔ غور سے سنو تم نے کیا کرنا ہے۔“

”یو لو میں سن رہا ہوں۔“

”تمہارا بیٹا زندہ ہے اسے ایک خراش تک نہیں آئی۔“

”کیا واقعی۔۔۔؟“ اس نے تقریباً چیخے ہوئے کہا۔

”تمہارے پاس یہ آخری موقع ہے۔ ابھی تک تمہارے بیٹے کو خراش تک نہیں آئی میں اسے قتل نہیں کرنا چاہتا لیکن اگر تم۔۔۔“

”نہیں۔۔۔ تم رقم پہنچانے کی بات کرو بس۔“

”تو پھر اس کو رقم دو ابھی اور پچھلے دروازے سے یہ بندہ رکشے میں بیٹھ کر آؤے کی جانب چلا جائے میں اسے سنبھال لوں گا۔۔۔ رقم

ملے ہی تمہارا بیٹا آزاد ہوگا۔“

”میں تم سے یہ نہیں پوچھوں گا کہ تم جی کہہ رہے ہو یا جھوٹ لیکن میں اسے ابھی رقم دے رہا ہوں یہ یہ یہی اسی کرے گا۔“

”تو تمہارا بیٹا بھی مل جائے گا۔۔۔“

یہ کہہ کر اُس نے فون بند کر دیا۔ پھر اگلے ہی لمحے اُس نے اپنے فون سے کسی بندے کو فون کر کے کہا۔

”یہاں سے ایک ملازم پچھلے دروازے سے باہر نکلے گا اس کا نمبر میں تمہیں دیتا ہوں۔ وہ رکشے میں آئے گا کنفرم کر کے بیگ لینا اور مجھے بتا کر محفوظ جگہ چلے جانا پھر رابطہ ہو جائے گا۔“

اس وقت جنیڈا مگرتے ہوئے سورج کو دیکھ رہی تھی اس وقت اس نے ہندے کا فون آگیا کہ بیگ لے لیا گیا ہے اور اب وہ محفوظ جگہ جا رہے ہیں پھر چند ہدایات دینے کے بعد وہ پرسکون ہو گیا۔ اس نے اس شخص سے بات کی جو تھوڑے پاس تھا وہ اسے لے کر اس شہر سے نکل چکے تھے۔ اس نے تھوڑی بات اس کے باپ سے کرادی مگروں کے پہلے پہر تک مطمئن ہو جانے کے بعد اس نے ہمایوں کافون کر دیا۔

”جی جناب۔۔۔!“ ہمایوں نے شوخ لہجے میں کہا۔

”تمہیں اپنے بچا کو ڈی ایس پی کے پاس لے جانا ہوگا مگر وہاں بات کچھ مختلف ہوگی۔“

”میں سمجھا نہیں۔۔۔“

”تھوڑا ایس آگیا ہے اپنے گھر۔۔۔ اب تم نے بات پھینکنے سے پہلے چاچا کو اپنے پاس بلا لینا ہے اور دوسری پارٹی کے ساتھ تمہارا رویہ کیا ہوگا تم خود سمجھا رہو۔ مجھے فون مت کرنا میں اب سونے لگا ہوں۔“

”میں سمجھ گیا۔۔۔ آپ آرام کرو شام کو ملاقات ہوگی۔“

”اوکے۔۔۔“

یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ پھر بیڈ پر لیٹنے ہوئے اس نے سوچا کہ شام سے قبل اسے آدمی رقم مل جانے والی تھی پھر اس کے بعد ہی وہ کوئی بات سوچے گا۔

☆☆

ڈاٹ کام

عصمت چغتائی اردو زبان میں افسانہ نگاری کے حوالے سے ایک بڑا اور معتبر نام ہے..... منٹو کی طرح عصمت کا قلم بھی معاشرے کے حساس موضوعات کی نشاندہی کرتا رہا اور اس پر بھی اکثر اوقات قلم نگاری کا الزام لگتا رہا۔ لیکن اسکے باوجود عصمت چغتائی کے افسانے اور ناول اردو ادب کا لازمی جز ہیں۔ **لحاف** عصمت کے 11 بہترین منتخب افسانوں کے مجموعہ کا نام ہے، اس میں جوانی، لحاف، پہلی لڑکی، ہانسی، ایک شوہر کی خاطر جی ڈہن، جل، عورت، خریدو، بہو بیٹیاں اور ڈائن افسانے شامل ہیں۔ افسانوں کا یہ مجموعہ بہت جلد کتاب گھر پر پیش کیا جائے گا، جسے افسانے سیکشن میں پڑھا جا سکے گا۔

دھاتی شام کے سائے دھیرے دھیرے گہرے ہوتے چلے جا رہے تھے۔ لیکن میں ٹپٹی ہوئی راحیلہ گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس کے ذہن میں فقط ایک سوال گونج رہا تھا کہ کہیں وہ سراب کے پیچھے تو نہیں دوڑ رہی؟ اس سوال نے تو اس کا چہرہ زرد کر کے رکھ دیا تھا حالانکہ شام سے پہلے جب وہ ڈیوٹی آف کر کے گھر آنے والی تھی اس وقت نرسن کے ساتھ خوب ہنس ہنس کے خوشگوار سواڑ میں باتیں کرتی رہی تھی۔ چند دنوں بعد ان کے امتحان شروع ہونے والے تھے۔ نرسن اسے دیکھ کر یہ باور کرانے کی کوشش کر رہی تھی کہ اب وہ پہلے سے زیادہ خوبصورت ہو گئی ہے اسی بات کو لے کر وہ دیر تک اپنے ماضی کو یاد کر کے ہاتس کرتی، ہنسی مسکراتی رہیں تھیں۔ اس وقت وہ ہسپتال سے نکل رہی تھی جب جنیڈ کا فون آ گیا کہ وہ آ رہا ہے۔ اس نے دھیرے سے سن کر فون بند کر دیا تھا۔ گھر آ کر اس نے رضیہ کی مدد سے پر تکلف کھانے کا اہتمام کرنا شروع کر دیا مگر اسے پھر بھی یقین نہیں تھا کہ وہ آئے گا۔ یوں سوچ کا ایک سرا اس کے ہاتھ آیا تو پھر یہ ڈورا لٹھکتی چلی گئی۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جب بار بار ہاتھ میں آتی ہوئی خوشیاں دسترس سے نکل جائیں تو انسان بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے تاہم اس وقت تک یقین رہتا ہے جب تک حوصلہ مضبوط ہو حوصلہ ہارتے ہی یقین ٹٹم ہو جاتا ہے۔ راحیلہ مسلسل یہی سوچے چلی جا رہی تھی کہ اس نے اپنی زندگی واؤپر لگا دی لیکن جنیڈ کیا چاہتا ہے اس بات کی سمجھ اسے اب تک نہیں آ سکی تھی۔ سچی کال قتل سنا دی تو وہ چونک گئی۔

”سنیں دیکھتی ہوں۔۔۔“ رضیہ نے اپنے ہاتھ کپڑے سے پونچھے ہوئے کہا۔

”نہیں سنیں جاتی ہوں۔۔۔“

یہ کہہ کر راحیلہ نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی پلٹ ایک جانب رکھی اور لیکن سے نکل کر گیٹ کی جانب بڑھ گئی۔ باہر ہالوں کھڑا تھا۔ راحیلہ کی توقع چھناکے سے ٹوٹ گئی۔ اس کے ذہن میں یہی آیا کہ آج پھر جنیڈ نہیں آسکا اور اس نے ہالوں کو بھیج دیا ہے۔

”میرا آنا اچھا نہیں؟“ ہالوں نے اس کے چہرے کے تاثرات دیکھتے ہوئے حیرت اور شرمندگی کے طے چلے احساس کے ساتھ کہا۔

”نہیں نہیں تو۔۔۔ آپ۔۔۔“ راحیلہ گڑبڑاتے ہوئے بولی۔

”کیا جنیڈ نے میرے آنے کے بارے میں نہیں بتایا وہ آیا نہیں ابھی تک۔۔۔؟“ ہالوں نے تیزی سے پوچھا۔

”ابھی تک تو نہیں۔۔۔؟“

راحیلہ نے کچھ بھی نہ سمجھتے ہوئے کہا تو ہالوں نے فوراً ہی اپنا فون نکالا اور اس کے نمبر پر کال کر دینے پھر رابطہ ہو جانے پر پوچھا۔

”کہہ دو آپ ابھی تک پہنچے کیوں نہیں؟“ یہ کہہ کر وہ دوسری جانب سے کچھ منتارہا پھر بولا۔ ”سنیں ادھر گیٹ پر کھڑا ہوں۔ آپ آؤ گے تو اندر جاؤ گا۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

”کیا بات ہے؟“ راحیلہ نے پوچھا۔

”کہتا ہے قریب ہی ہوں ابھی چند منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔“ اس نے بتایا۔

”اچھا آپ گاڑی تو اندر لے آئیں نا!“

راحیلہ نے وجہ سے کہا تو ہمایوں پلٹ کر گاڑی تک گیا۔ جیسے ہی اس نے گاڑی اندر کی انہمی لہوں میں جنید بھی آ گیا۔ اُسے دیکھتے ہی راحیلہ کو یوں لگا جیسے کوئی خزانہ اسے مل گیا! اس کے روم روم میں خوشی سراپیت کر گئی۔ اُس نے گیٹ کھلا دیکھا تو سیدھا گاڑی اندر لے آیا ہمایوں نے گیٹ بند کر دیا۔

”تمہیں یقین نہیں تھا کہ میں آؤں گا؟“ اُس نے راحیلہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”ان سے پوچھیں مجھے کیا کہہ رہے ہیں۔“ راحیلہ نے جواب دیا۔

”بھئی میں نے سوچا شاید اس بار بھی مجھے تمہاری جگہ کھانا کھانا پڑے گا۔“ ہمایوں مسکراتے ہوئے بولا۔

”راحیلہ کیا تم اتنا بد مزہ کھانا بنا تی ہو کہ ہمایوں جیسا بندہ بھی خوفزدہ ہے؟“ جنید نے خوشگوار لہجے میں کہا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔

”آپ بیٹھیں میں ذرا کچن میں دیکھوں۔“ راحیلہ نے اُن سٹی کرتے ہوئے کہا۔

”امی کہاں ہیں آپ کی؟“

”اپنے کمرے میں۔“ راحیلہ نے پوچھا۔

”میں ملنا چاہتا ہوں۔“

”میں بتا دیتی ہوں وہ ادھر ہی آ جائیں گی۔“ راحیلہ نے کہا۔

”اوکے۔“

وہ جتنی انداز میں بولا تو راحیلہ اندر کی جانب چلی گئی تب ہمایوں اُس کے قریب بیٹھ گیا۔

”امی ہمایوں صاحب! کیا روٹی یاد ہے آج کی۔۔۔؟“

جنید نے پوچھا تو ہمایوں نے چند لمحے سوچے رہنے کے بعد کہا۔

”کوئی خاص نہیں وہ چاہے والے معاملے میں تو بات بہت آگے تک مٹی۔۔۔ خیر میں تمہیں تفصیل سے بتاتا ہوں۔“

”تم اختصار سے بتاؤ۔“ جنید نے تیزی سے کہا۔

”ڈی ایس پی کے پاس تو جانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ میں نے جب اُسے فون کیا تو اُس سے وہی بات ہو گئی! انہیں خبر مل چکی تھی تاہم

میں نے پھر کسی وقت ملنے پر اصرار کیا تو کل میری اُس سے بات ہونے والی ہے۔“ وہ بولا۔

”آب اُس سے کیا بات کرنی ہے؟“ جنید نے پوچھا۔

”وہی جو تیرے سبز باغ و کھانے کے چکر میں جملی دستاویز بنائی تھیں۔“ اس نے بتایا۔

”اُوہ تم اسے اپنے کسی مقصد کے لیے استعمال کرو گے؟“

”کیوں نہیں— میں نے چاہے کوفون کیا وہ تیار تھا۔ میں نے اُسے آفس بلوالیا، پھر وہیں اُسے بتا دیا کہ بات کیا ہوئی ہے۔ اُس نے خاصی شرمندگی کا اظہار کیا۔ وہ جو فرور تھا، وہ نہیں رہا۔ وہ میرے ساتھ اباجی کے پاس جانے کو تیار تھا مگر میں نے اپنی مصروفیت کا بہانہ بنا دیا۔“

ہالیوں کے لہجے میں نفرت سنگ رہی تھی۔

”کیوں نہیں ملوایا۔۔۔؟“ جنید نے دلچسپی سے پوچھا۔

”میں اباجی سے تو پوچھوں کہ وہ اُن سے ملنا بھی چاہتے ہیں یا نہیں، پھر اچھے برس بعد۔۔۔“ وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

”تمہاری منزل تو صاف ہے نا، اس تک رسائی کا راستہ تمہیں مل گیا ہے تو پھر۔۔۔؟“

”وہ اب میری منزل نہیں ہے، میں نے آپ کو بہت دفعہ کہا ہے البتہ جو میں چاہتا ہوں وہ اب مجھے میسر آ چکا ہے۔“ ہالیوں نے کہا تو دونوں میں خاموشی چھا گئی جیسے دونوں ہی اپنی اپنی جگہ سوچ رہے ہوں کہ اب کس موضوع پر بات کریں یا پھر دونوں ہی اپنے خیالوں میں کھو گئے تھے۔ اتنے میں راحیلہ ٹرے میں شہدائے شروب لے کر آ گئی۔ اُس نے ٹرے میز پر رکھتے ہوئے دونوں کی جانب دیکھا، پھر یوں۔

”کیا بات؟ آپ دونوں ہی خاموش ہیں؟“

”ہم دونوں تمہارا انتظار کر رہے تھے کہ تم آؤ تو صاف کے بارے میں پوچھیں۔۔۔ سنا ہے، وہ اب دوبارہ ہسپتال میں ہے؟“ ہالیوں نے پوچھا۔

”ہاں وہ دوبارہ وہیں ہے۔۔۔ لگتا ہے وہ اس صدمے سے باہر ہی نہیں آ رہی۔ راحیلہ نے عام سے انداز سے کہا۔ اُسے کہاں معلوم تھا کہ دونوں کے درمیان یا پھر جنید نے اس کے پس منظر میں کیا کچھ کہا ہے۔

”ٹھیک ہو جائے گی وقت مرہم لاتا ہے۔“ جنید نے دھیرے سے کہا۔

”ہاں یہ تو بتاؤ کہ صاف سے میرے بارے میں کیا باتیں ہوئیں؟“

ہالیوں نے پوچھا تو راحیلہ نے دھیرے دھیرے ساری بات بتا دی، جب تک تینوں نے مشروب بھی ختم کر لیا تو راحیلہ پھر سے کچن میں چلی گئی۔ ان دونوں کے درمیان بہت ساری باتیں ہوئیں۔ جنید اسے ان راہوں کے بارے میں تفصیل سے بتاتا رہا جن سے وہ اپنے مقاصد حاصل کر سکتا تھا یہاں تک کہ کھانا آ گیا۔ کھانے کے دوران وہ تینوں ہلکی ہلکی باتیں کرتے رہے۔ راحیلہ کی امی بھی ان سے آ کر مل گئیں۔ چائے پینے کے بعد ہالیوں چلا گیا تو وہ دونوں رہ گئے۔ جنید باہر گیا اور گاڑی میں سے ایک بیگ نکال لایا۔

”اس میں کیا ہے؟“ راحیلہ نے پوچھا۔

”میں بتاتا ہوں آپ نے کمرے تک چلو۔۔۔“

جنید نے کہا تو راحیلہ کا چہرہ ایک دم سے زرد ہو گیا، پھر اگلے ہی لمحے اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”آئیے۔۔۔“

وہ دونوں کمرے میں آگئے۔ راحیلہ نے دروازہ کھلا رہنے دیا تو جنید نے اسے بند کر دیا۔ وہ ایک صوفے پر جا بیٹھا تو راحیلہ بیڈ کے ایک کونے پر ٹنگ گئی۔ تب جنید نے بیگ کی زپ کھولی اور راحیلہ کے سامنے کر دیا! وہ دیکھتے ہی وہ جھنجھکی پھٹی لگا ہوں سے جنید کی جانب دیکھنے لگی۔

”یوں کیا دیکھ رہی ہو۔۔۔؟“ اُس نے پوچھا۔

”ات۔۔۔ نے۔۔۔ سارے روپے۔۔۔“ وہ ہکھکاتے ہوئی بولی۔

”تقریباً ایک کروڑ ہیں یا پھر اس سے تھوڑے کم ہوں گے۔“ یہ کہہ کر اُس نے راحیلہ کے چہرے کی جانب دیکھا جو لٹھے کی مانند سفید ہو رہا تھا۔ ”اتنی حیرت زدہ مت ہو یہ تو شروعات ہیں۔ تم انہیں منجبال کر رکھو۔ اُس نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

”میں۔۔۔ میں اسے سارے کہاں۔۔۔ نہیں۔۔۔“ وہ اب تک ہکھکاتی تھی۔

”اتنا کھرانے کی ضرورت نہیں ہے یہ زندگی ہے اس میں بہت سے حیرت انگیز مظہر دیکھنے کو پیش گئے۔ جن میں خوشیاں بھی ہو سکتی ہیں اور دکھ بھی۔۔۔“ اُس نے سمجھایا۔

”لیکن ایسی خوشی کیوں حاصل کی جائے جس کے پیچھے بہت بڑا غم ہوگا“ وہ حیرت زدہ لہجے میں بولی۔

”یہ نقطہ سوچنے کا فرق ہے۔۔۔ میں کہتا ہوں ایسا غم کیوں پالا جائے جو چھوٹی چھوٹی خوشیوں کا بھی ٹکڑا ٹھنڈا دے۔“ جنید نے سمجھانا چاہا۔

”میں مانتی ہوں کہ زندگی کے ہزاروں رنگ ہیں۔ اس میں غم بھی ہیں اور خوشیاں بھی لیکن یہ جو دولت دکھائی دے رہی ہے یہ پھندا ہے میں جان بوجھ کر خود کشی نہیں کرنا چاہتی۔“ یہ کہتے ہوئے اسے اپنا لہجہ قدرے اجنبی لگا تھا۔ اس کے ساتھ یہ احساس ابھرا آتا تھا کہ جس کے لیے وہ زندگی داؤ پر لگا چکی ہے اس کا ساتھ کہیں خود کشی کے مترادف تو نہیں؟

”تم! اسے میری امانت کچھ کر رکھو۔۔۔ میں بحث نہیں چاہتا۔ میں خود تمہیں اجازت دیتا ہوں کہ اس سے جس قدر چاہو خرچ کر لینا۔“ جنید نے پھر سمجھانے والے انداز میں کہا۔

”لیکن کیوں۔۔۔ اچانک اتنی دولت مزہک پر پڑی تو نہیں مل جاتی ہے۔“

”۔۔۔ غلط طریقے سے آئی ہے لیکن یہ دولت غلط لوگوں نے غلط طریقے سے حاصل کی تھی کیونکہ اسے اچھے انداز سے ان لوگوں کو واپس کر دیا جائے جن سے یہ لی گئی ہے۔ میں ان تھیلاٹ میں نہیں جانا چاہتا لیکن اتنا ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ حردور کے منہ کا ٹوالہ چھیننے والا ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ وہ چاہے سرمایہ دار ہے یا جاگیردار یا پھر کوئی تو دولتیا۔ اس ملک میں عوام کا اکتھال کرنے والے تو اچھی زندگی گزاریں لیکن ہر معاملے میں قربان عوام کو کیا جائے مجھے تعے آتی ہے سیاستدانوں کے ان بیانات پر جب وہ اپنے مفاد کی خاطر عوام کے دکھ کی بات کرتے ہیں۔ کتنے آئے اور کتنے گئے لیکن عوام کی حالت دن بہ دن خراب ہوتی چلی جا رہی ہے۔ آخر کئی سرمایہ جانا کہاں ہے؟۔۔۔ مجھے ان دانشوروں کے لفظوں سے بے آتی ہے جو ملک کی معاشی بہتری کے پلان تو بناتے ہیں لیکن دورروٹی کو ترستے عوام کو نظر انداز کر کے انہی لوگوں کو مراعات دے دیتے ہیں جو پہلے ہی

دولت مند ہوتے ہیں۔ تم۔ تم ان چکروں میں مت پڑو اس رقم کو سنبھالو۔ میں تمہیں بتاؤں گا کہ اس کا کیا کرنا ہے۔"

"جینید! میں بھی اسی طبقے سے تعلق رکھتی ہوں جس کے اکتھال کی بات آپ کر رہے ہیں میں جانتی ہوں کہ روٹی حاصل کرنا کس قدر

مشکل ہو گیا ہے لیکن کیا روٹی کے بدلے میں ہم اس راہ پر چل سکتیں جو فطرت میں جاتی ہے۔؟"

"تم بتاؤ کیا حاصل ہے اس کا۔؟" اچانک اُس نے صبر سے لہجے میں کہا۔

"انصاف۔۔۔ ہر کسی کے ساتھ انصاف آگے بڑھنے کے مواقع۔۔۔" راحیلہ نے دھیرے سے کہا۔

"جو یہاں ڈور ڈور تک دکھائی نہیں دے رہا ہے۔۔۔ تم اپنے ذہن میں خدمتِ خلق کے لاکھ پلان بنا لو لیکن جب تک تمہارے پاس

سرمایہ نہیں ہوگا وہ پلان کسی کام کے نہیں باصلاحیت طبیس جاہ ہو رہی ہیں اور ہر صاحبِ اختیار اور با اختیار کے پاس صرف بیانات ہیں۔ قانون کی

بات کر کے لاکھ لاکھ روپے میں حصہ دار بن جاتے ہیں۔ چھوڑ دو راحیلہ! چھوڑ دو۔ سوچنا چھوڑ دو اور وہ سب کرو جو میں کہہ رہا ہوں۔ اسے سنبھالو میں

بعد میں بتاؤں گا کہ اس کا کیا کرنا ہے۔"

"ہر بات بعد میں۔۔۔" راحیلہ نے شکوہ بھرے لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" اُس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" وہ تیزی سے بولی پھر اس نے بیگ کی زپ بند کی اور اسے اٹھا کر الماری میں رکھا واپس آ کر اسی طرح بیڈ کے کونے

پر بیٹھ گئی۔ دونوں کے درمیان کچھ دیر تک خاموشی رہی پھر وہ بولا۔

"راحیلہ! اگر تمہیں مجھ سے کچھ کہنا ہے تو کہو۔ میں تمہاری ہر بات سننے کے لیے تیار ہوں۔"

"میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ میں نے کچھ نہیں کہنا۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"۔۔۔ اور میرے پاس بھی کہنے کو کچھ نہیں ہے۔ بس مجھ پر اعتبار کرنا یہی کہنا چاہتا ہوں۔"

جینید نے کچھ اس انداز میں کہا کہ راحیلہ نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کے لہجے انداز اور بات میں نجانے کیا جاوئی اثر تھا کہ

راحیلہ کو سکون کا احساس ہوا تھا یوں جیسے کوئی دکھ کی چادر اتار چیکتا ہے۔

"مجھے آپ پر اعتبار ہے تو میں یہاں تک آئی ہوں ورنہ اب تک گندگی کا ڈھیر بن چکی ہوتی۔"

"یہی تمہارا حوصلہ مجھے پسند ہے راحیلہ! یونہی ثابت قدم رہو اور ان مظلوموں کا سہارا بن جاؤ جو تمہاری طرح اس معاشرے سے لڑ رہے

ہیں۔"

"جینید! میں مانتی ہوں کہ اس معاشرے میں نیکی کرنے والے بہت کم ہیں۔ میرے ہسپتال کی مثال لے لیں وہاں نیکی کرنے والے

تھوڑے ہیں لیکن ہیں ان کی موجودگی سے انکار نہیں کیا جاسکتا البتہ برائی کے درپے لوگ بھی کم نہیں۔ ہوس کے متوالے ان نیکی کرنے والوں کو

دبا جاتے ہیں۔ مجھے حصہ اس اکثریت پر ہے جو نہ تو نیکی کرنے والوں کا ساتھ دیتے ہیں اور نہ برائی کرنے والوں کا اور جہاں اپنا مفاد دیکھتے ہیں

ادھر لڑھک جاتے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں اصل اخصالی طبقہ وہ ہے جو خاموش تماشائی بنا ہوا ہے۔"

"یہ تمہارے ہسپتال کا حال ہی نہیں ہے ہر طبقے میں ایسا ہے۔ ان ایمانوں میں جہاں تقدس ہوتا چاہئے وہاں ویسا کچھ نہیں مل رہا ہے۔ ہسپتال میں تو سبھی ہوتے ہیں۔ ان میں کتنے لوگ ہیں جو اسے عبادت سمجھ کر اپناتے ہیں۔ اس معاشرے میں فریب آدمی بیمار ہو جائے تو اسے موت دکھائی دیتی ہے یہی سوچ کر کہ دوہائی کے پے کہاں سے لائے گا ڈاکٹر کی فیس کہاں سے دے گا یا سرکاری ہسپتال میں کتنی دیر تک دھکے بننے کی قوت برداشت رکھتا ہے۔ تم انصاف چاہتی ہو؟ فیصلہ تم کرو۔"

"میں وہی کروں گی جو آپ چاہیں گے۔"

راحیلہ نے جذب کے عالم میں کہا تو ان کے درمیان خاموشی چھا گئی تب جنید اٹھا اور کھڑا ہو کر بولا۔

"میں چلا ہوں۔"

"کہاں؟" وہ حیرت سے بولی۔

"جہاں مجھے جانا چاہئے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"کیا آپ اپنا کمرابھی نہیں دیکھیں گے۔ جو میں نے آپ کے لیے سجایا ہے؟" اس نے پرشوق انداز میں کہا۔

"واقعی؟"

جنید نے کہا اور راحیلہ کے ساتھ باہر کی جانب چل دیا۔ دونوں ایک دوسرے کمرے میں چلے گئے راحیلہ نے روشنی کی تو جنید کو یہ احساس بہت اچھا لگا کہ کسی نے اس کے لیے اتنے بھرپور انداز میں یہ کمرہ اس لیے سجایا ہے۔ وہ چند لمحوں دیکھتا رہا پھر پٹختے ہوئے بولا۔

"اچھا ہے بہت اچھا ہے۔"

"کچھ دیر بعد جنید چلا گیا۔ راحیلہ کافی دیر تک اس کے احساس میں گھری رہی پھر اس نے وضو کیا اور اپنے کمرے میں آ گئی جہاں خوشگوار بہت کے احساس میں ڈوبی جذب کے عالم میں وہ اللہ رب العزت کے حضور جھک گئی۔ اسے بہت غلوں سے اپنے رتب سے جنید کے لیے دعا نہیں مانگنا تھیں۔

☆☆

مشق کیا ہے؟ — یہ بحث صدیوں سے چلتی آئی ہے اور شاید آئندہ بھی یہ بحث جاری رہے گی تاہم گزرتے ہوئے اس وقت میں مشق کو بہت حد تک سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اصول یہ ہے کہ وہ بات جس پر بہت زیادہ لوگ مشق ہو جائیں اسی کو درست تسلیم کیا جاتا ہے۔ مشق کو سمجھنے کے لیے انسان کے اندر اس "شے" کو سمجھنا بہت ضروری ہے جس سے یہ احساس ہوتا ہے کہ اس بندے کو مشق ہو گیا ہے۔ ظاہر ہے مشق کے بارے میں اسی وقت معلوم ہو سکتا ہے تا جب کسی سے اعمال ایسے مرزد ہوں اعمال ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اندر کیا ہے؟ — انسان کے "انداز" کو اگر ہم زرخیز زمین تصور کر لیں تو ہم مشق کو سمجھنے کی ایک کوشش کر سکتے ہیں۔ زرخیز زمین میں آپ جو بوئیں ویسی ہی فصل تیار ہو جاتی ہے لیکن اس وقت

مشق فنا ہے مشق بقا

تک زرخیز زمین بھی فصل نہیں اگا سکتی جب تک اسے اس کے لیے تیار نہ کر لیا جائے ورنہ جھاڑ جھکاڑ پیدا ہوتے رہیں گے گھاس پھوس اور جھاڑیاں اُگتی رہیں گی جب تک جھاڑ جھکاڑ گھاس پھوس اور جھاڑیوں کو صاف کر کے زمین کو تیار نہیں کیا جاتا تو اصل درجے کی فصل نہیں اگائی جا سکتی۔ اب یہ بات بھی نہیں ہے کہ کوئی فصل نہیں اگے گی تاہم معمول کے ماحول میں اگر فصل اگانے کی کوشش کی جائے گی تو فصل بار آور نہیں ہوگی۔ زمین میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ ہر اس بیج کو اگا دے جو اس میں اپنا آپ کھودتا ہے۔ اگر صلاحیت کے بغیر زمین ہوگی تو اس میں کچھ نہیں اگے گا لہذا پہلے زمین کو اس قابل بنایا جائے کہ اس میں بیج بویا جاسکے۔ انسان کا من بھی ایسا ہی ہے۔ انسان کے اندر اللہ رب العزت نے ہر طرح کی صلاحیت رکھ دی ہے۔ یہ صلاحیتیں اس وقت تک سامنے نہیں آسکتیں جب تک انہیں اُجاگر کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ من کی زرخیز زمین پر وہی کچھ اگتا رہتا ہے جو ہم شعوری یا لاشعوری طور پر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اگر کسی من میں عشق کا بیج آن پڑے تو فصل عشق ضرور اُگتی ہے۔ ہم نفرت، محبت، امید یا اس اور نہ جانے کیسے کیسے بیج ہوتے رہتے ہیں۔ جن کی فصل بھی بار آور ہوتی ہے۔ یہ قانون قدرت ہے اور یہ بھی قانون قدرت ہے کہ بیج سے لے کر فصل تک کا ایک مرحلہ بنے سازگار ماحول ملتا ہے تو بیج ایک تھوڑا درخت کا زوہ بھی دھار لیتا ہے جس پر پھل پھول اور پتے بھی اُگتے ہیں لیکن کیسے وہ کیا "شے" ہے جو انہیں ایک بیج سے تھوڑا درخت کا زوہ دے دیتی ہے؟ وہ ایک آن دیکھا ٹھیل ہے جو تھوڑا درخت کی جانب متوجہ رکھتا ہے یہاں تک کہ بے شمار نئے بیج بنا دیتا ہے اور وہی قوت دراصل عشق ہے۔ عشق وہ قوت ہے جو انسان کو اس کی منزل تک پہنچا دینے میں سب سے زیادہ محرک ثابت ہوتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان میں عشق اس وقت اُترتا ہے جب تمنا کا بیج انسان کے من میں بویا جاتا ہے۔ جو چیز شے یا قوت بیج کو تھوڑا درخت بنا دیتی ہے وہی تمنا کو منزل تک لے جانے کی قوت دیتی ہے۔ انسان کا من اگر فضول خواہشات بے جا جذبات اور لاعمل امیدوں کے جھاڑ جھکاڑ سے صاف ہوگا تو عشق تمنا کے بیج کو تھوڑا درخت بنا دے گا جو نہ صرف بار آور ہوگا بلکہ بے شمار نئے بیج بھی دے دے گا اس لیے صوفیاء نے تزکیہ نفس کی بات کرتے ہیں اور بلاشبہ دینِ فطرت بھی انسان سے یہی چاہتا ہے۔ جس طرح صوفیاء محققانق ہے کہ عشق اپنی کچھ خود ہی عطا کرتا ہے اسی طرح عشق انسان کو بدل دینے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے لیکن اس سے پہلے یہ نکتہ سمجھ لینا بہت ضروری ہو جاتا ہے کہ عشق کسی بھی شے انسان اور رب سے بھی ہو سکتا ہے۔ بیج جس طرح کا ہوگا درخت بھی ویسا ہی اُگتا ہے۔ زمین بددینا نہیں کرتی پھول کے بیج سے برکت نہیں اُگتا اور نہ برکت سے پھول۔ پھر وہ کون سی صلاحیت ہے جو انسان کو بدل کر رکھ دیتی ہے؟ وہ ہے انسان کا اپنا خیال یہ خیال ہی ہے جس سے انسان کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے من میں کیا بیج اُگا ہوا ہے۔ وہ اس کی آبیاری کرتا رہتا ہے یا پھر نیا بیج اُگانے کی سعی کرتا ہے۔ اب یہ انسان کا اپنا اختیار ہے کہ وہ پھول بوتا ہے یا برگد؟

چند کو یہ اعتراف تو تھا کہ اُسے راحلہ سے محبت ہوگئی ہے اور ہرگز رتے دن کے ساتھ اس کی شدت میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اُسے خود پر اختیار نہیں رہا تھا یہاں تک کہ اُس کی محبت حد و عشق میں داخل ہو چکی تھی۔ یہ سارا کچھ ہونے کے باوجود اُسے اب تک اس بات کی سمجھ نہیں آئی تھی کہ یہ بے اختیار محبت جو اب عشق کی صورت اختیار کرتی چلی جا رہی ہے جس کے سامنے وہ بے بس ہے۔ آخر اس کی منزل کیا ہے؟ وہ جب بھی اس بارے سوچتا اسے گھپ اندھیرے کے سوا کچھ بھی دکھائی نہ دیتا یہاں تک کہ وہ مایوس ہو جاتا۔ وہ عشق ہی کیا جو انسان کو بے عمل کر

عشق فنا ہے عشق بقا

دے۔ عشق تو ایسی قوت کا نام ہے جو انسان کو ہر لمحہ متحرک رکھتا ہے۔ جنید بھی لاشعوری طور پر متحرک رہا تھا۔ اُسے سب سے پہلا خیال ہی یہی آیا تھا کہ راحیلہ کو ایسی زندگی سے باہر نکالنا ہے جہاں وہ مظلومی بے بسی اور غربت میں قید ہے۔ ایسا کرنا اس کے بس میں تھا، اس نے جموٹ کچ کہہ کر اسے ایسی زندگی سے نکال لیا تھا۔ جب بھی اُس کی سوچ راحیلہ کو پالنے کی جانب جاتی تب راحیلہ تو اُسے اپنی دسترس میں دکھائی دیتی وہ جب چاہتا اُسے اپنا لیتا۔ اس راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی اور خود راحیلہ اُس سے اپنی محبت کا اظہار کر چکی تھی۔ بس چند نظموں پر مشتمل اپنی تمنا کا اظہار اس سے کرتا تھا اور وہ اُس کی ہو جاتی مگر وہ خود اس راہ میں بہت بڑی رکاوٹ تھا۔ وہ اسے ساری دنیا کی سہولیات اور آسائشات دے سکتا تھا لیکن اگر کچھ نہیں دے سکتا تھا تو اس کا اپنا آپ تھا۔ اس کا اظہار وہ راحیلہ سے بھی کر چکا تھا اُسے اپنی زندگی کا قطعاً کوئی بھروسہ نہیں تھا۔ کسی بھی لمحے کوئی بھی سنسناتی ہوئی گولی اس کے زندگی بھرے وجود کو موت دے سکتی تھی۔ یہ قدرت کا احسان ہے کہ انسان اپنی موت سے آگاہ نہیں ہے اور جب اسے اپنی موت کے بارے میں معلوم ہو جاتا ہے تب اس دنیا میں رہنے کے سارے پلان ختم ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اپنی زندگی کا بھروسہ نہ ہونے کے باعث جب بھی وہ راحیلہ کے بارے میں سوچتا تب ہی وہ سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتا جو اس کی زندگی کو اتنا سہل بنا دے کہ رہتی زندگی تک راحیلہ کو پھر مظلومی بے بسی اور غربت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ان دنوں اُس کی ساری سوچ کا محور راحیلہ ہو چکی تھی۔ جاگتی آنکھوں سے نجانے کتنے خواب وہ دیکھ چکا تھا۔ وہ جو اپنے تخیلی امور میں ہمیشہ شدت سے سرگرداں رہتا تھا، اس شدت کو محبت کی پھوار نے بہت حد تک کم کر دیا تھا۔ وہ اس ہدف کے بارے میں کم سوچتا جو اس کی قیادت نے اُسے دیا تھا۔ اس سے کہیں زیادہ اُسے راحیلہ کا خیال رہتا۔ اُس کی پوری کوشش تھی کہ اُس کی اپنی تنظیم کے کسی فرد کو اس بارے میں معلوم نہ ہو کہ اُس کا تعلق راحیلہ سے ہے۔ وہ اسے ساری دنیا سے بچا کر رکھنا چاہتا تھا۔

اس وقت بھی وہ راحیلہ ہی کے خیال میں ڈوب رہا تھا۔ اس رات کے بعد وہ پھر وہ بارہ اس سے نہیں ملا تھا، بس فون پر اس سے رابطہ تھا۔ اس کے احسان شروع ہو چکے تھے اب وہ ہسپتال نہیں جاتی تھی۔ عقیدے کب کی اپنے گھر منتقل ہو چکی تھی اور راحیلہ وہ باران کے گھر بھی جا چکی تھی تاکہ اُن کے درمیان رابطہ رہے۔ راحیلہ کی بدولت ہمایوں کو اس کی ذہنی حالت کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو جاتا تھا۔ اس وقت وہ یہی سوچ رہا تھا کہ جب راحیلہ امتحان دے چکے گی تو پھر کیا ہوگا۔ کیا وہ اسے ہسپتال میں ملازمت کی اجازت دے دے گا؟ اس سے پہلے کہ ہاں یا نہیں کا جواب اُسے متاثر سے یہی صدا ہنسنے ہوئی کہ تم کون ہوتے ہو اسے اجازت دینے یا نہ دینے والے! کیا تم اس پر اپنی مرضی مسلط کرو گے۔ اگر تم اس پر اپنی مرضی مسلط کرو گے تو پھر تم میں اور ڈاکٹر جمیل میں کیا فرق رہ جائے گا؟ اس صدا نے اُسے بے چین کر کے رکھ دیا تھا۔ اس بے چینی کی بنیاد شدید خواہش تھی جس کے تحت وہ اسے ساری دنیا کی لگا ہوں سے بچا کر رکھنا چاہتا تھا۔ وہ کیا کرے؟ یہی بات اُس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ اس وقت رات کا تیسرا پہر ہو چکا تھا وہ چھت پر لیٹا لیگی لیگی ٹھنڈی ہوا میں یہی کچھ سوچے چلا جا رہا تھا کہ اچانک اُس کا فون بج اٹھا۔ اُس نے نمبر دیکھے اور پھر جلدی سے فون کال ریسیڈ کر لی۔

”ہیلو۔۔۔ یولو کیا بات ہے؟“

”آپ نے جس بندے کی نگرانی کے لیے کہا تھا اس وقت وہ چند لوگوں کے ساتھ ایک گھر میں ہے۔ لگتا ہے اُن کی کوئی میٹنگ وغیرہ چل

رہی ہے۔"

"تمہیں ایسا کیوں محسوس ہوا کہ وہاں کوئی مینٹک ہو سکتی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"وہ گھر سے اچانک نکلا تھا پھر اس کے پیچھے جب میں گیا ہوں تو وہاں کے بعد دیگرے چند گاڑیاں آئی ہیں۔ اگر وہ کچھ دیر مزید گھر

سے باہر نہ نکلا تو میں وہاں سے جانے والا تھا۔"

"اوکے۔۔۔ تم وہیں رہنا اگر تھوڑی بہت بھی کوئی غیر معمولی حرکت ہو تو مجھے مطلع کرتے رہنا۔ آج ان کا معاملہ بھی ختم کر دیتے ہیں۔"

اس نے ویرے سے کہا۔

"ٹھیک ہے میں ادھر ہی ہوں۔"

اس نے یہ سن کر فون بند کر دیا پھر اس نے چند جگہ فون کیا اس دوران وہ نیچے اپنے کمرے میں آ کر تیزی سے تیار بھی ہوتا رہا۔ مطمئن حد

تک تیاری کر کے وہ گاڑی تک آیا اور پھر گھر سے باہر نکلا چلا گیا۔

طے شدہ مقام پر اس کے چند ساتھی جمع ہو چکے تھے۔ وہیں پر اطلاع دینے والا بندہ بھی پہنچ چکا تھا اس نے ساری تفصیل بتائی وہاں کی

سیکورٹی کے بارے میں جائزہ لیا پھر اس جانب چل پڑے۔ وہ علاقہ پوری طرح خاموش تھا۔ جس طرح دیگر گھر روشن تھے اس گھر کی جتیاں بھی

ویسے ہی روشن تھیں۔ وہ سب بڑے عظام انداز میں آگے بڑھتے چلے گئے۔ یہاں تک اس گھر کی دیوار کے ساتھ جا گئے۔ باؤنڈری وال سے پرے

لان تھا اور اس کے بعد اصل عمارت تھی۔ جنید انہیں ہر طرح سے سمجھا چکا تھا کہ کتنا کیا ہے۔ وہ سب خاموش تھے اور بڑے صبر سے اندر کی جانب

نگاہیں جمائے بیٹھے تھے۔ گیٹ پر دو آدی تھینا تھے جو پوری طرح الرٹ تھے۔ جنید نے صحت پر کسی بندے کی موجودگی کو نظر انداز نہیں کیا تھا اس

لیے ہر طرف سے عظام ہو کر ان لوگوں کے باہر نکلنے کا خطرہ تھا۔ انہیں وہاں زیادہ سے زیادہ چند منٹ گزارے ہوں گے کہ اندر سے چند افراد

نکلے اور آپس میں گفتگو کرتے ہوئے گاڑیوں کی جانب بڑھے۔ جس مخصوص گاڑی کا نمبر ان سب کو معلوم تھا اس بندے کو وہ نگاہوں میں کر چکے

تھے۔ ڈرائیور سمیت وہ چار لوگ تھے ان میں دو سیکورٹی گارڈ تھے۔ وہ گاڑی تیسرے نمبر پر کھڑی تھی جنید نے آخری بار ہر طرف کا جائزہ لیا اور اپنی

گمن نکال کر پوری طرح تیار ہو گیا۔ اس کی گاڑی حرکت میں آئی تو وہ ساکت ہو گیا۔ گیٹ کھل چکا تھا پہلی گاڑی نکلی اور زن سے سڑک پر چلی گئی

دوسری کے بعد جیسے ہی تیسری گاڑی گیٹ کے باہر آئی جنید نے فائر کھول دیا۔ اس کے ساتھ وہ پورا علاقہ فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھا۔ دو تین

منٹ میں وہ گاڑی گولیوں سے چھلنی ہو گئی۔ اس گاڑی سے تو کوئی مزاحمت نہ ہوئی لیکن گھر سے فائرنگ کی آواز آنے لگی۔ جنید کا مقصد ان لوگوں

سے لڑنا نہیں تھا۔ جس مقصد کے لیے وہ آیا تھا وہ پورا ہو چکا تھا لہذا فائرنگ میں شدت ہونے سے پہلے ہی وہ وہاں سے پلٹ جانا چاہتا تھا۔ اس نے

اپنے ہدف کو ختم کر لینے کے یقین کے ساتھ ہی پیچھے ہٹنا شروع کر دیا۔ ڈرا سے فاصلے پر ان کی گاڑی کھڑی تھی وہ تیزی سے اس جانب لپکا۔ اس

وقت وہ گاڑی کا گیٹ کھول چکا تھا جب ایک برست آیا اور دائیں ٹانگ میں جیسے کسی نے گرم لوہے کی سلاخ ڈال دی ہو۔ ایک لمبے کو وہ سمجھنا کر رہ

گیا۔ اُسے گولی لگ چکی تھی۔ یہاں لمبے کے ہزاروں حصے کی کوتاہی اس کی زندگی کو ختم کر سکتی تھی۔ لہذا اس نے سٹارٹ کھڑی کار کو اتنی تیزی سے

کیئرنگا یا کروہ خود حیران رہ گیا۔ انسان اپنی بنا کے وقت کس قدر حیرت انگیز ہوتا ہے اس کا انکشاف اُسے ان لمحات میں ہوا۔ اُس کے ساتھی وہاں سے نکل چکے تھے وہ اکیلا تھا۔ اس وقت وہ بڑی شاہراہ پر تھا۔ ابھی تک اُس کے پیچھے کوئی نہیں تھا لیکن فون مسلسل بج رہا تھا۔ ٹانگ میں درد کی شدت بڑھتی چلی جا رہی تھی یہاں تک کہ اُسے رفتار بڑھانے میں بڑی مشکل ہو رہی تھی۔ وہ پسینے سے تر ہو چکا تھا۔ اُس نے بڑی مشکل سے فون نکالا اور پھر اُسے آن کر دیا۔ دوسری جانب اُس کا ساتھی تھا۔

”آپ ٹھیک تو ہیں۔۔۔؟“

”میری چھوڑ دو ساتھیوں کے بارے میں بتاؤ؟“ جنید نے اذیت سے پوچھا۔

”سب ٹھیک ہیں اور وہ سب ہی اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہنچ جائیں گے ان کی گلز کریں آپ۔۔۔؟“

”میری دائیں ٹانگ میں گولی لگ چکی ہے خون جیزی سے بہ رہا ہے اور گاڑی بڑھانے میں بہت وقت ہو رہی ہے۔۔۔ میری عمر مت کرنا ساتھیوں کو سنجال لیتا۔“

یہ کہہ کر اُس نے فون بند کر دیا اس کے ساتھ ہی اُسے خیال آیا کہ میں کہاں جاؤں۔ اسی لمحے میں اُس کا فون پھر بج اُٹھا۔ وہ فون کال راجیل کی طرف سے تھی۔ وہ چونک گیا اس وقت اس کا فون کیوں آیا ہے؟“ اُس نے جلدی سے ردیو کر لیا۔

”آپ ٹھیک تو ہیں؟“ اس نے فوراً پوچھا۔

”میں ٹھیک ہوں لیکن تم نے اس وقت۔۔۔؟“ وہ حیرت سے بولا۔

”آپ ٹھیک نہیں ہیں آپ کی آواز۔۔۔“ وہ انتہائی تشویش سے بولی۔

”تم نے اس وقت فون کیوں کیا؟“ جنید نے درد سے کراہتے ہوئے کہا۔

”میں۔۔۔ میں نے ابھی ایک بہت بھیا تک خواب دیکھا ہے۔ آپ۔۔۔ پلیز آپ بتائیں۔ آپ ٹھیک ہیں نا۔۔۔؟“ وہ رو بانسو انداز میں پوچھ رہی تھی۔

”میں نہیں میں ٹھیک نہیں ہوں۔۔۔“ اُس نے شدت درد سے کراہتے ہوئے کہا۔

”کیا ہوا۔۔۔؟“ اس کی آواز میں جیسے آنسو تیر گئے تھے۔

”تم۔۔۔ گیٹ پر میرا انتظار کرو۔۔۔ میں۔۔۔ اگر تم تک پہنچ گیا تو ٹھیک۔۔۔ میری دائیں ٹانگ میں گولی لگی ہے۔۔۔ اور گاڑی چلانا بہت مشکل ہو رہا ہے۔۔۔“ وہ کراہتے ہوئے بولا۔

”گولی۔۔۔؟“ وہ چیختے ہوئے بولی۔

”ہاں۔۔۔ میں تم تک ضرور پہنچنے کی کوشش کروں گا۔۔۔“

”میں آپ کو کچھ نہیں ہو سکتا۔ میں انتظار کر رہی ہوں۔ آپ مجھ تک پہنچیں گے میں آپ کا انتظار کر رہی ہوں۔۔۔“

وہ ہڈیانی انداز میں کہہ رہی تھی انہی لہلوں میں درد کی شدت سے اُس کا پاؤں سن ہو گیا۔ گاڑی کی رفتار ایک دم سے سختی چلی تھی فون گر گیا۔ جنید نے بیک سر میں دیکھا ایک کار تیزی سے آ رہی تھی۔

زندگی میں ایسے لمحات بہت کم آتے ہیں جب انسان کی صلاحیتیں اپنے عروج پر ہوتی ہیں۔ انسان یہ گمان بھی نہیں کر سکتا کہ ان لمحات میں اس سے کیا کچھ سرزد ہوتا رہا ہے اور بعد میں جب انسان ان لمحات میں سرزد ہونے والے اعمال پر سوچتا ہے تو خود قی و تک رہ جاتا ہے۔ ان لمحات میں جبکہ یہ اعمال سرزد ہو رہے ہوتے ہیں وہ قطعاً نہیں سوچتا بس لاشعوری طور پر وہ ہوتے رہتے ہیں۔ اپنی جتنا احساس ان لمحات میں ہوتا ہے بشرط صرف یہ ہے کہ انسان حوصلہ نہ ہارے۔ اس وقت جنید بھی کچھ ایسی ہی صورت حال سے دوچار تھا۔ دائیں ٹانگ میں لگنے والی گولی نے کسی بھی حرکت سے معذوری ظاہر کر دی تھی وہ اپنی پوری قوت سے ٹانگ ہلانا چاہتا تھا لیکن شل ہوئی ٹانگ حرکت ہی نہیں کر رہی تھی۔ گاڑی کی رفتار کم ہو چکی تھی اور بیک سر میں دکھائی دینے والی گاڑی تیزی سے قریب آتی چلی جا رہی تھی۔ جس قدر یہ امکان تھا کہ یہ گاڑی دشمن کی ہو سکتی ہے اتنا ہی امکان یہ بھی تھا کہ یہ گاڑی کسی اور کی بھی ہو سکتی ہے۔ وہ کوئی رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔ ایسے میں بائیں جانب سیٹ پر پڑا ایل فون آن تھا اس میں سے راہیلہ کی آواز جھنجھٹا ہٹ کی صورت میں اُس تک پہنچ رہی تھی وہ اپنی پوری بے تابیوں کے ساتھ اُسے پکار رہی تھی۔

”ہلو جنید! آواز دو کہاں ہو آپ۔۔۔ مجھے بتاؤ میں آپ تک پہنچ جاتی ہوں۔۔۔ اپنے پارے میں بتاؤ۔۔۔ دیکھو مجھ تک پہنچ جاؤ۔ میں سارے ذنیبا سے آپ کو چھپالوں گی۔۔۔ آواز دو پلیز۔۔۔“

جنید نے تل فون سے آتی ہوئی سرگوشیوں کو غور سے سنا پھر آنکھیں بند کر کے ساری قوت کو جمع کیا۔ ذرا سی حرکت کے ساتھ بائیں ٹانگ کو ہلایا اور پھر گاڑی کی رفتار بڑھتی گئی۔ پیچھے سے قریب آتی ہوئی گاڑی زور ہوتی چلی گئی۔ صبح کے وقت سڑکیں صاف تھیں اکاڈا گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ جنید کے ذہن میں فقط ایک بات سما گئی تھی کہ اگر وہ کسی طرح راہیلہ تک پہنچ گیا تو پھر جتنے جائے گا اور نہ اس کے دشمن اسے یہیں سڑک پر قتل کر دیں گے۔ وہ جو شکار کرنے گیا تھا شکار ہونا نہیں چاہتا تھا۔ وہ لہو لہو اس کے قریب ہوتا چلا جا رہا تھا یہاں تک کہ وہ اس علاقے تک پہنچ گیا جہاں راہیلہ تھی۔ اُس نے تمام راستے اس بات پر توجہ ہی نہیں دی تھی کہ کوئی اُس کے تعاقب میں ہو سکتا ہے اُس کا سارا اوجھان راہیلہ کی طرف تھا جو اُسے پکار رہی تھی۔ اس کی آواز ایک قوت بن کر اُس تک پہنچ رہی تھی۔ پھر وہ اس گھر کے قریب پہنچ گیا۔ جب اُس نے زور زور سے چلانا شروع کر دیا کہ گیت کھولو میں پہنچ گیا ہوں۔ گھر پہنچ کر اُسے گیت کھلا ہوا مادہ گاڑی اندر لے گیا اور تھی اُس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ وہ بمشکل راہیلہ کی طرف دیکھ سکا جو اُس کی جانب بڑھ رہی تھی۔ گاڑی بند ہو چکی تھی۔ راہیلہ نے دروازہ کھولا اور اُسے تھا م لیا۔ اُس کی ٹانگ خون سے لت پت ہو رہی تھی۔ بھاری بھر کم جنید کا وزن راہیلہ برداشت کر رہی تھی۔ وہ اُسے اندر لے گئی اور جاتے ہی بستر پر لٹا دیا جائے عافیت تک پہنچ جانے کے احساس ہی سے جنید اپنے آپ میں نہر ہا اور ہوش و خروش بیگانہ ہو گیا۔۔۔

اُسے جب ہوش آیا تو بہت سکون محسوس کر رہا تھا۔ لگا ہوں کے سامنے سے دُستد چلتی گئی تو اُسے گزشتہ واقعات یاد آتے چلے گئے، تبھی اُس نے چونک کر اپنی ٹانگ کو دیکھا جہاں پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اُس کے قریب ہی زمین پر بیٹھی بیڈ سے سر نکالنے راہیلہ سو رہی تھی۔ اُس نے کمرے کا

جائزہ لیا۔ وہ اسی کمرے میں تھا جو راحیلہ نے اُس کے لیے مخصوص کر کے سجایا تھا۔ جب وہ یہ کمرہ دیکھ رہا تھا اس وقت سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یوں کبھی اس حالت میں یہاں آئے گا۔ سائینڈیکل پردوں کے ساتھ محل پڑے ہوئے تھے۔ پھر گھوم کر اُس کی نگاہ راحیلہ پر پڑی جو سو رہی تھی۔ وہ اس کی طرف دیکھتا چلا گیا۔ اُس کے دماغ میں اپنے ساتھیوں کے بارے میں جاننے کا جنس ابھر رہا تھا، تاکہ اُن کے بارے میں معلوم کرے لیکن وہ سوئی ہوئی راحیلہ میں کھوجانا چاہتا تھا۔ کچھ دیر کے لیے ہی کسی ساری دنیا سے کٹ کر بیٹوں کا مورخے کو شدت سے دل چاہ رہا تھا۔ اُس نے ہر شے ذہن سے بھلا دی اور اسے دیکھتا چلا گیا۔

کہتے ہیں کہ جب کسی کی شخصیت کا تھوڑا بہت اندازہ کرنا ہو تو اس کا سوتے ہوئے مشاہدہ کرنا چاہئے۔ اس وقت بہت کچھ چہرے سے عیاں ہو جاتا ہے جو اسکی اندرونی کیفیات کا نماز ہوتا ہے۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ راحیلہ کے چہرے پر بلا کی مصحوبیت تھی یوں جیسے کوئی بچہ خینڈ کی آغوش میں ہو۔ اُس نے پہلی بار اسے غور سے دیکھا۔ بند آنکھوں کی لانی پلکیں ستواں سی ناک پتلے پتلے گلابی ہونٹ، گداز گالوں کے ساتھ نرم سی ٹھوڑی لانی گردن کی دائیں جانب سیاہ مٹل آچھل میں سے جھانکتے سیاہ گیسو گلابی نائل سفید رنگت بھرا مجرا جسم۔۔۔ وہ کئی ہوئی بیڈ کے ساتھ ٹیک لگائے تیند میں تھی۔ کتنا ہی وقت بے غمی گزر گیا، جمی کرے گا دروازہ کھلا اور نرسین اندر آ گئی۔ اُسے جانتا ہوا دیکھ کر وہ ڈرا سا سمجھتی پھر شرمندہ سے لہجے میں بولی۔

”اوسوری۔۔۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ جاگ رہے ہیں۔“

اس کی آواز سن کر راحیلہ بڑبڑا کر جاگ گئی۔ اُس نے تیزی سے دونوں کی جانب دیکھا۔

”اس میں سوری کی کیا بات ہے نرسین!۔۔۔ آ جاؤ۔“

جنینے نے کہا تو راحیلہ نے اُس کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”اب کیسی طبیعت ہے۔؟“

”سنیں ٹھیک ہوں۔۔۔ ویسے تمہیں ہی پتہ ہے کہ میرے ذمہ کی حالت کیا ہے؟“

”گولی خاصی گہری چلی گئی تھی اُس نے بڈی کو کبھی نقصان پہنچایا ہے۔۔۔ خیر اب خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔“ راحیلہ نے ڈرا سا مسکراتے ہوئے کہا۔

”راحیلہ! تمہارا بہت شکریہ۔“

جنینے نے دل کی گیرائی سے کہا تو اس کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی۔

”شکریہ تو نرسین کا ادا کریں وہی اس کی مستحق ہے اور اس کی بھی ضرورت اس لیے نہیں ہے کہ انہوں میں ایسا نہیں ہوتا۔“

”کیسے۔۔۔؟“ وہ بولا۔ اس کے لہجے میں شرمندگی چمک رہی تھی اسی لیے وہ انتہائی اختصار سے بولا تھا۔

”تھوڑی بہت میڈیسن تو گھر میں پڑی ہی رہتی ہیں لیکن ایسا بھی نہیں کہ منیں چہرہ پاڑ کر کے گولی نکال سکتی۔ منیں نے اسے فون کر کے

صورت حال بتائی۔ یہ بیوی تو تھی اسے بھی معلوم تھا کہ آپ وہاں نہیں جاسکتے سو یہ مارے لوازمات کے ساتھ یہاں آگئی۔ سبھی مسنون میں اس نے ہی گولی نکالی ہے۔“ اس نے تفصیل بتائی۔

”اور میں بے ہوش رہا؟“ جنید نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں آپ کو بے ہوش کروایا گیا۔ اب وقت دیکھیں کیا ہے۔“

نسرین نے کہا تو اس نے کھاک کی جانب دیکھا دو پہر ڈھل جانے والی تھی۔ اس پر ان میں تھوڑی دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔

”ٹھیک ہونے میں کتنے دن لگ جائیں گے۔“ اس نے دروہسوں کرتے ہوئے کہا۔

”یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ کتنے دن میں ٹھیک ہو سکتے ہیں لیکن یہ طے ہے کہ کچھ دن لگیں گے۔“ راحیلہ نے یوں کہا کہ جیسے اُسے باور کر رہی ہو کہ سکون سے پڑے رہو۔

”میرا خون کہاں ہے؟“ جنید نے پوچھا۔

”جے میرے پاس لیکن وہ آپ کو ملے گا نہیں۔ میں نے بند کر کے رکھ دیا ہے۔ چند دن تک آپ اسے دیکھ بھی نہیں پائیں گے اور وہ آپ نے مانگنا بھی نہیں ہے۔“

راحیلہ نے قدرے سختی سے کہا تو وہ اس کی طرف دیکھا رہ گیا تب نسرین بولی۔

”اچھا کچھ کھانے کے لیے دل چاہ رہا ہے؟“

”ہاں اب کی ہے تا کام کی بات۔“ جنید نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے کچھ کھانی لیں۔ پھر آپ کو میڈیسن بھی لہنا ہے۔“

اس نے کہا اور اٹھ گئی تب راحیلہ نے اس کے چہرے کی جانب غور سے دیکھا اور اگلے ہی لمحے اٹھ کر نسرین کے پیچھے چلی گئی جنید اس کی ادا پر مسکرا کر رہ گیا۔

☆☆

ضنیہ بالکل تنہا ہو کر رہ گئی تھی اس کا سارا دن کمرے میں پڑے گزر جاتا تھا۔ وہ یہ گمان بھی نہیں کر سکتی تھی کہ اس پر یہ وقت بھی آسکتا ہے۔ وہ سب سے شرمندہ تھی خاص طور پر اپنی ماں زینون بی بی سے جس نے قدم قدم پر اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی مگر تیمور کے عشق میں وہ نیم پاگل ہو گئی تھی۔

”کیا واقعی وہ تیمور کے عشق میں پاگل ہوئی تھی؟“

یہ سوال اکثر اس کے سامنے تن کر کھڑا ہو جاتا اور وہ اکثر ہی اس سے لگاؤ میں جرات جاتی کیونکہ اسے معلوم تھا کہ ایسا ہے نہیں بلکہ اس مقام تک لانے میں اس کے اپنے اندر کالاجی شامل تھا۔ وہ اپنی خواہشوں کے جہم میں کھو گئی تھی یہاں تک کہ اسے اپنے آپ کی بھی مدد بدھ نہیں رہی

تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کے ارد گرد کے لوگ یہی سوچ رہے تھے کہ جمود کی بے وفائی کا صدمہ اس نے لیا ہے اور اس حال تک پہنچ گئی ہے۔ جب بار بار یہی بات اس کے سامنے ڈھرائی گئی تو اس نے بھی یہی باور کرایا اور خود کو تسلیم دینے لگی حالانکہ وہ اچھی طرح سمجھتی تھی کہ یہ اپنے آپ کو دھوکہ دینے کے مترادف ہے۔ پھر جیسے ہی وہ ان الحاحات کو سمجھتی جب جمود نے اسے دستکار دیا تھا اس کی اذیت میں اور زیادہ اضافہ ہو جاتا۔ اس کی بے بسی کی انتہا یہ تھی کہ وہ اپنے اس دکھ کے بارے میں کسی کو بتا بھی نہیں سکتی تھی۔ اس اذیت کو تجربائی نے مزید بڑھا دیا تھا۔ وہ جو اپنے پاپا کو اپنا دوست تصور کیا کرتی تھی اب ان کا سامنا کرنے سے بھی کتراتے تھی۔ پوری زندگی میں وہ کبھی یوں پولیس کی حراست میں نہ تھی کہ جسے اس کی جہ سے وہ مجرموں کی طرح تھانے لے جائے گئے۔ اسی احساس کے باعث ہواؤں میں اڑنے والی مفید آب خود کو زمین پر رکھنے والا ایک کیزا سمجھ رہی تھی۔ ان الحاحات کے بارے میں جب بھی وہ سوچتی اس کے اندر آگ لگ جاتی۔۔۔ کیا وہ اس لیے بنی ہے کہ اتنا کچھ برداشت کر جائے کیا وہ اتنی کمزور ہے کہ طوفان میں تنگے کی مانند اڑ جائے؟ یہ سب سوچتے ہوئے اس کی امیدیں خواہشیں اور خواب بھرے اس کے سامنے آسور ہوئے۔ وہ ان کی جانب حسرت سے دیکھتی لیکن کچھ بھی نہ کر پاتی کیونکہ اسے یہ پورا یقین تھا کہ سب اس سے بہت ڈور جا چکے ہیں مگر پھر بھی اس کے اندر کوئی جذبہ موجود تھا تو انتقام تھا۔ تیمور سے انتقام! جس نے اس کی تذلیل کی تھی۔ اس کے خوابوں، خواہشوں اور امیدوں کی توہین کی تھی۔ اس کی ذات کو گھٹیا قرار دیا تھا جیسے کوئی لشوہہ استعمال کر کے پینک دیتا ہے۔۔۔ وہ یہ سب کچھ سوچتی اپنے آپ میں حوصلہ بھی پاتی لیکن پھر محض سلگ کر رہ جاتی۔ تیمور سے انتقام لینے کے لیے اس کا بہت مضبوط ہونا ایک حقیقت تھی۔ اس کی سوچ کا یہی وہ مقام تھا جہاں وہ خود کو خلا میں محسوس کرتی تھی یہاں تک کہ اسے سانس لینا بھی مشکل ہوتا۔ ڈور ڈور تک امید کی کوئی کرن دکھائی نہ دیتی۔

اس کے لیے دو ہری اذیت کا باعث ہا یوں تھا۔ جسے وہ کبھی انسانوں میں شمار بھی نہیں کرتی تھی آج وہی ان کے خاندان کا محسن قرار پایا تھا۔ وہ جو کبھی اس سے بات کرنے کے لیے ترستا تھا اور بات کرنے کی کوشش کرتے ہوئے ذلیل ہو گیا تھا آج اس کی جانب دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا تھا۔ اسے ہا یوں کی بالکل کجگوش آگئی تھی۔ کیا وہ کسی اپنے انتقام کے تحت ان کے قریب ہو رہا تھا؟ کیا رشتے داری کو بھاتے ہوئے اپنے ہی خاندان کے بزرگ کی پاسداری میں یہ سب کر رہا تھا؟ پھر محض اپنے پیش وراثہ فرائض بھاتے ہوئے ان کی مدد کر رہا تھا؟ پورے گھر میں اس کے بارے میں بات ہوتی، ہر کوئی اپنی رائے رکھتا لیکن زمین بی بی کی پہلے جو رائے تھی اب بھی وہی تھی کہ خون بہہ رہا حال خون ہوتا ہے جو اپنے کی مصیبت میں جوش ضرور مارتا ہے۔ وہ جس طرح سے بھی کہی اپنے چاچا کی مدد کو آن پہنچا ہے۔ کوئی مانتا یا نہ مانتا لیکن زمین بی بی کی اس بات کی کوئی بھی مخالفت کرنے کی جرأت نہ کرتا جس سے دھیرے دھیرے ہا یوں اور ان کے گھر والوں کے درمیان وہ تناؤ نہیں رہا تھا جو کبھی ہوتا تھا اور پھر اس دن تو حد ہی ہو گئی تھی جب ہا یوں کی دعوت پر اس کے پاپا اور ماد دونوں ان کے پاس گئے تھے۔ اسے جب معلوم ہوا تو اذیت کی انتہا سے وہ خود کو لہو لہو محسوس کر رہی تھی۔ وہ خاندان جس سے وہ نفرت کرتی تھی آج انہی کے پاس اس کے والدین گئے ہوئے تھے۔ ان کے واپس آنے تک وہ انتہائی درجے کی بے چینی میں رہی۔ اس وقت وہ ڈرامنگ روم ہی میں تھی جب وہ دونوں واپس آئے۔ اس کے پاپا کے چہرے پر تو انتہائی درجے کی شجیدگی تھی تاہم اس کی ماں کے چہرے پر دبی دبی خوشی اور خوشواریت پھیلی ہوئی تھی۔ سلیٹی بھی انتہائی تجسس کے ساتھ ان کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی ان

عشق کا ہے عشق بتا

کے بیٹے ہی سہی نے پوچھا۔

”ان کے ہاں جانا کیسا لگا۔۔۔؟“

اس نے انتہائی تجسس سے دونوں کی جانب دیکھ کر کہا تھا جواب چاہے کوئی دے۔ اس پر ماما نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

”بہت ہی اچھا۔۔۔ انہوں نے بہت ہی عزت اور احترام دیا ہے اپنے پاپا سے پوچھنا سہی کی کسی ایک بات کو بھی نہیں ڈررایا انہوں نے بلکہ

میں نے اگر ذکر کرنے کی کوشش بھی کی تو وہ نال گئے۔“

”جب انہوں نے ماضی دہرانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تو آپ ایسا کیوں چاہ رہی تھیں؟“ منیہ نے تنگ کر پوچھا۔

”اس لئے بیٹا کہ اگر ان کے دل میں کوئی بات ہو بھی تو اسی وقت صاف ہو جائے۔ دل میں کدورتیں رکھ کر تعلقات نہیں بھمائیے جا

سکتے۔“ زینون بی بی نے انتہائی نرمی سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”تو اس کا مطلب ہے آپ نے تعلقات بنانے کی شروعات کر دی ہیں؟“ اس نے دھیرے سے مگر حسے میں کہا۔

”اچھا تو پھر اور کیا باتیں ہوئیں وہاں پر۔۔۔؟“ سہلی نے جلدی سے پوچھنا کہ منیہ کی بات نظر انداز ہو جائے۔

”بہت ساری باتیں ہوئیں۔۔۔ انہوں نے تم دونوں کے بارے میں پوچھا اپنے بارے میں بتایا۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے حسرت

سے کہا۔ ”وہ اپنے دونوں بیٹوں پر فخر محسوس کر رہے ہیں۔ سعید کی نوکری لگ گئی ہے اور وہ اچھا کام دار ہے۔ عزت ہے اس کی لیکن ہمایوں کے لیے تو ہر

وقت دعا کر ہیں جس نے دنوں میں ترقی کی ہے ایک اچھا گھر یا عزت روزگار شہر میں عزت و وقار اور کیا چاہئے انہیں۔“

”اس کا مطلب ہے کہ ان کی جو غربت تھی وہ دور ہو چکی ہے۔ اب کم از کم ان کا اسٹیٹس تو ہے۔“

سہلی پھر لگا ہوں سے منیہ کی جانب دیکھتے ہوئے بولی جس پر اس نے ہنٹ سکیڑتے ہوئے کہا۔

”وہ جو مرضی کر لیں ہمارے اسٹیٹس تک نہیں پہنچ پائیں گے۔“

اس پر پاپا نے غور سے منیہ کی جانب دیکھا پھر دھیرے سے بولے۔

”بات یہ نہیں ہے بیٹا! کہ وہ ہمارے اسٹیٹس تک کبھی پہنچ بھی پائیں گے یا نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو بنایا ہے۔

بھائی کی محنت اور تربیت نے ایک مقام تک تو انہیں پہنچا دیا ہے اب ان بچوں کی اپنی محنت ہے کہ وہ کہاں تک جاتے ہیں۔ جس طرح ہمایوں نے حیران

کن انماز میں اپنے آپ کو بنایا ہے وہ بہر حال قابل رشک ہے۔ ان کے پاس سرمایہ نہیں تھا جو وہ بزنس میں نہیں آسکا۔ اگر وہ بندہ بزنس میں ہوتا بہت جلد

بڑی بڑی کامیابیوں تک چاہنے والے میرا گمان کہتا ہے۔“

اس طرح کی حسی بات کہنے پر منیہ کو جیسے چپ لگ گئی۔ اس کے پاپا کا تجزیہ اس کے دماغ میں بیٹھ گیا جو کالے نہیں نکل رہا تھا۔ وہ جس

قدر ہمایوں کو اپنے ذہن سے نکالنا چاہتی تھی اسی قدر وہ اس کے سامنے کھڑا تک آ میرا گمان سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا وہ چہرہ جو اس نے کبھی

اس کے گال پر مارا تھا اس کی سنسنہا بہت اسے اپنے چہرے پر محسوس ہوتی تھی۔

اگلے دن کی شام ہی تھی جب وہ لان کے ایک کونے میں بیٹھی یونہی خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ اسکے دماغ میں کچھ دیر اگر تیر رہتا تو اس سے زیادہ وقت ہمایوں قبضہ جمائے رکھتا۔ جب وہ بے بس ہوتی تو جھنجھلا کر رہ جاتی۔ اسے احساس تھا کہ اگر ایسا ہی رہا تو وہ بلاشبہ پاگل ہو جائے گی۔

”کیا سوچ رہی ہو مفید۔۔۔؟“

سُلٹی نے اس کے قریب آ کر کہا تو وہ اپنے خیالوں سے نکل آئی۔

”کچھ نہیں۔۔۔“ اس نے تھکی سے جواب دیا۔

”تم مانویا نہ مانو۔ یہ جو تمہارا فضول سوچنا ہے، تمہیں پاگل کر دے گا۔“ سُلٹی نے دھیرے سے مگر غلوس سے کہا۔

”اچھا ہے پاگل ہو جاؤں۔ اس طرح کم از کم سوچنے کی اذیت سے توفیق پاؤں گی۔“ اس نے خود دکھائی کے سے انداز میں کہا۔

”نہیں امری بہن! اس قدر مایوسی اچھی نہیں ہے۔ جو ہونا تھا اسے بھول جاؤ اور۔۔۔“

”کیسے بھول جاؤں؟۔۔۔ میں بھول سکتی ہی نہیں۔ میں تو جب تک تیمور سے انتقام نہ لے لوں مجھے چین نہیں آئے گا ورنہ میں

یونہی سوچنے سوچنے پاگل ہو جاؤں گی۔ مجھے معلوم ہے میرے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے۔“ اس نے تیزی سے کہتے ہوئے سُلٹی کی جانب دیکھا اس کے انداز میں بے بسی جھلک رہی تھی۔

”کیا تم سمجھتی ہو کہ فقط سوچنے رہنے سے تم تیمور سے انتقام لے لو گی؟۔۔۔ کم از کم تلوار اٹھانے کی سکت بھی تو تم میں ہو۔ باتوں سے

میدان نہیں بیچے جاتے تمہارا سامنا ایک مضبوط مرد سے ہے۔“

”تم تاؤ نہیں کیا کروں؟“ اس نے بے بسی سے پوچھا۔

”صغیر! اصل میں تم نے سارے راستے خود ہی بند کر لیے ہیں کوئی ایک بھی راستہ کھلا نہیں چھوڑا لیکن اگر تم اب بھی مبرو تھل اور کھلے دل و

ذہن سے سوچو تو بہت کچھ ہے۔ تمہارا نہ صرف وہی وقار بحال ہو سکتا ہے بلکہ تم جو چاہو سو کر سکتی ہو۔“

”کیسے۔۔۔؟“ اس نے چوہکتے ہوئے کہا۔

”اپنے آپ پر غور کرو اپنے ارد گرد جھاگو۔ تم تو خود سے بھی غافل ہو گئی ہو۔ مظلومی کے حصار سے نکلو۔ تم نے بڑھنا تک چھوڑ دیا جس

کا لازمی نتیجہ ہے کہ تم امتحان نہیں دے پاؤ گی جو چند دنوں بعد شروع ہونے والے ہیں۔ اس امتحان کے بعد تمہارے کتنے خواب تھے تم کتنا کچھ

کرنا چاہ رہی تھیں۔ پاپا کے ساتھ بزنس میں آنا تھا تمہیں وہ سب کہاں گیا؟۔۔۔ ایک بندے کی بے وفائی نے تمہیں اس حالت تک پہنچا دیا ہے تو تم

بزنس کے بڑے بڑے مسائل کو کس طرح نبھانا پڑے گی۔“ سُلٹی نے دھیرے دھیرے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”ہاں تم ٹھیک کہتی ہو۔ اگرچہ بزنس میں جذباتی پن نہیں ہوتا لیکن انسان کو ہوش مند تو رہنا پڑتا ہے۔ تم ٹھیک کہتی ہو نہیں خود سے

غافل ہو گئی ہو۔“ اس نے گہری سوچ میں ڈوبتے ہوئے کہا۔

”پھر ایک بات اور۔۔۔“ یہ کہہ کر سُلٹی نے بڑے عطا انداز میں کہا۔ ”یہ ضروری نہیں ہوتا کہ جن سے تم محبت کرو تمہیں ان سے محبت ل

جانے ایسے لوگ بھی تو ہو سکتے ہیں جو تم سے محبت کرتے ہیں اور تم پر اپنی محبت لٹانا چاہتے ہیں۔ تم محبت پائیں سکیں تو کسی کی امیدوں کا سہارا بن جاؤ۔“

سُلی نے جس انداز سے کہا تھا ان لفظوں میں کہیں ڈور اسے ہمایوں کی ہمشیرہ دکھائی دی تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے جس کو اس نے نفرت سے ٹھکرایا تھا۔

”کیا سوچ رہی ہو۔۔۔؟“ سُلی نے پوچھا۔ تو اس نے سوچتے ہوئے خود کلاہی کے سے انداز میں بولی۔

”کچھ نہیں۔۔۔ تمہارا شکر یہ میری بہن ا!“

سُلی نے کہا اور اٹھ کھڑی وہ جلد از جلد اپنے کمرے میں موجود تمہائی کے ساتھ مل بیٹھنا چاہتی تھی۔ اس کے اندر وہ ہر اٹھ کھڑی تھی جس میں کچھ کرنے کا لزوم تھا۔۔۔

وہ رات گئے تک سوچتی رہی پھر ایک نتیجے تک آ پہنچی۔ اُسے ہر حال میں اپنے خوابوں کو پورا کرنا ہے۔ اس میں اگر ہمایوں کی محبت کو بھی اسے استعمال کرنا پڑا تو وہ کرے گی۔ پہلے تو فقط اس کا مقصد اس سلسلے کا میعار زندگی تھا جس کا خواب اس نے دیکھا تھا اب اس میں تیور سے انتظام بھی شامل ہو گیا تھا۔ سُلی نے ہمایوں کی محبت کی جانب اشارہ کر کے بہت اچھا کیا تھا وہ اس محبت کو جھٹیلنے کے طور پر استعمال کر سکتی تھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا اور مسکرا دی۔۔۔ وہ اٹھی اور اس نے حیات سے اپنی کتاب نکالی آسمان پاس کرنا اس عزم کا پہلا مرحلہ تھا۔

☆☆

میرے خواب ریزہ ریزہ

جو چلے تو جاں سے گزر گئے جسے خواہ صورت ناول کی مصنفہ ماہانگ کی ایک اور خوب صورت تخلیق۔ میرے خواب ریزہ ریزہ کہاں ہے اپنے ”حال“ سے غیر مطمئن ہونے اور ”شکر“ کی نعمت سے محروم لوگوں کی۔ جو لوگ اس نعمت سے محروم ہوتے ہیں وہ زمین سے آسمان تک پہنچ کر بھی غیر مطمئن اور محروم رہتے ہیں۔

اس ناول کا مرکزی کردار نئیب بھی ہمارے معاشرے کی ہی ایک عام لڑکی ہے جو زمین پر رہ کر ستاروں کے درمیان جھتی ہے۔ زمین سے ستاروں تک کا یہ قاصداں نے اپنے خوش رنگ خوابوں کی راہ گزر پر چل کر طے کیا تھا۔ بعض سطر منزل پر پہنچنے کے بعد شروع ہوتے ہیں اور انکشافات کا یہ سلسلہ اذیت ناک بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے رستوں کا تعین بہت پہلے کر لینا چاہیے۔

یہ ناول کتاب گھر پر دستیاب ہے، جسے رومانی معاشرتی ناول سیکشن میں پڑھا جا سکتا ہے۔

ہر آنے والے دن کے ساتھ ہمایوں کی پریشانی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ پچھلے کئی دن سے وہ جنیڈ کو فون کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اسے کوئی جواب نہیں ملا تھا۔ اب وہ کوئی عام سا بندہ تو نہیں رہا تھا کہ شہر میں گردش کرنے والی خبروں اور افواہوں کو نظر انداز کر دیتا۔ اخبار میں پڑھی خبر کے ساتھ ہی وہ اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ یہ کارروائی کن لوگوں کی ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد جنیڈ کا یوں غائب ہو جانا اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ کہیں وہ؟۔۔۔ یہ خیال آتے ہی وہ مزید آگے سوچنے کی ہمت ہی نہ کر پاتا۔ بات یہ نہیں تھی کہ اس کے کیریئر میں کہیں کوئی توڑ پھوڑ والی کیفیت پیدا ہو جانے کا امکان تھا بلکہ اسے اپنے فحش سے ایک طرح سے دلی لگاؤ ہو چکا تھا۔ وہ فحش جس نے اسے زمین پر بیٹھنے والا ایک کیڑا بننے سے بچا لیا ایک پردہ دار اور باعزت پہچان حاصل کرنے کی جانب گامزن کر دیا اس کے لیے تو وہ اپنی جان تک دینے کے لیے بھی تیار تھا اور پھر جس طرح پچھلے چند ہفتوں سے وہ اس پر احسان و در احسان کرتا چلا آ رہا تھا اس نے تو اس کی ذات کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔ اس کے لیے پریشانی فطری سی بات تھی۔ اس نے راحیلہ کو کئی بار فون کر کے جنیڈ کے بارے میں پوچھا تھا مگر اس نے بھی جنیڈ کے بارے میں لامٹی کا اظہار کیا تھا۔۔۔ آخر وہ کہاں جا سکتا ہے اس کی یہ پریشانی بہت حد تک بڑھ گئی تھی۔

اس صبح بھی وہ اپنے جیمبر جا بیٹھا لیکن اس کا سارا دھیان جنیڈ کی جانب تھا، تبھی اسکی لگاؤ اخبار پر پڑی۔ حکومت نے بعض تنظیموں پر پابندی عائد کر دی تھی اور کئی تنظیموں پر پکڑ دھکڑ اور چھاپوں کا سلسلہ بھی چلتا رہا تھا۔ بہت سارے لوگ گرفتار ہو گئے تھے۔ یہ خبر پڑ کر اسکی پریشانی مزید بڑھ گئی۔ اسے احساس ہوا کہ حالات تیزی سے بدل رہے ہیں۔ اسے اپنا کیریئر بھی داؤ پر لگتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ بات جب اسکی اپنی ذات تک آ پہنچی تو اسے کچھ بھی سمجھائی نہ دیا۔ اسکے پاس کوئی ایسا نمبر یا کوئی ایسا ڈیرہ نہیں تھا جس سے وہ کوئی معلومات کسی سے لے سکتا۔ وقتی طور پر وہ شدید حسرت کے داؤ میں آ گیا۔ اسے کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟۔۔۔ جب یہ داؤ توڑا تو اس نے سارا کام چھوڑ دیا اور راحیلہ کو فون کر دیا۔

”کیسے ہیں آپ۔۔۔؟“ راحیلہ نے عام سے انداز میں پوچھا۔

”میں ٹھیک ہوں۔ تم کہاں ہو؟“ اس نے تیزی سے جواب دیتے ہوئے سوال کر دیا۔

”میں گھر پر ہی ہوں۔“ اس نے بتایا۔

”اچھا میں آ رہا ہوں۔“

اس نے کہا اور پھر بغیر کچھ سے فون بند کر دیا۔ اگلے ہی لمحے اٹھا اور اخبار پکڑ کر اپنی کار تک چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ راحیلہ کے سامنے بیٹھا تھا۔

”میں بہت پریشان ہوں۔ آخر وہ گئے کدھر ان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں مجھے۔۔۔؟“ ہمایوں نے اجماعی پریشانی کے عالم میں کہا۔

”آپ کو تو معلوم ہے کہ وہ ہوا کی مانند آتے ہیں اور پھر اسی طرح چلے جاتے ہیں۔ میں ہمیشہ ان کا انتظار ہی کرتی رہ جاتی ہوں۔۔۔

اب آپ نے جو خبر سنائی ہے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اب میں بھی انتظار کرنا چھوڑ دوں۔“ راحیلہ نے عام سے انداز میں جواب دیا۔

”راحیلہ! وہ میرے محسن ہیں اور میں انہیں بھول نہیں سکتا۔ یہ وہ وقت تھا کہ جب میں اُن کے لیے کچھ کرتا اور مجھے کرنا بھی چاہئے لیکن میں کیا کروں! میرا اُن سے رابطہ ہی نہیں ہے۔“ ہمایوں کے لہجے میں دکھ بھرا تھا۔

”آب سوائے انتظار کے اور کیا ہو سکتا ہے۔“ راحیلہ دھیرے سے بولی۔

”اچھا! تمہارے امتحان کیسے ہوئے؟“ ہمایوں نے ایک دوسری طرح سے بات کا آغاز کیا۔

”ٹھیک ہو گئے ہیں“ نتیجے آئے گا تو پھر ذکر کری کروں گی۔“ اس نے ہمایوں کے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا جہاں پریشانی چھلک رہی تھی۔

”جنید نے کچھ تو سوچا ہوگا تمہارے بارے میں۔ انہوں نے کبھی بات کی؟“ ہمایوں نے پوچھا۔

”یہ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟“ راحیلہ نے تیزی سے سوال کیا۔

”اس لیے کہ تم نے قصداً پریشان نہیں ہونا۔ میں ہوں یہاں پر۔۔۔ جب تک اُن کا کوئی پتہ نہیں چلتا، کوئی بھی مسئلہ ہو یا کوئی پریشانی مجھے بتانا۔۔۔“ ہمایوں نے غلوں سے کہا۔

”ٹھیک ہے میں آپ ہی سے کہوں گی۔“

راحیلہ نے دھیرے سے کہا تو وہ اُٹھتے ہوئے بولا۔

”آب مجھے اجازت۔ میں چلتا ہوں۔“

”کم از کم چائے تو پیجے جائیں۔ ابھی تو آئے ہیں آپ۔“ راحیلہ نے بھی اُٹھتے ہوئے کہا۔

”نہیں! پھر کسی وقت سہی۔ دراصل مجھے اس وقت تک چین نہیں آئے گا جب تک میں اُن کے بارے میں معلوم نہ کر لوں! مجھے بہت لگ رہے۔“

یہ کہتے ہوئے وہ باہر کی جانب چل دیا راحیلہ! اسے جانتا ہوا دیکھتی رہی۔

☆☆

”جنید! مجھے سمجھ نہیں آئی یہ بات کہ آپ اس سے بھی کیوں خود کو چھپا رہے ہیں۔“ راحیلہ نے بیڈ پر پڑے جنید کی جانب گہری لگا ہوں سے دیکھتے ہوئے اُلجھے لہجے میں کہا۔

”تم بیٹھو میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔“

اُس نے ٹی وی کا والیم کم کرتے ہوئے کہا۔ راحیلہ اُس کے بیڈ کے ساتھ دھری کر سی پر بیٹھ گئی تب وہ اُسکی جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

”میں ماننا ہوں کہ وہ بہت باصلاحیت، مخلص اور اچھا انسان ہے لیکن راز دہی ہوتا ہے جو اپنے تک محدود رہے۔ میں یہ بھی نہیں کہتا کہ اُسے معلوم ہو جانے کی صورت میں وہ کسی کو بتا دے گا! ایسی بات نہیں ہے لیکن ہر جانب یہی تجسس رہے کہ میں کہاں ہوں! یہی بہتر ہے۔“

”مجھے تو آپ کی بات کچھ میں نہیں آ رہی ہے۔“ اس نے پھر وضاحت طلب لگا ہوں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں زخمی ہوں سو اس وقت بے بس ہوں۔ کچھ نہیں کر سکتا۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی بھی میری بے بسی دیکھے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے راحیلہ کی جانب دیکھا اور پھر بڑے ہی عجیب سے لہجے میں بولا۔ ”یہ تم بھی جان لو جس دن اس بات کا یقین ہو گیا کہ میں اب دوسروں کے سہارے پر ہوں وہ میری زندگی کا آخری دن ہو گا۔“

”اللہ نہ کرے۔۔۔ آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں؟“ راحیلہ نے تڑپ کر کہا لیکن من میں خوشی کی لہر نے اسے سر مست کر دیا تھا کہ وہ اسے اپنا سمجھتا ہے کوئی غیر نہیں۔

”میں اس لیے ایسا سوچتا ہوں کہ حالات ایسے ہیں۔ کوئی دوسرے کا ذرا سا بوجھ نہیں اٹھا سکتا تو پھر میں کیوں کسی پر بوجھ بن جاؤں؟“ جنید نے اسے حقیقت سے آگاہ کیا۔

”لگتا ہے ان دنوں میں آپ نے خاصا اوٹ پٹا کھا سوجنا شروع کر دیا ہے۔ چھوڑیں اس موضوع ہی کو چھوڑیں۔“ اس نے اکتاتے ہوئے کہا۔

”میں تمہیں بتا نہیں سکتا۔ جس طرح کی زندگی میں بسر کر رہا ہوں اس میں۔۔۔“

جنید نے کہنا چاہا لیکن راحیلہ نے اس کی بات کا متعہ ہوئے کہا۔

”کیا ہے آپ کی زندگی کو اچھی بھلی گزر رہی ہے اور انسان نے اس دنیا سے اس وقت ہی جانا ہے جو اس کا وقت نہیں ہو چکا ہے تو پھر اس کا کیا ڈر؟۔۔۔ مجھے معلوم ہو رہا ہے کہ آپ کو خوف نے گھیر لیا ہے۔“

”نہیں ایسی بات نہیں ہے۔۔۔ میں نے زندگی کا ایک ہی پہلو دیکھا تھا لیکن اب جبکہ میں نے زندگی کا حقیقی پہلو دیکھا ہے تو وقت میری دسترس میں نہیں رہا۔ اس کا مجھے السوس ہے خوف نہیں اور کچھ پوچھ تو راحیلہ! میں نے یہ دن جو تمہارے ساتھ گزارے ہیں میری زندگی کے خوبصورت اور پیارے دن ہیں۔ مجھے محسوس ہوا ہے کہ زندگی اتنی خوبصورت بھی ہوتی ہے۔ کوئی کسی پر یوں بھی اپنا آپ وار سکتا ہے میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔۔۔ راحیلہ تمہارا اور میرا کیا ناتا ہے جو تم نے میرے لیے دن رات ایک کرو یا؟“

”میں نے کوئی احسان نہیں کیا اور اگر میں نے ایسا کیا ہے تو آپ کے لیے خود اپنے لیے کیا ہے۔ میں آپ سے محبت کرتی ہوں اور اس کے عوض میں آپ سے محبت کی طلبگار نہیں ہوں۔“ اس نے دھیرے سے کہا۔

”چند دن یہاں ٹھہرنے کے بعد میں پھر سے چلا جانا چاہتا تھا لیکن آج کی جو خبر ہے کہ حکومت نے تنظیموں پر پابندی لگا دی ہے اس سے مجھے یہاں ٹھہرنے کا اور جواز مل گیا ہے۔“

جنید نے مسکراتے ہوئے کہا تو راحیلہ نے پہلو تھپی کرتے ہوئے پوچھا۔

”لیکن بات ہو رہی تھی ہمایوں کی اس سے۔۔۔“

”ہاں وہ اب نہیں۔۔۔ میں اس سے تعلق تو زنا تو نہیں چاہتا بس چند دن اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ وہ میرا معاملہ ہے میں دیکھ لوں گا۔ تم پریشان نہیں ہونا۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے۔۔۔“

راحیلہ نے کہا اور وہاں سے اٹھنے لگی تو جنید نے کہا۔

”میرا فون تو مجھے دے دو۔۔۔“

”ابھی لاتی ہوں۔۔۔“

یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلی گئی۔۔۔ تھوڑی دیر بعد وہ فون سیٹ کے ساتھ آگئی۔ جنید نے اُسے آن کیا پھر وہ ایوں کا نمبر تلاش کر کے اُسے پیش کر دیا۔ دوسری نسل پر فون اٹھا لیا گیا۔

”کہاں ہیں آپ۔۔۔؟“ دوسری طرف سے ہمایوں نے اتنی شدت سے پوچھا کہ وہ خود بھی حیران رہ گیا۔

”میں ایک بہت ہی محفوظ جگہ پر ہوں۔۔۔ میں زخمی ہوں اس لیے باہر نہیں نکل پارہا ہوں۔“ جنید نے دھڑے سے کہا۔

”جنید ہوائی ایجنسی وقت ہے کہ ہم آپ کے کام آسکیں۔ خدا کے لیے مجھے بتائیں آپ کہاں ہیں اس میں آپ کو لے آتا ہوں۔ آپ یہاں زیادہ محفوظ رہیں گے۔“ اس نے رو ہانسو ہوتے ہوئے کہا۔

”کوئی بات نہیں میں یہاں محفوظ ہوں۔ اب میں تمہارے ساتھ رابطے میں رہوں گا۔“ اس نے اسی لہجے میں جواب دیا۔

”آپ کی مرضی ہے میں کیا کہہ سکتا ہوں لیکن یہ اچھا نہیں ہے۔“ ہمایوں نے شگوہ بھرے لہجے میں کہا۔

”تم سمجھتے نہیں ہو۔۔۔ میرے معاملات کو مجھ پر ہی چھوڑ دو اور تم کسی بھی پریشانی کے بغیر اپنا سفر جاری رکھو۔ تمہیں کہیں بھی رکاوٹ نہیں آئے گی۔ یہ جو ایک نئی لہر چل لگی ہے یہ کسی تبدیلی کا پیش خیمہ ہے۔ جہاں تک ان پابندیوں کی بات ہے یہ پابندیاں ہم جیسے لوگوں کے لیے نہیں ہوتیں۔ ہمارا کام یونہی چلتا رہتا ہے۔ جب بھی مناسب ہوا میں تم سے رابطہ کروں گا۔ تم پریشان مت ہونا۔“

یہ کہہ کر اُس نے چندا لودا فی ہاتھیں کیں اور فون رکھ دیا۔

”اب کیوں رابطہ کیا۔۔۔؟“ راحیلہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”اس لیے کہ وہ پریشان نہ ہو۔۔۔“ پھر اس کی جانب دیکھ کر بولا۔ ”دوسری سب سے اہم بات یہ ہے راحیلہ! کہ اب میں نے آگ نئی ڈنیا بنانے کے لیے اپنی راہ کا انتخاب کر لیا ہے۔“

یہ سن کر راحیلہ مسکراتی آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھتی چلی گئی۔ پھر کوئی بات کہنے بتایوں لہذا کے کمرے سے باہر نکلتی گئی جیسے اسے اپنی محبت کے اثر پذیر ہونے کا یقین ہو گیا ہو۔

☆☆

اس شام زینون بی بی ڈرانگ روم میں بڑے خوشگوار موڈ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ بہت دنوں بعد اسے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے کوئی طوفان آیا تھا اور آنے کے بعد اچانک ختم گیا ہو۔ اس شام سلٹی اور صفیہ قریب ہی کے ایک گھر میں مہندی کی تقریب میں گئی تھیں۔ اسے خوشی اس بات کی تھی کہ صفیہ نہ صرف آب معمول پر آ گئی ہے بلکہ اس کا رویہ پہلے والا نہیں رہا تھا۔ وہ اب اسے زیادہ وقت دیتی تھی اس کی باتیں سنتی اور خود کو ویسا ہی بنا کر رکھنے کی کوشش کرتی جیسا زینون بی بی چاہتی تھی۔ اسی لیے وہ اب صفیہ کے مستقبل کے بارے میں اپنے حق اندازے سے سوچنے لگی تھی۔ یہ سوچ دیکھتی تھی جیسے اس معاشرے کی عام مائیں سوچتی ہیں۔ وہ چاہ رہی تھی کہ سلٹی اور صفیہ دونوں کی شادی کر دی جائے پھر وہ اپنے بیٹے کا خر کو بیا ہے گی لیکن زینون بی بی کے سامنے یہی مسئلہ تھا کہ وہ انہیں کہاں بیا ہے؟۔۔۔ اس کی دونوں نظیروں کی سوچ میں زمین اور آسمان کا فرق تھا۔ سلٹی ایک عام سی گھریلو لڑکی تھی۔ اس کے بارے میں زینون بی بی کو پورا یقین تھا کہ جس گھر میں بھی جائے گی وہاں ایڈ جسٹ ہو جائے گی لیکن صفیہ کے معاملے میں جو خناس بھرا ہوا تھا وہ اسے ہمیشہ خوف زدہ رکھتا تھا اور اس کا نتیجہ بھی سب کے سامنے آ گیا۔ شروع ہی سے زینون بی بی کے ذہن میں یہی تھا کہ وہ اپنی دونوں نظیروں کو انور بھائی کے گھر میں بیاہ دے گی۔ اسے یہ احساس تھا کہ اس گھر میں دونوں پیش کشیں رہیں گی اسی لیے وہ اس گھر سے رابطہ رکھنا چاہتی تھی لیکن صفیہ کی نظرت اور اس کے شوہر اصغر علی کے غرور نے ایسا نہ ہونے دیا۔۔۔ ان دنوں وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرتی تھی۔ وہ جو بات کہتی تھی وہی سچ ثابت ہوتی تھی۔ اصغر علی نے بھی اب کبھی اس کی بات سے اختلاف نہیں کیا تھا۔ تقریباً دو مہینے پہلے جب وہ انور علی کے گھر ہو کر آئے تھے تب زینون بی بی نے اپنے شوہر سے بات کی تھی۔

”اگر آپ نہ ان مائیں تو میں ایک بات کہوں؟“ زینون بی بی نے ویرے سے پوچھا۔

”بولو۔۔۔ میں سن رہا ہوں۔“ اصغر علی نے اس کے لہجے سے کوئی اہم بات بھا مچتے ہوئے کہا۔

”اب جبکہ انور بھائی کے ساتھ ہمارے تعلقات اچھے ہو گئے ہیں اور ماشا اللہ ان کے بیٹوں نے کافی حد تک خود کو غربت سے نکال لیا ہے

تو کیوں نہ ہم اپنی نظیروں کے بارے میں سوچیں۔“ اس نے کافی حفاظ انداز میں اپنا مدعا بیان کیا۔

”تم ٹھیک کہتی ہو بیٹی!۔۔۔ جہاں تک سلٹی کا معاملہ ہے وہ تو ٹھیک ہے لیکن صفیہ شاید ان کے ساتھ نہ چل سکے۔ میں سمجھتا ہوں اس بات

کو۔۔۔“ اصغر علی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”ایسے میں یہ تو ممکن ہے کہ ہم فقط سلٹی کے لیے ہی بات کریں اور صفیہ کے لیے کہیں دوسری جگہ دیکھ لیں لیکن۔۔۔“ زینون بی بی نے

اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

”لیکن کیا۔۔۔؟“ اصغر علی نے پوچھا۔

”کیا ہی اچھا ہو کہ دونوں ایک ہی گھر میں چلی جائیں مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے صفیہ کو کوئی طور پر تیار کر لیں۔ آپ بھی مدد کریں

تو پھر کوئی بات آگے بڑھائیں۔“

زینون بی بی نے اصغر علی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا ”جب وہ بارے ہوئے لہجے میں بولے۔

”تم بات کر کے دیکھ لو یا پھر جیسا تم مناسب سمجھو گی مجھے منحور ہوگا۔“

اس دن کے بعد سے زینون بی بی نے صنفیہ پر بہت زیادہ توجہ دینی شروع کر دی تھی وہ بھی اپنے دل کا حال اُسے بتانے لگی۔ زینون بی بی نے یہی سمجھا کہ اب جو اس نے ایک جھکا کھایا ہے اسے خوراک کی ہے تو وہ سنبھل گئی ہے۔ پھر اُس نے سوچ لیا کہ وہ صنفیہ سے بات کرے گی کہ اس کا عندیہ کیا ہے پھر کوئی بات آگے بڑھائے گی۔

اس وقت وہ ڈرائنگ روم میں صنفیہ ہی کے انتظار میں تھی۔ ان دونوں بہنوں کو گئے ہوئے کافی وقت ہو گیا تھا۔ جب تک وہ آئیں وہ انہی کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔ سلیٹی عام لڑکیوں کی طرح خوش تھی جبکہ صنفیہ کا چہرہ ستا ہوا تھا جیسے وہ جذبات سے عاری ہو۔ زینون بی بی کے من میں ڈکھ کی ایک لہر اتر گئی۔ آخر وہ ماں تھی اپنی بیٹی کا ڈکھ برداشت نہیں کر پاتی تھی اس لیے تشویش زدہ لہجے میں پوچھا۔

”خبر یہ تو ہے بیٹی۔۔۔؟“

”میں سمجھی نہیں امی آپ کیا پوچھنا چاہ رہی ہیں؟“ صنفیہ نے جواباً پاٹ سے انداز میں پوچھا۔

”ادھر آؤ میرے پاس بیٹھو“ زینون بی بی نے پیار سے کہا تو صنفیہ اُسکے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئی جبکہ سلیٹی اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ وہ پہلے ہی صنفیہ کے روکھے پن سے استغائب ہوئی تھی۔ ”صنفیہ بیٹی! کیا بات ہے تم اس قدر رنجیدہ کیوں ہو رہی ہو۔ کیا وہاں جانا تمہیں اچھا نہیں لگا؟“

”نہیں امی وہاں سب ٹھیک تھا۔ میرا ہی دل نہیں چاہتا کہ ایسے شور شرابے میں جاؤں۔ یہ ہنگامے مجھے بالکل بھی اچھے نہیں لگتے۔“ اس نے صاف انداز میں کہہ دیا۔

”اؤ تو یہ بات ہے۔“ زینون بی بی نے ہنکارا بھرتے ہوئے کہا۔ پھر چند لمبے توقف کے بعد بولی۔ ”دیکھو بیٹی! زندگی میں اچھے نرے دن خوشیاں اور غم ڈکھ کھاتے جاتے رہتے ہیں۔ ان کے ساتھ ہی زندگی ہے لیکن اپنے اندر ایک ہی موسم کو بسائے رکھنا یہ فطرت نہیں ہے۔ جو ہونا تھا وہ ہو گیا میری بیٹی! اسے ذہن سے اتار چھینو۔ اسی زندگی پڑی ہے کیوں اپنے آپ کو گمن نگار ہی ہو؟“

”میں کیا کروں امی! میں جتنا یہ سب بھولنا چاہتی ہوں اتنا ہی مجھے یاد آتا ہے۔ مسئلہ صرف یہ ہے کہ اس نے مجھے دھوکا دیا اور اس کا اُسے کوئی بھی خیالہ بھگتتا نہیں پڑا۔“ وہ دیر سے بولی۔

”یہی بات تم خود سوچو۔ اگر تم نے دھوکا کھایا ہے تو سارا الزام اس پر نہ دھرو اس میں تم بھی شامل تھیں لیکن اب یہ ساری جمع تفریق کرنا اور پھر جزا و سزا کی بات کرنا فضول ہے۔ میں کہتی ہوں! اسے مت سوچو۔ اپنے مستقبل کے بارے میں غور کرو۔ تم نے امتحان دے لیا کچھ عرصے بعد تمہارا نتیجہ آجائے گا۔ پھر تمہارے پاس کئی راستے ہیں چاہو تو آگے تعلیم حاصل کرو یا اپنے پیارے ساتھ بزنس میں چل جاؤ جو تم ہمیشہ کہتی آئی ہو۔ بزنس ہو یا تعلیم دونوں کے لیے تمہیں اس موجودہ سوچ سے نجات لینا ہوگی ورنہ تم کچھ نہیں کر پاؤ گی۔“ اس نے بڑے پیار سے سمجھایا۔

”ٹھیک ہے میں سوچوں گی کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔“ صنفیہ دیر سے بولی۔

”بیٹی! میں ایک بات کہوں۔“ زینون بی بی نے بڑے ہی حفاظ انداز میں پوچھا۔

”جی امی!—“ وہ چمکتے ہوئے بولی۔

”بات یہ ہے کہ بیٹی جتنی مرضی لکھ پڑھ جائے۔ بزنس یا کسی بھی شعبے میں جتنی مہارت حاصل کرنے اُسے لازمی طور پر ایک دن اپنا گھر چھوڑ کر دوسرے گھر میں جانا ہوتا ہے ورنہ معاشرہ اُسے وہ مقام نہیں دیتا جس کا وہ حقیقت میں حق رکھتی ہے اور یہ معاشرہ اُسے وہ تحفظ نہیں دیتا جس کی اُسے ضرورت ہوتی ہے۔ فطری ضرورت سے زیادہ اُب یہ معاشرتی مسئلہ بن کر رہ گیا ہے اس لیے منہ تمہیں مکی مشورہ دوں گی کہ تم جو بھی کرنا چاہو کرو لیکن شادی کے بعد۔۔۔۔۔ یقین جانو تمہاری زندگی بدل کر رہ جائے گی۔“ زینون بی بی نے اُسے بڑے ہی تحمل سے سمجھایا۔

”امی آپ ہمیشہ سے یہی کہتی چلی آ رہی ہیں لیکن آپ یہ کیوں نہیں سمجھتیں کہ اس بندھن کے لیے وہ انسانوں میں جتنی ہم آہنگی ہونا بہت ضروری ہے ورنہ بعد میں تو انسان بچھڑتا ہے۔“ صفیہ نے اپنی ماں کے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”منیں تمہیں فلفلہ نہیں کہتی بلکہ تمہاری بات کسی حد تک ٹھیک ہے۔ یہ والدین کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ وہ دیکھ بھال کر طمینان کرتے ہیں تو معاملہ آگے بڑھتا ہے۔ منیا نے ہمیشہ تمہارے لیے ہمایوں کا انتخاب کیا اور تمہارے نزدیک اس کی غربت سب سے بڑی حاشی رہی ہے مگر آج وہ غریب نہیں رہا۔ جس طرح وہ آگے بڑھ رہا ہے جتنی تیزی سے اُس نے اپنا مقام بنایا ہے اُس میں مصلحتیں ہیں تو اُس نے اپنا مقام بنایا ہے اور آگے وہ بہت کچھ کر سکتا ہے۔ تم اُس کے ساتھ شادی کرو یا نہ کرو یہ ایک الگ معاملہ ہے لیکن تم اس بات سے انکار نہیں کر سکتی ہو کہ اُس نے خود کو منوالیا ہے۔۔۔۔۔ تمہیں شاید یاد ہوگا کہ ایک بار پولیس اُسے پکڑ کر لے گئی تھی تب تمہارے باپ نے صرف اپنے آپٹنس کے باعث اُسے پولیس سے چھڑوانے کے لیے انکار کر دیا تھا لیکن پھر وہ وقت بھی آیا کہ وہی ہمایوں تمہارے باپ کو پولیس حراست سے لے کر آیا۔ منیں یہ نہیں کہنا چاہتی کہ اُس وقت تمہارے باپ کا غلط فیصلہ تھا یا درست لیکن منیں تمہیں یہ باور کرانا چاہتی ہوں کہ حالات کسی وقت بھی بدل سکتے ہیں اور اس بدلنے ہوئے وقت میں اپنا ہی کام آتا ہے۔“ وہ دھیرے دھیرے اسے سمجھاتی چلی گئی تھی۔

”تو آپ کا مطلب یہ ہے کہ مجھے ہمایوں سے شادی کر لینی چاہئے۔“ صفیہ زلزلے سے لڑتے ہوئے لہجے میں خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”میرا مشورہ اور رائے یہی ہے کہ تم اور تمہارا باپ بہتر فیصلہ کر سکتے ہو۔“ زینون بی بی نے پھر حفاظ اعجاز میں بات اسی پر چھوڑ دی۔

”لیکن جس طرح اُن کے ساتھ اور خصوصاً ہمایوں کے ساتھ میرا رویہ رہا ہے۔ ایسے میں وہ مجھے تو کیا اس خاندان کو بھی قبول نہیں کریں گے۔“ صفیہ نے دھیرے سے کہا۔

”وقت اور حالات تبدیل ہو چکے ہیں۔ بہن زینب کے ذہن میں اب بھی ویسا ہی سب کچھ ہے بالکل اسی طرح جیسے منیں یہاں رہ کر سوچتی ہوں۔ اگر تم چاہو تو منیں اس بات کو چھیڑتی ہوں۔ پھر دیکھتے ہیں آگے کیا ہوتا ہے۔“ زینون بی بی نے دے دے جوش سے کہا۔

”لیکن اگر انہوں نے آپ کی سوچ کو قبول نہ کیا تو کیا جنگ نہیں ہوگی؟— بلاشبہ وہ اپنا بدلہ لینے کی کوشش کریں گے۔“ صفیہ نے اپنی ماں سے ایک نئے پہلو کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”یہ فقط تمہاری سوچ ہے تمہارے اندر کا خوف ہے۔ اگر میں نے ایسا محسوس کیا تو میری بیٹی اتم مجھے سب سے زیادہ عزیز ہو۔ پھر تم جو کہو گی میں ویسا ہی کروں گی۔“

زینون بی بی نے حسی سے انداز میں کہا تو منیہ نے چند لمحوں توقف کے بعد کہہ دیا۔

”جیسے آپ کی مرضی۔ میں آپ کے کسی بھی فیصلے سے اختلاف نہیں کروں گی۔“

اس نے کہا تو زینون بی بی کے چہرے پر خوشی پھیل گئی جبکہ منیہ اپنے طور پر بہت کچھ سوچ چکی تھی مگر ویسا نہیں جیسا زینون بی بی چاہتی تھی۔

۶۶۶

اس صبح راحیلہ نماز فجر ادا کر چکی تو حسب معمول کچن میں چلی گئی۔ اس نے ناشتہ بنایا اور جنید کے کمرے میں چلی گئی۔ اس دن خلاف معمول وہ ابھی تک جائے نماز بچھائے بیٹھا تھا اس کی آنکھیں بند تھیں اور جسم ساکت تھا۔ ایک لمحوں کے لیے تو وہ کانپ کر رہ گئی۔ پہلے تو وہ ہمیشہ کرسی پر یا صوفے پر بیٹھا دکھائی دیتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں قرآن پاک یا پھر کوئی حدیث مبارکہ کی کتاب ہوتی تھی مگر اس لمحہ اس کے سامنے جو جنید تھا وہ اسے کسی اور ہی دنیا کی صورت دکھائی دے رہا تھا۔ بچانے وہ اس وقت کس طرح کی کیفیت میں تھا۔ راحیلہ نے ٹرے دھیرے سے میز پر رکھی اور بے قدموں سے چلتی ہوئی اس کے پاس آ گئی۔ شاید جنید نے اس کی مہک محسوس کی تھی اس لیے آنکھیں یوں کھول دیں جیسے کوئی گیانی اپنے گیان سے باہر آتا ہے۔ اس نے ذرا سا رخ پھیر کر راحیلہ کی جانب دیکھا تو وہ لرزتے ہوئے لہجے میں بولی۔

”آج آپ بہت اچھے لگ رہے ہو۔“

راحیلہ نے یوں کہا تھا جیسے وہ محض بات کرنا چاہ رہی ہو۔ اس پر جنید نے ہنسنے سے انکار کیا۔

”ہاں۔۔۔ میں خود بھی محسوس کر رہا ہوں کہ اب مجھے اچھا لگنا چاہئے۔“

”ہائیں یہ کیا بات کی آپ نے۔۔۔؟“ وہ حیرت سے بولی۔

”راحیلہ! بہت غور و فکر کرنے کے بعد آج میں نے ایک فیصلہ کیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ فیصلہ مجھے کر لینا چاہئے۔“ جنید نے کھوئے لہجے میں کہا۔

”کیسا فیصلہ۔۔۔؟“

راحیلہ نے پوچھا تو جنید نے غمور سے لہجے میں یوں بولنا شروع کیا جیسے اس کے لفظ لفظ میں اعتماد و اتر آیا ہو۔

”انسان اپنی زندگی میں بچانے کتنے فیصلے کرتا ہے ان میں کچھ غور سے ہوتے ہیں اور کچھ غلط بھی ہو جاتے ہیں۔ دراصل یہ انسان کا اپنے ماحول کے ساتھ بھگوت ہوتا ہے۔ انسان جو سوچتا ہے کبھی اسے معاشرہ قبول کرتا ہے اور کبھی نہیں کرتا۔ یہ ایک فرد کی سوچ ہوتی ہے جو کسی نہ کسی نتیجے پر پہنچ کر فیصلے کی صورت اختیار کرتی ہے۔ یوں فیصلے بھی کبھی قبول ہو جاتے ہیں اور کبھی قبول نہیں ہوتے لیکن۔۔۔ لیکن انسان کو سکون کہاں ملتا ہے

اس کے سن میں اطمینان کیسے اُترتا ہے؟ جب فیصلے ہمارے اپنے ہیں ہم اپنے اندر سے کرتے ہیں جن کی بنیاد میں ہماری خواہشیں امیدیں اور خواب ہوتے ہیں تو پھر ہم کیوں نہ یہ سوچیں کہ خراب کیا جاتے ہیں؟“

”— آپ کیا سوچ رہے ہیں؟“ وہ حیرت زدہ سی بولی۔

”میں بالکل ٹھیک سوچ رہا ہوں راجیلہ! انسان کے لیے یہ بڑا مشکل مرحلہ ہوتا ہے جب اسے اپنے نظریات پر نظر ثانی کرنا پڑتی ہے۔ میں نے ان دنوں میں بہت سوچا ہے، کیونکہ میرے پاس سوائے سوچے رہنے کے اور کوئی دوسرا کام ہی نہیں تھا— ایسا اس لیے نہیں ہوا کہ میں زخمی ہو کر بے بسی کی حالت میں بستر پر آن پڑا ہوں ایسا تو پہلے کئی بار ہو چکا ہے مگر اب شاید وہ وقت آ گیا ہے کہ جب میں سوچوں کسی بھی جذبے کے بغیر فقط حقیقت کی دنیا میں رہتے ہوئے۔۔۔ میں بار بار موت کے منہ سے نکلا ہوں۔ گولیاں لگیں زخمی ہوا، حوالات میں بے اعتناء تشدد برداشت کیا۔ تب مجھے اپنے نظریات پر نظر ثانی کی خواہش کبھی پیدا نہیں ہوئی۔“

”ایسا کیوں نہیں ہوا تھا؟“ وہ دیر سے سے بولی۔

”اس لیے کہ تب میرے سن میں محبت نہیں جاگی تھی۔ میں اب تک عقیدت میں سب کچھ کرتا چلا جا رہا تھا اس میں عشق نہیں اُترا تھا— ہمارے مقصد کی بنیاد کیا ہے، حقیقی عشق کیا ہے؟ یہ درست ہے کہ ایک مسلمان کی ایمانی غیرت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اسلامی نظریات پر آٹھ نہ آنے دے لیکن کیا یہ میرا حق نہیں کہ میں یہ سوچوں کہ جس راستے پر میں جا رہا ہوں وہ درست ہے؟ وقت اور حالات کا تقاضا کیا ہے؟ ایسا تو نہیں کہ ہم زبردستی ایسے راستے پر ڈھکیل دیئے گئے ہوں جو سیدھا نہیں ہے۔ وہ راستہ جو نبی رحمت نے ہمیں دکھایا، خود چلے اور ہمیں اس پر چلنے کی تہقین کی۔ خاتم المرسل کو خود رحمت العالمین ہیں۔ جب عشق رسولِ مومن میں اُترتا ہے تو پھر نظریہ جنگ بھی تبدیل ہو جاتا ہے۔ جب جنگ نہیں کی جاتی بلکہ فتنہ دور کرنے کے لیے جہاد کیا جاتا ہے۔ اصل مقصد اللہ کی شکرانی اس زمین پر نافذ کرنا ہے۔ میرا نہیں خیال کہ سن میں عشق رسول بھی ہو اور دنیا پر اللہ کی شکرانی نہ ہو پائے۔“

”یہ کیا سوچ رہے ہیں آپ—؟“ راجیلہ نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔

”میں ٹھیک سوچ رہا ہوں— کتو اس وقت اٹھائی جاتی ہے جب تشنگی کا امکان نہ رہے اور فتنہ سرچھڑ جائے۔ جس معاشرے کا میں فرد ہوں میرے اس میں کیا فرمائشیں ہیں اور اس سے بھی پہلے ہمیں سوچنا ہے کہ وہ کون سے امکانات ہیں جن سے فتنہ دور کیا جاسکتا ہے۔ ذور جدید میں بہت سارے کاڈ مکمل گئے ہیں۔ کیا ہم صحیح اسلامی پیغام عوام تک پہنچا پائے ہیں یا محض ہم فضیلت پرستی تک محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔ کیا فرد اور اجتماعیت کی ذمہ داریاں الگ الگ کر سکے ہیں؟ پہلے خود کو مضبوط کرتے ہیں۔ ہمارے معاشرے کے اندر کا وہ طبقہ جو غربت عوام کو لوٹ رہا ہے ان پر ظلم کر رہا ہے ہمارے وسائل پر قابض ہے، ان کے خلاف علم بغاوت نہیں اعلان جہاد کیوں نہیں کیا جاتا، کیا جہاد کے لیے قربانیاں دینا ایک مخصوص طبقے ہی سے ہے، کیا پھر پلٹ کر ان کے خاندان کی نگہداشت کرنے والا کوئی ہے؟ ان کی بیٹیوں، بچہ اؤں کا آسرا کون ہوگا؟ ہمارے اپنے ہی معاشرے کی اجتماعی سوچ کس سمت میں جا رہی ہے۔ ہمیں اندر سے مضبوط ہونا ہے۔ خیر۔۔۔“ وہ یہ کہہ کر ایک لمحے کے لیے زکا اس نے طویل

سائنس لی اور پھر حتیٰ سے لہجے میں بولا۔ "اے چھوڑو یہ میرے من کے معاملات ہیں۔ میں نے آج ایک فیصلہ کیا ہے۔"

"کیسا فیصلہ۔۔۔؟"

راحیلہ پوری جان سے لرزے ہوئے بولی کہ نجانے وہ کیا بات کہوے۔ وہ چند لمحے اس کے چہرے پر دیکھتا رہا پھر دھیرے سے بولا۔

"میں تمہارے ساتھ نکاح کرنا چاہتا ہوں۔"

"نکاح۔۔۔؟" راحیلہ کی آواز میں سرسراہٹ سی تھی۔

"ہاں نکاح۔۔۔ کیونکہ اگر ہمیں ایک چھت تلے رہنا ہے تو ایسا لازمی ہے۔" وہ بولا۔ اگرچہ یہ ایک سوہوم سی دلیل تھی لیکن اصل بات کیا تھی وہ دونوں اچھی طرح سمجھتے تھے۔

"کیا لفظ اس لیے کہ ایک چھت تلے رہنا ہے؟" راحیلہ نے احتجاجی جھنس سے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ بلکہ اس لیے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ اس کی جانب دیکھتا رہا۔ راحیلہ کچھ بھی نہ بولی تو اس نے کہا۔

"کسی کو پر کھنے بغیر یقین کر لینا اور کسی کو پرکھ کر یقین کر لینے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ تم نے بتاؤ کہ تم پر کھنے پر اکتا کیا اور میں نے تمہیں پرکھ

کر۔۔۔ اس سے زیادہ میرے پاس کہنے کے لیے کوئی لفظ نہیں ہے۔ تم بتاؤ کیا میں تمہیں قبول ہوں؟"

جنید نے کہا تو راحیلہ کے چہرے پر حیرت، خوشی اور بے یقینی کے ملے جلے جذبات پھیل گئے۔ کتنے ہی لمحے یونہی بیت گئے تب وہ خواب آگئیں لہجے میں بولی۔

"میں نے تو آپ کو بھاننے کب سے اپنا مان لیا ہے۔ میں آپ کی مرضی میں خوش ہوں۔"

"لفظ میری مرضی نہیں تمہاری رضا بھی ضروری ہے؟" وہ بڑے ہی اکتاد سے بولا۔

"جی۔۔۔ میں راضی ہوں۔" اس نے دھیرے سے ہلکی جھکاتے ہوئے کہا۔

"تو ٹھیک ہے۔۔۔ آج شام تیار رہنا میں اس کا بندوبست کرتا ہوں۔"

جنید نے کہا اور اٹھ گیا۔ راحیلہ کے من میں خوشیاں جگمگا اٹھی تھیں ان لمحات کے تصور ہی سے وہ مٹلاؤں میں اڑنے لگی جہاں اپنے وجود کا احساس ہی نہیں رہتا۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ منزل اس قدر جلدی اس کے پاس خود چل کر آ جائے گی۔

سہ پہر تک گھر میں خوب رونق ہو گئی تھی۔ نسرین جو زف پہنچ گئی رضیہ نے لیکن سنبھال لیا۔ اس دن راحیلہ کی ماں کے چہرے پر پہلی بار رونق آئی تھی ورنہ پہلے تو وہ یوں اس گھر میں رہتی تھی جیسے قید کاٹ رہی ہو۔ جنید اپنے بیروں پر چل کر ڈرائنگ روم میں آ بیٹھا تھا جبکہ راحیلہ اپنے کمرے میں تھی وہ اس کا سامنا ہی نہیں کر پار ہی تھی۔ وہ اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ نسرین جو زف کمرے میں آئی اس کے ہاتھ میں چند بڑے بڑے شاہک بیک تھے۔

عشق تو ہے عشق بتا

”راحیلہ! تم ابھی تک ایسے ہی بیٹھی ہو؟“

”تو پھر اور کیا کروں؟“ اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”ڈرامنگ روم میں ہمایوں صاحب اور ان کے ساتھ دو بندے آگئے ہیں رضیہ کا خاوند بھی ہے۔ اب بس تمہارا انتظار ہے۔ تم جلدی سے

تیار ہو جاؤ۔ یہ شاپنگ بیگ تمہارے لیے ہمایوں صاحب لے کر آئے ہیں۔“

”نسرین! منٹا ان مردوں میں نہیں جاسکوں گی۔“ راحیلہ نے تیزی سے کہا۔

”نہ سہی لیکن تم تیار تو ہو جاؤ۔“ وہ تیزی سے بولی۔

”منٹا تیار ہو جاتی ہوں مگر وہاں نہیں پلیز۔۔۔!“

وہ گھبرائے ہوئے انداز میں بولی تو نسرین چند لمحوں کے بعد اسی دیکھتی رہی پھر پلٹ گئی۔ تھوڑی دیر بعد جب راحیلہ وہ شاپنگ بیگ میں آئی

ہوئی چیزیں دیکھ چکی تھی اور دانے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور اس کے ساتھ نسرین امداد آ گئی۔

”کناخ خواں کے ساتھ ہمایوں صاحب آئے ہیں۔۔۔“ وہ اسے تیزی سے بتا کر باہر کی جانب دیکھ کر بولی۔ ”آ جائیں۔“

آواز سنتے ہی ہمایوں کناخ خواں اور ایک مرد امداد داخل ہوئے انہوں نے دستخط کر دئے۔ ایجاب و قبول کے لیے پوچھا اور واپس چلے

گئے۔ مغرب کے بعد تک نسرین اور رضیہ نے جی بھر کے راحیلہ کو جایا ستوارا۔ وہ ڈھن بنی بہت سی خوبصورت لگ رہی تھی۔ وہ تیار ہو چکی تھی کہ

اس کی ماں کمرے میں آئی اور کتنی ہی دیر تک اس کے سامنے بیٹھی اسے یوں دیکھتی رہی جیسے اپنے ذہن میں کھلی آنکھوں سے دیکھے گئے خواب ڈہرا

رہی ہو۔ کافی دیر تک بونہی دیکھتے رہنے کے بعد راحیلہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

”جینتی رہو بیٹی! سدا سہمی رہو۔“

اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ راحیلہ اپنی ماں کے گلے لگ کر رونے لگی یہاں تک کہ اس کی نگلی بندھ گئی۔ جب وہ خوب جی بھر کے رو

چکی تو اس کی ماں نے خود سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

”بیٹی! مجھے تم پر فخر ہے کہ تم نے میرا مان رکھا۔ یہاں آ کر میں خوش نہیں تھی لیکن منٹا آ گئی منٹس تمہاری مجبوریاں بھگتی ہوں۔ یہ تمہاری

نہیں میری مجبوریاں ہیں۔ میرے پاس غربت کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔۔۔ خیر۔۔۔ اب جنید جیسا بھی ہے جو بھی ہے تمہارا اجاڑی خدا ہے۔ آج

سے پہلے تک منٹس اس کے بارے میں اچھا نہیں سوچتی تھی لیکن اس نے میری سوچ بدل دی۔ تم بیٹی! اپنی ہر سانس اس کے نام کرو یا۔ یہی عزت والی

بیٹیوں کی شان ہوتی ہے۔ اللہ تمہیں آہاد رکھے۔“

”امی۔۔۔!“

یہ کہہ کر وہ دوبارہ اپنی ماں کے گلے لگ گئی۔ وہ چند لمحوں کے بعد اسی دیکھتی رہی پھر اسے الگ کرتے ہوئے بولی۔

”بس بیٹی! بس۔۔۔ تم اپنی جی زندگی کی شروعات کرو اللہ تمہارا نگہبان رہے۔“

”آؤ اب تمہیں رخصت کریں۔۔۔“

رضیہ نے اس کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ حیران رہ گئی پھر نسرین کی جانب دیکھا تو اس نے بھی اشارے سے عندیہ دے دیا۔ وہ دونوں اسے چنید کے کمرے میں لے گئیں جہاں اک نیا سا کمرہ تھا۔ پورا کمرہ پھولوں سے بھرا ہوا تھا۔ سچی ہوئی سچ نے اسے خوشگوار حیرت میں مبتلا کر دیا۔ خوشبوؤں میں بے کمرے میں وہ داخل ہوئی تو اس کی رُوح تک سرشار تھی۔

☆☆

ہا یوں اس شام بہت مضطرب تھا۔ وہ اس طرح کی ابھی ہوئی سوچوں میں گھرا ہوا تھا جن کا نہ کوئی سراؤ کھائی دیتا تھا اور نہ ہی ان کی سمجھ آ رہی تھی۔ کسی بھی ایک سوچ کو اگر وہ تمام لیتا تو ذرا سا آگے جا کر ایک نئی سوچ اس کا ہاتھ تمام لیتی۔ اسے احساس تو تھا کہ وہ کبھی نہ کبھی ایسے مقام پر آکر آہوگا جب اسے یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ صفیہ کے بارے میں اس کا رویہ کیا ہوگا؟ اور یہ احساس اس دن شدت اختیار کر گیا تھا جب وہ اپنے چاچا کو پولیس اسٹیشن سے لے کر آیا تھا۔ اتنی چھوٹی سی بات تو ہر بندہ سمجھ سکتا ہے کہ جب کوئی احسان مند ہو جائے اور دوسرے کو خود سے ہماری محسوس کرے تو اس کا جھکاؤ اسی جانب ہو جاتا ہے۔ وہ بھی سمجھتا تھا حالات بالکل بدل کر رہ گئے تھے۔ اب تو اس کے اپنے گھر والوں کا رویہ یہ بھی بڑی حد تک صفیہ اور اس کے گھر والوں کے بارے میں نرم تھا۔ زینون بی بی تیسرے چوتھے دن ان کے گھر کا پھر ضرور لگائی تھی ڈپے دبے انداز میں صفیہ کے متعلق باتیں بھی ہونا شروع ہو گئی تھیں لیکن وہ خود مطمئن نہیں تھا۔ وہ کوئی فیصلہ ہی نہیں کر پا رہا تھا کہ آخروہ کیا چاہتا ہے؟۔۔۔ اس کے سامنے وہ طرح کی باتیں تھیں۔ کیا وہ صفیہ سے اب بھی عشق کرتا ہے؟ اسے چاہتا ہے اور اسے حاصل کرنے کی وہی خواہش رکھتا ہے یا پھر اس کی اپنی ترجیحات بدل چکی ہیں۔ غربت کے اس دور میں اس کا اپنا ڈن! اتنا وسیع نہیں تھا جتنا اب تھا۔ وہ کسی بھی خاندان سے اپنا نام جوڑنے کے بارے میں سوچ سکتا تھا جسے وہ اپنی دسوس میں سمجھتا۔ دولت اب اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں رہی تھی۔ دوسری بات اس کے سامنے یہ تھی کہ اگر فقط صفیہ کا حصول ہی مقصد تھا تو پھر اتنی محنت اور ریاضت اسی کے لیے تھی؟ وہ اگر محبت نہیں کر سکتی تو اس کا یہ حق کیوں نہیں مانا جاتا۔ وہ کسی سے زبردستی محبت تو نہیں کروا سکتا یہ تو من کی بات ہوتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اب تک کی محنت اور ریاضت اسی کی وجہ سے کی گئی ہے تو اب حاصل بھی کر لینا چاہئے کیونکہ صفیہ کے حصول کی خواہش ہی اسے یہاں تک لے کر آئی تھی چاہے اس خواہش میں انتقامی جذبہ ہی کارفرما تھا۔ وہ جیسے ہی اس طرح کے فیصلے کے قریب پہنچتا تھا اسے یہ سارا کھیل ہی مضحکہ خیز لگتا کیونکہ اگر صفیہ ہی کو جھکانا مقصد تھا تو وہ جھک چکی تھی۔ پچھلے چند دنوں سے فون پر کائی باتیں ہو چکی تھیں۔ ان باتوں میں صفیہ کی یہ خواہش بھی شامل تھی کہ وہ اس سے ملنا چاہتی ہے بہت ساری باتیں کرنا چاہتی ہیں۔ وہ لڑکی جو کبھی اس سے بات تک کرنا گوارا نہیں کرتی تھی اب خود ملنا چاہتی ہے۔ اس کا مقصد تو پورا ہو چکا تھا۔ اب اس کا انتظار کیوں؟۔۔۔ کیوں ہار بار اس کا خیال آتا ہے کیوں ہر فون کال کے بعد اس کا دل جھک اٹھتا ہے کیوں اس کی یاد ہار بار آتی ہے؟ وہ اسی اضطراب میں تھا اور کوئی بھی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ اسی وجہ سے وہ ملنے کے لیے صفیہ کو وقت نہیں دے رہا تھا کیونکہ وہ خود اندر سے مطمئن نہیں تھا۔

اس شام بھی وہ اس لیے مضطرب ہو گیا تھا کہ دوپہر کے بعد صفیہ کا فون آیا تھا۔ کچھ دیر کی باتوں کے بعد اس نے ملنے کی خواہش ظاہر کی

تمہی اور وہ حسب معمول مصروفیت کا بہانہ کر کے نال میا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کرے؟ پھر اچانک اسے یوں لگا جیسے وہ اس مسئلے کو حل کرنے لگا۔ اس نے فون اٹھایا اور جنید کے نمبر ملا دیئے۔

”کیسے یاد آگئی ہماری ہمایوں صاحبہ؟“ جنید نے تمہیدی باتوں کے بعد خوشگوار لہجے میں پوچھا۔
 ”جب بھی کوئی اُلجھن ہوتی ہے نا تو میں آپ ہی کو یاد کرتا ہوں۔“ ہمایوں نے انتہائی سنجیدگی میں دہیرے سے کہا۔
 ”مطلب کوئی اُلجھن ہے۔۔۔“

جنید ہنستے ہوئے بولا تو ہمایوں نے دہیرے دہیرے ذہن میں آنے والی سوچیں کہہ دیں آخر میں بولا۔

”مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہی ہے کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے؟“

”میرے خیال میں تو یہ بات کوئی اتنی زیادہ اُلجھن والی نہیں ہے اور فرض کیا اگر اُلجھن والی ہے بھی تو اسے کوئی دوسرا نہیں سمجھا سکتا۔ ایسا نہیں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اس کا فیصلہ تم نے خود کرنا ہے۔“ جنید نے سنجیدگی سے کہا۔

”وہی تو۔۔۔ میں سوچ سوچ کر تھک چکا ہوں۔ میں جس قدر سوچتا ہوں اس قدر ہی اُلجھ جاتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان سوچوں سے۔۔۔“

”ختم نہیں۔۔۔ میری جان! کوئی دوسرا جب تمہیں کوئی راہ دکھائے گا تو پھر وہ فیصلہ تمہارا اپنا نہیں رہے گا۔ چاہے جتنا بھی غلطی بھرا مشورہ ہو وہ ایک راہ کا تعین کرے گا۔ صفیہ والا معاملہ تمہارا اپنا ہے یہ تو من سے کیا جانے والا فیصلہ ہے۔ سوچو ایک ایک بات پر سوچو۔ اس میں جتنا مرضی وقت لگ جائے لیکن جب کوئی فیصلہ کر لو تو پھر پورے دل سے اس پر عمل کرنا۔ اس طرح تم کبھی خود سے شرمندہ نہیں ہو گے۔“ جنید نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں مجھے ایسے ہی کرنا چاہئے لیکن وہ وقت جو مجھے سوچنے کے لیے چاہئے اس میں سکون ہوگا تب نا!۔۔۔ وہ ہر فون کال میں ملاقات کی خواہش کرتی ہے ایسے میں۔۔۔“

”یار! تم سمجھتے کیوں نہیں ہو اور پھر تم کیسے سیاستدان ہو تمہیں ہر بات سمجھانے کی ضرورت ہے۔ میرے بھائی اگر وہ تم سے ملاقات کی خواہش ہے تو اچھی بات ہے۔ ایک اچھے سیاستدان کی مانند اپنی رائے یا فیصلہ نہ دو بلکہ اس کا رویہ جانچو کہ تمہیں کیا تاثر دینا چاہتی ہے۔۔۔ دو باتوں میں سے ایک بات ہوتی ہے یا تو وہ تمہارے قریب ہونے کی کوشش کرے گی یا پھر وہ تم سے درخواست کرے گی کہ تم اس کی دنیا میں سے نکل جاؤ۔۔۔ اس وقت وہ مجبوری کی حالت میں ہے۔ مجبور چاہے کوئی عورت ہو یا پھر تو مزہ اپنا فیصلہ نہیں دے سکتی۔“ جنید نے اسے تفصیل سے سمجھانے کی کوشش کی۔

”مجھے ڈر اس بات کا نہیں ہے کہ وہ میری دنیا سے چلے جانے والی کوئی بات کرے گی بلکہ میں اس وجہ سے پریشان ہوں کہ وہ میری زندگی میں آنے کی بات نہ کرے۔ میں یہ بات اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ اس کے پاس میرے علاوہ اب کوئی آپشن نہیں ہے اور۔۔۔“

”فطرتی ہے تمہاری۔ اُس کے پاس بہت آپشن ہیں۔ وہ کیا ہو سکتا ہے میں اس کے بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کیونکہ جو زخمی ہوتا ہے اُس کا انتقام کے جذبہ بہت بڑھ جاتا ہے۔ وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔“

”آپ کا مطلب یہ ہے کہ میں ابھی اُسے دیکھوں پرکھوں اور جانوں کہ وہ کیا چاہتی ہے؟“ ہمایوں سوچتے ہوئے بولا۔

”میرا خیال تو یہی ہے۔۔۔ میں نہیں سمجھتا کہ ان حالات میں بلکہ مجبوری والے حالات میں اُس کے سن میں تمہارے لیے محبت پھوٹ پڑی ہو۔ محبت کے ظہور کے لیے ماحول میں کشاف نہیں ہوتی۔“ جنید نے آہستہ سے کہا۔

”چلیں ٹھیک ہے میں دیکھتا ہوں کہ وہ کیا چاہتی ہے۔“ وہ حسی سے لہجے میں بولا۔

”بالکل۔۔۔ اس طرح تمہیں کوئی بھی فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی اور ویسے بھی ابھی حالات نے کوئی ایسی واضح صورت اختیار نہیں کی ہے جس پر تم کوئی حسی بات کہہ سکو۔ ابھی تو سب کچھ حسد میں ہے ایسے میں اگر تم کوئی فیصلہ کرو گے تو وہ قبل از وقت ہوگا۔“ اُس نے اپنی رائے دے دی۔

”اوکے۔۔۔ میں اُسے ملاقات کا وقت دیتا ہوں۔ پھر دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔“

اس نے جیسے ایک فیصلہ کر لیا۔ پھر چند اوردامی باتوں کے بعد رابطہ منقطع کر دیا۔۔۔

چھبیسے بات کر کے ہمایوں ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔ وہ غبار جو اس کے دماغ میں اٹھا ہوا تھا دھیرے دھیرے بیٹھ چکا تھا۔ یوں سحر کانی حد تک واضح ہو جانے کے بعد وہ مطمئن ہو گیا۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ جب انسان ایک جانب سے مطمئن ہو جائے تو آگ دوسرا پہلو اس کے سامنے واضح ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اسے جنید بہت ہی پرسکون محسوس ہوا تھا۔ اس کی پرسوجی گفتگو، ظہر اہوا انداز اور نرم لہجہ دیکھ کر کوئی بندہ بھی یہ محسوس نہیں کر سکتا تھا کہ وہ کبھی تاریک راہوں کا راسی ہو سکتا ہے۔ اس نے سوچا کہ یہ حالات ہی ہیں جو انسان کو بدل کر رکھ دیتے ہیں اگر وہ زخمی نہ ہوا ہوتا تو شاید وہ راحیلہ کے اتنے قریب نہ ہوتا۔ ممکن ہے پہلے اُسے راحیلہ میں وہ سب کچھ دکھائی نہ دیا ہو جو اس کی قربت نے اُس پر واضح کر دیا۔ یوں جنید بڑے سکون سے ایک فیصلے تک پہنچ گیا اور اُس نے راحیلہ سے شادی کر لی۔ ممکن ہے اس کے ساتھ بھی ایسا ہو جیسا کہ حالات بتا رہے ہیں صفیہ خود اس سے ملنا چاہتی تھی۔ صفیہ نے حالات تجزیہ کیا تو سوائے اس کے کوئی بھی دکھائی نہ دیا ہو۔ وقت کی ٹھوکر انسان کو بہت کچھ سکھا جاتی ہے۔ اس طرح خود بھی اپنے حالات کو دیکھتے ہوئے وہ اپنے رویے میں تبدیلی پیدا کر کے اپنی اس دیرینہ خواہش کی تکمیل کر لے جس کے لیے اس نے جدوجہد کا یہ سفر طے کیا تھا اور اس مقام تک پہنچا تھا کہ جہاں نئے سفر اس کے سامنے تھے اور واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اہم بات یہی تھی کہ اس کی قربت میں تمہوڑا وقت گزارا جائے۔ پھر صورت حال کیا بنتی ہے اس کے مطابق فیصلہ کر لیا جائے۔ اس نے سوچا اور ایک طویل سانس لی پھر سامنے میو پر پڑا ہوا اسل فون اٹھایا اور صفیہ کے نمبر ڈائل کر دیئے۔

☆☆

صنید جہاں اس بات پر خوش تھی کہ ہمایوں نے خود فون کر کے اسے بلایا ہے وہاں وہ حیران بھی تھی کہ اس نے بات کرتے وقت ایک شرط بھی عائد کر دی تھی۔ ہمایوں نے اسے شہر کے سب سے مہنگے ہوٹل میں بلایا تھا لیکن ساتھ میں یہ بھی کہا تھا کہ وہ جب بھی آئے پہلے اپنی والدہ زیتون بی بی سے اجازت لے اور اسے بتا کر آئے۔ سب کچھ طے کرنے کے بعد وہ اس وقت کا انتظار کرنے لگی جب اس نے ہمایوں سے ملنا تھا اور پھر وہ شام آگئی۔ وہ تیار ہو کر ہوٹل کے استقبال پر پہنچی۔ جہاں اس نے اپنا نام بتا کر ہمایوں سے ملنے کے بارے میں کہا تو ایک خوش شکل خاتون میزبان نے جیسی ہی مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کیا اور اسے ساتھ لیتے ہوئے چل دی۔ لٹ کے ذریعے وہ سوئیٹ تک پہنچیں جو بہر حال صنید نے پہلی بار دیکھا تھا۔

”خوش آمدید صنید۔!“

ہمایوں نے صوفے سے اٹھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ نروس ہی صنید اس کی جانب دیکھتی رہی پھر وجرے سے سلام کیا ہمایوں نے جواب دیتے ہوئے سامنے صوفے کی جانب بیٹھنے کا اشارہ کیا تب تک وہ میزبان لڑکی پلٹ کر اس جگہ چلی گئی جہاں مختلف مشروب چڑے ہوئے تھے۔ دونوں کے درمیان خاموشی تھی۔ جب وہ میزبان لڑکی ان کے سامنے مختلف مشروب رکھ کر چلی گئی تو ہمایوں نے یہ کب کہہ کر خاموشی توڑی۔

”لیجئے۔“

صنید ابھی تک اس ماحول کے زیر اثر تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے کزن ہمایوں سے نہیں کسی انجینی امیر زادے سے ملنے کے لیے آئی ہے۔ اس نے ہمایوں کی طرف دیکھا جو چہرے پر مسکراہٹ سجائے اس کی جانب مسلسل دیکھ رہا تھا۔ اس پر وہ مزید نروس ہونے لگی۔ اسے کچھ نہ سوچا تو بولی۔

”یہ اتنا مہنگا۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ محض باتیں کرنے کے لیے آپ نے اس قدر اہتمام کیا؟“

”کہتے ہیں کہ اچھے ماحول میں اچھی باتیں سوچتی ہیں اور میں تم سے اچھی اچھی باتیں ہی کرنا چاہتا ہوں۔“ ہمایوں کے لہجے میں بڑی حد تک خوشگواریت تھی۔

”صنید بھی خوشگوار باتیں ہی کرتا چاہوں گی لیکن یہ اچھی اچھی باتیں تو کسی اور عام ہی جگہ پر بھی ہو سکتی تھیں۔“ وہ دوسرے سے بولی۔

”صنید تم پر اپنی امارت یا دولت کا زعب نہیں جمانا چاہتا اور نہ ہی میرا مقصد تمہیں مرعوب کرنا ہے۔۔۔ دراصل میں اس ملاقات کو بہت اہم اور یادگار بنانا چاہتا ہوں اس کا نتیجہ چاہے کچھ بھی ہو۔“

ہمایوں نے گہری سنجیدگی سے کہا اور مشروب کی جانب اشارہ کیا۔ صنید نے ان مشروبات کی جانب دیکھا اور پھر ان میں سے اپنی پسند کا گلاس اٹھایا۔

”ہاں یہ بات درست ہے کہ میں اس ملاقات کو بہت یادگار بنانا ہوگا جو ظاہر ہے ملنے ملانے تک محدود نہیں ہوتی بلکہ اس میں کوئی اہم فیصلہ کیا جائے جیسی وہ یادگار بنتی ہے۔“ صنید کا اعتماد کچھ کچھ بحال ہو چلا تھا۔

”ہاں ہونا تو ایسے ہی چاہئے خیر۔۔۔ تم بتاؤ مجھ سے کیوں ملنا چاہ رہی تھیں؟“ ہایوں نے فوراً ہی مدعا پر آتے ہوئے کہا۔
”میں اپنے سابقہ رویے پر معذرت کرنا چاہتی تھی۔ وہ حالات۔۔۔“

صفیہ نے کہنا چاہا لیکن ہایوں اسے ٹوکتے ہوئے بولا۔۔۔ ”ماضی بن گئے ہیں اور میں انہیں بھول چکا ہوں۔“

”ابھی بات ہے لیکن میں نے خود کو بھی تو مطمئن کرتا ہے۔ میں ایسا اس لیے نہیں چاہ رہی ہوں کہ میرے اور آپ کے گھر والے کیا سوچ رہے ہیں۔ آئندہ وہ نہیں حالات کیا ہوں گے۔ لیکن پھر بھی۔۔۔“ وہ کہتے کہتے رک گئی۔

”میں سمجھا نہیں کہ آئندہ حالات سے تمہاری کیا مراد ہے؟“ وہ تجسس سے بولا۔

”کل کے بارے میں کس نے جانا کچھ بھی ممکن ہے۔“ وہ بات کو گول کر گئی۔

”ہاں تم ٹھیک کہتی ہو اور میرا خیال ہے کہ تم اسی تناظر میں کوئی بات کہنا چاہتی ہو۔“ ہایوں نے دھیرے سے کہا۔

”ہاں۔۔۔“ یہ کہہ کر وہ ایک لمحہ کے لیے اس کی جانب دیکھتی رہی پھر دھیرے سے بولی۔ ”ہایوں اور اصل آج تک مجھے کسی نے سمجھا ہی

نہیں۔ میں ایک عام لڑکی جیسی زندگی نہیں گزارنا چاہتی میرے اپنے خواب ہیں اور میں انہیں اپنے سامنے حقیقی صورت میں دیکھنا چاہتی ہوں جو میرا حق ہے لیکن یہ معاشرہ مجھے میرا حق کیوں نہیں دیتا؟“ آخری لفظ کہتے ہوئے وہ ذرا سی تلخ ہو گئی تھی۔

”اپنے خوابوں کے حصول کے لیے کوشش کرنا ہی تو جہدِ جہد ہے۔ ماحول معاشرہ اور حالات کے ساتھ ہی تو نبرد آزما ہونا چاہتا ہے۔ اگر یہ

رکاوٹیں نہ ہوں تو ہر بندے کے خواب، خواہشیں اور امیدیں پوری ہو جائیں اور وہ بہت آسانی محسوس کرے۔ اس راہ میں تو نجانے کتنی ٹھوکریں دھوکے اور فریب ہوتے ہیں مگر انہی راہوں میں کامیابیاں بھی ہیں۔ اب تو یہ جہدِ جہد کرنے والے کی نگاہ ہے نا کہ وہ اپنے ہاتھ میں کیا پاتا ہے؟“

”لیکن میرے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ مجھے اس راہ پر چلنے ہی نہیں دیا جا رہا۔“ وہ تیزی سے بولی۔

”کس نے روکا ہے؟“ اس نے بھی جواباً تیزی سے کہا اور پھر بولا۔ ”خیر جب انسان کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اندر سے مضبوط

ہوتا ہے نا تو وہ مقصد پالیتا ہے اور یہ بھی شرط ہے صفیہ! کہ ماحول معاشرہ اور حالات اسی وقت سازگار ہوتے ہیں جب وقت اور سمت کا تعین کر لیا جائے۔ جب ہم اس کا خیال نہیں کریں گے تو کامیابی ہاتھ میں نہیں آتی۔“ ہایوں نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر ایک گہرا سہلے کر گلاس واہنس

رکھ دیا۔

”میں آپ کی بات سے انکار نہیں کرتی اس سے پوری طرح متعلق ہوں لیکن۔۔۔“

”لیکن کیا۔۔۔؟“ وہ دھیرے سے بولا۔

”دیکھیں میں ماضی میں آپ کے ساتھ اپنا رویہ اچھا نہیں رکھ پائی ہوں اور اس وقت میں شرمندہ ہوں لیکن اگر انصاف سے دیکھا

جائے تو میں غلط نہیں تھی۔ مجھے اپنی سوچ، نیچیلے اور اختیار کا بھی تو حق ہونا چاہئے۔ اب بھی اگر مجھے میری مرضی کے بغیر دھکیلا جا رہا ہے تو پھر وقت تو میرے لیے ٹھہرا ہوا ہے؟“ اس نے کافی حد تک اعتماد سے کہا۔

”تمہارے کہنے کا مطلب کہیں یہ تو نہیں ہے کہ اب جو ہم دونوں کے والدین سوچ رہے ہیں انہیں ویسا نہیں سوچنا چاہئے؟“ ہمایوں نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”ممکن ہے ان کی سوچ دُست ہو اور یہ بھی کہ دُست نہ ہو مگر یہ ہونا اور نہ ہونا بعد کی بات ہے۔ اس سے پہلے اس بات کا تعین کر لینا چاہئے کہ جن لوگوں کے لیے وہ سوچ رہے ہیں آیا ان کے لیے سوچا بھی جائے یا کہ نہیں؟“ وہ اُس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے بولی۔

”میں تمہاری بات سمجھ گیا کہ تم کہنا کیا چاہتی ہو لیکن سوال یہ ہے کہ تم ایسا کیوں سوچ رہی ہو؟“

اُس نے کریدنا چاہا۔ اس پر سفید بہت حد تک محتاط ہو گئی۔ اصل میں وہ ہمایوں سے یہی بات کرنا چاہ رہی تھی یہی وہ نکتہ تھا جس پر وہ اپنے تعلق کی بنیاد رکھنا چاہ رہی تھی اس لیے پہلو بدلتے ہوئے بولی۔

”دیکھیں ہمایوں! ہر انسان کی زندگی میں کچھ ترجیحات ہوتی ہیں۔ میں مانتی ہوں کہ یہ ترجیحات وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل بھی ہوتی ہیں لیکن کچھ اتنی اہم ہوتی ہیں کہ ان سے آگے دیکھا ہی نہیں جاسکتا۔ یہ ایک منزل کی مانند ہوتی ہیں جسے سر کر لینے کے بعد ہی اگلی منزل کا خیال آتا ہے۔“ سفید نے اپنا نکتہ نگاہ اس پر واضح کرتے ہوئے کہا۔

”میں سمجھا نہیں تم کیا کہنا چاہ رہی ہو؟“ ہمایوں نے اُلجھتے ہوئے کہا۔

”میں جب بھی اپنی زندگی کے بارے میں سوچتی ہوں یا اپنے مستقبل کا خیال کرتی ہوں تو میں اپنے آپ کو ایک بزنس وومن کے طور پر دیکھتی ہوں۔ یہ میرا خواب ہے اور اسے میں پورا کرنا چاہتی ہوں۔ آپ تائیں کیا ایسا خواب دیکھنا غلط ہے یا میرا حق نہیں؟“ اس نے جذباتی لہجے میں پوچھا۔

”ٹھیک ہے یہ تمہارا حق ہے۔“ اُس نے دھیرے سے کہا تا کہ وہ اپنی بات جاری رکھے۔

”اب لازمی بات ہے وہی پہلو میرے لیے ترجیح رکھتے ہیں جو میرے خواب کے لیے معاون ثابت ہوں گے۔ اب معاشرہ حالات یا پھر ماحول مجھے دوسری راہ پر تھکیل دینے کی کوشش کرے تو مجھے مزاحمت تو کرنی چاہئے نا! — اب میری اس مزاحمت کو میری بھنات بکھلایا جائے تو یہ انصاف نہیں ہے۔“ وہ بہت زیادہ جذباتی ہو گئی تھی۔

”جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے تمہارے پاپا نے تمہارا پورا پورا ساتھ دیا ہے اور وہ دے رہے ہیں۔“ ہمایوں نے دھیرے سے کہا۔

”لیکن ماما نے ہر قدم پر کھٹ چینی کی میرا حوصلہ پست کیا اور مجھے اس راہ سے ہٹانے کی ہر ممکن کوشش کی۔“ یہ کہتے ہوئے وہ چونک گئی پھر تیزی سے بولی۔ ”مجھے معلوم ہے اس پر سوال کیا جاسکتا ہے کہ پھر نتیجہ کیا رہا؟ میں نے تیمور جیسے شخص کے ہاتھوں دھوکا کھایا لیکن یہ سراسر ایک الگ معاملہ ہے۔ جس وجہ سے ماما اس تعلق پر کھٹ چینی کرتی تھیں میں نے وہ سب کچھ تو نہیں مٹوایا۔“ اس نے اشارے میں بات کہہ دی۔

”لیکن پھر بھی سفید! جس شخص نے تمہاری حوصلہ افزائی کی اسے بھی تکلیف ہوئی، ڈکھ پہنچا اور اذیت کے مراحل سے گزرنا پڑا۔“ ہمایوں نے عیسیٰ سے کہا۔

"میں مانتی ہوں کہ یہ میری غلطی تھی لیکن میری حراحت نے مجھے ایک ایسی راہ پر ڈال دیا۔ ممکن ہے میں اس راہ میں اپنا سب کچھ گنوا بیٹھی اگر میرے پاپا کی حوصلہ افزائی نہ ہوتی۔" یہ کہتے ہوئے وہ چند لمحوں کے لیے یوں خاموش ہو گئی جیسے کچھ کہنے سے قبل وہ اپنے اندر ہمت جمع کر رہی ہو۔ چند لمحوں بعد وہ بولی۔ "جس طرح میں نے ترجیحات بدلنے کی بات کی ہے۔ میری زندگی میں اس خوفناک واقعہ کے بعد کچھ ترجیحات بدلی ہیں البتہ میرے خواب نے اب بھی میرا بچپانہ جھوٹا ملکہ و مزید مضبوط ارادے کے ساتھ میرے من میں سما گیا ہے۔ میں صاف لفظوں میں کہوں گی کہ میں اب بھی ایک بزنس وومن کے طور پر خود کو منوانا چاہتی ہوں اور اس میں شادی کر کے ایک گھر بسانے کا تصور بہت معمولی سا لگتا ہے۔" صفیہ نے بالآخر شکل کر بات کرنے کی ٹھان لی اس لیے اس نے صاف طور پر اپنا مدعا کہہ دیا۔

"یہاں ایک بات سمجھنے کی ہے صفیہ! اگر تمہاری زندگی میں کوئی ایسا شخص آ جائے جو تمہارے خواب کی تکمیل میں معاون ثابت ہو تو پھر تمہیں شادی کر لینے پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔"

ہاہوں نے اس کے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تو صفیہ کے من میں ایک خوشگوار لہر دوڑ گئی۔ وہ سبھی تو چاہتی تھی اس لیے خوشی سے بولی۔

"آف کو رس! سبھی تو میں چاہوں گی۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ہاہوں کی جانب دیکھا اور پھر پوچھا۔ "اب آپ بتائیں ہمارے والدین کا ہمارے بارے میں سوچنا ٹھیک ہے یا نہیں؟"

"صفیہ! جس طرح تم نے بات کی اپنا پوائنٹ آف ویو مجھے سمجھایا مجھے اچھا لگا۔ کسی بھی نئی زندگی کی شروعات کے لیے بہر حال ایک دوسرے کی ذات پر اعتماد بہت ضروری ہوتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں والدین کے فیصلے پر اعتماد کیا جاتا ہے اور لوگ اپنی زندگی کو خوشگوار بھی رکھتے ہیں تاہم بہت سارے اپنی زندگی خوشگوار نہیں رکھ پاتے اور ان میں غلط فہمیاں جنم لیتی ہیں۔ یہ بہت اچھی بات ہے بعد میں کسی غلط فہمی کی بنا پر زندگی تلخ کرنے سے بہتر ہے کہ پہلے ہی اس غلط فہمی کو دور کر لیا جائے۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ تم کیا چاہتی ہو۔ میں کوشش کروں گا کہ اپنے والدین کو یہ بات سمجھا سکوں جو تم چاہتی ہو۔"

"آپ نے ٹھیک کہا کہ پہلے ہی غلط فہمی کو دور کر لیتا چاہئے۔ یہاں میں اپنے لیے ایک سوال ضرور پوچھنا چاہوں گی آپ اگر رُخصتوں نہ کریں تو۔۔۔؟" وہ آخری لفظ کہتے ہوئے تھوڑا جھجک گئی تھی۔

"ہاں بولو۔۔۔؟" ہاہوں تیزی سے بولا۔

"اس سارے معاملے کو میری خواہش یا خواب کو ایک طرف رکھ کر اگر ہمارے والدین قریب ہونا چاہیں تو پھر کیا آپ میرے خواب کی تکمیل میں معاون ثابت ہوں گے؟" صفیہ نے جھجکتے ہوئے پوچھا تھا۔

"صفیہ! تم اپنے خواب کی بات تو کرتی ہو لیکن یہ کیوں نہیں سوچتی ہو کہ دوسرا بھی اپنے ساتھ کوئی خواب لیے پھرتا ہے وہ بھی اپنے خواب سے دستبردار نہیں ہونا چاہتا تو پھر زندگی مشکل ہو جاتی ہے۔ زندگی تہی گزرتی ہے جب مفاہمت سے بھی آگے قربانی دینے کا جذبہ دونوں طرف موجود

ہو۔ وہیں احماد آتا ہے اور وہیں پر احترام۔۔۔ لفظ اپنے خواب کے بارے میں سوچتا اور یہ چاہتا کہ دوسرے اس کے خواب کی تکمیل میں معاون ثابت ہوں یہ نری خود فرضی ہوتی ہے۔“

ہمایوں نے کہا تو صفیہ نے خود کو اپنے ہی خول میں سمیٹے ہوئے محسوس کیا۔ اس کا چہرہ اتر گیا تھا اس لیے دھجے سے انداز میں بولی۔
 ”میں اس پہلو کو بھی سمجھتی ہوں لیکن میں ایک آئیڈیل زندگی کی بات کر رہی ہوں ورنہ میں بھی دیکھتی ہوں اور آپ بھی دیکھ سکتے ہیں کہ ہر انسان اپنے ساتھ بہت زیادہ نہیں تو تھوڑی بہت محرمیاں لیے پھرتا ہے۔ زندگی تو گزارنا پڑتی ہے۔ اس میں اگر محرمیاں ہوں چاہے نہ ہوں یا پھر کم یا زیادہ ہوں۔“

”تم نے میری ہی بات کی تائید کر دی ہے صفیہ! زندگی گزارنا پڑتی ہے۔ آئیڈیل زندگی مانا کہ کسی کو بھی نہیں ملتی لیکن پھر کیا زندگی میں ہر بندے کی راہ الگ الگ ہو؟۔۔۔ میرے خیال میں مثالی یا جسے تم کہہ رہی ہو آئیڈیل تو وہ تب ہوتی ہے کہ اختلافات غلط فہمیاں محرمیاں اور یہ سب کچھ ہونے کے باوجود بھی زندگی گزارنی جائے۔“ ہمایوں نے اسے سمجھایا۔

”یہ کیسے ممکن ہے آپ! اسے آئیڈیل کیسے کہہ سکتے ہیں؟“ صفیہ کو جیسے اس کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔
 ”وہ کیا زندگی ہوئی جس میں کوئی اختلاف غلط فہمی یا محرومی نہ ہو۔ ساری خوشیاں ہی خوشیاں ہوں! کتنی بھی ڈک کی پرچھائیں نہ ہو۔ ایسا ممکن نہیں ہے بلکہ اختلاف ختم کرنا غلط فہمی کا ازالہ کرنا محرمیوں کو ایک دوسرے کی مدد سے دور کرتے جانا ہی اصل زندگی ہے۔ ڈک سکھ میں شراکت ہی سے دوسرے کے وجود کا احساس ہوتا ہے اور ایسا قربانی کے جذبے کے بغیر نہیں ہو سکتا۔“

”یہ جذبہ آتا کہاں سے ہے۔۔۔؟“

صفیہ نے ہنسنے لگے ہوئے کہا تو ہمایوں چونک گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ صفیہ اپنے آپ میں اس قدر خود فرض ہے جبکہ صفیہ اس کی بدلتی ہوئی کیفیت کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ وہ چند لمحوں سوچتا رہا اور پھر ویرے سے بولا۔

”محبت۔۔۔ محبت ہی وہ قوت ہے صفیہ! جو خود کو دوسرے پر وار دینے کا حوصلہ پیدا کر دیتی ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے گویا بات ختم کر دی۔ ”خیر بہت باتیں ہو گئیں۔ آؤ اب کھانا کھاتے ہیں۔“

”ابھی تو مجھے آپ سے ڈیڑھ ساری باتیں کرنی ہیں۔“ وہ تیزی سے بولی۔

”بہت وقت پڑا ہے پھر ہوتی رہیں گی باتیں۔“ ہمایوں کا دل اچانک ہی ادب گیا تھا جسے صفیہ نہ سمجھ سکی تھی۔

ایک بڑی میز کھانوں سے بھری ہوئی تھی۔ اس میز پر دو دونوں ہی تھے۔ ان سے ڈراما صلی پر دو ویڈیو لیس تھیں جو ان کے اشارے کے انتظار میں تھیں۔ صفیہ تمام وقت یہی سوچتی رہی تھی کہ ہمایوں نے اپنی امارت کا اظہار خوب کیا ہے۔ کھانے کے دوران ان کے درمیان اتنی زیادہ گفتگو نہ ہو سکی جبکہ صفیہ کے من میں بہت سارے سوال سر اٹھ رہے تھے خاص طور پر ایک سوال جس نے اس وقت سر اٹھایا تھا جب ہمایوں نے محبت کی بات کی تھی۔ پر تکلف کھانے کے بعد وہ پھر سے صوفے پر آ بیٹھے تب صفیہ نے کہا۔

”ایک بات پوچھوں آپ سے۔“

”پوچھو۔“ ہمایوں و میرے سے بولا۔

”اگرچہ میں ماضی کو یاد نہیں کرنا چاہتی لیکن ماضی سے جڑا ہوا یہ سوال میرے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے۔“ وہ یہ کہہ کر خاموش ہو گئی۔

ہمایوں کچھ نہ بولا تو اس نے کہا۔ ”آپ مجھ سے کیا کہنا چاہتے تھے کیوں آرہے تھے قریب۔“ آپ میرے لیے کیسے جذبات رکھتے تھے۔“

اس نے یوں کہا جیسے بہت مشکل سے وہ اہٹاہٹا کا کہہ پائی ہو۔ اس دوران ہمایوں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ کتنے ہی لمحے دے پاؤں مگر

گئے تب وہ بڑے ہی جذباتی لہجے میں بولا۔

”مجھے تم سے محبت تھی، صرف اس لیے۔۔۔“

”تھی۔۔۔ میرا مطلب ہے آپ نہیں؟“ وہ تیزی سے حیرت زدہ لہجے میں بولی۔

”میں نے فقہ تمہارے سوال کا جواب دیا ہے۔ اب ہے یا نہیں، میں اس کا اظہار لفظوں میں نہیں کرنا چاہتا، محبت کا اظہار ہمیشہ عمل سے

ہوتا ہے اس کا فیصلہ تم خود کر سکتی ہو۔“

ہمایوں نے بہت سوچ کر اس کی بات کا جواب دیا تو صنفی جیسے مایوس ہو گئی۔ اب اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا۔ دوسرے

لفظوں میں ہمایوں نے اسے یہ یاد کرادیا تھا کہ اب یہ تمہارے رویے پر منحصر ہے کہ تم کیسا تعلق چاہتی ہو۔ صنفی ہنسی نہیں تھی کہ وہ اس کی بات کون

کچھ سکتی لیکن اس میں بھی ایک بہت بڑا اشارہ تھا کہ وہ تعلق کا خواہاں ہے۔ وہ اگر چاہے تو اس تعلق کو جس حد تک چاہے لے جا سکتی ہے۔ یہ سوچتے ہی

وہ خوشی سے بھر گئی۔۔۔ اب ان کے درمیان عام سی باتیں ہونے لگیں یہاں تک کہ دو دن بعد ملاقات کے وقت اور مقام کا تعین ہو گیا۔ صنفی اس پر

بہت خوش تھی وہ اسے اپنی کامیابی گردان رہی تھی۔

اس وقت رات گہری ہو رہی تھی جب ہمایوں نے اسے ہونٹوں سے الوداع کہا۔ وہ سرشاری اپنے گھر کی جانب ہل پڑی۔ وہ سوچ رہی تھی

کہ اب ہمایوں سے کیسا تعلق رکھتا ہے؟

☆☆

رات گہری ہوتی چلی جا رہی تھی۔ شرقی آفتی پر کچھلی رات کا چاند طلوع ہونے کے آثار واضح ہو رہے تھے سیاہ آسمان پر تارے یوں

دکھائی دے رہے تھے جیسے وہ چاند کی آمد پر ٹھک گئے ہوں۔ موسم کی حدت دھیمی ہوا کے باعث ختم ہو گئی ہوئی تھی۔ اس خانہ ناک ماحول میں جنید اور

راجلہ اپنے گھر کی چھت پر بیٹھے ہوئے تھے۔ راجلہ کچھ دیر پہلے ہی وہاں آئی تھی جبکہ جنید کو وہاں بیٹھے ہونے کا کافی وقت ہو گیا تھا۔ ان کے درمیان

خاموشی تھی جسے راجلہ نے توڑا۔

”آپ کچھ زیادہ ہی خاموش نہیں ہیں آج۔۔۔؟“ ندیم ہی روشنی میں اس نے جنید کے چہرے پر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں تو۔۔۔ تم نے ایسا کیوں محسوس کیا؟“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”ابھی میں نے آپ سے پوچھا کہ یہاں کیوں تمہائی میں بیٹھے ہیں تو آپ نے اس کا بھی واضح جواب نہیں دیا اور خاموش ہو گئے

ہیں۔۔۔ بات کیا ہے؟“

راحیلہ نے تشویش سے پوچھا۔ اس پر جنید نے بڑی گہری نگاہوں سے اسے دیکھا اور اجنبی سے لہجے میں بولا۔

”راحیلہ! انسان اپنی زندگی میں بے تحاشا فیصلے کرتا ہے۔ کچھ اس کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں کچھ نہیں ہوتے اور کچھ نہ چاہتے ہوئے

بھی پوری زندگی اپنا آپ منواتے رہتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہی زندگی میں آنے والے سوڑ ہوتے ہیں جہاں نئے مہلک واضح ہوتے ہیں تب

انسان انہی کے مطابق سوچتا ہے یا شاید انہی مناظر کی وجہ سے سوچنا پڑتا ہے اور انہی مناظر میں ہمارا مستقبل پڑا ہوتا ہے جسے دیکھنے کو ہم بے تاب

ہوتے ہیں یا محرم مستقبل میں جھانکنے کی اس لیے بھی کوشش کرتے ہیں کہ ہمارے اندر کہیں عدم تحفظ کا احساس یا خوف پڑا ہوتا ہے۔ تب انسان

ٹھنک جاتا ہے سوچتا ہے اور تمہیں پتہ ہے سوچنے کا یہ عمل اپنے آپ سے گھٹکو کرنا ہوتا ہے۔“

جنید نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں دھیرے دھیرے کہا تو راحیلہ بے چینی سے پہلو بدل کر رہ گئی۔

”فیصلہ منظر مستقبل خوف۔۔۔ یہ کیا سوچ رہے ہیں آپ کس آپ اُلھے ہوئے تو نہیں ہیں؟“ وہ تجسس سے بولی۔

”نہیں میں الجھا ہوا نہیں ہوں بلکہ اپنے ارد گرد کے سارے حالات کا تجزیہ کر رہا ہوں۔ یہ اس لیے راحیلہ کہ میں مستقبل کے لیے کوئی

بہترین فیصلہ کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ مستقبل ہمیشہ حال میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ کوئی بھی انسان چھلانگ لگا کر مستقبل میں نہیں جا سکتا! اسے لھول کے رتھ پر

بیٹھ کر وقت کی راہ پر چلنا پڑتا ہے۔ اس کا حال ہی راہیں متعین کرتا ہے۔“ جنید نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تو گویا آپ آئندہ آنے والے دنوں کے بارے میں سوچ رہے ہیں؟“ وہ بولی۔

”ہاں۔۔۔ تمہارے ساتھ سے پہلے میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ ہمیشہ حالات کے مطابق فیصلہ کیا تھا کب کیا کرنا ہے۔ اس میں چونکہ

زندگی کی ضمانت نہیں ہوا کرتی تھی اس لیے مستقبل کے بارے میں سوچنے کا تردد بھی نہیں تھا۔ زندگی کی ضمانت اب بھی نہیں ہے مجھے اگلے سانس کی بھی

ضمانت نہیں ہے لیکن امید ہے۔ اسی امید کے باعث میں آنے والے دنوں کے بارے میں سوچنا چاہتا ہوں۔ ایک خوشگوار فرح حال اور پر امن زندگی

ہر انسان کا حق ہے لیکن جو انسان نے بویا ہوتا ہے اسے کاٹنا بھی پڑتا ہے۔ کبھی خود اور کبھی آئندہ نسل کو۔“ وہ کہتے ہوئے اچانک خاموش ہو گیا۔

”کیا میں سوچ سکتی ہوں کہ آپ کے سامنے آپ کا حال کیا ہے؟“ راحیلہ سنجیدگی سے بولی۔

”وہ سب تمہارے سامنے ہے میں نے تم سے کچھ بھی نہیں چھپایا۔ میرا ضمیر اس لیے مطمئن ہے کہ میں نے اعلیٰ مقصد کے لیے خود کو وقف

کیا تھا۔ میں اب بھی اس مقصد سے باہر نہیں آیا اور نہ ہی میں نے اسے چھوڑا ہے کیونکہ حقیقت یہی ہے۔ اس وقت میرے سامنے حالات کے دو

پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ میں تنظیم کے لوگوں سے کس طرح چھپ سکتا ہوں تاکہ میں ان کی نگاہوں میں نہ آسکوں ورنہ یا تو مجھے ان کے ساتھ شامل ہونا

پڑے گا یا پھر اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑیں گے کیونکہ میں ان کا راز داں ہی نہیں محرم راز بھی ہوں۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ اپنے مقصد کے حصول کے

لیے کون سا راستہ اختیار کروں؟ اس کا اگر فیصلہ ہو جاتا ہے تو ہی مستقبل کے بارے میں سوچ سکتا ہوں۔“ جنید نے اسے تفصیل سے سمجھایا۔

”مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ اس قدر اچھے ہوئے ہیں ورنہ میں آپ کو لاٹری نہیں کرتی لیکن اگر آپ مجھے بتاتے تو شاید میں کوئی —“
 راحیلہ نے کہنا چاہا تو جنید نے ٹوکتے ہوئے کہا۔ ”ہاں یہ نہیں کہ میں تمہیں اپنے مسائل میں شریک نہیں کرنا چاہتا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ تمہیں ان حالات کی نزاکت کا احساس نہیں۔ تم گولیوں کی بوچھاڑ کا تصور تو کر سکتی ہو لیکن اس کی شدت اور ان حالات میں اندر کی کیفیت کا احساس نہیں کر سکتی ہو۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ یہ میرے مسئلے ہیں انہیں میں ہی حل کروں گا بلکہ اب ہم نے مل کر ان مسائل کا حل نکالنا ہے مگر کوئی صورت کوئی راہ ہو کوئی مل تو دکھائی دے اور پھر راحیلہ! مجھے یہ بھی احساس ہے کہ ہر لڑکی کے اپنے ارمان خواہشیں اور خواب ہوتے ہیں۔ میں وہ بھی پورے نہیں کر پا رہا ہوں۔“

”کیا نہیں ہے میرے پاس۔۔۔ آپ ہیں ایک گھر ہے۔ میری ماں میرے پاس ہے۔ خوشگوار زندگی ہے اس سے بڑھ کر مجھے کیا چاہئے؟۔۔۔ مجھے نہیں معلوم کہ آپ اس حوالے سے کیا سوچتے ہیں لیکن یقیناً جانیں میں نے کبھی اتنا کچھ سوچا ہی نہیں تھا۔ یہ سب میری توقعات سے بڑھ کر ہے البتہ ایک خواہش ضرور ہے کہ خوف کی یہ فضا ختم ہو جائے اور ہم عام انسانوں کی مانند نارمل زندگی گزاریں۔ آپ صبح اپنے کام پر جائیں میں گھر پر آپ کا انتظار کروں۔ چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے ہماری زندگی میں رنگ بھر جائیں۔ میں بس اتنا ہی چاہتی ہوں۔“ وہ خوابناک لہجے میں کہتی چلی گئی تھی۔

”کیا یہ بہت زیادہ نہیں ہے اور یہ جو تم نے خوف کی فضا کہا ہے یہی تو ہے جسے دور کرنے کی سوچ رہا ہوں۔۔۔ جب سے میں زخمی ہوا ہوں میں نے کسی سے رابطہ نہیں رکھا سوائے ہمایوں کے اور چونکہ میں نے کبھی اس زندگی سے نکلنے کا سوچا نہیں تھا اس لیے مجھے راہ بھی دکھائی نہیں دے رہی ہے لیکن میں مایوس نہیں ہوں۔ یہ راہ ضرور سامنے آئے گی۔ تم دیکھنا بہت جلد ہم آزاد فضا میں سانس لے رہے ہوں گے۔“ جنید نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تو کیا اب ساری رات یہیں بیٹھنے کا ارادہ ہے اپنے کمرے میں نہیں جائیں گے؟“ راحیلہ نے خوشگوار لہجے میں پوچھا۔

”کیوں نہیں۔۔۔ لیکن میں ابھی تھوڑی دیر یہیں بیٹھنا چاہوں گا۔“ جنید ویرے سے بولا۔

”کوئی فائدہ نہیں ہے۔“ راحیلہ نے اصرار سے کہا۔

”مطلب۔۔۔؟“ جنید نے چوکتے ہوئے پوچھا۔

”اس لیے کہ آپ آدھا سوچ رہے ہیں پورا نہیں سوچ رہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”آدھی سوچ۔۔۔ میں سمجھا نہیں تم کہنا کیا چاہ رہی ہو؟“ اس نے تجسس سے پوچھا۔

”آپ گھر میں ہیں باہر کے حالات کا آپ کو بالکل نہیں پتہ۔ پوری سوچ اس وقت ہوگی جب آپ کو اپنے ان حالات کا پتہ ہوگا جن

سے آپ لٹکنا چاہتے ہیں اس لیے آدھا سوچیں بلکہ دور راست نکالیں جو محفوظ ہو اپنے ارد گرد کے حالات جاننے تاکہ درست فیصلہ ہو سکے۔“

راحیلہ نے کہا تو جنید نے اس کی جانب خوشگوار حیرت سے دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے بولا۔

”بیکم اتم تو واقعا بکھڑا ہو — چاڑھتے ہیں۔“

جنینے اٹھتے ہوئے کہا تو وہ مسکرا دی۔ تب اس کے چہرے پر ہزار رنگ بکھر گئے جنہیں وہ دیکھتا چلا گیا۔

☆☆

حُش کہیں سے نہیں آتا یہ تو ہر انسان کے من میں پڑا ہوا ہے۔ جس طرح قانونِ فطرت یہ ہے کہ سچ سے لے کر درشت تک کے سفر میں ”وقت“ شرط ہے اسی طرح من میں حُش ظاہر ہونے کا بھی ایک مرحلہ ہوتا ہے۔ اس کے لیے وقت درکار ہوتا ہے۔ انسان کو بعض اوقات محسوس بھی ہوتا ہے کہ اچانک اس پر الہام کی مانند یہ انکشاف ہو جاتا ہے کہ اسے کسی سے حُش ہے مگر فوراً سے تجزیہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اس لمحہ انکشاف سے بہت پہلے ایک سفر کا آغاز ہو چکا ہوتا ہے۔ آپ سوال یہ اٹھتا ہے کہ انسان کو معلوم کیوں نہیں ہوتا کہ اس کے من میں حُش پڑا ہوا ہے۔ حُش اپنا احساس کیوں نہیں دیتا یا لکھ انسان اسے کیوں نہیں سمجھ پاتا؟ — معاملہ کوئی بھی ہو لیکن جب تک انسان توجہ نہیں دیتا اس وقت تک یہ بھی ظاہر نہیں ہوتا۔ بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ حُش من سے ظاہر ہو چکا ہوتا ہے لیکن چونکہ انسان کی نگاہ اس پر نہیں پڑتی اس لیے اسے سمجھ ہی نہیں پاتا۔ یہ بالکل ایسی بات ہے کہ انسان ساری زندگی اپنا مادی وجود اپنے ساتھ لیے پھرتا ہے لیکن وہ اپنے آپ کو پوری طرح دیکھ ہی نہیں سکتا اسے خود کو دیکھنے کے لیے ایک آئینے کی ضرورت پڑتی ہے۔ جیسے ہی وہ آئینے کے سامنے آتا ہے اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیسے حُش و نگار رکھتا ہے۔ اس کی آنکھیں کیسی ہیں یا دیگر نقوش میں وہ کیسا ہے؟ ایک مثالی جسم اس کے سامنے آ جاتا ہے جسے دیکھ کر وہ اپنے بارے میں پتہ کرتا ہے۔ بحث اس سے نہیں ہے کہ آئینے کی صورت کیا ہے۔ وہ کسی کی آنکھ کا تل بھی ہو سکتا ہے یا کالج سے بنا ہوا کوئی ٹکڑا اور یہی وہ نکتہ ہے کہ انسان جب اپنے آپ پر توجہ دیتا ہے تب اسے احساس ہوتا ہے کہ وہ کیسا ہے۔ اسی طرح حُش کے تصور کے لیے بھی ایک آئینہ یا صورت درکار ہوتی ہے بنا صورت کے حُش کا ظہور بھی نہیں ہوتا۔ حُش ایک قوت کا نام ہے جب تک وہ ظاہر نہیں ہوتی تب تک وہ اپنا احساس بھی نہیں دیتی لیکن جیسے ہی کوئی صورت سامنے آتی ہے یہ قوت بیدار ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ انسان پر غالب آ جاتی ہے۔ — عین ایسی قوت کا پتہ اس وقت لگتا ہے، جب لوہا اس کے قریب آ جائے، مگن ٹیس اور لوہے کی قربت ہی سے اس قوت کا انکشاف ہوتا ہے۔

صورت کیا ہے؟ — یہ انسان کا اپنا خیال ہے جسے ہم تصور بھی کہتے ہیں۔ دراصل انسان کے اندر عالمِ افکار موجود ہے جہاں ہر لمحہ نجانے کتنے تصورات جنم لیتے ہیں۔ اس عالمِ افکار سے جب بھی کوئی تصور جنم لیتا ہے اس کی اپنی ایک صورت ضرور ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اس دنیا میں ایک جمونپزی سے لے کر محل تک جو کچھ بھی تعمیر ہوا یا ہو رہا ہے وہ پہلے تصور میں موجود تھا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے سامنے موجود جو اشیاء ہیں یہ سب تصور کا عکس ہیں۔ آپ تصور سے نئے تصورات جنم لیتے ہیں۔ ایک خیال سے خیالات کا منبع ہے جو کسی نہ کسی طرح اپنے اندر صورت رکھتا ہے۔ عالمِ افکار میں ہر لمحہ تصورات جنم لے رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہمارے وجود میں دیگر صلاحیتیں اور قوتیں ہیں جنہیں یہ تصورات ہی تحریک دیتے ہیں یوں عمل اور رد عمل کا ایک سلسلہ جاری رہتا ہے۔

انسان میں حواسِ خمسہ موجود ہیں جو کہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے۔ لیکن ہے انسان میں مزید حواس بھی ہیں جنہیں ابھی ”دریافت“ کیا

حُش ہی ہے حُش بتا

جانا ہے یا اس پر تحقیق ہو رہی ہوگی تاہم حواسِ خمسہ طے شدہ بات ہے یعنی دیکھنے، سنے، چمکنے، سونگنے اور احساس کرنے کی حس۔ جن سے انسان مشاہدہ کرتا ہے۔ اب یہ بات ایک انگِ بحث رکھتی ہے کہ مشاہدہ مستبر ہوتا ہے یا نفس؟ بہر حال حواسِ خمسہ اطلاعاتِ جمع کر کے ایمانِ ذہن میں لے آتے ہیں جہاں پر وہ ایک صورت اختیار کرتے ہیں۔ اس صورت کے بارے میں ذہن کوئی نہ کوئی فیصلہ صادر کرتا ہے۔ جس کی بنا پر ہمارا مادی جسم حرکت پذیر ہوتا ہے کیونکہ جسم پر دماغ کا اختیار ہے وہی حکم جاری کرتا ہے لیکن یہاں اس کے تمام تر افعال کا نگرانِ دل کی صورت میں موجود ہے جہاں سے انسان کی کیفیات جمع لیتی ہیں۔ دماغ کے حکم پر نگرانِ دل اپنا فیصلہ صادر کرتا ہے اور یہیں انسان میں ایک تکلفش پیدا ہوتی ہے۔ اسی تکلفش میں انسانی صلاحیتیں منتقلی تو تھیں اور کیفیات کا ظہور ہوتا ہے۔ یہی زندگی ہے۔

انسان کے اندر جو عالمِ افکار موجود ہے، جہاں سے خیال کا ظہور ہوتا ہے اسے من، شخصیت یا نفس بھی کہا جاتا ہے۔ منبعِ علم و حکمت قرآن حکیم میں اللہ پاک نے انسان کی رہنمائی کے لیے نفس کے بارے میں بتایا ہے۔ اس کے تین پہلو بیان کیے گئے ہیں۔ نفسِ امارہ، نفسِ لواس اور نفسِ مطمئنہ۔ اب جس طرح کا من ہوگا اندر کی دنیا چمکنی ہوگی وہاں کے عالمِ افکار میں سے ویسے ہی تصورات و خیالات کا ظہور ہوتا ہے۔ اس پر نگرانِ دل ہے جہاں خمیر موجود ہے۔ اگر دل سے مطابقت رکھنے والے خیالات و تصورات کا ظہور ہو رہا ہے تو مادی جسم اس پر عمل کرتا ہے جو انسان کے رویے کا اظہار ہے ورنہ شاندار تکلفش موجود رہتی ہے۔ دنیا کے ہر انسان میں خمیر موجود ہے چاہے وہ کسی قومِ طیبے یا مذہب سے تعلق رکھتا ہو۔ جیسے کہ وہ چمکنے کا ثباتِ ہادی برحق نبی آخر الزماں حضرت محمدؐ نے فرمایا کہ ہر بچہ فطرتِ سلیمہ پر پیدا ہوتا ہے۔ یہی خمیر انسان کے اعمال پر نگران ہے جو دراصل دل ہی کی ایک کیفیت کا نام ہے۔ یہ دل ہی ہے جو صحیح معنوں میں انسانی وجود پر حکمرانی کرتا ہے۔

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ آیا انسانی وجود میں ایسی بھی کوئی قوت موجود ہے جو انسان کو اندر سے بدل دینے کی صلاحیت رکھتی ہے نہ مرنے سے اچھائی کی جانب یا پھر اچھائی سے نہ مرنے کی طرف۔ تحتِ لغوی سے اوجِ ثریا تک زمین سے آسمان کی جانب تو بلاشبہ یہ بھی انسان کے اندر ہی موجود ہے جسے عشق کہا جاتا ہے۔ یہاں بحث اس سے نہیں کہ عشق ہوتا کس سے ہے۔ انسان جسے احسن تقویم پر بتایا گیا ہے اسے اسل سالین بھی ہو سکتا ہے۔ پھر اسل سالین سے احسن تقویم کی اہلی ترین پلندوں تک پہنچ سکتا ہے۔ یہ سب کچھ اس کے اندر ہی سے ہو رہا ہے۔ ایک نقطے سے دوسرے نقطے تک سفر کرانے والی کون سی قوت ہے یہی عشق ہی تو ہے۔ کھینے کی حد تک اس کی مثال یوں ہوگی کہ ہوا مادے کی ایک قسم ہے لیکن ہمیں دکھائی نہیں دیتی کیونکہ وہ صاف و شفاف پاکیزہ ہے۔ ایک لمحے کو اس پر غور کیا جائے تو یہ انسانی زندگی کے لیے کس قدر اہم ہے چند منٹ اس کے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ کتنے رازوں کی امین ہے جدید دور میں اس کی اہمیت ظاہر ہوتی چلی جا رہی ہے کہ موسم کی تبدیلی سے لے کر ماحول کی تبدیلی تک کس قدر اثر انداز ہے۔ یہی ہوا جب تھوڑی سی کثافت میں آتی ہے تو پانی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ بے رنگ، بے بو بے ذائقہ زندگی بخش، جس کے بغیر کچھ دن ٹکالے جاسکتے ہیں لیکن انسانی زندگی کے لیے بے حد ضروری۔ اس کا وجود دکھائی دینے لگتا ہے۔ اسی ہوا میں مزید کثافت آتی تو پھر یہ برف بنتی ہے اور ایک جگہ جم جاتی ہے۔ اس کی اذان موسم کی تبدیلی کی صلاحیت زندگی بخش ہونے کی صلاحیت اس میں بہت کم رہ جاتی ہے۔ پھر یہی ہوا جب برف سے پھر بنتی ہے تو پھر خود عاجز آ جاتی ہے۔ اس کے بارے میں اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ انسانی زندگی موسم یا ماحول پر کس قدر اثر رکھتا

ہے۔ ہوا سے چتر تک کے سفر میں ٹھنڈک کی ایک قوت ہے جو ہوا کے رُوپ ہدلی ہوئی اسے فنا کی جانب لے جاتی ہے لیکن اگر یہی سفر پتھر سے ہوا کی جانب شروع ہو تو وہی قوت گرمی کا روپ دھارتی ہے۔ چتر پگھل کر برف بنتا ہے پھر پانی کی صورت اور پھر ہوا تک جا پہنچتی ہے۔ عشق میں جتنی شدت ہوگی اس قدر سفر آسان تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ راہ میں آنے والی جس قدر رکاوٹیں ہوتی ہیں انہی سے شدت عشق کا پتہ چلتا ہے۔ فنا و بقاء کے اس سفر میں عشق ہی کا درما ہے۔ اسی طرح اگر انسان جب عشق کرتا ہے تو اس کا ایک ہدف بہر حال ہوتا ہے۔ عشق میں اپنی تمام تر توجہ ہدف پر رکھتا ہے۔ جس قدر عشق میں ڈوبتا ہے اس قدر ہی اس کی تمام تر توجہ 'ملاصحتیں' قوت اس ہدف پر لگ جاتی ہیں۔ اب ہدف کیا ہے؟ یہ ہدف پر منحصر ہے کہ وہ فنا کی جانب لے جاتا ہے یا پھر بقاء کی طرف۔ مٹ جانے والا مقم ہو جانے والا مادوی وجود اگر ہدف ہے تو بلاشبہ فنا ہی اس کا مقدر ہے اور ہمیشہ قائم رہنے والا ہدف ہے تو کوئی شک نہیں وہ بقاء کا راستہ ہے اور یہی اس کی قسمت۔۔۔!

☆ ☆

ہا یوں مسلسل صفیہ کے بارے میں سوچتا چلا جا رہا تھا۔ اس ایک طویل ملاقات میں وہ بہت حد تک اس کی ذہنیت کے بارے میں سمجھ گیا تھا۔ ٹھوکر کھا کر بھی وہ اپنے خوابوں، خواہشوں اور اُمیدوں کو اہمیت دے رہی تھی۔ اس سے قلمبغا غرض نہیں تھی کہ وہ اپنے مستقبل کے بارے میں کیا اور کیسا سوچتی ہے یہ اس کا حق ہے لیکن اسے تصور ابہت یہ افسوس ضرور ہوا تھا کہ اس کے من میں کہیں بھی اس کے لیے محبت نہیں جاگی تھی، ہا یوں سے تو یہ جانتا چاہتا تھا کہ وہ اس کے خوابوں کی تکمیل میں کس حد تک مدد و معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ اچھی بات تھی کہ صفیہ نے اپنا اظہار کر دیا اپنا آپ اس پر کھول دیا۔ مصنوعی یا جھوٹی محبت کی دعویٰ دینے نہیں ہوئی اس کے من میں جو تھا وہ ظاہر ہو گیا۔ اب یہ فیصلہ ہا یوں نے کرنا تھا کہ وہ کیا چاہتا ہے آیا وہ اپنی محبت میں اس کا ساتھ چاہتا ہے یا پھر اس نفرت کے ساتھ اسے قبول کرے گا جو ایک چھتر کے ساتھ اس کے اندر جاگی تھی اور جس نے اسے ایسی جدوجہد میں ڈال دیا اسے اس مقام پر لاکھڑا کیا ہے۔ اس کے من میں کئی طرح کے خیالات آ رہے تھے۔ وہ انہیں دیکھتا پرکھتا اور پھر نئے خیال کی جانب متوجہ ہو جاتا وہ مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس کے من میں صفیہ کی محبت موجود تھی۔ کوئی وقت تھا جب اس نے اپنے سارے خوابوں میں صفیہ کو دیکھا تھا اس کے خوابوں کی تکمیل اسی سے ہوتی تھی۔ وہ اپنے اہم اس کی قربت محسوس کرتا تھا بھی مجبور ہو کر اس کے کالج کے سامنے جا پہنچا تھا۔ وہ اسے خود سے الگ سمجھتا ہی نہیں تھا۔ اس محبت کے ساتھ وہ جدوجہد چاہتا تھا وہ اس کے رنگ میں رنگنا چاہتا تھا وہ جو ایک خاص طرح کا معیار زندگی چاہتی تھی اس کے حصول کے لیے وہ پوری طرح آمادہ ہو چکا تھا۔ اس کا ہدف وہ تھی لیکن جیسے ہی وہ اس کے قریب گیا اسے احساس ہو گیا کہ یہ وہ تو نہیں ہے جسے وہ اپنے قریب سمجھتا ہے۔ یہ اس کے تصورات میں کسی ہوئی صفیہ تو نہیں بلکہ یہ تو کوئی سراپا نفرت ہے جس نے اس کے اندر بھی نفرت بیدار کر دی۔ اسی محبت اور نفرت کی کشمکش میں وہ اس مقام تک آ گیا۔ ہدف اس کا صفیہ ہی رہی۔ اس کا بت نونا نہیں اس کے من مندر میں پورے نظم و انضام سے ایسا دور رہا۔ کبھی اسے دیکھ کر اس کے تصورات اس کی زندگی میں خوشگواریت بھر دیتے تھے اب اسی بت کو دیکھ کر اٹھنے والے تصورات میں سے ایسی کیفیات اٹھتیں جو خوشگواریت کا باعث بن جاتیں۔

ہا یوں کی زندگی میں وہ مقام آ گیا تھا جہاں اس نے فیصلہ کرنا تھا کہ یا تو اس بت کو اس کی تمام تر خوبیوں و نعمتیوں اور سحر طرازیوں

سمیت اپنے من میں یونہی ایسا دور رکھے پھر زندگی جو دے اسے قبول کرے۔ سر پھولے یا خواہش بر آئے یا پھر اس معاملے کو اپنی زندگی سے نکال باہر کرے اور اپنی مرضی سے زندگی کی نئی شروعات کرے جس میں صفیہ اس کا جہ نہ ہو۔ اب فیصلہ اس کے ہاتھ میں تھا۔

ہاویوں کے لیے یہ فیصلہ اس قدر اہم تھا جس قدر زندگی — وہ فیصلہ کر لینا چاہتا تھا کیونکہ زندگی اسے ایسے دورا ہے پر لا چکی تھی جہاں اسے یہ فیصلہ کرنا تھا۔ اس کے لیے کوئی بھی دوسرا اس کی مدد نہیں کر سکتا تھا کیونکہ یہ من کے معاملات تھے اور وہی اپنے من کو بہتر طور پر سمجھ سکتا تھا۔

یہ دورا ہا اس وقت سامنے آیا جب اس کی والدہ نے اسے اپنے سامنے بٹھا کر یہ پوچھا تھا کہ بتاؤ تمہاری صفیہ کے بارے میں کیا رائے ہے؟ وہ چاہتا تو بہت زیادہ بحث کرتا اس کے بارے میں کوئی رائے دیتا لیکن وہ ایسا کچھ بھی نہ کر سکا۔ وہ اپنی ماں کو یہ بھی نہ بتا سکا کہ اس وقت صفیہ کی ذہنیت کیا ہے۔ اسے معلوم تھا کہ اس رشتے میں اس کی ماں اپنی انا رکھتی ہے۔ جسے کبھی اس معاملے میں بات تک کرنے سے روک دیا گیا تھا آج انہوں نے خود سے سوال دراز کیا تھا۔ ماں کے سامنے وہ خاموش رہا تھا ایک لفظ بھی تو نہ کہہ سکا اور بس سوچنے کے لیے مہلت مانگ لی تھی۔ اب بیٹھا وہ یہی تجربہ کر رہا تھا کہ آخر ایسا کیوں ہوا وہ کیوں خاموش رہا دو نوک انداز میں اپنی رائے کیوں نہیں دے سکا؟ یقیناً اس کے من میں کہیں نہ کہیں صفیہ کی محبت موجود ہے باوجود نفرت کرنے کے وہ اسے ہلا نہیں سکا۔ شاید محبت نے ہی نفرت کا روپ دھار لیا تھا۔ کہتے ہیں کہ شدید نفرت بھی محبت کا ایک روپ ہوتی ہے۔

”اگر میں صفیہ کو قبول کر لیتا ہوں تو پھر میری زندگی میں کیا تبدیلی آئے گی۔ بس اس کا مادی وجود میری دسترس میں آ جائے گا اس کے من میں محبت تو نہیں ہوگی۔“

”قربت ہمیشہ تبدیلی لاتی ہے۔ تم اس کے قریب ہو گئے تو ہی محبت کا ظہور ہوگا۔“

”لیکن ممکن ہے کہ محبت نہ ہو اور نفرت شدید ہو جائے۔ جب پھر زندگی اجیرن ہو جائے گی۔“

”کیا اس طرح تمہاری زندگی پر سکون ہے؟۔۔۔ صرف اس کے سامنے اپنا آپ منوانے کے لیے تم نے دن رات ایک کرو یا ہے۔ تم نے دولت کے حصول کے لیے ایسے فیصلے بھی کیے ہیں جن پر تمہارا ضمیر تمہیں ملامت کرتا ہے۔ تمہارے سامنے اچھائی یا بُرائی کا معیار نہیں رہا اور ایسا تم نے صرف ایک مقصد کے لیے کیا اور وہ مقصد کیا تھا؟ یہی تا کہ تم صفیہ کو اپنے سامنے جھکا لو۔ اب جبکہ وہ وقت آ گیا ہے۔ تم اپنی جدوجہد میں کامیاب ہو گئے تمہارا مقصد تمہارے سامنے ہے تو پھر کیوں تذبذب میں ہو؟“

”یہاں تک تو ٹھیک تھا میں نے جیسے بھی کیا جو بھی کیا اس میں کامیاب ہوا۔ میں یہاں تک کا سفر کر آیا ہوں لیکن جیسے ہی صفیہ کو اپنی زندگی میں لے آیا ایک نئے سفر کا آغاز ہو جائے گا۔ اس کی خواہشیں پوری کرنا میری ذمہ داری ہوگی۔ اسے اپنا لینے کا مطلب یہ ہے کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔“

”ایسا بھی تو ممکن ہے کہ وہ تمہارے محبت بھرے رویے سے پھٹل جائے۔ اپنا آپ تمہیں سوچ دے تمہاری مرضی کے مطابق چلے۔“

”اک نئے سفر کا آغاز تو ہونا! ایک نئی جدوجہد! ایک نئی منزل۔“

”تو پھر کیا تم پر سکون رہو گے؟“ — فرض کر دو وہ دوبارہ تیرے وجود کی جانب بڑھ جاتی ہے یا پھر کوئی بھی ایسا شخص جو اس کے خوابوں کی تکمیل کر

دے تو کیا تم برداشت کر لو گے؟“ نظر انداز کر سکتے ہو؟“

”میرے خیال میں دکھ تو مجھے ضرور ہوگا۔ اب ایسا بھی نہیں کہ میں اُسے نظر انداز کر سکوں۔“

”درمیان میں فقہ دولت ہے نا؟ تم دولت سے اُس کا مادی وجود خرید لو یا خریدنے والی بات ہی ہے نا؟ پھر یہ تمہاری محبت کی قوت ہوگی جو

اُسے اپنی ذات کی جانب متوجہ کر لو۔ آخر وہ انسان ہے اور عورت بھی۔ اس طرح تمہاری اُنا کو بھی تسکین ہوگی۔ پھر جب وہ تمہاری دسترس میں آ

گئی تب اُسے جھکانا اور جھکانے رکھنا ہی تمہاری مردانگی ہوگی۔“

”کیا میری زندگی اسی گفتگو میں گزر جائے گی؟“

”اسے ہی تو متاثر رکھتے ہیں۔ اپنا آپ متاؤ۔“ کیا تم مفید سے محض اس لیے ڈر رہے ہو کہ اس پر دولت نچھاور کرنا پڑے گی؟ یہ تو بہت

سستا سوا ہے۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو دولت سے ایک نگاہ کی جنبش بھی نہیں خرید سکتے۔ اب دولت تمہارے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ آگے بڑھو اور

ایک ذرا سے نظروں کے ساتھ اُسے اپنی دسترس میں کر لو۔ وہ لوگ جو تمہیں کسی اس قابل نہیں سمجھتے تھے کہ تم سے بات کی جائے، اُنہیں نچھاورنا بھی تو

تمہاری جدوجہد تھی۔ اس میں فقہ تم ہی نہیں دوسرے لوگوں کی خواہش بھی شامل ہے۔“

دجال (شیطان کا بیٹا)

انگریزی ادب سے در آمد ایک خوفناک ناول۔ عظیم الحق حقی کا شاندار امداد زبیاں۔ شیطان کے پھاریوں اور ہیروکاروں کا نجات دہندہ شیطان کا بیٹا۔ جسے بائبل اور قدیم صحیفوں میں بیست (جانور) کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ انسانوں کی دنیا میں پیدا ہو چکا ہے۔ ہمارے درمیان پرورش پا رہا ہے۔ شیطانی طاقتیں قدم قدم پہ اسکی حفاظت کر رہی ہیں۔ اسے دنیا کا طاقتور ترین شخص بنانے کے لیے کروڑوں سازشوں کا جال بنا جا رہا ہے۔ معصوم بے گناہ انسان، دانستہ یا نادانستہ جو بھی شیطان کے بیٹے کی راہ میں آتا ہے، اسے فوراً موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔

دجال..... یہودیوں کی آنکھ کا تارہ جسے عیسائیوں اور مسلمانوں کو جہاد و برباد اور نیست و نابود کرنے کا مشن سونپا جائے گا۔ یہودی کس طرح اس دنیا کا ماحول دجال کی آمد کے لیے سازگار بنا رہے ہیں؟ دجالیت کی کس طرح تبلیغ اور اشاعت کا کام ہو رہا ہے؟ دجال کس طرح اس دنیا کے تمام انسانوں پر حکمرانی کرے گا؟ 666 کیا ہے؟ ان تمام سوالوں کے جواب آپ کو یہ ناول پڑھ کے ہی ملیں گے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ آپ اس ناول کو شروع کرنے کے بعد ختم کر کے ہی دم لیں گے۔ ناول دجال کتاب گھر پر دستیاب ہے۔

اُس نے سوچا اور پھر اچانک فیصلہ کر لیا۔ تب اُس نے فون اٹھایا اور اپنے گھر کے نمبر ڈائل کیے فون ملا زمنہ نے اٹھایا۔
”امی سے بات کراؤ۔“

تھوڑی دیر بعد اُس کی والدہ نے اپنے ہونے کا احساس دلاتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں بیٹے! کیا بات ہے؟“

”امی آپ آج ہی ابو کے ساتھ چاچا اصغر علی کے گھر جائیں اور صنفیہ کا رشتہ مانگ لیں۔“ اُس نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔
”کیا واقعی پتر۔۔۔؟“ اُس کی والدہ حیران رہ گئیں۔

”ہاں۔۔۔ اگر آپ سہلی کو بھی اپنی بھونٹنا چاہتی ہیں تو آپ بھائی سے بات کر لیں۔“

”وہ میں نے کر لی ہے اور میں آج ہی جاتی ہوں۔“

اُس کی والدہ نے کہا تو اُس نے فون بند کر دیا پھر کرسی سے اٹھا ٹریک دیا۔ یہ فیصلہ کر کے اُس نے بہت سکون محسوس کیا تھا۔

ہذا ہے:

جینے اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑا غروب آفتاب کا منظر دیکھ رہا تھا۔ وہ اس منظر میں پوری طرح کھویا ہوا تھا یوں جیسے اُس کے سامنے لہر رنگ ہونٹا ہوا سورج نہ ہو بلکہ وہ آئینہ ہو جس میں وہ اپنا عکس دیکھ رہا ہے۔۔۔ سورج کس طرح اُبھرتا ہے؟ تاریک رات کے اندھیرے میں اپنے ہونے کا احساس دیتا ہے۔ کرنیں اس کی آمد کی بڑیا مبرمتی ہیں۔ سیاہ آسمان لمحہ بہ لمحہ نیلا ہونا شروع ہوتا ہے اور پھر اس کا گہرا نیلگوں پن دھیرے دھیرے ہلکا نیلا ہو جاتا ہے۔ کچھ دیر پہلے اندھیرے میں پڑی ہوئی ذنیا روشن ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ سورج کے سفر کا آغاز ہوتا ہے یہاں تک کہ نصف النہار پر آ جاتا ہے۔ وہ سامنے تک گھٹا دیتا ہے اپنے ہونے کا پورا پورا احساس دلاتا ہے اور پھر جیسے تھک جاتا ہے۔ دھیرے دھیرے وہ جھلکتا شروع ہو جاتا ہے یہاں تک کہ لہرنگ ہو کر غروب ہو جاتا ہے۔ کیا سبکی اس کی کہانی ہے؟۔۔۔ نہیں کہانی نہیں تک آ کر ختم نہیں ہوتی بلکہ اک نئی کہانی کے آغاز کی بنیاد بنتی ہے۔ اندھیرا چھا جاتا بھی کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ اس میں بھی قدرت کے راز ہیں وہ راز جنہیں انسان اس وقت سمجھتا ہے جب وہ اندھیرے کو بھی مثبت اعزاز میں دیکھے۔ اصل میں انسانی زندگی میں نگاہ ہی سب سے بڑی اور اہم شے ہے۔ یہی نگاہ جب بلندی کی جانب اُٹھتی ہے تو آسمان کی وسعتیں اس میں سما جاتی ہیں اور جب انسان زمین کی جانب دیکھتا ہے تو زمین اس کے من میں بسیرا کر لیتی ہے۔ یہ نگاہ ہی ہے جو انسان کو آسمان یا زمین کی جانب لے جاتی ہے ورنہ تو صدیاں گزر چکی ہیں زمین بھی وہیں موجود ہے اور آسمان بھی اُس کے درمیان میں انسان ہی ہے جو زمین کی تہ میں جانے کے باوجود دوسروں کے دل میں دھڑکنارہ جاتا ہے یہی فتاوہ ہے۔ نگاہ کا ایک مقصد ہے اور اس مقصد کو عشق ہی قوت دیتا ہے۔ تب انسان فتا یا بھاکا کی جانب محو سفر ہو جاتا ہے یہاں تک کہ کہانی ختم ہو کر پھر سے شروع ہو جاتی ہے۔ زمین وہیں آسمان وہیں انسان کا سفر جاری ہے۔۔۔ وہ مسلسل سوچ رہا تھا کہ اس نے بھکارا راستہ چنا تھا پھر کیوں راستے ہی میں ٹھک کر رک گیا؟۔۔۔ اب یہ سوال بہت پرانا ہو چکا تھا۔ عشق تو اُس کے من میں پہلے ہی سے موجود تھا لیکن اُسے تحریک دینے والی کوئی صورت نہیں تھی۔ جونہی کوئی صورت اُس کے سامنے آئی

عشق فتا ہے عشق بھتا

اُسے اپنے خدو خال کا اندازہ ہوا۔ اُس نے خود کو دیکھا اور احساس کیا کہ وہ تو کسی اور منزل کا راہی ہے۔ اس کے من میں ایک سورج غروب ہو گیا تو نیا سورج طلوع ہو گیا۔ گو مقصد وہی تھا لیکن روشنی میں اُسے بہت سارے راستے دکھائی دیے جن پر چل کر وہ اپنا مقصد حاصل کر سکتا تھا۔ اُسے یہ پوری طرح یقین تھا کہ یہی جتا کا راستہ ہے۔

”جنید! کہاں کھو گئے ہیں آپ؟“

راجیلہ نے اُس کے کاندر سے پردے سے ہاتھ دیکھے ہوئے پوچھا تو وہ چونک گیا پھر اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے بولا۔

”کیا تم کچھ دنوں کے لیے میری جدائی برداشت کر سکتی ہو؟“

”یہ کیا بات ہوئی؟“ وہ چونکتے ہوئے بولی۔

”میں جو پوچھ رہا ہوں اس بات کا جواب دو۔“ اُس نے پونجی راجیلہ کے چہرے پر دیکھتے ہوئے دہرے سے کہا۔

”ہاں۔۔۔ چند دنوں سے لے کر اپنی زندگی کی آخری سانس تک جس قدر بھی جدائی دیں۔“ وہ اعتماد سے بولی۔

”ایسا کیوں؟“ اُس کے لہجے میں سرسراہٹ تھی۔

”یہ میرا یقین ہے جنید! آپ جہاں بھی ہوں گے۔ جس حال میں بھی ہوں گے آپ میرے ہیں۔“ وہ بھی دہرے سے بولی۔

”اتنا یقین کیوں ہے تمہیں؟“ اُس نے پھر پوچھا۔

”میں نے اپنی محبت کو تو دیکھا ہی ہے جو میرے من میں چمکتی رہتی ہے۔ میں نے اپنا تڑپنا بھی محسوس کیا ہے۔ اسی طرح میں آپ کی

محبت بھی دیکھ چکی ہوں۔ آپ میرے من میں یوں ساچکے ہیں کہ اب فقط موت جدا کر سکتی ہے۔ اس طرح کی دیوانگی کے لیے مادی وجود کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔“ وہ اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

”تم ایسی باتیں کیسے کر لیتی ہو؟“ وہ دہرے سے ہنستے ہوئے بولا۔

”پرندے کو آواز ان کون سکھاتا ہے پھلا اسی طرح محبت بھی باتیں کرنا سکھادتی ہے۔“ راجیلہ بھی مسکرائی۔

”ہاں راجیلہ! یہ اندر کی کیفیات ہوتی ہیں جو خود بخود راستہ بتاتی ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ کھڑکی سے ہٹ گیا اور کمرے کے وسط میں پڑے

صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”خیر آؤ۔ میں نے تم سے ایک بات کہنی ہے۔“ اُس کے یوں کہنے پر وہ سامنے والے صوفے پر چڑھ گئی تو وہ کہتا چلا گیا۔

”راجیلہ! یہاں میرے لیے خطرہ ہے۔ اس شہر میں بلکہ اس ملک میں۔ میں ساری زندگی گھر کی اس چار دیواری میں بسر نہیں کر سکتا۔ مجھے باہر تو

لگانا ہے اس لیے میں نے سوچا ہے کہ یہ ملک ہی چھوڑ دوں۔“

”کب جانا چاہتے ہیں آپ؟“ اُس نے پرسکون انداز میں کہا۔

”چند دنوں میں۔“ یہ کہہ کر اُس نے پھر راجیلہ کی جانب دیکھا جہاں انتہار کے دیے ابھی سے روشن ہو گئے تھے اور آنکھوں میں پاس

آز آتی تھی تب وہ بولا۔ ”لیکن میں کچھ ہفتوں کے لیے جاؤں گا۔ ایک اچھی جاہ کی کوشش کروں گا اور پھر تمہیں بھی اپنے پاس بلا لوں گا۔“

”مطلب جب تک آپ کو ہاں ٹھہرنے کا جواز نہیں مل جاتا تب تک میں انتظار کروں؟“ وہ ویرے سے بولی۔

”ہاں۔۔۔ میں ایسا ہی کرنا ہوگا۔ حالات بدلتے دیر نہیں لگتی۔ ممکن ہے بہت جلد میرے لیے یہاں خطرہ نہ رہے۔ ہم واپس بھی آسکتے ہیں لیکن میں جو اپنی تنظیم کے لیے کم ہو چکا ہوں فی الحال ابھی کچھ عرصے کے لیے کم ہی رہنا چاہتا ہوں۔“

”جنید! میں کبھی بھی آپ کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنی۔ آپ جو چاہیں کریں۔ میری ذمائی آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ کا دیا ہوا انتظار بھی مجھے قبول ہے۔“ اس نے حتیٰ انداز میں کہا لیکن لہجہ ٹھیک چکا تھا اس لیے وہ جلدی سے اٹھی اور باہر کی طرف جانے لگی۔

”ٹھہر ڈرا حیلہ!۔۔۔ کیا تم میرے فیصلے سے مطمئن نہیں ہو؟“ اس نے تیزی سے پوچھا۔

”بات فیصلے پر مطمئن ہونے کی نہیں آپ کے حکم کی ہے۔۔۔ یہ بات نہیں کہ مجھے جدائی پر ڈکھ نہیں ہو رہا ہے۔ مجھے ڈکھ ہوگا لیکن خوشگوار اور آپ کے ساتھ والی زندگی کے لیے میں یہ انتظار قبول کر سکتی ہوں۔“

”میں نے تمہاری مصروفیت کے بارے میں بھی سوچا ہے۔ چند ہفتے مجھے دو مہینے سب ٹھیک کر لوں گا۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے جیسا آپ چاہیں۔“ اس نے کہا۔ پھر بدلے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”وہ ہاتھوں کا فون آیا تھا آپ سے ملنا چاہتا ہے۔“

”کب فون آیا تھا۔۔۔؟“

”تھوڑی دیر پہلے۔۔۔ میں یہی بتانے کے لیے آئی تھی۔“

”بلالو!۔۔۔ دیکھیں کیا کہتا ہے؟“

اس نے نرم سے انداز میں کہا پھر خود ہی اس کے ساتھ کمرے سے باہر نکلا جا گیا۔

کھانے کی میز پر چنید اور ہاتھوں دونوں موجود تھے۔ راحیلہ کھانا کھا رہی تھی رضیہ اپنے کام ختم کر کے راحیلہ کی والدہ کو کھانا دے کر اوپر اپنے بچوں کے پاس چلی گئی تھی۔ راحیلہ کھانا کھا لیگی تو ان کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

”ہاتھوں بھائی! بسم اللہ کریں۔“

”لیکن پہلے وہ بات تو سن لو جسے سنانے کے لیے یہاں تک آیا ہے یہ۔۔۔“ جنید نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اگر وہ خوشخبری ہے تو سنادیں لیکن اگر کوئی ایسی ایسی بات ہے تو کھانے کے بعد۔“ راحیلہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”مجھے تو یہ بتا چکا ہے اب تم سن لو۔“ جنید نے پھر سے خوشگوار لہجے میں کہا۔

”چلیں بتائیں۔۔۔؟“ وہ جنید کے لہجے سے سمجھ گئی تھی کہ کوئی خوشخبری ہی ہو سکتی ہے۔

”اس کی منگنی ہو رہی ہے اور وہ بھی اس لڑکی کے ساتھ جیسے یہ بے حد چاہتا ہے بلکہ شش کرتا ہے۔“

”وہی منیہ۔۔۔؟“ راحیلہ نے خوشگوار حیرت سے پوچھا۔

”ہاں وہی۔“ ہاتھوں نے ویرے سے کہا۔

”ارے واہ یہ تو اچھی خبر ہے۔“ وہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔

”پتہ نہیں اچھی ہے یا بُری۔۔۔؟“ جنید نے ہنستے ہوئے کہا۔

”اسکات کیوں کہتے ہیں آپ۔۔۔ ہمایوں بھائی نے جسے چاہا تھا ان کے من کی مراد مل گئی ہے۔۔۔ اور کیا چاہئے؟“ اس نے جنید کی

جانب دیکھتے ہوئے حیرت سے کہا۔

”خیر، کھانا کھاؤ۔۔۔ بعد میں بات کرتے ہیں۔۔۔“

جنید نے کہا اور پھر وہ کھانے کی جانب متوجہ ہو گئے۔۔۔ کھانے کے بعد وہ تینوں چائے سلگ لیے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔

راجیلہ شکر گئی کہ ہمایوں بات کرنے سب وہ بولا۔

”آپ ہمارے پس منظر سے واقف ہیں اس سے ملاقات کی تفصیل بھی میں نے آپ کو بتا دی تھی۔ آپ میرے گھر والے بہت خوش ہیں

بلکہ دونوں طرف سے ہی خوشی کا اظہار ہو رہا ہے۔۔۔“

”اصل بات کیا ہے۔۔۔؟“ وہ بے تابی سے بولی۔

”وہ یہ ہے کہ معاملہ میرے اور صفیہ کے درمیان آ کر ظہور کیا ہے۔ ہمارے درمیان خوشگوار زندگی کا ہونا ایک بڑا ہے۔ زندگی خوشگوار ہو بھی

سکتی ہے، نہیں بھی ہو سکتی۔ وہ دونوں خاندان جو قریب آ گئے ہیں پھر سے جدا بھی ہو سکتے ہیں۔ ہم اکٹھے رہ بھی سکتے ہیں اور۔۔۔“

وہ تذبذب میں تھا کہ جنید نے نوکتے ہوئے کہا۔

”ہمایوں اور اصل تم خود مطمئن نہیں ہو۔ سب سے پہلے تمہارا اپنا اطمینان بہت اہمیت رکھتا ہے۔ تم اس سے کوئی انتظام وغیرہ لے ہی نہیں

سکتے اس لیے کسی بھی فیصلے سے قبل یہ سوچ لو کہ تمہیں آ خر کرنا کیا ہے؟“

”وہی تو۔۔۔“

”نہیں، ہمایوں!“ جنید نے پھر اسے لوک دیا۔ ”میں نے اب تک جو دیکھا ہے، تم لاگت باصلاحیت سکی آگے بڑھنے کی تم میں قوت بھی

ہے لیکن صفیہ کے معاملے میں تم ڈسٹرب ہو کر کچھ بھی نہیں رہ جاتے ہو۔ اس راہ پر بھی خود کو مضبوط کرو اور ایک آخری بات۔ تم نے اس بارے

میں کسی بھی تم کا فیصلہ کرنے کے لیے اب میرے ساتھ مشورہ نہیں کرنا۔“ جنید نے دھیرے دھیرے کہتے ہوئے قدرے سختی سے کہا۔

”ایسا کیوں، جنید۔۔۔؟“ وہ حیرت سے بولا۔

”ڈنیا کا سب سے اہم ترین شخص وہ ہوتا ہے جو میاں بھوی کے معاملات میں آتا ہے۔۔۔ وہ تمہاری ازدواجی زندگی ہوگی۔ تم جو بہتر

بگھتے ہو وہی کرو۔“

جنید نے کہا اور خالی گک میز پر رکھ دیا۔۔۔ ہمایوں چہرے لمبے بیٹھا سوچتا رہا۔ پھر اچانک اٹھ کر اجازت چاہی اور باہر نکلا چلا گیا۔

”ایک بات اور۔۔۔“ جنید نے اسے نکتے نکتے روکا۔ ”میں نے تم سے پہلے بھی سرسری انداز میں کہا تھا کہ مجھے یا راجیلہ کو نون کرتے

وقت موہاں کی تم تبدیل کر لیا کرو۔ جو نرسب کو مظلوم ہے اس سم سے تم مجھے کال نہیں کرو گے۔“ جنید نے جیسے سمیری کی۔

”مجھے احساس ہے جنید! آپ لگژرہ کرو۔“ ہمایوں نے جواب دیا اور زُخمت ہو گیا۔

”آپ کو اتنی سختی نہیں کرنی چاہئے تھی۔“ راحیلہ نے ویرے سے کہا۔

”مجھے اس سے بھی زیادہ سختی سے پیش آنا تھا لیکن میں نے ایسا اس لیے نہیں کیا کہ وہ بچھدار ہے اور بات کو سمجھتا ہے چپ چاپ چلا گیا

ہے۔“

”کیوں۔۔۔؟“ وہ حیرت سے بولی۔

”اس کے دل میں چور ہے۔ وہ بظاہر صنیہ سے نفرت کرتا ہے لیکن اندر سے شدید محبت کرتا ہے بلکہ ایسا بھی نہیں ہے۔ وہ اُس سے نفرت یا

محبت کچھ بھی نہیں کرتا بلکہ وہ صرف دولت سے عشق کرتا ہے۔۔۔ دیکھ لینا وہ اُس کے لیے بہت کچھ کرے گا۔“

”آپ ایسا کیسے کہہ سکتے ہیں؟“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”اس لیے کہ میں یہی سمجھتا ہوں کہ وہ صنیہ سے نفرت کرتا ہے لیکن یہ عمل ایک جواز تھا ان دنوں آ کر مجھے احساس ہوا کہ وہ اندر سے کچھ

اور ہے وہ صنیہ کو دولت بنانے کی مشین کی مانند استعمال کرے گا۔۔۔ خیر چھوڑو ہمیں ان سے کوئی لینا دینا نہیں۔۔۔“

یہ کہتے ہوئے وہ اٹھنے لگا تو راحیلہ نے ویرے سے پوچھا۔

”تو کیا آپ نے باہر جانے کا ارادہ کر لیا ہے؟“

”بالکل میں اب اک نئے راستے سے اپنی منزل تک پہنچوں گا یہ یقین کا راستہ ہے۔“

اُس نے مسکراتے ہوئے کہا اور اٹھ گیا راحیلہ اُس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

جنید کو اچھی طرح یہ احساس تھا کہ گزارنے والا ہر لمحہ اُس کی زندگی کے لیے انتہائی قیمتی ہے۔ اس لیے کوئی بھی لمحہ ضائع کئے بغیر وہ ملک

سے باہر جانے کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ سب سے پہلے پاسپورٹ حاصل کرنے کا مرحلہ تھا جو دنوں میں اُس نے طے کر لیا تھا۔ اُس کے

ذہن میں کیا خیال آیا کہ اپنے ساتھ ہی اُس نے راحیلہ کا پاسپورٹ بھی حاصل کر لیا۔ دو ہی میں اُس کے دو انتہائی قابل اعتماد ساتھی تھے۔ اُن سے

رابطہ ہونے پر اُس نے سرسری طور پر انہیں تمام معاملہ سمجھا دیا اور تقریباً اُس کی تیاری مکمل ہی تھی کہ ایک دن ہمایوں کا فون آ گیا۔ چند ادھر ادھر کی

باتوں کے بعد وہ بولا۔

”میں نے اب مشورہ کرنے کے لیے نہیں آپ کو دعوت دینے کے لیے فون کیا ہے۔“

”کس سلسلے میں۔۔۔؟“ جنید نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

”سب معاملات سلجھ گئے ہیں جنید بھائی! اسی لیے گھر والوں نے فوری طور پر دو دن بعد منگنی کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور اس فنکشن میں آپ

نے لازمی آنا ہے۔۔۔ بھائی کو بھی لائیے گا۔“ ہمایوں نے کہا۔

”تم جانتے ہو ہمایوں! میں یہ دن کیسے گزار رہا ہوں۔ اسی صورتحال میں میرا کلنا کسی فنکشن میں شرکت کرنا ممکن نہیں ہے۔“ جنید نے اسے سمجھایا۔

”میں آپ کی ہر بات مان لیتا ہوں جنید بھائی! لیکن یہ بات نہیں مانوں گا۔۔۔ پلیس زیادہ دیر کے لیے نہیں لیکن تھوڑی دیر کے لیے شرکت کرنے ضرور آجائیے گا اور اگر آپ شائے تو میں فی الحال یہ فنکشن ہی ملتوی کر دیتا ہوں ایسی خوشی جس میں میرا حسن ہی شامل نہ ہو، کیا فائدہ رہے گا سمجھیں، فنکشن ملتوی۔“ ہمایوں نے جیسے قطعی لہجے میں کہا۔

”نہیں، فنکشن ملتوی مت کرنا۔۔۔ آپ ضد کر رہے ہو تو میں آ جاؤں گا لیکن صرف چند لمحوں کے لیے اور راحیلہ نہیں آسکے گی۔ میں چند ضروری کاموں کے سلسلہ میں باہر ہوں گا اور وہیں سے تمہارے فنکشن میں شرکت کر لوں گا۔۔۔“ جنید بادل خواستہ رضامند ہو گیا۔

”بہت شکر یہ جنید بھائی! آپ تھوڑی دیر کے لیے ہی آ جائیں میرے لیے یہی کافی ہے۔“ ہمایوں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ جس دن ہمایوں کی منگنی تھی جنید صبح ہی گھر سے نکل آیا۔ اسے چند انتہائی اہم کام منٹانے تھے۔ سارا دن اس بھاگ دوڑ میں گزار گیا۔ شام کو اس نے کچھ خریداری کی کہ اگلے دن صبح اس کی رواجی تھی۔ جس وقت وہ ہمایوں کی منگنی میں شرکت کے لیے پہنچا تو تقریب میں خوب مہمانگمی تھی میڈیا والے بھی وہاں موجود تھے جنہیں دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا لیکن پھر بھی وہ بہت محتاط انداز میں ہمایوں سے ملا اور چند ہی وہاں سے نکل آیا۔۔۔ گھر آنے کے بعد بھی وہ راحیلہ کو زیادہ وقت نہ دے سکا کہ صبح اس کی رواجی تھی۔

☆ ☆

صفیہ لان میں بیٹھی اپنے خیالوں میں مگن تھی جیسے جیسے دن ڈھلتا چلا جا رہا تھا اس کے من میں بے چینی اسی قدر بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ وہ دن اس کی زندگی کا اہم ترین دن تھا۔ اس کی نگاہیں گیت پر لگی ہوئی تھیں اور ذہن میں ہاں اور ناں کے درمیان وہ کرب ناک کیفیت میں خود کو محسوس کر رہی تھی۔ وہ دن اسی کرب کی انتہا کا تھا جو گزشتہ چند دنوں سے دیرے دیرے اس کے من میں اٹھا تھا۔ ان لمحات میں وہ ان دنوں کا تجربہ کر رہی تھی۔۔۔ ہمایوں سے ملاقات میں اس نے اپنا آپ کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔ جہاں اس نے ہمایوں کی حیثیت کو تسلیم کیا تھا وہاں اپنی خواہش بھی واضح کر دی تھی۔ یہی وہ نکتہ آواز تھا جہاں سے اس کے من میں کرب انگیز کیفیت نے جنم لیا تھا اور وہ ہونے یا نہ ہونے کے درمیان آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ بظاہر اس نے خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ اس کے بارے میں گھر والے جو فیصلہ کرتے ہیں وہ قبول کر لینے کو چاہی طور پر تیار تھی لیکن ہمایوں سے فون پر ہونے والی باتوں نے بے چینی بڑھا دی تھی۔ صفیہ کے ذہن میں یہ بات پوری طرح واضح تھی کہ ہمایوں اس سے اپنا انتقام لے گا، نئی بھر کے اپنی بے عزتی کا بدلہ لے گا۔ جس قدر اس نے نفرت کی تھی اس کو جواب اسے بھی بڑھ کر ملے گی یا پھر اس نے وہی کرنا تھا جو اس کی محبت اس سے کرائی۔ اگر اس کے دل میں محبت ہے تو پھر وہ اس کی خواہشوں کو پورا کرنے کی بھرپور کوشش کرے گا۔ ہمایوں سے ملاقات کے بعد اس نے سوچ لیا تھا کہ اگر ہمایوں کے دل میں اس کے لیے محبت ہے تو وہ اسے استعمال کرے گی۔ اس کے نزدیک محبت انسان کو بے حد کمزور کر دیتی ہے۔ وہ بظاہر پرسکون انداز میں دونوں گھروں کے درمیان بڑھتے ہوئے تعلق کو دیکھتی رہی تھی۔ لیکن بی بی اور نب دونوں ہی اس میں پیش

عشق کا ہے عشق بتا

پیش تھیں جس کا منتہی نتیجہ ان دونوں کی مکملی کی صورت میں نکلا۔ وہ اور سلی دونوں ہی اس گھر کی بہو ہوں گی یہ طے ہو گیا۔ دونوں گھر ہی بہت خوش ہوئے اور اس خوشی کا اظہار مکملی کی رسم کو دھوم دھام سے منا کر کیا گیا۔ سیاستدان اس موقع سے بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ تو کسی کی منت پر بھی جائیں تو واضح ہو کر تصور بنواتے ہیں یا اس کا چرچا اخباروں میں دیکھ کر خوشی محسوس کرتے ہیں اور کچھ کرنا یا نہ کرنا ہو کسی بھی سانچے یا حادثے پر مدتی بیان ضرور داغ دیتے ہیں۔ نئی زمانہ سیاستدان یا شہزادے کے بندے میں اس حوالے سے کوئی فرق باقی نہیں رہ گیا۔ ہمایوں نے بھی اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اپنے حلقہ کے بااثر لوگوں کو نہ صرف دعوت دی بلکہ اس کا چرچا اخباروں میں بھی ہوا۔ اس پر صنیہ بہت خوش ہوئی تھی اس حوالے سے نہیں کہ اس کی مکملی دھوم دھام سے ہوئی ہے یا شہر بھر میں چرچا ہوا تھا بلکہ اس نے اس سارے واقعے میں ہمایوں کی اس خوشی کو محسوس کیا تھا جو اس کے من میں تھی۔ وہ دل سے چاہتا تھا کہ صنیہ اس کی ہو جائے اور اس خواہش کی تکمیل پر اس نے بہت زیادہ خوشی کا اظہار کیا تھا اور پھر اس دن صنیہ پر یہ بات واضح ہوئی جب انون پر باتیں کرتے ہوئے ہمایوں نے کہا تھا۔

”صنیہ تمہارا خواب یہی ہے نا کہ تم ایک بزنس وومن کے طور پر پہچانی جاؤ۔ میں تمہارا وہ خواب پورا کر سکتا ہوں، جب بھی تم چاہو لیکن کیا تمہارے اعتماد کا اعتماد ہے کہ تم کسی بھی بزنس کو سنبھال سکو؟“

”کیوں نہیں۔۔۔ میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہی یہی ہے۔ میں نے ہمیشہ خود کو ایک بزنس وومن کے طور پر دیکھا ہے۔ میرا امتحان نہ ہوتا تو میں پاپا کے ساتھ بزنس شروع کر بھی چکی ہوتی۔ اب میرے امتحان تم ہو گئے رزلٹ آ گیا اور میں مزید نہیں پڑھنا چاہتی لیکن اگر مجھے پڑھنا پڑا تو پڑھوں گی۔“

”یہ بات میری کچھ میں نہیں آئی۔ پڑھنا نہیں چاہتی اور۔۔۔؟“

”دیکھیں اگر بزنس کی کوئی بھی صورت بن گئی پاپا راضی ہو گئے یا آپ کوئی میرے لیے صورت ملاتے ہیں تو پھر میں کہاں تعلیم حاصل کروں گی بزنس میں تو تجربہ چلتا ہے لیکن اگر کوئی بھی میرے لیے کچھ نہ کر پاتا تو پھر مجبوری میں مجھے پڑھنا ہی پڑھے گا یا پھر آپ کے گھر کا لیکن سنبھالنا پڑے گا۔“

”تم نے ابھی تجربے کی بات کی ہے وہ تو آتے آتے آئے گا؟“

”پاپا ہیں نا وہ بھائی کے بزنس کو دیکھ رہے ہیں۔ دو چار مہینے وہ مزید ملازمت کریں گے پھر میں اور پاپا دونوں مل کر ہی بزنس کریں گے۔ تجربہ خود بخود آتا چلا جائے گا۔“

”ٹھیک ہے صنیہ! میں تمہیں اور تمہاری خواہش کو مقدم رکھتا ہوں۔ میں تم سے شادی ہی اس وقت کروں گا جب تم کہو گی۔ میں آج ہی سے چاہتا ہوں کہ تمہارے لیے کسی سیٹ آپ کا بندوبست کرتا ہوں۔“

”کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں؟“

”اس میں شک والی بات بھی کیا ہے تم چند دن تک خود ہی دیکھ لو گی۔“

اس دن کے بعد سے صنف کے خواب اور سوچیں ایک نیا رنگ لیے ہوئے تھے۔ ہر آنے والا دن اسے اپنی کامیابی کے نزدیک کرتا چلا جا رہا تھا۔ روزانہ اس کا باپ اس سے باتیں کرتا، کوئی نئی بات بتاتا، اسی طرح ہمایوں سے بھی فون پر باتیں چلتی رہیں۔ دنوں میں وہ لکھ بھی آ گیا جب کاغذات پر حتمی دستخط کے بعد وہ ایک کاروبار کی مالک بن جاتی اور اس دن وہی لمحے اس کی خوشی اس کی جموںی میں ڈال دینے والے تھے۔ کرب اور بے چینی اپنے عروج پر تھی۔ لان میں بیٹھی وہ اپنے پاپا سے اپنا انتظار کر رہی تھی جنہوں نے آج ہر شے کو حتمی شکل دینا تھی۔ وقت و میرے و میرے گزرتا چلا جا رہا تھا اور وہ منتظر تھی۔ پھر اس کا انتظار ختم ہو گیا۔ اس کے پاپا کی گاڑی جو ٹھکانے پر تھی وہ بے تابی سے کھڑی ہو گئی۔ اس کے پاپا گاڑی سے نکلے اور گہری لٹا ہوں سے اس کی جانب دیکھا، پھر اس کی جانب ہی بڑھتے چلے آئے۔ اُن کے ہاتھ میں بیگ تھا جو انہوں نے بیڈ کی میز پر رکھا اور سامنے والی کرسی پر بیٹھے ہوئے بولے۔

”بہت بے چین دکھائی دے رہی ہو۔۔۔“

”جی پاپا۔۔۔“

وہ میرے سے بولی اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ تب اس کے پاپا نے بریف کیس کھولا اور اس میں سے سفید رنگ کی فائل نکالی، اسے میز پر رکھا کر بولے۔

”آج میری ہمایوں سے ایک تفصیلی نشست رہی جس میں سارے معاملے طے پا گئے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ لکھ بھر کے لیے نڈکے اور پھر کہتے چلے گئے۔ ”وہ میرے ہی انتظار میں تھا۔ جس طرح میں نے سوچا تھا، اُس نے بھی ویسی ہی بات کی۔ جو کاروبار تم کرو گی، اس میں وہ بھی شریک ہوگا۔“

اس کے پاپا نے کہا تو صنف کے دل میں خوشی بھر گئی۔ پھر ان کے درمیان اس سارے معاملے کی تفصیلات زیر بحث رہیں یہاں تک کہ پاپا نے آخری بات کہتے ہوئے کہا۔

”میں نے آفس بھی دیکھ لیا ہے تم اسے اپنی پسند سے چاہو۔ میں جلد سبکدوش ہو جاؤں گا اور پھر تمہاری ہر طرح سے مدد کروں گا۔“

”پاپا! آپ میرے لیے۔۔۔!“ وہ جذباتی ہو گئی تھی۔

”ہاں بیٹا! والدین کو اپنے بچوں کے لیے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔“

انہوں نے بھی گھوم کر لہجے میں کہا۔ نجانے اُن کے دل میں کیا کچھ تھا۔ پھر ان میں کوئی گفتگو نہ ہوئی اور دونوں اٹھ کر اندر چلے گئے۔

☆☆

راحیلہ کے ڈرائنگ روم میں خوشگوار ماحول کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کے سامنے نسرین بیٹھی ہوئی تھی، اُس کے ہاتھ میں چائے کا گلاس تھا اور سامنے دھرے لوازمات میں سے سکٹ اٹھاتے ہوئے اُس نے خوشگوار حیرت سے کہا۔

”راحیلہ! ہاتھل کے پہلے تین برس ہم نے کس قدر روٹی پریشانی میں گزارے تھے اور میرا خیال ہے کہ تم نے اس طرح کی زندگی کے بارے میں

سوچا بھی نہیں ہوگا۔ کیا نہیں درست کہہ رہی ہوں؟“

”ہاں تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔۔۔ ہاشل کی زندگی واقعتاً وہی پریشانی کی زندگی تھی۔ وہ ڈاکٹر جمیل اور اس جیسے لوگ۔۔۔ خیر چھوڑو۔۔۔“

اس نے ماضی کی تعجبی کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

”اوہاں یاد آئی تم تو پھل پھرتی تھیں ہو۔ وہ ڈاکٹر جمیل اب نہیں رہا برین عمیر جی ہو اور۔۔۔“

نسرین نے دھیرے سے کہا جس پر راحیلہ نے کوئی بھی تاثر نہیں دیا۔ جیسے نہ اسے خوشی اور نہ دکھ ہوا ہو بس نسرین کی جانب دیکھتی رہ گئی تھی۔ اصل میں انسان کبھی نہیں مرتا۔ جب تک وہ کسی نہ کسی حوالے سے یاد رہتا ہے ایک طرح سے وہ زندہ ہی ہوتا ہے۔ بحث اس سے نہیں کہ اس کی یاد کسی حوالے سے ہے؟ جیسے حضرت آدم ربی دنیا تک زندہ ہی رہیں گے۔ الہامی مذہب ہو یا غیر الہامی خدا کو ماننے والے ہوں یا نہ ماننے والے کسی نہ کسی حوالے سے وہ حضرت آدم کو ضرور یاد رکھتے ہیں۔ تب سے لے کر آج تک کے درمیان میں کتنے لوگ اس دنیا پر آئے اور چلے گئے لیکن حوالہ کن کا زندہ رہا ہے یہی لہو لکھریہ ہے۔ اس کے علاوہ ہر انسان اپنے ہونے کا ایک حوالہ رکھتا ہے۔ وہ حوالہ جیسا بھی ہو اگر اپنی زندگی میں وہ خود ختم کر لیتا ہے۔ اس سے دستبردار ہو جاتا ہے تو کبھی اسی وقت فنا ہو گیا۔ فنا اور فنا کی اصل حقیقت ہی یہی ہے کہ یہ دونوں طرفین ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں بلکہ ایک دوسرے کی پیدائش کے ذمہ دار ہیں۔ فنا سے بھاگے اور بھاگے۔ بالکل اسی طرح ہے جیسے زندگی سے موت اور موت سے زندگی کا احساس موجود ہو۔ مادی جسم تو اس کے اظہار کا وسیلہ ہے۔ جب تک مادی جسم موجود ہے فنا اور بھاگنا اظہار رہا ہے اور کوئی طریقہ ہی نہیں ہے۔ مادی جسم سے جو اظہار ہو رہا ہے وہ کردار کہلاتا ہے اور کردار ہی فنا اور بھاگنا کی سمت متعین کرتا ہے۔ اگرچہ یہ ایک عام سی بات ہے کوئی فلسفہ نہیں۔ کوئی اگر یہ چاہے کہ اس کا کوئی سائنسی پہلو یا اس کی کوئی سائنسی دلیل ہے تو وہ زیادہ اہمیت کے ساتھ اسے ثابت کر رہی ہے۔ مثال کے طور پر آئین سائیکس کا قانون توانائی۔ اس کے مطابق مادہ توانائی میں تبدیل ہو سکتا ہے اور توانائی مادے میں بدل سکتی ہے۔ اگرچہ یہ نظریہ وجدان کی بنیاد پر رکھا گیا تھا لیکن ڈیڑھ صدی گزرنے کے بعد اسے سائنسی اہمیت ملی ہے۔ فنا اور بھاگنا کی بحث اس معاملے کو بھی دیکھنے کی بنیاد ہے کہ دوبارہ زندگی کیسے ملے گی؟

”ہاں۔۔۔ جو اس دنیا میں آیا ہے اس نے جانا بھی ہے۔“

راحیلہ نے بے سوج لہجے میں کہا جیسے وہ اس خبر پر اس سے زیادہ تہمت نہیں کرنا چاہتی۔ اس پر دونوں کے درمیان خاموشی آگئی یوں جیسے ان کے پاس بات کرنے کے لیے کوئی موضوع ہی نہ رہا ہو۔ چند لمحوں بعد نسرین ہی نے اس خاموشی کو توڑا۔

”جنید بھائی دکھائی نہیں دیتے؟“

اس پر راحیلہ نے یوں اس کی جانب دیکھا جیسے وہ ایک درد سہی دنیا میں آگئی ہو۔ اس کا تاثر ہی بدل گیا مسکراتے ہوئے

بولی۔

”وہ یہاں نہیں ہیں میں نے اسی لیے تمہیں بلایا ہے۔“

”ہائیں وہ نہیں ہیں اور مجھے بلایا ہے۔“ سمجھ نہیں آئی؟“ نسرین نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”وہ اس ملک میں نہیں ہیں۔ چند دن ہوئے دوہنی چلے گئے ہیں اور یہ معاملہ انہوں نے انتہائی خفیہ رکھا ہے۔ سوائے میرے کسی کو بھی

نہیں معلوم۔۔۔“

”یہ تم کیسی اچھی ہوئی باتیں کر رہی ہو۔۔۔ اگر انہوں نے اپنا دوہنی جانا خفیہ رکھا ہے تو مجھے کیوں بتا رہی ہو؟“ وہ ہنستے ہوئے بولی۔

”اس لیے کہ انہوں نے ہی مجھ سے کہا تھا۔۔۔ خیر نہیں تمہیں تفصیل سے بتاتی ہوں۔ اُن کا خیال ہے کہ وہ دوہنی یا کسی دوسرے ملک

میں رہنے کا بندوبست کریں گے۔ وہ نہیں چاہتے کہ اپنی پرانی زندگی میں لوٹ جائیں لہذا یہاں رہنے کے لیے کوئی جواز نہیں اور نہ ہی وہ روہ سکتے ہیں

دوسرے دس ہی میں جانا ہوگا۔ جاتے ہوئے انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں تمہیں یہاں اپنے پاس لے آؤں۔ ہم دونوں نے فرسنگ کو رس کیا ہے

سو یہاں ٹیکہ بناؤں اور جہاں تک ممکن ہو لوگوں کی خدمت کریں۔ وہ لوگ جو کسی نہ کسی حوالے سے مستحق ہیں ان کے کام آئیں۔ اگر تم رضامند

ہو تو میرے ساتھ آؤ یہاں رہو اور چاہو تو نوکری کرو۔۔۔“

راحیلہ نے تفصیل سے بتایا اور کسی متوقع جواب کے لیے اُس کی جانب دیکھنے لگی۔ نسرین نے ہونے اور حیرت زدہ چہرے کے ساتھ اس

کی جانب دیکھتی رہی پھر اُس کی ہلکی سی جھنجھکی لگیں یہاں تک کہ اُس تک میز پر رکھا اور گہری سانس لے کر جھکے ہوئے لہجے میں بولی۔

”راحیلہ! مجھے پہلی بار احساس ہوا ہے کہ زندگی میں کوئی تو اپنا ہے اور ایک انسان دوسرے انسان کے کام بھی آتا ہے۔۔۔ مجھے لوگوں کی

خدمت کا احساس نہیں لیکن میں ایک گھر کے لیے ترس گئی ہوں۔ ماں باپ کے ساتھ تھی تو وہ مجھے ذاتی طور پر بھی باور کراتے رہے کہ میں پیدا ہی اس

لیے ہوئی ہوں کہ چیر کھاؤں۔ مشنری سکول کے بائبل میں رہی وہاں سے فرسنگ بائبل۔ میرا نہیں خیال کہ تم میرے والدین سے کبھی ملی ہو۔

انہیں بس میری تکواہ کے آدھے حصے سے غرض ہے اور مزید کا مطالبہ رہتا ہے۔ انہوں نے بھی میرے ساتھ یہ بات نہیں کی کہ میں عورت ہوں۔

میرے بھی جذبات ہیں میرا بھی ایک گھر ہونا چاہئے اور وکٹر۔۔۔ وہ یہاں نہیں ہے۔ وہ تو مذہب کی خدمت کے لیے خود کو وقف کر چکا ہے۔ اب کوئی

میری جانب جاتے ہوئے بھی بڑھائے گا تو اسی وجہ سے کہ میں اچھا سا کمانی ہوں اور وہ ساری زندگی بیٹھ کر کھانے گا۔ کیا ہے زندگی؟۔۔۔ اب تم نے مجھے

اپنے ساتھ رہنے ایک گھر میں رہنے کی آفر دی ہے تو مجھے یوں لگا جیسے میں بھی انسان ہوں میں بھی کسی گھر میں رہ سکتی ہوں اور اس پر حیرت والی

بات یہ ہے کہ جنید بھائی کو میرا خیال رہا۔۔۔“

وہ یوں کتنی چلی جا رہی تھی جیسے پھٹ پڑی ہو۔ انسان دوسروں کی توجہ ہمدردی اور محبت کے لیے یوں بھی ترستا ہے؟ راحیلہ کے لیے یہ

حیران کن تھا۔

”تم اگر پہلے کبھی اشارہ بھی دو سوتی تو میں ضد کر کے تمہیں اپنے ساتھ رکھتی۔“ راحیلہ بولی۔

”کیسے کتنی تم بھی تو۔۔۔ خیر نہیں مان گئی ہوں کہ محبت میں جب یقین شامل ہوتا ہے تو سب کچھ ممکن ہو جاتا ہے۔ میری محبت وہ محبت

نہیں تھی جو تمہاری ہے تم جو راتوں کو اٹھ اٹھ کر دعائیں کیا کرتی تھیں اس کا نتیجہ میں دیکھ رہی ہوں۔ کبھی کبھی بن مائے مانتے ہے اور کبھی ان لوگوں

سے تعلق کی بنا پر بھی مل جاتا ہے اور جو خدا کے حضور پسندیدہ ہو جائیں خدا انہیں برکت دے دیتا ہے۔" وہ ممنونیت بھرے لہجے میں کہتی چلی گئی۔

"چھوڑو ان باتوں کو۔۔۔ جنید نے اگر تمہارے بارے میں کہا ہے تو کچھ سوچ کر ہی کہا ہوگا۔ اب کیا خیال ہے تمہارا؟"

"میں ابھی سے تمہارے گھر میں ہوں۔ نہیں بلکہ اپنے بھائی کے گھر میں ہوں۔ جہاں تک نوکری کا معاملہ ہے وہ بھی میں چھوڑ دوں

گی۔ جو بھائی نے کہا ہے وہی کروں گی۔" وہ ایک دم سے خوش ہوتے ہوئے بولی۔

"تو پھر ٹھیک ہے تم اس کمرے میں رہو جو میرا تھا۔ جس قدر جلدی ممکن ہو سکا ہم کلیٹک بنا لیں گے۔ سب تختیاں بھول جاؤ۔ اب ہم

ایک نئی زندگی کی شروعات کریں گے۔"

راحیلہ نے کہا تو وہ ایک دم سے رونے لگی۔ راحیلہ اٹھی اور اس کے پاس چلی آئی، کافی دیر تک اس کی دلجوئی کرتی رہی یہاں تک کہ وہ

نارمل ہو گئی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اچھے جذبات، مظلوم نیت اور خوش گمانی اپنا اثر ضرور رکھتی ہے۔

☆ ☆

ہمایوں اس وقت اسی صنعت کار سینٹھ حفیظ کے پاس بیٹھا ہوا تھا جو اس کا پاس بھی تھا اور سیاست میں اس کا گڈ فادر بھی۔ کوئی وقت تھا

جب جنید نے اس کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیا تھا اور جس کے ٹل بوتے پر وہ علاقے میں نہ صرف اپنا سیاسی اثر و رسوخ بنا چکا تھا بلکہ شہر کے اہم لوگوں

میں بھی اس کا شمار ہو چکا تھا۔ سینٹھ حفیظ سے اس کی ملاقات بہت کم ہی ہوا کرتی تھی زیادہ تر فون پر پر یا پھر ان کے جنرل منیجر کی طرف سے کوئی بات

اس تک پہنچ جاتی تھی ورنہ ہمایوں اپنے معاملات میں آزاد تھا اور بہت تیزی سے اپنی جگہ بنا چکا تھا۔ اس دن جب سینٹھ حفیظ کی جانب سے بلاوا آیا تو

وہ دونوں تھے ان کے درمیان تیسرا کوئی فرد نہیں تھا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ کوئی نہ کوئی اہم بات ہوگی۔ سینٹھ حفیظ حسب عادت حالات کے بارے میں سوال

کر کے خاموش ہو گیا اور ہمایوں بتاتا رہا۔ وہ کہہ چکا تو سینٹھ حفیظ نے وچیرے سے پوچھا۔

"تم جنید کے بارے میں جانتے ہو کہاں ہے وہ آج کل۔؟"

اس غیر متوقع سوال پر ہمایوں نے صرف گڑبڑا گیا بلکہ یہ سوال اسے چونکا دینے کے لیے کافی تھا۔

"مصر ہوا اس سے ملاقات نہیں ہوئی، کبھی کبھار وہ خود ہی فون کر لیتا ہے۔ میں اگر چاہوں بھی تو اس سے رابطہ نہیں کر سکتا، وہ کہیں

روپوشی کی زندگی گزار رہا ہے۔" اس نے محتاط انداز میں کہا۔

"دیکھو ہمایوں! تمہیں یاد ہوگا کہ اس نے ہی تمہارا تعارف کرایا تھا اور تم میری توقع کے مطابق بالکل ٹھیک رہے ہو۔۔۔ اس کا پس منظر

کیا ہے میں پہلے نہیں جانتا تھا لیکن کچھ دنوں سے مجھے اندازہ ہوا۔ میں شاید یہ جاننے کی کوشش بھی نہ کرتا لیکن یہ میری مجبوری تھی کہ مجھے یہ سب جانا

پڑا۔" اس نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

"میں سمجھتا ہوں۔؟" ہمایوں تیزی سے بولا۔

"میں سمجھتا ہوں۔۔۔ تمہیں اور بہت کچھ بھی سمجھانا ہے لیکن وچیرے وچیرے ہی تو سمجھا پاؤں گا۔" سینٹھ حفیظ نے اسی سنجیدگی سے کہا

اور پھر چند لمبے وقف کے بعد بولا۔ ”مجبوری میری یہ ہے کہ جس بندے نے مجھے احساس دلایا ہے وہ میرا دوست بھی ہے اور منہ نکار ہونے کے ناتے ہمارے سیاسی مقاصد ایک ہی ہیں۔ خیر، ان باتوں کو چھوڑو۔ میں تمہارے ہارے ہی میں بات کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر سینٹہ حفیظ نے اپنا بوجھا ہوا سنگار منہ میں لیا اسے چلایا اور دھواں گھٹا میں بکھیرتے ہوئے بولا۔ ”انکیشن بہت قریب ہیں۔ ہماری پارٹی ڈالواں ڈول ہے کہ انکیشن میں حصہ لے یا نہ لے مگر اندر کی خبر یہی ہے کہ ہم انکیشن میں حصہ ضرور لیں گے ہماری جہاں اسی میں ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ کم از کم ایم پی اے کا ٹکٹ تمہیں ملے اور ٹکٹ نہ بھی ملا تو آزاد حیثیت سے انکیشن تو لڑنا ہی ہے۔ تم نے مقفی کی اور بڑی دھوم دھام سے کی اچھا کیا۔ اس سے شہر بھر کو معلوم ہو گیا کہ جس لڑکی کے ساتھ تم شادی کر رہے ہو وہ تمہاری بچھا زاد ہے۔ اب تمہاری شادی کا پروگرام کیا ہے۔ مطلب کب کر رہے ہو؟“

”فی الحال تو کوئی طے نہیں کیا لیکن جلد ہی۔۔۔“ ہاویوں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے گول مول جواب دیا۔

”خدا ہرے تم شادی کرو گے تو شادی کے بعد کچھ عرصہ تک تمہاری باہر کی مصروفیات کم ہو جائیں گی۔ ممکن ہے تمہیں ہون کے لیے کسی دوسرے ملک بھی جاؤ تو ایسے میں حالات۔۔۔ میرا مطلب ہے سیاسی حالات پر نگاہ رکھنے میں بہت دشواری آئے گی۔ کیا خیال ہے تمہارا۔۔۔؟“

سینٹہ حفیظ نے یہ کہا اور سنگار کا کاش لیتے ہوئے اس کی جانب غور سے دیکھا۔

”میں سمجھ گیا شادی انکیشن کے بعد ہی ہجر ہے گی۔۔۔“ ہاویوں تیزی سے بولا۔

ناش کے بنے

نجر کی بساط پر کھلی جانے والی خونی بازی..... ایک جنونی قائل کا قصہ جو دنیا کے عظیم ترین قائلوں کے درمیان اپنا نام سرفہرست رکھنا چاہتا تھا۔ ناش کے ہاؤن پتے اُس کے مرکز نظر تھے۔ فی قتل ایک پتے کے حساب سے شروع ہونے والا یہ سلسلہ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ قانون کے محافظ معمولی سے سراخ کو بھی فراموش نہ کرتے ہوئے قائل تک پہنچنا چاہتے تھے۔ مگر قائل کی احتیاط پسندی اور فنکاری محافظوں کی راہ میں حائل تھی۔

سٹر سٹریٹس اور سٹینس پھیلانے والے اس ناول کی دلچپ ترین بات یہ ہے کہ قائل آپ کے سامنے ہونے کے باوجود بھی ساتھ پردوں میں پوشیدہ ہے۔

ناش کے بنے ایک سنسنی خیز اور دلچپ ترین ایڈو نجر سے بھرپور ناول ہے جسے کتاب گھر کے ایکشن ایڈیٹور جاسوسی ناول سبکشن میں بہت جلد پیش کیا جائے گا۔

”ہاں یہ اچھی بات ہے لیکن جس بندے نے — میرا مطلب ہے جنیڈ نے تمہارا تعارف کروایا مگر وہ آپ منظر پر نہیں ہے۔ اب جبکہ تم ایکشن میں جا رہے ہو تو تمہاری کیا مدد کرے گا؟“ ہاس نے دیکھنے سے لہجے میں پوچھا۔

”آپ وہ سامنے تو ہے نہیں۔ ہم جیسے ہی اس کا فون آتا ہے سنیں اسے ساری صورت حال بتاؤں گا۔“ ہمایوں نے قہقہے سے کہا۔

”مجھ سے بھی تو کوئی رابطہ نہیں ہوا اس کا۔“ سیٹھ حفیظ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”سنیں آپ کا بیٹا مومے دوں گا۔۔۔ بلکہ وہ آپ سے رابطہ کرے گا۔“ ہمایوں نے یقین دہانی کروائی۔

”دیکھو یہ تمہارے کیریئر کا سوال ہے۔ اس میں جنیڈ بہت زیادہ اہمیت اختیار کر گیا ہے اس کا ہونا بہت ضروری ہے ورنہ شاید ہم وہ کچھ نہ کر پائیں جو ہم سوچ رہے ہیں۔۔۔“

سیٹھ حفیظ نے پھر اصرار کیا تو ہمایوں کو لگا جیسے وہ کوئی اور بات کرنا چاہتا ہے اس لیے پوچھا۔

”جیسے اس کی روپوشی ہے اور پہلی والی کارکردگی بھی نہیں اس سے لگتا ہے کہ وہ اپنی عقیم میں نہیں رہا۔ اگر ایسا ہوا تو پھر۔۔۔؟“

”سچی نکتہ کھینچنے کی بات ہے۔۔۔ بات یہ نہیں ہے کہ اس کے ہنر میں تمہاری مدد نہیں کروں گا جبکہ میں تم پر بہت زیادہ سرمایہ کاری کر چکا ہوں۔ تمہیں ہر حال میں ایکشن ہونا پڑی مجبوری ہے لیکن اگر میرا نقصان کسی دوسری طرف سے پورا ہو جائے تو میں اس سے بھی دستبردار ہو سکتا ہوں۔“

”سنیں سمجھا نہیں۔ میں تو ایکشن کے بعد ہی آپ کا سرمایہ۔۔۔“

ہمایوں نے دھیرے سے کہنا چاہا تو سیٹھ حفیظ نے اس کو ٹوکتے ہوئے کہا۔ ”اے نہیں تم میرا سرمایہ ایکشن سے پہلے یا بعد میں کیا لوٹا سکو گے۔ میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے لمحہ بھر کو ہمایوں کے چہرے کی جانب دیکھا لہر بولا۔ ”ہر طبقے کے لوگوں میں مسابقت کے ساتھ ساتھ مل کر چلنے کی مجبوری بھی ہوتی ہے جیسے ہم صنعتکار ہیں تو تھوڑے سے تو ہیں اس شہر میں۔ ہم اگر ایک دوسرے کے ساتھ نہ چلیں تو بہت جلد ہم ختم ہو جائیں۔ جہاں پر ہمیں نقصان آ رہا ہو تو ہم ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ جس طرح میں نے تم پر سرمایہ کاری کی ہے کسی دوسرے نے بھی تو کی ہے۔۔۔ خیر یہ معاملہ بھی نہیں ہے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ جنیڈ نے ہمارے ایک صنعتکار دوست کو لوٹا ہے۔ اس کا بیٹا تورا خوا کیا تھا۔“

”جنیڈ نے۔۔۔؟“ ہمایوں بڑی طرح چونک گیا۔ اسے یوں لگا جیسے خطرے کا الارم بج چکا ہو۔

”ہاں اسی نے۔۔۔ میرا دوست اُسے نہیں جانتا تھا۔ اُس کے نزدیک چند دن پہلے تک وہ ایک انخواہ کار تھا لیکن جیسے ہی تمہاری مقفی کی تصویریں اخبار میں آئیں لوگوں کو پتہ چلا تو میرے صنعتکار دوست کی سمجھ میں ساری بات آ گئی۔“ سیٹھ حفیظ نے عجیب سے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

”سنیں اب بھی نہیں سمجھا کہ میرے معاملات سے انخواہ کا تعلق کیا ہو سکتا ہے؟“ ہمایوں دھیرے سے بولا۔

”جھوٹ بولتے ہو تم۔ تم جانتے ہو اور شامل بھی ہو اس معاملے میں لیکن کس حد تک اس کی تصدیق بہر حال نہیں ہے سو میں صاف

صاف کہتا ہوں کہ جنیڈہ میں چاہئے اسے دے دو اور اپنا کیریئر بچالو۔ ہم بھول جائیں گے کہ تم اس میں کس حد تک ملوث ہو۔ ہم جائیں اور جنیڈہ۔ تمہارے ساتھ ہمارا معاملہ ویسے ہی رہے گا جیسے کہ اب ہے۔" وہ سختی سے کہتا چلا گیا تو ایک دم سے ماحول میں سختی مچ گئی۔

"میں نہیں جانتا کہ اس نے یہ سب کیوں کیسے اور کب کیا ہے۔۔۔ میں مانتا ہوں کہ میرا جنیڈہ سے تعلق رہا ہے۔ اس نے میری بہت مدد کی ہے لیکن انخواہ وغیرہ میرے علم میں نہیں آپ میرا یقین کریں۔" ہمایوں نے بہت نرم لہجے میں یقین دہانی کروائی۔

"ہمایوں! تم اپنی مگتیر اور تیمور کے تعلق کے بارے میں جانتے ہو۔ ان دونوں کے درمیان کیا معاملہ ہوا یہ بھی تم جانتے ہو اور اسی طرح تیمور کا باپ جو میرا دوست ہے وہ بھی جانتا ہے۔ جنیڈہ کا اور تمہارا تعلق میں جانتا ہوں۔ ذرا سے غور کرنے پر کوئی بچہ بھی اندازہ لگا سکتا ہے کہ اصل معاملہ کیا تھا؟"

"وہی جو میں کہہ چکا ہوں۔" ہمایوں نے سختی سے لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے۔ تم جنیڈہ کو لے آؤ اور اپنا شاندار مستقبل لے جاؤ ورنہ۔۔۔" سینٹھہ حنیفہ یہ کہتے ہوئے ایک لمحہ کوڑکا اور پھر سخت لہجے میں بولا۔ "ورنہ میں تمہارا کیریئر خود تباہ کر دوں گا۔ تمہیں اس کا نل بھی نہیں چھوڑوں گا کہ کسی عدالت کے احاطے میں اپنا شیخ بھی رکھ لو اس لیے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا۔ جنیڈہ نے دو کروڑ ڈالنے ہیں۔ بات رقم کی نہیں آتا کی ہے۔ شیر کے منہ سے نوالہ چھین لینا کوئی معمولی بات نہیں۔ اس پر اگر چار کروڑ بھی خرچ آ گیا تو کوئی پرواہ نہیں کسی کی قربانی بھی دینا پڑی تو دے دیں گے لیکن جنیڈہ ہمیں چاہئے۔ بہتر ہے کہ تم ہی اسے کسی نہ کسی طرح ہمارے حوالے کر دو۔ انجام ملے گا تو کن اسٹیبل بھی بن جاؤ گے اور تمہاری ہونے والی بیوی کے کاروبار کے لیے رقم بھی ملے گی! اسے تحفظ بھی دیں گے ورنہ وہ کاروبار شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جائے گا۔ جاؤ! شام تک مجھے سوچ کر بتا دینا۔"

سینٹھہ حنیفہ نے آخری لفظ کچھ زیادہ ہی سختی سے کہے تو حریفہ کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہیں رہی۔ وہ باس الاعلق سا ہو کر بیٹھ گیا تو اسے اٹھنا پڑا۔ ہمایوں کے لیے ایسا اطمینان آن پڑا تھا جس میں ہر طرف خسارہ ہی خسارہ تھا۔

☆☆

صنیعہ کو اپنی منزل انتہائی قریب دکھائی دے رہی تھی۔ ایک آفس کا تصور مزاج تیار ہو کر آفس کے لیے ٹھکانا وہاں سارا دن مصروف رہتا۔ شہر اور بیرون شہر بزنس والوں سے باتیں ان سے ڈیل شہر کی مجلسی زندگی اور ایک خاص قسم کا انفرادیت کا تصور ہی سحر انگیز تھا۔ جب سے اس کے پاپانے خوشخبری سنائی تھی تب سے ایک شمارا لودی کیفیت اس پر حاوی تھی۔ وہ بڑے سکون نہیں تھی بلکہ اس کے اندر بہت کچھ کرنے کی بے چینی عود آئی تھی۔ وہ سکون سے بیٹھتی ہی نہیں تھی۔ دن بھر اگر اپنے بھائی اشعر کے آفس میں گزارتی تو رات کا بیشتر حصہ کپیوٹر استعمال کرتے گزر جاتا۔ وہ تھوڑے وقت میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کر لینا چاہتی تھی۔ وہ شخص جو اس کے بارے میں نہ جانتا ہوا سے پہلی نگاہ میں دیکھ کر یہی اندازہ لگاتا کہ وہ پاگل ہو گئی ہے۔ اس نے جو ایک خاص اسٹیلٹس اور دولت سے عشق کیا تھا اس کا ہدف سامنے تھا اور وہ پوری لگن سے اس کی جانب متوجہ تھی۔ اس رات بھی وہ لیپ ٹاپ گود میں رکھے بیڈ پر نیم دراز تھی۔ اس کی ساری توجہ سکرین پر تھی۔ رات ابھی اتنی گہری نہیں ہوئی تھی کہ اس کا فون بج اٹھا۔ اس نے بے

خیالی میں فون اٹھایا، نمبر دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کی اور فون کان سے لگا کر ہی لو کہہ دیا۔

”میں ہوں۔ کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔“ دوسری طرف تیمور کی آواز میں جہاں خوشگواریت تھی وہاں کسی حد تک طنز یا انداز بھی تھا۔

”کون؟“ مصفیہ نے جان بوجھ کر اُسے نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

”کہانا، ہم کبھی ایک دوسرے کے آشنا تھے۔ تم بھول گئی ہو اور تمہیں بھولنا بھی چاہئے لیکن میں تمہیں نہیں بھولا اور ہاں ایک بات سن لو۔

فون بند کرنے کی غلطی مت کرنا اور نہ تمہاری چاہی زیادہ بھیانک ہو جائے گی۔“

تیمور نے فراتے ہوئے کہا تو مصفیہ ایک دم سے چونک گئی۔ ایسا لہجہ تو اس نے کبھی نہیں سنا تھا۔

”تم کہنا کیا چاہتے ہو۔۔۔؟“

”میں مانتا ہوں کہ تم بہت ساری لڑکیوں سے منفرد ہوناز سے حسین بھی ہو۔ کسی بھی مرد کو اپنی جانب حوجہ کر لینے کی بھرپور صلاحیت رکھتی

ہو لیکن اتنی تنگی ہوگی یہ مجھے چند دن پہلے ہی معلوم ہوا ہے۔“ وہ پھر طنز سے لہجے میں بولا۔

”یہ تم کیا کہو اس کرتے چلے جا رہے ہو۔ تم ہوش میں تو ہو؟“ مصفیہ نے غصے میں کہا۔

”میں پورے ہوش و حواس سے بات کر رہا ہوں اور میں یہ سمجھتا بھی ہوں کہ تم سے اب بات کرنی چاہئے۔“ تیمور نے سرد سے لہجے

میں کہا۔

”تم آخر کہنا کیا چاہتے ہو، جلدی بولو۔ میرے پاس فضول وقت نہیں ہے۔“ وہ جان چھڑانے والے انداز میں بولی۔

”نہ ایسے نہیں کہتے دوسرے کو، ابھی لگ سکتا ہے۔“ خیر پہلے تو میں تمہارے ساتھ نکلا کھیل رہا تھا، ایسا کھیل جو میں کئی دوسری لڑکیوں

سے کھیلا رہا ہوں اور یہ کھیل اب بھی جاری ہے۔ تمہارے جھسی کئی خواہشوں کی ماری خود بخود اس کھیل میں شامل ہو جاتی ہیں اور میں۔۔۔“

تیمور کہہ رہا تھا کہ اُس نے بات کا سچے ہوئے کہا۔

”کچھ جاؤ گے یا کام کی بات کرو گے۔؟“

وہ ہڈیانی انداز میں بولی لیکن تیمور سنی آن سنی کرتے ہوئے کہتا چلا گیا۔

”اب میں تم سے خود کھیلوں گا۔ میں جانتا ہوں کہ تم کیا کر رہی ہو۔ میں تمہاری منگنی سے بھی واقف ہوں اور وہ جو تم پزیرا شروع کرنے جا

رہی ہو اپنے منگیتر کے ساتھ۔۔۔“

”تو پھر تمہیں کیا تکلیف ہو رہی ہے؟“ وہ انتہائی غصے میں بولی۔

”تکلیف تو مجھے ہوتی ہے کیونکہ میرے پیسے ہی سے تم یہ کاروبار شروع کر رہی ہو۔ وہ تمہارا منگیتر جو فون میں امیر ہوا ہے، پونجی نہیں ہو

گیا۔ اسے یہ سمجھ ہی نہیں ہے کہ دولت لوٹ لینا کوئی بڑی بات نہیں لیکن اسے ہضم کرنا بہت مشکل ہوتا ہے، خاص طور پر ان لوگوں کے لیے جو نچلے

درجے کے فریب لوگ ہوتے ہیں۔" اس کے لہجے میں پھر سے طنز سا گیا تھا۔

"دیکھو تم میرے ساتھ سیدھی بات کرو۔ آخر تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟" وہ ہنسنے لگا۔

"ہاں اب ہوگی کام کی بات۔ تو سنو۔ تمہارے منگیترنے مجھے اغواء کر لیا اور دو کروڑ کی رقم تاوان کے طور پر حاصل کی۔ میں نہیں جانتا

کہ اس نے اس رقم کے کتنے حصے کیسے ہیں یا اب اس کے پاس کتنی رقم روٹھی ہے لیکن میں ایک ایک پائی اس کے حلق سے نکالنے والا ہوں۔ وہ میرا اور اس کا معاملہ ہے لیکن تم اب وہی کرو گے جو میں چاہوں گا۔" وہ غصے میں کہتا چلا گیا۔

"مثلاً کیا کرو گے تم۔؟" اس نے انتہائی طنز سے کہا حالانکہ وہی طوطی پر ایک دم سے بکھر گئی تھی۔

"جو میرا دل چاہا۔۔۔ میں جب چاہوں تمہیں اپنے قدم پہ بلاؤں گا۔ وہ جو پہلے تمہاری مرضی سے چاہتا تھا اب اپنی مرضی۔۔۔"

"بکو اس بند کرو۔ تم میرے لیے ایک خارش زدہ ٹکٹے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے ہو کبھی تم۔۔۔ اور آئندہ اگر تم نے مجھے فون کیا تو مجھ سے نہ کوئی نہیں ہوگا۔"

صفیہ نے انتہائی غصے میں کہا اور فون بند کر دیا۔۔۔ وہ اس انکشاف پر حیرت زدہ رہ گئی تھی۔ یہ سوالیہ نشان اسکے ذہن میں تھا کہ ہاویوں

دونوں میں امیر کیسے ہو گیا اور اسے یہ بھی یقین تھا کہ راتوں رات امیر ہونے والے جائزہ سندھ نہیں کرتے۔ اس میں کالک ضرور ہوتی ہے مگر دولت

کالی ہے یا سفید اسے اس سے غرض نہیں تھی بس دولت ہونی چاہئے۔ تیمور یکدم پیچھے کیوں ہٹ گیا تھا اور ہاویوں اس سارے منظر پر اچانک

کیسے چلا گیا؟ ان سوالوں کے جواب بھی اسے مل گئے۔ اگرچہ یہ سوال ہنوز اپنی جگہ تھا کہ یہ سب اس نے کیسے کیا لیکن یہ حقیقت تھی کہ ایسا ہو گیا اور

اب جبکہ وہ اپنی منزل کے بالکل قریب پہنچ چکی ہے تو تیمور اسے دھمکیاں دینے لگا تھا۔ اسکا ایک دوسرا پہلو بھی تھا کہ ہاویوں اس سے اس قدر محبت کرتا

ہے کہ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ لی، کیا واقعی محبت تھی یا اس کی نظرت کا رول؟ اگر تیمور کی بات سچ ہے تو پھر وہ ہاویوں کو کبھی نہیں چھوڑے گا اور اگر ہاویوں

کے پاس دولت نہ رہی تو سب کچھ ٹکڑا جائے گا۔ یہی سوچ کر اس نے پریشانی کے عالم میں فوراً ہاویوں کے نمبر ملائے رابطہ ہوتے ہی اس نے کہا۔

"ہاویوں! مجھے بہت عجیب سی فون کال ملی ہے۔" اس نے عجاظ انداز میں کہا۔

"کیا۔۔۔؟" وہ بولا۔

"کوئی یہ کہہ رہا ہے کہ تم نے تیمور کو اغواء کر لیا اور دو کروڑ حاصل کیسے۔ اب انہی سے تم کاروبار کر رہے ہو اور جو تم راتوں رات۔۔۔"

"یہ ایک سازش ہے تم گھبراؤ مت۔۔۔" اس نے غصے سے کہا تبھی صفیہ کے فون پر تیمور کی کال دینگ پڑ گئی۔

"کون لوگ سازش کر رہے ہیں؟" وہ تیزی سے بولی۔

"ان کا پتہ ہوتا تو میں اب تک سارا معاملہ ختم بھی کر لیتا۔ میں نے کہا تم پریشان نہیں ہونا۔ تم ایسی فون کالز پڑھا بھی دھیان نہ دو بلکہ

سنا ہی نہ کرو۔" ہاویوں نے عام سے انداز میں کہا۔

"تم کہتے ہو تو ٹھیک ہے نہ میرا دل تو بہت گھبرا رہا ہے۔" اس نے پھر تشویش زدہ لہجے میں کہا۔

”کہانا نظر انداز کر دو اور وہی کرو جو تم کر رہی ہو۔“ ہمایوں نے اسے تسلی دی۔

”ٹھیک ہے۔۔۔“

اس نے تیسور کی کال دیکھ کر چیزی سے کہا اور پھر فون بند کر دیا۔ تھی تیسور کے نمبر سکرین پر ابھر آئے۔ اس نے چند لمبے دیکھا اور پھر فون

ریسٹ کر لیا۔

”بولو کیا چاہتے ہو تم۔۔۔؟“ صفیہ نے انتہائی غصے میں کہا۔

”یہی کہ میں دو کرو نظر انداز کر سکتا ہوں اگر تم میری بات مانتی رہو میں جب چاہوں۔۔۔“

”تیسور ابہت ہو گئی میں آخری بار وارننگ دے رہی ہوں۔۔۔“

”تم مجھے کوئی وارننگ نہیں دے سکتی ہو وہ اس لیے کہ فارم ہاؤس میں لگے ہوئے خفیہ کیمرے وہ سب کچھ ریکارڈ کر چکے ہیں جو ہم وہاں

کرتے تھے۔ میری بات نہیں مانو گی تو تم پرنس وومن تو شاید نہ بن سکو لیکن کال گرل کے طور پر مشہور ہو جاؤ گی۔ ذرا سوچو کیسا رہے گا یہ سب۔۔۔“

موبائل کی دنیا میں یہ جو ایم ایم ایس کی سہولت ہے ایسے کاموں کے لیے کتنی بڑی سہولت ہے۔ پھر انٹرنیٹ ہے۔۔۔ خیر شاید تمہارا منگیتر جو تمہارا

کزن بھی ہے آنکھوں دیکھی کسی اگل کر خاندان کی عزت بچالے۔ تم سے شادی کر لے لیکن دنیا تمہیں معاف نہیں کرے گی۔“ وہ کہتا چلا گیا۔

”جھوٹ بول رہے تم، کجواس کر رہے ہو۔۔۔“ وہ ہذیبانی انداز میں بولی لیکن اندر سے کانپ کر رہ گئی تھی۔ اگر یہ سب سچ ہوا تو اس کے

پاس کچھ بھی نہیں بچے گا۔

”میں جھوٹ نہیں بولتا۔ ابھی چند لمحوں کی روداد تمہیں بھیج رہا ہوں دیکھنا اور انجائے کرنا پھر سوچنا۔۔۔ اپنا ای میل ایڈریس بھیجنا بہت کچھ

تمہیں دیکھنے کو ملے گا اور اب تم مجھے فون کرو گی۔“

اس نے انتہائی سرد لہجے میں کہا اور اچانک فون بند کر دیا۔ صفیہ ایک دم سے اپنے آپ ہی میں نہ رہی۔ یہ اچانک کیسی القاد پڑ گئی۔ اسے

یوں لگا جیسے وہ ہواؤں میں اڑتی ہوئی اچانک زمین کی طرف جا رہی ہے جہاں گرتے ہی چور چور ہو جانا اس کا مقدر ہے۔ اپنے خاندان کے ایک ایک

فرد کا چہرہ اس کے سامنے آتا چلا گیا وہ بے گناہ ہوتے ہوئے بھی انہیں کیسے یقین دلانے کی؟۔۔۔ تھی اس کے فون نے اسے حشو کر لیا۔ اس نے

جلدی سے فون اٹھایا اور اسے دیکھا۔ چند لمحوں کی فلم سے اس کے ہوش اڑ گئے وہ ساکت ہو کر رہ گئی۔ اگر یہی فلم۔۔۔ وہ اس سے آگے نہ سوچ سکی۔

☆ ☆

ہمایوں اس وقت دہلی دہاؤ کی اس سٹل پر تھا جہاں اسے کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اس کے دماغ کی کوئی نس چھٹ سکتی تھی یا نروس بریک ڈاؤن ہو

سکتا تھا۔ وہ انتہائی مشکل سے اس پارک تک پہنچا تھا جو اس کے گھر کے راستے میں آتا تھا۔ اگرچہ پریشانی تو اسے پہلے ہی تھی وہ اس وقت سے سوچ

کی سولی پر لٹکا ہوا تھا جب سیٹھ حفیظ نے جنید کو اس کے سامنے لانے کے لیے کہا تھا۔ وہ کسی طور بھی ضمن کشی نہیں کر سکتا تھا اس لیے جنید کے بارے میں

سوچنے کی بجائے وہ یہی سوچتا رہا تھا کہ کوئی ایسا راستہ نکالے جس سے سارا معاملہ حل ہو جائے۔ اسے یہ بھی طرح معلوم تھا کہ جنید کے بارے میں

عشق تو ہے عشق بتا

اسے کہا اس لیے کیا ہے کہ وہ خود سامنے نہیں آتا چاہتے تھے بلکہ راز افشا کرنے کا سارا بوجھ اور ذمہ داری اسی پر ڈال کر خود مزی الذمہ ہونا چاہتے تھے۔ تیور کے انخواہ سے چاہے جنید نے تاوان وصول کیا ہو یا نہیں لیکن اس کی اپنی زندگی میں بہت زیادہ انقلاب آ گیا تھا۔ وہ حالات جنہیں وہ محض خواب سمجھتا تھا حقیقت کا زور و دھار گئے تھے۔ اسے جو حاصل کرنے کی تمنا تھی دلوں میں اس کی دسترس میں آتا چلا گیا تھا۔ اسے یہ سمجھ نہیں آتی تھی کہ صفیہ سے منگنی کے بعد انہوں نے دو اور دو چار کر کے معاملہ کس طرح فوراً سمجھ لیا تھا۔ اسے یہ اچھی طرح احساس تھا کہ وہ چاہے جتنا جھوٹ بولتا رہے وہ حقیقت جان گئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے سینہ حقیقت نے بلا لیا اور انتہائی سرد لہجے میں کہا تھا۔

”اتفاق گزر جانے کے باوجود ابھی تک تم نے جنید کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا۔ کیا تم اس معاملے کو سمجھ گئی سے نہیں لے رہے

ہو؟“

”سرا! میں کوئی فیصلہ تو نہیں دے رہا ہوں کہ اس نے تیور کو انخوا کیا تھا یا نہیں! میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک انتہائی پیچیدہ معاملہ ہے لیکن سرا اصل مسئلہ یہ ہے کہ میرا کچھ لے گئی دلوں سے اس کے ساتھ کوئی رابطہ ہی نہیں ہے۔ میں نے آپ کو بتایا بھی تھا کہ جب وہ چاہتا ہے تو رابطہ کرتا ہے۔ میں۔۔۔“

اس نے کہنا چاہا لیکن سینہ حقیقت نے اسے نوکتے ہوئے پوچھا۔ ”اس کا کوئی رشتہ دار تو ہوگا؟“

یہی وہ سوال تھا جس سے وہ گھبراہٹ محسوس کر رہا تھا اسی سوال پر اس کا امتحان بھی ہو سکتا تھا۔ اگر وہ انکار کرتا ہے اور اس بارے میں اسے معلوم ہوا تو پھر سب کچھ ایک لمحے میں ختم ہو جاتا جبکہ دوسری صورت میں۔۔۔ وہ اس سے آگے نہیں سوچ سکا لہذا اس نے رسک لینے ہی کی ٹھانی اور بڑے اعتماد سے انکار کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں۔۔۔ اگر ہوگا یہی تو مجھے نہیں معلوم۔۔۔“

”بس! میں سے تمہاری نیت کے بارے میں پتہ چل گیا ہے، ہاں! تم مجھ سے مسلسل جھوٹ بولتے چلے آ رہے ہو۔ میرے بھی ذرا رخ ہیں، انہوں نے کنفرم کیا ہے کہ جنید کی بیوی ہے اور اسی شہر میں ہے اور تم اس سے واقف ہو۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“ اس کا لہجہ انتہائی غصے سے بھر ہوا تھا۔

”میں نے کہا تھا مجھے اس کے بارے میں نہیں معلوم۔۔۔“ اس نے سختی سے تردید کر دی۔

”کامو مان لیا کہ تمہیں نہیں پتہ، لیکن میں تمہیں فقط آج کی رات دیتا ہوں۔ ساری رات میں تمہارے فون کا انتظار کروں گا۔ طلوع صبح تک اس کی بیوی ہمارے قبضے میں ہوگی تو وہ خود بخود سامنے آ جائے گا اور اگر تم ایسا نہ کر سکتے تو۔۔۔“ وہ غصے میں پاگل ہو رہا تھا۔

”میں اگر اس کی بیوی کو تلاش کر بھی لوں، تب بھی وہ اگر سامنے نہ آتا تو پھر۔۔۔؟“

”یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے تمہارا کام ختم ہو جائے گا پھر ہم جانیں یا وہ۔۔۔“ اس نے قدرے نرم پڑتے ہوئے کہا۔

”دیکھیں! سرا! میں نہیں سمجھتا کہ اتنے کم وقت میں اسے تلاش کیا جا سکتا ہے۔“ ہاں! میں نے سوہمی دی ویل کے سہارے ذرا سی مزاحمت

کرتے ہوئے کہا۔

”دیکھو ہاویں اتم میرے لیے کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتے ہو میں چاہوں تو ابھی تمہارے ذریعے تم سے سب کچھ اٹگوا لوں۔ میں نے تمہارا جھوٹ بھی نظر انداز کیا ہے تو اس لیے تم اب تک میرے ایک مہرے کی سی حیثیت رکھتے ہو ورنہ میں ٹشو پیپر کی طرح تمہیں مسل کر رکھ دیتا۔ جس طرح کوئی حاکم کسی بڑے سیاستدان کے بارے میں یہ کہہ سکتا ہے کہ میں چاہوں تو بکری چوری کے اہرام میں جیل کے اندر ڈال دوں اور اس کی ضمانت بھی نہ ہو میں تمہیں ایک پیچہ دے چوری کرنے کے اہرام میں ابھی اندر کروا سکتا ہوں۔ تم شاید نہیں جانتے اب تک نجانے کتنے کاغذات کتنی دستاویزات میرے پاس موجود ہیں جو تمہیں ساری زندگی کے لیے جیل میں سڑنے پر مجبور کر دیں گی لہذا جو کہتا ہوں وہی کرو ورنہ کل سورج طلوع ہونے کے بعد تمہارا مستقبل تاریک ہو جائے گا۔ جاؤ پلے جاؤ۔“

سیٹھ حنیف نے کچھ اس انداز میں حقیقی بات کی تھی کہ ہاویں نے ہی طرح چوک گیا۔ اسے احساس تو تھا کہ بیٹی اپنے سارے دادا نہیں سکھاتی مگر اسے اس قدر محسن کشی کے لیے مجبور کیا جائے گا یہ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ انتہائی خستہ یعنی حالت کے ساتھ وہاں سے نکلا تھا۔ اسے ہر حال میں فیصلہ کرنا تھا کہ وہ کیا کرے؟۔۔۔ ایک طرف اس کا حسن تھا جس نے اسے یہاں تک پہنچا دیا تھا۔ وہ جو چاہتا تھا اسے مل گیا پھر اس کی اپنی خواہشوں نے ہی اسے یہ دن دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا اس کی خواہشیں ہی اس کے گلے پڑی تھیں ورنہ وہ تو ٹھیک جا رہا تھا۔ یہ تیور اور مشیہ ہی کا مسئلہ تھا جو اس کے مستقبل کو جاہ کرنے کا باعث بن رہا تھا اور اب وہ بھٹ چکا تھا۔ اسے چند تک رسائی چاہئے تھی ورنہ اسے پورا یقین تھا کہ وہ ایک دفعہ پھر جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہوگا اور کوئی اسے بچا بھی نہیں پائے گا۔ شاید بے گناہی اور مصومیت اپنی جگہ خود ایک قوت ہوتی ہے جو کسی نہ کسی طرح اپنا آپ متوالی ہے لیکن انسان جب جرم کرتا ہے تو خمیر بھی اس کا ساتھ نہیں دیتا کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی حد تک احماد میں درازیں ضرور پڑ جاتی ہیں جن کا نتیجہ ہمیشہ یہی نکلتا ہے کہ ایک خوف من میں سرانیت کر جاتا ہے جو اسے ثابت قدم رہنے ہی نہیں دیتا۔ وہ چند کوئی نئی طرح یاد کر رہا تھا وہ ہوتا تو کم از کم اسے بتا کر کوئی مشورہ ہی کر لیتا۔ وہ اگر سیٹھ حنیف سے ملوا سکتا تھا تو اس جیسے کچھ اور لوگ بھی تو اس کے پاس ہو سکتے تھے یا پھر کم از کم وہ محسن کشی کا مرتکب تو نہ ہوتا۔۔۔ راجیلہ کا چہرہ ہا بار اس کے سامنے آ رہا تھا۔ اس بے چاری نے کیا تصور کیا تھا جو وہ اسے ان لوگوں کے ہاتھوں میں دے دے؟ ان سے کچھ بھی بچ رہا نہیں تھا وہ اس پر بے جا تشدد بھی کر سکتے تھے۔ اس سے ہٹ کر جب اسے یہ معلوم ہوگا کہ ہاویں نے اسے اس حال تک پہنچایا تو اس کا احماد انسانیت ہی سے اٹھ جائے گا۔ اس کا فظ بھی گناہ ہے کہ اس کا تعلق جنید سے ہے۔ نہیں میں کم از کم اسے ان لوگوں کے حوالے نہیں کروں گا۔ وہ بے گناہ ہے اس سارے معاملے میں اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

”تو پھر کیا کرو گے۔۔۔؟“

یہی سوال اس کے ذہنی دہاؤ میں مسلسل اضافہ کرتا چلا جا رہا تھا۔ وہ پارک کے ایک تنہا گوشے میں بیٹھا مسلسل یہی سوچتا چلا جا رہا تھا۔ اچانک ایک خیال امید کی کرن کی مانند اس کے ذہن میں آیا کہ اگر انہیں راجیلہ کے گھر کے بارے میں معلوم ہوتا تو وہ کبھی اس قدر اس پر دباؤ نہ ڈالتے فوراً جاتے اور اسے قابو میں کر لیتے۔ تب انہیں یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ جنید بھی وہیں ہے۔ وہ اسے درمیان میں ہی نہ لاتے۔ راجیلہ کو قابو

عشق کا ہے عشق بتا

کرنے یا جنید کو اپنے دام میں پھنسانے کے بعد ہی سب کچھ اُسے بتایا جاتا۔ تو اُنہیں جنید اور راحیلہ کے گھر کے بارے میں نہیں معلوم! اس لیے وہ اب تک محفوظ ہیں۔ میں اگر ساری صورت حال سے راحیلہ کو آگاہ کر دوں اور وہ۔۔۔ اس کے ساتھ ہی بہت ساری سوچیں اُس کے ذہن میں آتی چلی گئیں۔ اُس نے جلدی سے اپنا فون نکالا۔ سم تھیل کی اور راحیلہ کے نمبر ڈائل کر دیئے، تھوڑی دیر بعد ہی راحیلہ سے رابطہ ہو گیا۔

”ہاں ہاویں بھائی! کیسے ہو۔۔۔ بڑے دنوں بعد فون کیا؟“ وہ خوشگوار لہجے میں اُس سے پوچھ رہی تھی۔

”میں ایک بہت بڑی الجھن میں پھنس گیا ہوں بلکہ۔۔۔ میں حق نہیں جنید اور تم بھی۔۔۔ خدا کے لیے میری جنید سے بات کرو اور اُس

سے رابطہ بہت ضروری ہے۔“ وہ نہ یانی انداز میں کہتا چلا گیا۔

”خیر تم تو ہنہاویں بھائی! آپ اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہیں؟“ وہ تشویش سے بولی۔

”بات ہی کچھ ایسی ہے۔۔۔“ وہ انتہائی شکت لہجے میں بولا۔

”گھر بھی کچھ تو پوچھ چلے؟“ منیہ نے اسی لہجے میں پوچھا۔

”میں تمہیں کیا بتاؤں۔۔۔ جنید کو تفصیل بتاؤں گا تو وہ اس کا کوئی نہ کوئی مل نکال لے گا۔“ وہ بولا۔

”اصل میں وہ یہاں ہیں ہی نہیں کسی دوسرے ملک میں ہیں۔۔۔ مجھے بتائیں بلکہ یہاں آ جائیں! امینان سے بات کر لیتے ہیں۔“

راحیلہ نے کہا۔

”خیر میں آ رہا ہوں لیکن تم نے بہت احتیاط کرنی ہے۔ اگر ذرا سا بھی خطرہ محسوس کرو کسی اجنبی کو اپنے ارد گرد دیکھو تو سامنے مت آنا

بالخصوص اس وقت تمہیں بہت خطرہ ہے۔“ وہ مایوسی کی انتہا کو چھوتے ہوئے بولا۔

”آپ گھبرائیں نہیں ہاویں بھائی! آپ آئیں میں جہر حال تھا طرہوں گی۔“

راحیلہ نے اسے ڈھارس دیتے ہوئے کہا اور فون بند کر دیا۔۔۔ لاعلمی بھی کس قدر نعمت ہوتی ہے۔ اگر اُسے معلوم ہو جائے کہ دوسرے

اس کے بارے میں کیا سوچ رہے ہیں تو خوف کے عالم میں بھانے کیا کچھ کر بیٹھے کی سوچتا ہوا ہاویں وہاں سے اُٹھ گیا۔ اُس نے اپنے طور پر یہ

فیصلہ کر لیا کہ وہ ہر حال میں راحیلہ کو بچائے گا اس کے لیے چاہے اُسے سب کچھ قربان کرنا پڑے۔ سینٹھ حقیقہ کے پاس اگر کوئی بیک میل کرنے کا مواد

ہے تو اس نے کون سا صحاف کیا تھا۔ وہ ایک امداد کے ساتھ پارک سے نکلا چلا گیا۔

☆☆

منیہ ساری رات اور پھر سارا دن سوچوں میں ڈوبی رہی تھی۔ تیمور کا یہ انداز بہت ہی بھیاںک تھا وہ ڈھی ٹانگ کی طرح پھٹکار رہا تھا۔ اُس

سے کچھ بید نہیں تھا کہ وہ ڈنگ ماروے۔ وہ نہ صرف اُس کے ذہر سے بچتا چاہتی تھی بلکہ اُس کا ذہر بھی نکال لینا چاہتی تھی لیکن وہ پاگل تھی۔ ایسا سوچا تو

جاسکتا تھا لیکن اس پر قطعاً عمل نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ایسا کرنے کے لیے بہت زیادہ تجربہ، ذہانت اور مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ سارے متر

بندے کو آتے ہوں جو اس کام کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔۔۔ شام کے سائے ڈھل رہے تھے۔ اس دوران اس نے کئی بار ہاویں کو فون کیا تھا

لیکن ہر بار وہ تلی بن کر خاموش ہو جاتی۔ وہ اسے یہ بتا بھی نہیں سکتی تھی کہ تیور نے اسے کس طرح کی دھمکی دی ہے اور اس کے ثبوت میں کیا کچھ بھیج دیا ہے۔ تیور کے معاملے میں اسے جو کچھ بھی کرنا تھا خود ہی کرنا تھا یا تو اسے اپنا آپ پیش کر دینی اور جو وہ چاہتا وہی کچھ کرنے پر مجبور ہو جاتی یا دوسری صورت میں وہ پرنس وومن کی بجائے کال گرل کے طور پر مشہور ہو جاتی جو اسے کسی صورت بھی منظور نہیں تھا۔ تو پھر کیا کرے؟— فیصلہ تو بہر حال اسے خود ہی کرنا تھا اس میں وہ ہائیوں کی مدد لے ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ انہی سوچوں میں ڈوبی ہوئی تھی کہ اس کا فون بج اٹھا۔ سکرین پر تیور کے نمبر جگمگا رہے تھے۔

”ہیلو۔۔۔“ اس نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

”ہاں نہیں ہوں تیور۔۔۔ تو پھر کیا سوچا ہے تم نے؟“ اس نے یوں کہا جیسے وہ صغیرہ کے کسی بھی متوقع فیصلے کے بارے میں جاننا ہو کہ وہ کیا فیصلہ کرے گی۔

”دیکھو تیور اتنی بہت ہی گھٹاؤنی اور گھٹیا حرکت کر رہے ہو۔ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ یہی تھا نا کہ تمہارے اصرار پر قارم ہاؤس چلی جاتی تھی مگر تم نے ان ملاقاتوں کو کیا رنگ دیا۔ میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی کہ تم اسے گھٹاؤنے بھی ہو سکتے ہو۔“ وہ اچھائی غصے میں کہتی چلی گئی۔

”میں اس سے بھی تر ہوں۔ میں شاید بھول جاتا جس طرح اور بہت ساری لڑکیوں کو بھول چکا ہوں۔ ضروری نہیں کہ ہر لڑکی میری مرضی کے مطابق چلے لیکن تم نے اور تمہارے منگیتر نے جو کچھ کیا وہ میں نہیں بھول سکتا میری جان ا“ وہ طنزیہ لہجے میں غراتے ہوئے بولا۔

”جو کچھ تم نے نکل کہا یا اب کہہ رہے ہو میں اس کے بارے میں بالکل نہیں جانتی۔ مجھے کچھ پتہ نہیں ہے تو پھر اس کی اتنی بڑی سزا مجھے کیوں دی جا رہی ہے؟— اصل میں تم یہ سب الزام لگا کر۔“

”نہیں یہ الزام نہیں ہے جرم کیا ہے تم دونوں نے اور اس کی سزا تو ملتی ہی چاہئے۔ کیا تم نے ایسی موت کو قریب سے دیکھا ہے جس میں ایک ہی وقت میں بار بار مرنا پڑے۔ اس کی اذیت میں جاتا ہوں۔ کس طرح اس بندے نے مجھے ذلیل کیا۔ میں ریپڈل وانس اسی لیے نہیں گیا ہوں کہ ان بندوں کا سراغ لگا سکوں۔ پتہ نہیں نہیں نے کتنا پیسہ بھایا ہے اس مقصد کے لیے۔ میں تم تینوں کو وہی ذہنی اذیت دینا چاہتا ہوں۔“ وہ غصے میں کہتا چلا گیا۔

”تم کچھ بھی نہیں کر سکو گے۔“ اچانک صغیرہ نے اچھائی امداد سے کہا۔

”کیوں نہیں کر سکو گا؟— تمہارا منگیتر کسی سدھائے ہوئے ٹنٹے کی مانند اس جینڈ نامی شخص کی یوسو گھٹتا پھر رہا ہے۔ اس کے پاس فقط صبح تک کا وقت ہے پھر اس کے بعد وہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہوگا۔ اس کے لیے مقدمات تیار ہو چکے ہیں۔ اگر ٹنٹے کی طرح وفا داری کرے گا تو شاید اسے معاف کر دیا جائے ورنہ میں خود اسے بھیانک سزا دوں گا اور تم کو میری ہونی جاو گی۔۔۔ ویسے اگر تم کہو تو میں تمہیں مستقل طور پر اپنے قارم ہاؤس میں رکھ لوں گا۔ وہاں تم۔۔۔“

”تیور! میں تم سے ملنا چاہتی ہوں ابھی اور اسی وقت۔ کہاں مل سکتے ہو؟“ صغیرہ نے اجنبی سے لہجے میں کہا۔

”ارے واہ اتنی جلدی موم ہو گئی ہو۔۔۔ چلو ٹھیک ہے۔ آسنے سامنے بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔“ اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

”سنیں پوچھ رہی ہوں کہاں مل سکتے ہو؟“ وہ سنی آن سنی کرتے ہوئے بولی۔

”اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے میری جان! میرے فارم ہاؤس پر آ جاؤ۔“ وہ پھر ہنستے ہوئے بولا۔

”نہیں! اس وقت میں وہاں نہیں آ سکتی۔ شہر کے کسی ریستوران کے بارے میں بتاؤ۔“ وہ بولی۔

”تو اسی ریستوران میں آ جاؤ جہاں ہم اکثر ملتے تھے وہ تمہیں بہت پسند ہے نا۔۔۔ اچھا ہے آسنے سامنے بیٹھ کر بات ہوگی تو شاید کوئی

اچھا پہلا نکل آئے۔۔۔ کب تک پہنچ رہی ہو؟“ وہ خوشگوار ریت کے لہجے میں فتح مند انداز لے لے بولا۔

”شاید تمہارے کونچے سے پہلے ہی وہاں پہنچ جاؤں۔۔۔“ صفیہ نے کہا اور فون بند کر دیا۔

پھر صفیہ نے کسی کو بھی نہیں بتایا اپنا پرس چیک کیا اور باہر کی جانب چل دی۔ زینون بی بی ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہوئی تھی اس نے سرسری

سے انداز میں پوچھا تو وہ بولی۔

”ہاں! سنیں! کچھ دیر کے لیے باہر جا رہی ہوں۔ اگر زیادہ وقت ہو جائے تو پریشان نہیں ہوتا۔“

”پھر بھی جا کہاں رہی ہو؟“ زینون بی بی نے اس کے تے ہوئے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کہنا کسی کام سے جا رہی ہوں۔“ وہ بولی اور باہر نکلتی چلی گئی۔

وہ شہر کا معروف ریستوران تھا جہاں ان دونوں کی اکثر ملاقاتیں رہا کرتی تھیں۔ صفیہ اپنی کار میں اس ریستوران کے سامنے پہنچ چکی تھی

لیکن ابھی اس نے ریستوران کی جانب ٹرن نہیں لیا تھا سڑک پر ہی تھی کہ اس نے تیمور کی گاڑی دیکھی جو ٹرن لے چکی تھی اور کسی بھی لمحے پارکنگ کی

جانب مڑنے والی تھی۔ اسے امیٹان ہو گیا کہ وہ آ گیا ہے۔ اس نے بڑے سکون سے گاڑی پارکنگ کی جانب موڑ لی۔ شاید وہ بھی اسی کا اختر تھا؟

اس نے صفیہ کو دیکھ لیا اور گاڑی سے باہر نکل کر بڑی پرشوق لگا ہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ صفیہ نے امیٹان سے گاڑی پارکنگ میں لگا لی اور اپنا پرس

اٹھا کر باہر آ گئی۔ دونوں آسنے سامنے ہوئے تو انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا جب تیمور نے مصنوعی ڈکے سے کہا۔

”پہلے سے بہت زیادہ کمزور دکھائی دے رہی ہو۔۔۔ کچھ تانا میرے ساتھ نہ ہونے کا ٹم تھا؟“

”کچھ بھی نہیں تھا۔۔۔ میں تم سے حتمی بات کرنے آئی ہوں تیمور! تم میری زندگی سے نکل جاؤ! اس میں ہم دونوں ہی کا بھلا ہے۔“

صفیہ نے بڑے ہی نرم لہجے میں کہا۔

”اب میں چاہوں بھی تو ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ بات میرے ہاتھ میں نہیں رہی بلکہ پاپا براہ راست اس مسئلے میں دلچسپی لے رہے

ہیں۔۔۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔“

”لیکن تم مجھے کیوں بلیک میل کرنا چاہ رہے ہو؟ کیا یہ بھی تمہارے پاپا کی مرضی ہے؟“ اس نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

”سمجھو! تمہیں دھمکانے اور اصل لوگوں تک پہنچ جانے کی ایک کوشش ہے۔ ہم تو تمہیں بھی اس میں ملوث دیکھتے ہیں اور تم ہو بھی کیونکہ اتنی

مضبوط پلاننگ وہی کر سکتا ہے جو بہت قریب رہا ہو۔۔۔ خیر آؤ۔ اُنہر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔ مجھے ایک اہم فون کا انتظار ہے۔ جو مئی وہ فون آ گیا مجھے یہاں سے جانا ہوگا۔“ اُس نے عام سے انداز میں کہا۔

”انتظار فون تھا تو پھر یہاں تک آئے کیوں۔۔۔ میں نے کہا تاہم تم سے حتمی بات کرنے آئی ہوں؟“ وہ اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”وہ فون تمہارے لیے بھی بڑا اہم ہے۔ تمہارے منگیترنے آج رات ہی حتمی رسائی حاصل کرنی ہے اُس نے فون کرنا ہے تو مجھے معلوم ہوتا ہے۔۔۔ آؤ وہیں بیٹھ کر حتمی بات کر لیتے ہیں۔“

اُس نے یوں کہا جیسے صیغہ اب اُس کے لیے کوئی اہمیت نہ رکھتی ہو۔ وہ اس کے ساتھ ایسا رویا بنائے ہوئے تھا جو کوئی فاتح اپنے مفلوح کے ساتھ روا رکھتا ہے۔ اُس نے قدم بڑھا یا ہی تھا کہ صیغہ نے بڑے اطمینان سے اپنا پرس کھولا اس میں سے ریور اور نکال کر اُس پر تان لیا۔

”تمہارا کھیل ختم ہو گیا تیمور!“

صیغہ کے یوں کہنے پر تیمور نے پلٹ کر دیکھا اور گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

”میں اکیلا نہیں ہوں میرے گارڈ ز میرے ساتھ ہیں۔ نیچے کروور تو وہ تمہیں گولی مار دیں گے۔“

لفظ اُس کے منہ ہی میں تھے کہ صیغہ کانپ کر رہ گئی اس نے جیسے تیمور کی بات ہی نہ سنی ہو بیکلام دو قہار ہوئے کسی طرف سے انتہائی گولی صیغہ کو لگی اور اس سے ٹرائیگرب گیا۔ دو گولیاں تیمور کے سینے میں جا لگی تھیں۔ دونوں ہی چکرا کر گرے۔۔۔ لحوں ہی میں وہاں ہجوم اکٹھا ہونا شروع ہو گیا۔

☆☆

ٹائپنگ ٹائپنگ

کتاب گھر پر پیش کیا جانے والا، گل نو خیز اختر کا مقبول ترین ناول، جسے پاک وہند کے قارئین نے سند قبولیت بخشی۔ اُردو کا پہلا مکمل حراجی ناول، ہمارا دعویٰ ہے کہ آپ اس ناول کو ایک بار شروع کر کے ختم کیے بغیر نہیں چھوڑیں گے۔ ٹائپنگ ٹائپنگ کہانی ہے ایک غریب گھر کے سادہ لوح نوجوان کی جسے حالات ایک ارب پتی لڑکی کا کرانے کا شوہر بنا دیتے ہیں۔ اس کا ترقی شادی سے پہلے اور بعد میں کمال عرف کمالے کی سادہ لوحی اور محنتیں کمال کھلاتی ہیں، جاننے کیلئے پڑھیے ٹائپنگ ٹائپنگ۔ اسے ناول سیکشن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

رات ابھی اتنی گہری نہیں ہوئی تھی۔ راحیلہ انتہائی پریشانی کے عالم میں نہیں رہی تھی۔ جنید کا نمبر ہی نہیں مل رہا تھا حالانکہ اس نے دوپہر کے وقت اس سے بات کی تھی۔ ممکن تھا کہ وہ اس سے بات ہی نہ کرتی لیکن ہمایوں کے فون نے اسے بُری طرح اُسٹرب کر دیا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ حالات اس قدر خطرناک ہو جائیں گے۔ اس نے ہمایوں کی بات بہت قتل سے سنی تھی۔ اسے احساس تھا کہ وہ فوراً جنید سے بات کرے گی اور پھر جو وہ کہے گا اسی پر عمل کرے گی۔ ایسے نازک حالات میں جبکہ ہمایوں بھی اس کی جانب آ رہا تھا جنید کا فون نہ ملنا اسے پریشان کر گیا تھا۔ اب اگر ہمایوں آ بھی جائے تو اسے خطرناک صورت حال کے بارے میں بتا بھی دے تو وہ کیا جواب دے پائے گی؟

”کیا بات ہے راحیلہ! تم اتنی پریشان کیوں ہو۔۔۔؟“

سرسین جوزف نے اس سے پوچھا تو وہ چند لمحوں تک اُس کی جانب دیکھتی چلی گئی۔ اسے کچھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ ہمایوں کے بارے میں اسے بتائے یا نہیں؟

”کچھ نہیں۔۔۔ تم آرام کرو۔“ وہ بولی مگر اس کا لہجہ بے چینی چھپا نہ سکا۔

”راحیلہ! یہ کیا بات ہوئی؟ کیا میں اتنا بھی اندازہ نہیں لگا سکتی کہ اس وقت تمہاری کیفیت کیا ہے۔۔۔ بولو تاؤ مجھے کہ بات کیا ہے۔ کیوں اتنی پریشان ہو؟“ وہ نرم سے لہجے میں بولی۔

”ہمایوں آ رہا ہے اور اس کے پاس کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔ کہہ رہا ہے کہ میرے اور جنید کے لیے انتہائی خطرناک حالات ہیں۔ جنید کا فون بھی نہیں مل رہا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ کیا کروں۔“ وہ کہتی چلی گئی۔

”اوہ۔۔۔ تم کوشش جاری رکھو شاید بھائی کا فون مل جائے اور اگر ہمایوں آ بھی گیا تو بات سن لیں گے، تمہی سارے حالات کا بہتر پتہ چلے گا۔ آدھی ادھوری بات سے کیا معلوم ہوگا؟“

”کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو لیکن۔۔۔“

لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ اس کا فون بج اٹھا۔ اجنبی سے نمبر تھے اس نے چند لمحوں کے لیے سننے یا نہ سننے کے بارے میں فیصلہ کیا پھر فون سن لیا۔

”ہیلو۔۔۔“ اس نے ویرے سے کہا۔

”شکر ہے خدا کا تم نے فون سن لیا۔“ دوسری جانب سے جنید بول رہا تھا۔

”لیکن یہ نمبر اور میں کب سے۔۔۔“

”کچھ بھی مت کہو۔۔۔ فوراً یہاں سے نکلو۔ کچھ بھی مت لو اور میری سرسین سے بات کراؤ۔“ جنید نے جیڑی سے کہا۔

”وہ میرے پاس کھڑی ہے۔۔۔“ اس نے کہا۔

”تو پتہ کراؤ کہ وہ جلدی۔۔۔“

وہ تیزی سے بولا تو راحیلہ نے پتکرا آن کر دیا۔

”جی جنید بھائی! اکہیں۔۔۔؟“ نسرین نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

”حالات ٹھیک نہیں ہیں لیکن تمہیں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ پریشان نہیں ہوتا راحیلہ کی امی کا بہت خیال رکھنا۔ بہت جلد میں اور راحیلہ تمہیں

آن ملیں گے۔ کلینک بنانے کی جلد از جلد ہر ممکن کوشش کرنا۔۔۔ اور راحیلہ! تم سنو۔ فوراً یہاں سے نکلو۔ میں سنیں ہوں تم گھر سے باہر نکل کر مارکیٹ تک آؤ۔ فون بند نہیں کرنا میں تمہیں پک کر لیتا ہوں۔“

”آپ سنیں ہو۔۔۔؟“ وہ حیرت سے بولی۔

”سوال جواب بعد میں۔۔۔ تم فوراً نکلو اپنی امی کو بھی بتانے کی ضرورت نہیں ہے اور ہاں نسرین! میں تم سے بعد میں رابطہ کرتا ہوں تم

نے ہر کسی کو یہی بتانا ہے کہ ہم دونوں یہاں رہتے تھے لیکن شادی کے بعد یہاں سے چلے گئے ہیں یعنی مومن وغیرہ کا کہہ دینا۔۔۔ آپ چلاؤ نکلو۔“

جنید نے کہا تو راحیلہ نے ایک نگاہ نسرین پر ڈالی اس کے گلے لگ کر چند لمبے پونجی رسی اور پھر تیزی سے باہر نکلی چلی گئی۔ وہ تیز تیز

قدموں سے مارکیٹ کی جانب چلی گئی۔ اسے کچھ اعزازہ نہیں تھا کہ وہ کہاں ہو سکتا ہے اس لیے وہ ایک سست چلتی چلی گئی۔ اس کا فون آن تھا وہ بتاتی

چار ہی تھی کہ اس وقت وہ کہاں پر ہے۔ جلد ہی اسے سرخ رنگ کی مرسیڈیز دکھائی دی۔ جنید اسی میں تھا راحیلہ کے پیٹھے ہی گاڑی چل دی۔ ان کے

علاوہ فقط ایک ڈرائیور تھا۔

”آپ سنیں تھے۔۔۔؟“ وہ دہیرے سے بولی۔

”نہیں۔۔۔ دوپہر کے وقت دوغنی میں تھا لیکن حالات ٹھیک نہیں تھے۔ یہ تو قسمت اچھی ہے کہ مجھے بروقت پتہ چل گیا ورنہ ہمایوں آب

تک تمہیں ایسے لوگوں کے ہاتھ۔۔۔ خیر اس کا بھی پتہ چل جائے گا۔“

”نہیں وہ غلط نہیں ہو سکتا ورنہ وہ مجھے فون کر کے انتظار نہ کرتا۔۔۔“

”کیا اس نے تمہیں فون کیا تھا؟“

اُس نے حیرت سے پوچھا تو راحیلہ نے تفصیل بتا دی۔

”اوہ تو اس کا مطلب ہے کہ وہ خود بھی خطرے میں ہے۔ خیر دیکھتا ہوں۔“

اُس نے کہا ہی تھا کہ راحیلہ کا فون بج اٹھا۔

”کون ہے؟“ جنید نے پوچھا۔

”ہمایوں۔“

”لاؤ ہمیں بات کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر اُس نے فون لیا اور بولا۔ ”ہاں ہمایوں! کیا بات ہے؟“

”اوہ آپ۔۔۔ آپ فوراً وہاں سے نکل جائیں۔ کسی بھی لمحے۔۔۔“

”میں وہاں نہیں ہوں ایک بہت ہی محفوظ جگہ پر ہوں۔ میں اس وقت تمہیں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اگر اپنی جان بچانا چاہتے ہو تو فوراً روپوش ہو جاؤ۔۔۔“

”میں اگر مری جاؤں نا جنید بھائی! تو کوئی غم نہیں۔ میں بس محسن کشی کے الزام کے ساتھ نہیں مرنا چاہتا تھا۔ اللہ کرے کہ آپ محفوظ رہیں میری بولی خواہش ہے۔“ وہاں پر سانا انداز میں بولا۔

”ٹھیک ہے میں بعد میں فون کروں گا۔“

جنید نے کہا اور فون بند کر دیا۔

”یہ۔۔۔ یہ سب کیا ہے۔۔۔؟“ راحیلہ نے حیرت زدہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

”تفصیل کا وقت نہیں ہے۔ بس اتنا جان لو کہ جس نے جو کیا! اسے بھرتا پڑے گا مجھے ہمایوں سے بھر دی ہے۔ اس کی نگہباز جس کے لیے اس نے یہ سب کیا وہ اب اس دنیا میں نہیں رہی ہے۔ وہ قتل ہو گئی ہے۔“

”کیا۔۔۔ آپ کو کیسے پتا ہے؟“

”جانے میری چھٹی حس کیوں مجھے یہ یاد کر رہی تھی کہ اگر مجھے کبھی نقصان ہوا تو وہ ہمایوں کی طرف ہی سے ہوگا۔ میں نے کچھ بندے اس کے اور اس کے سیٹھ حفیظ کے ارد گرد چھوڑے ہوئے تھے۔ روپوش ہونا ان کی بھی بھجوری تھی۔ آج دو دو ہر کے وقت مجھے ساری کہانی معلوم ہوئی کہ ہمایوں کس قدر تھکے میں آچکا ہے۔ میں پھر وہاں نہیں رہا فوراً چلا آیا اور اب ہمیشہ کے لیے یہ ملک چھوڑ رہا ہوں۔۔۔ ہم ایئر پورٹ جا رہے ہیں باقی باتیں المینان سے جہاز میں بیٹھ کر بتاؤں گا۔ اب مجھے ڈسٹرب نہیں کرنا۔۔۔“ جنید نے کہا اور فون کی جانب متوجہ ہو گیا۔ اس نے ایک نئی سم ڈالی اور ہمایوں کے نمبر ملا دیئے۔

”جی۔۔۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔

”میری بات غور سے سنا۔“

”آپ۔۔۔؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں میں۔۔۔ غور سے سنو صفیہ قتل ہو چکی ہے۔“

”کیا کہہ رہے ہیں آپ۔۔۔؟“ وہ چیختے ہوئے بولا۔

”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ اپنے جذبات قابو میں رکھنا۔ ابھی پلٹ جاؤ تو یہ کارا سہ ہر وقت کھلا ہوتا ہے۔ سرین جو زف ہمیں ہے اس کی ہر ممکن مدد کرنا میں زیادہ بات نہیں کر سکتا۔ تمہارا یہ فون کہیں نہ کہیں ٹیپ ضرور ہو رہا ہوگا اس لیے۔۔۔“

یہ کہتے ہی اس نے فون بند کر دیا۔ پھر المینان سے ایک گہری سانس لیتے ہوئے راحیلہ کی جانب دیکھا تو راحیلہ نے اپنا سر اس کے کانہ سے لگا دیا۔

☆☆

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

وہ دونوں ایئر پورٹ کی عمارت کے اندر داخل ہوئے تو ایک جانب سے نوجوان سالہ لڑکا ان کی جانب بڑھا، اُس نے پاسپورٹ اور کاغذات ان کی طرف بڑھائے اور بتا کچھ کہے دوسری جانب چلا گیا۔ تب جنید نے راجیلہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”نسرین کوفون کر رہی اور اُسے سمجھاؤ کہ ہماری بہت دل برداشتہ ہوگا۔ اگر وہ اس کے پاس آئے تو دلجوئی کرنا۔“ ہاتی باتیں پھر سہی۔“

”ہاں ایسا ہی ہونا چاہئے۔ ہماریوں کے لیے یہ بہت بڑی سعادت ہوگی۔“

راجیلہ نے کہا اور نسرین سے باتیں کرنے لگی۔ چند منٹ تک وہ یونہی مصروف رہی پھر فون بند کر دیا۔ کچھ ہی دیر بعد اُن کی پرواز کا اعلان ہونے لگا۔ اُنہوں نے قدم بڑھا دیئے۔

ایک بے سکون زندگی اُن کی منتظر تھی۔



ناش کے بٹے

نجرم کی بساط پر کھینچی جانے والی خوبی بازی..... ایک جنوبی قائل کا قصہ جو دنیا کے عظیم ترین قانون کے درمیان اپنا نام سرفہرست رکھنا چاہتا تھا۔ ناش کے باون بٹے اُس کے مرکز نظر تھے۔ فی قائل ایک بٹے کے حساب سے شروع ہونے والا یہ سلسلہ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ قانون کے محافظ معمولی سے سراغ کو بھی فراموش نہ کرتے ہوئے قائل تک پہنچنا چاہتے تھے۔ مگر قائل کی احتیاط پسندی اور فنکاری محافظوں کی راہ میں حائل تھی۔

سطر سنسنی اور سسپنس پھیلانے والے اس ناول کی دلچسپ ترین بات یہ ہے کہ قائل آپ کے سامنے ہونے کے باوجود بھی ساتھ پردوں میں پوشیدہ ہے۔

ناش کے بٹے ایک سنسنی خیز اور دلچسپ ترین ایڈورچر سے بھرپور ناول ہے جسے کتاب مگر کے ایڈیٹر نے ایڈیٹنگ اور جاسوسی ناول سیکشن میں بہت جلد پیش کیا جائے گا۔